اردو کے دینی ادب میں منفرد اضافہ

شرح اسماء الحسنیٰ (اردو)

صفاتِ الٰہیہ سے متعلق علوم و معارف
ادیبانہ اور مفسرانہ اسلوب میں

ربوبیت کا ایک مربوط نظام



علامہ عبدالصمد صارم الازہری

مکتبہ قاسمیہ ملتان پاکستان

اردو کے دینی ادب میں منفرد اضافہ

شرح أسماء الحسنیٰ (اُردو)

صفاتِ الٰہیہ سے متعلق علوم ومعارف
ادیبانہ اور مفسّرانہ اسلوب میں

ربوبیت کا ایک مربوط نظام





علامہ عبدالصمد صارم الازہری

مکتبہ قاسمیہ ملتان پاکستان

اسمائے حسنیٰ اللہ تعالیٰ کے ان صفاتی ناموں کو کہتے ہیں جو قرآن کریم میں آئے ہیں، ان صفاتی اسماء کا احصا یعنی گن کر پڑھنا بھی عمل تلاوت وذکر کا ایک حصہ ہے۔ متفق علیہ روایات حدیث میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو بطور ورد پڑھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک وظیفہ معلوم ہوتا ہے، لیکن محدثین و مفسرین کے علاوہ دیگر اکابر اسلام نے بھی لکھا ہے کہ اسمائے حسنیٰ براہین نظر آئیں گے اور ان سے ایمان مستحکم ہوگا۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اسمائے حسنیٰ کے ورد سے اللہ پر توکل اور اس کی قدرت ورحمت پر جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ ہمارے اندر ہر شر سے مدافعت کی قوت پیدا کر دیتا ہے، خواہ امراض ہوں یا زندگی کی عام مشکلات۔ ان تمام باتوں کا انحصار معنویت ہی کے شعور وادراک پر ہے، ان صفاتی اسماء کی حقانیت کے جو دلائل ہیں وہ بھی معانی پر غور کرنے کے بعد واضح ہوں گے۔

زیر نظر کتاب "شرح اسمائے حسنیٰ" بھی اوراد و وظائف یا ان کے روحانی فوائد و خواص پر نہیں بلکہ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کاملہ کے ایمان آفرین دلائل پر ہے۔ استدلال کا اسلوب و انداز عام فہم اور سادہ ہے اس کی منفرد خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب اسمائے حسنیٰ کی علمی شرح و تفسیر بھی ہے اور مبلغین اسلام کے دل نشین طرز استدلال کی راہنما بھی۔ مصنف کا مقصد بھی یہی ہے، یقیناً یہ کتاب مفید اور تعمیری مقصد کی حامل اور لائق مطالعہ ہے۔

مولانا عبدالصمد صارم الازہری ایک ممتاز اور کئی اچھی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس لیے انہوں نے اسمائے حسنیٰ کی شرح میں اکابر مفسرین و محدثین ہی کا تتبع کیا ہے، استدلال اور اخذ نتائج کے سلسلے میں بھی وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔

(حکیم محمد سعید)

شرح اسماء الحسنیٰ

بسم الله الرحمن الرحیم

toobaa.elibrary.blogspot.com

شرح اسماء الحسنیٰ

(صفاتِ الٰہیہ سے متعلق علوم و معارف، ادیبانہ اور مفسرانہ اسلوب میں)

تصنیف

علامہ عبد الصمد صارم الازہری

ترتیب و تقدیم

حبیب الرحمٰن ہاشمی

مکتبہ قاسمیہ ملتان پاکستان

نزد چوک گھنٹہ گھر، کچہری روڈ۔ فون: 44585

کتاب : شرح اسماء الحسنیٰ اردو

تصنیف : علامہ عبدالصمد صارم الازہری

ناشر : عارف کمپنی' مکتبہ قاسمیہ۔ ملتان پاکستان

مطبع : حیرت پرنٹنگ پریس۔ ملتان

طبع اول : اکتوبر 1997ء

طبع دوم : جولائی 1998ء

قیمت : [redacted] روپے

بیرون ملک ملنے کے پتے

سعودی عرب

☆مکتبہ الکوثر
شارع ستین۔مدینہ منورہ

☆مکتبہ امدادیہ
باب العمرہ ۔مکہ مکرمہ

☆ مکتبہ الحجاز
باب المجیدی۔مدینہ منورہ

انگلینڈ

☆دارالعلوم
بالکرم لندن

امریکہ

☆ دفتر ماہنامہ آذان انٹرنیشنل
نیو یارک

انڈیا

☆مکتبہ دارالعلوم
دیو بند ۔ یوپی

☆مکتبہ رضائے مصطفیٰ
بریلی

بنگلہ دیش

☆کتب خانہ امدادیہ
چوک بازار ۔ ڈھاکہ

☆الجامعہ اسلامیہ
پوٹیا چٹا گانگ

مدرسہ زکریا لاتیز جوہانسبرگ ۔ جنوبی افریقہ

فہرست

اللہ تعالیٰ کے توقیفی نام

هُوَ اللهُ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۔ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ

الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ

الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ

الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ۔ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ

الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ الْحَلِيْمُ الْعَظِيْمُ

الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ الْحَفِيْظُ الْمُقِيْتُ

الْحَسِيْبُ الْجَلِيْلُ الْكَرِيْمُ الرَّقِيْبُ الْمُجِيْبُ الْوَاسِعُ

الْحَكِيْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِيْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيْدُ الْحَقُّ

الْوَكِيْلُ الْقَوِيُّ الْمَتِيْنُ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ الْمُحْصِي

الْمُبْدِئُ الْمُعِيْدُ ۔ الْمُحْيِيْ الْمُمِيْتُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الْفَرْدُ الصَّمَدُ

الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ

الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِيْ الْمُتَعَالِيْ الْبَرُّ التَّوَّابُ

الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّؤُوْفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِيُّ الْمُغْنِيْ الْمُعْطِيْ الْمَانِعُ

الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ ۔ الْهَادِيْ الْبَدِيْعُ الْبَاقِيْ

الْوَارِثُ الرَّشِيْدُ الصَّبُوْرُ

حرف اول

کائنات کو تخلیق کرنے والے نے جب اشرف المخلوقات کو تخلیق کیا تو کائنات کے تمام ذرے اور تمام ملائکہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے کہ انہیں اسی بات کا حکم دیا گیا تھا(واذقلنا للملئکته اسجدو لادم فسجدوا) پھر اسی انسان کو' اسی مسجودِ ملائک کو حکم دیا گیا کہ "سیروافی الارض ؟انسان کے لیے ہر وہ چیز مسخر کر دی گئی جو زمین اور آسمانوں میں ہے۔تب انسان نے تسخیر و تغلب کی راہیں تحقیق و تفکر سے کھولنا شروع کر دیں ۔وہ گہرے پانیوں میں' تند و تیز ہواؤں میں' لامحدود فضاؤں میں' سیاروں اور ستاروں کی بلند و پست دنیاؤں میں مطالعہ کائنات کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے وہ ہر لحہ' اللہ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے' اس کے حضور سر بسجود ہے کہ یقیناوہی کبیر واکبر ہے' وہی عظیم واعظم ہے' وہی قدیر و قادر ہے' انسان کو نہ اس کی قدرت سے مجال انکار ہے نہ اس کی مشیت سے !انسان تو حیرت زدہ اور دیکھتا ہے کہ اربوں ٹن وزنی دو عظیم کرے........ سورج اور چاند .... کیسی بلندیوں میں' کس اعتدال و توازن اور انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ' بغیر کسی ستون کے قائم ہیں اور اپنی اپنی جگہ مسلسل یوں حرکت میں ہیں کہ دن بھی بناتے ہیں' راتیں بھی بناتے ہیں اور زمین کا مکمل نظام بھی چلائے ہوئے ہیں۔اللہ اکبر یہ سب قدرت خداوندی کا ادنی اظہار ہے۔یہ ساری کائنات اور اس کا ایک ایک منظر' اسی کی قدرت کا مظہر ہے۔ تنظیم کائنات کے یہ سب مظاہر' یہ سب مناظر انسان کو قدرتِ خداوندی سے باخبر کرتے ہیں۔ لیکن انسان کو مشیت خداوندی سے کون باخبر کرے ؟اس مقصد کے لیے انبیائے کرام مبعوث فرمائے گئے۔مختلف ادوار میں مختلف اقوام میں جتنے بھی انبیاء ورسل تشریف لائے وہ انسان کو اس کی حقیقت وحیثیت سے اور اس کے خالق و مالک کی قدرت و مشیت سے باخبر کرنے کے لیے تشریف لائے بعثت انبیاء کے اس تواتر نے انسانی زندگی کو ایک منشور' دستور اور ضابطہ دیا' جسے دین کہا گیا ہے اور جو انسان اور الہ' خالق اور مخلوق' عابد اور معبود اور

عبد اور رب کے درمیان رابطے اور تعلق کو ممکن بناتا ہے۔

حیات و کائنات کے حوالہ سے اسمائے الہی کو عنوان بنا کر، گفتگو کرنے کا جو انداز آپ کو زیر نظر کتاب میں ملے گا، وہ علامہ عبدالصمد صارم الازہری سے خاص ہے۔ ان کی علمی بصیرت، تحقیقی ذوق، وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے پر مبنی اسماء الحسنیٰ کی یہ تشریحات بہت پر مغز اور بہت دلچسپ ہیں۔ سماجی اور دینی علوم کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے یکساں طور پر مفید ہیں۔ اور اردو کے دینی ادب میں ایک شاہکار اور یادگار اضافہ ہیں۔ اس کتاب کے ورق ورق، صفحہ صفحہ، سطر سطر اور لفظ لفظ میں سے حقائق کی روشنی پھوٹتی ہے۔ اب تک اسمائے الہی کے حوالے سے جو کتب چھپی ہیں، وہ اکثر و بیشتر اورا دو وظائف اور عملیات و تعویذات کی برکات و ثمرات تک محدود ہیں۔ بقول علامہ عبدالصمد صارم----- ان اسماء کے حقائق پر کم کم لکھا گیا ہے۔ الحمد للہ-----اس کتاب کے منصۂ مشہود پر آنے سے یہ تشنگی بڑی حد تک دور ہو گئی ہے۔

طباعت کے حوالے سے میری خواہش تھی کہ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے ہر نام سے پہلے اس کی معنویت و اہمیت کے مطابق رنگین نیچرل کائناتی تصاویر شامل کی جاتیں لیکن یہ ایک انتہائی مہنگا مرحلہ تھا جسکا عام قاری تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ بہر حال ہم نے اپنی سی ایک کوشش سے اس میں چند نیچرل تصاویر شامل کی ہیں۔

امید ہے کہ قارئین مذہبی اور دینی نکتہ نظر کے علاوہ عام معلومات کے حوالے سے بھی اپنے لئے بہت مفید پائیں گے۔ جناب مولانا حبیب الرحمٰن نے نہایت محنت سے مولانا عبدالصمد کی تحریروں کو یکجا کر کے اس کتاب کو آپ تک پہنچانے میں جانفشانی کی ہے اللہ انکی محنت اور کوشش کو درجہ قبولیت عطا فرمائے۔ (آمین)

زبیر احمد قاسمی

عارف کمپنی، ملتان، پاکستان

عرضِ مرتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزنامہ "امروز" مرحوم میں ہر ہفتے اشاعت اسلام کے لئے تقریباً" دو صفحے مخصوص تھے۔ اکثر اندرونی صفحات پر دینی' اخلاقی' اصلاحی مضامین ہوا کرتے تھے' جبکہ باہر کے صفحات ایمان سوز' مخرب اخلاق' حیاء باختہ' مواد پر مشتمل ہوتے یعنی وہ سب کچھ ہوتا تھا جس کی اشاعت سے نہ صرف اسلام نے منع کیا ہے' بلکہ اسلام اس کو مٹانے کے لئے آیا ہے' افسوس صد افسوس ! ہمارے ذرائع ابلاغ فواحش و منکرات کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے بجائے اس کے پھیلاؤ اور بہاؤ کو تیز کرنے کے لئے وقف ہیں۔ اکثر اخبارات اور رسالے زہر کے پیالے ہیں جسے قوم آنکھوں کے راستے دل میں انڈیل رہی ہے اور دل کی دنیا برباد کر رہی ہے'

فَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى

اخبار بینی کا لپکا شروع ہی سے تھا۔ "اشاعت اسلام" میں مولانا عبدالصمد صارم الازہری "اسماء حسنٰی" کے زیر عنوان کالم لکھ رہے تھے' سب سے پہلا کالم "اَلْمُقِيْتُ جَلَّ جَلَالُہٗ" پڑھا مولانا کی باریک بینی' علم کی وسعت اور تنوع' کثرتِ مشاہدہ' قوتِ بیان' زورِ قلم' الفاظ کے شکوہ نے مسحور کر دیا۔ پھر گذشتہ مضامین کی تلاش اور آئندہ کا انتظار شروع ہو گیا۔ اللہ کی شان' میں "المقیت" کے بعد صرف 45 "اسماء حسنٰی" جمع کر سکا ایک لمبے سفر نے تلاش کا یہ سلسلہ منقطع کر کے کسی اور دنیا میں پہنچا دیا' واپس آیا تو "امروز" مر چکا تھا اور اس کی فائلوں پر غبار کی تہیں جم چکی تھیں۔ "امروز" مرحوم کی مطلوبہ فائلوں کے حصول کے لئے نہ جانے کن کن کی خوشامد کی۔ مگر بے سود۔

پھر زکریا یونیورسٹی (ملتان) پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی لائبریریوں کا طواف شروع کیا۔ غبار میں اٹی ہوئی دیو قامت، بھاری بدن فائلوں کو اٹھانے کے لئے دست و بازو میں قوت درکار تھی، ناچار فرش خاک پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں فائلوں کی ورق گردانی کرتا، ہرچند ٹھنڈے فرش کا احساس ہوتا، مگر آتشِ طلب اس احساس کو جلا دیتی اور دل کو گرما دیتی، کئی دن کی تلاش و جستجو کے بعد مطلوبہ مواد میسر آیا تو دل کا کنول کھل گیا، جب عکس لینے (فوٹو کاپی کرانے) کا وقت آیا، تو یہ سن کر کہ "عکس لینے کی اجازت نہیں" ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ ہائے انسان کی مجبوری و بے چارگی! پاکر اتراتا ہے اور کھو کر گھبراتا ہے۔ مجھے یہ احساس ستا رہا تھا جس طرح غیر مطبوعہ کتب اپنے گراں مایہ مصنفین و مولفین کا نوحہ کرتے ہوئے پیوند خاک ہو گئیں. اسی طرح یہ بلند پایہ علمی کاوش کیڑوں کی خوراک نہ بن جائے۔ الحمد للہ میں نے ہمت ہاری نہ تلاش کا سفر موقوف کیا، تلاشتے اور کھوجتے مولانا صارم صاحب کو پا لیا۔ مولانا کی شخصیت پر انکے نام کی گہری چھاپ ہے۔ حددرجہ بے نیاز اور مستغنی اور کم آمیز ہیں۔ جب تکلف کے پرت اترے تو نہایت خلیق و شفیق انسان لگے۔ مولانا نے جب میری طلب دیکھی تو مدد اور تعاون کی ہامی بھری. کہ جس قدر مواد جمع کر سکتے ہو کر لو باقی میں مہیا کر دوں گا۔ مولانا نے نہ صرف مہیا کر دیا بلکہ کمال شفقت و مہربانی اور ازراہ خورد نوازی یہ بھی فرمایا.... "جوں کا توں شائع کر دو یا حک و اضافہ کرو. تمہیں مکمل اختیار ہے۔ بس میری کتاب چھپ جائے"۔ مولانا کثیرا لتصانیف، وسیع النظر، اور وسیع المشرب عالم ہیں۔ ڈھائی سو کے قریب بڑی چھوٹی کتابیں جن میں تصنیفات، تالیفات، تراجم، اور سفرنامے شامل ہیں،

یوں تو "اسماء حسنٰی" کی تشریح کے موضوع پر عربی، فارسی، اردو میں قابل قدر کام ہوا ہے۔ مثلاً

(۱) "اَلْمَقْصَدُ الْاَسْنٰی فِی شَرْحِ اَسْمَاءِ اللّٰہِ الْحُسْنٰی" حجتہ الاسلام ابو حامد محمد الغزالیؒ، المتوفٰی ۱۱۱۲ء،

(۲) "شرح اسماء اللہ الحسنٰی" شیخ الاسلام فخرالدین محمد بن عمر الرازیؒ المتوفٰی ۱۲۱۰ء

(۳۲) "الْاَسْنٰی" الامام ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبیؒ، المتوفٰی ۱۲۷۲ء

(۴) "الاَسْمَاءُ وَالصِّفَاتُ" الامام المحدثین الحافظ ابو بکر بن حسین بن علی البیہقیؒ، المتوفٰی ۱۰۶۵ء

(۵) "اسماء و صفات الٰہی فقط در قرآن" ڈاکٹر محمد باقر محقق فارسی، صفحات ۱۵۷۰

مذکورہ بالا کتابیں عربی میں اور آخری کتاب فارسی زبان اور ٹھوس علمی انداز میں ہیں۔ جس سے علماء ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا عربی سے ناواقف حضرات اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اردو میں اسماء حسنٰی مولانا سید محمد سلیمان منصور پوریؒ کی کتاب ہے۔ جو ایک کامیاب اور مفید کوشش ہونے کے باوجود اس کمی کو پورا نہیں کرتی جس کا یہ پاکیزہ موضوع تقاضا کرتا ہے۔ آج کا انسان شگفتہ تحریر اور شستہ تقریر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا اور توجہ کے کان سے سنتا ہے۔ مولانا صارم صاحب کا انداز منفرد بھی ہے اور ابنائے زمانہ کے ذوق کے مطابق بھی۔ صارم صاحب کی تحریر اپنے دامن میں جہاں بھرپور علم رکھتی ہے وہاں زبان کا چٹخارہ اور ادب کی چاشنی سے بھی مالا مال ہے۔ جس کو قارئین کرام دوران مطالعہ بخوبی محسوس کریں گے۔ ناچیز مرتب. مقدم. (پیش کار) اپنے کریم رب کے حضور سربہ سجود ہے کہ محض اس کی توفیق سے یہ عاجز بندہ ایک شاہکار کتاب پیش کرنے کے قابل ہوا. اے میرے اللہ میں تیرے ستھرے، پاک، برکت والے اور تیرے نزدیک سب سے زیادہ پیارے نام کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں میری تمام فرو گذاشتوں کو معاف فرما! اس حقیر کوشش کو قبول فرما۔ اپنے بندوں کی ہدایت اپنی محبت و رضا اور اپنی معرفت کا اس کو ذریعہ فرما۔ آمین

کوئی ایک بھی بھٹکا ہوا آہو، سوئے حرم آ نکلا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔ برادرم ڈاکٹر سید ذوالحسنین شاہ، اور عزیزی فرحان ملک نے

حروف خوانی میں بہت مدد کی اور گرامی قدر برادران سید ذوالکفل بخاری' ابو میسون اللہ بخش احرار اور حافظ سعید انور نے مفید مشوروں سے نوازا' ان کا میں تہہ دل سے شکرگزار ہوں' اللہ ان دوستوں کو ہرا اور سکھی رکھے' آمین۔

جناب زبیر احمد بن قاسم صاحب مدیر "عارف کمپنی، مکتبۂ قاسمیہ ملتان" کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ہوش ربا گرانی میں اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اللہ اپنی رحمت و برکت سے انکو نہال کرے آمین

حبیب الرحمٰن ہاشمی

جامع مسجد نشتر میڈیکل کالج ملتان پاکستان

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۶ء

*

دیباچہ

عقلِ سلیم اور چشمِ بصیر اس حقیقت سے بداہتہً آشنا ہے کہ خالق و مالکِ کائنات اور ربُّ العالمین سے بڑھ کر کوئی سزاوارِ حمد و ثنا نہیں، اور اس کی طرح کوئی مجیب و مرجع دعا و نداء نہیں۔ کسی پکارنے والے کی پکار اس ذاتِ صمد سے بڑھ کر کون سن سکتا ہے اور اس بے کراں کائنات میں کون ہے جسکو اس خدائے سمیع و بصیر کے سوا پکارا جائے؟ انسانی فطرت اور لاشعور شاید اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں، اسی لئے تہذیب و ادیان کے طلوع سے اب تک اس کو پکارنے، اس سے مدد مانگنے اور اس سے لطف و کرم کا سوال کرنے کے بے شمار انداز و اسالیب سرشتِ انسانی کی "کاوش ندا" کے طور پر سامنے آتے رہے ہیں۔ لیکن عقیدۂ توحید کے ذریعے حقیقی "تصورِ الٰہ" کو روشن اور واضح کرکے اسلام اور قرآن کریم نے قادرِ مطلق اور خالقِ حقیقی کو پکارنے کے جو آداب و اسماء سکھائے ہیں، ان سے بہتر کا تصور ممکن نہیں۔ اس ذاتِ بے ہمتا و یگانہ و یکتا نے اپنے اسمائے گرامی کو خود ہی "اسمائے حسنٰی" یعنی بہترین اور خوبصورت نام قرار دیا ہے۔ لاریب، یہ اسماء جمال و زیبائی کا مرقع ہیں۔ ان اسمائے حسنٰی کی شرح ہر دور کے علماءؒ نے کی ہے، لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں، ایسی ہر انسانی کاوش انسانی علم و ادراک کی حدود سے مشروط ہوتی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی بھی پینے والا سمندر سے چند چلو ہی پی سکتا ہے۔ اگر صفت اپنے موصوف کی آئینہ دار ہے تو اسمائے حسنٰی کا بحرِ بے کراں ہونا بھی بدیہی ہے۔ اس بحرِ بے کراں کو فہم و بیان کے انسانی ظروف میں سمیٹنا ناممکن ہے۔ اس لئے "ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے" کے مصداق دفتروں کے دفتر تمام ہوئے اور مدح کی میم کا بھی حق شاید ادا نہیں ہو پایا۔

ع سفینہ چاہئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

ماضیِ قریب کے علماء میں علامہ قاضی محمد سلمان منصور پوریؒ کی شرح اسماء الحسنٰی کو علمی حلقوں میں خاصی مقبولیت اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے زیادہ کی مدت میں اور کئی اربابِ علم نے بھی اس سمت میں کاوشیں کی ہیں۔ انہیں میں مولانا عبدالصمد صارم الازہری بھی ہیں۔ جو صاحبِ تصانیف کثیرہ ہونے کے باعث کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے علمی مقام و مرتبہ سے میں اپنے زمانۂ طالب علمی سے آگاہ ہوں۔ ان کی وسعتِ معلومات اور قوتِ تحریر ان کے لئے علمی حلقوں میں ہمیشہ امتیاز و احترام کا باعث رہی ہے۔ ان کے اسلوب میں فصاحت و بلاغت جوہری عنصر کے طور پر موجود ہے۔ مضامین و مطالب کی علمی نوعیت کے باوجود ان کے اندازِ بیان میں سادگی کا حسن بھی ہے اور بلاغت کی

خوبی بھی۔ ان کا کوئی جملہ ابلاغ کے حسن سے عاری نہیں ہوتا۔ ان کی جزالت و متانت ان کی شخصیت کی طرح ان کے اسلوبِ بیان میں بھی نمایاں ہے۔ ان کی یہ "شرح اسمائے حسنیٰ" جو ایک مدت تک قسط وار ایک قومی روزنامے میں شائع ہوتی رہی ہے' ان کی صلابتِ فکر اور صراحتِ بیان کی بدولت' اور سب سے بڑھ کر موضوع کی عظمت اور دائمی اہمیت و معنویت کے پیشِ نظر علمی دنیا اور قارئین کے وسیع حلقوں میں مستقل قدر و قیمت کی حامل قرار دی جائے گی۔ عربی زبان و ادب سے سے کامل آگاہی اور لغت کے وسیع علم نے مولانا صارم الازہری کی اس علمی کاوش کو اصول و عقائد اور لغت و ادب کا ایک خوبصورت اور ہمہ پہلو مرقع بنا دیا ہے۔ ایک وسیع المطالعہ ادیب اور انشاپرداز کی حیثیت سے مولانا نے اسمائے حسنیٰ کی تشریح میں قدیم و جدید علوم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کا علمی شعور عصرِ حاضر کے سائنسی انکشافات سے پوری طرح مربوط ہے۔ اسی لئے ان کی یہ تصنیفِ لطیف جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے بطورِ خاص معنی خیز اور موثر ہو سکتی ہے۔ بقول ان کے "میں نے حقائقِ اسماء پر روشنی ڈالی ہے جو اس دور کے لوگوں کے مزاج کے عین مطابق ہے" عصری شعورِ حیات سے قریب تر رہنے کے لئے مولانا نے سیاق و سباق کی مناسبت سے مظاہرِ فطرت اور سرشتِ انسانی کے مشاہدے اور مطالعے سے حاصل ہونے والے نتائج کو دلائل اور شواہد کے طور پر پیش کیا ہے اور حیات و کائنات کے عمومی مشاہدے اور تجربے سے بھی موثر انداز میں استشہاد کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ علمی کاوش عصرِ حاضر کے اصحابِ علم و دانش کے لئے ہدایت یابی کا ایک خوبصورت وسیلہ ہے۔ اس شرح کے فاضل مؤلف مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی الدہلوی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک مدت کی کاوش اور محنت سے اس کے اجزا کو خوش ذوقی اور خلوص کے ساتھ موجودہ صورت میں مرتب اور مدون کیا اور انہیں کی سعی سے یہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ علم قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ منصف اور مؤلف کے ساتھ ساتھ اس کے ناشر عزیزی زبیر احمد قاسمی کو بھی اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اسلم انصاری

۳/۴/۹۷

ممتاز ادیب و شاعر، مشہور نقاد و مصنف، معروف ماہرِ تعلیم
پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری
گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان

از: مرتب

حضرت المصنف

(ایک تعارف)

مولانا عبدالصمد صارم بن مولانا ظہور الحسن ناظم

(شجرہ نسب محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم سے جاملتا ہے)

مولانا ۱۹ دسمبر ۱۹۱۸ء کو قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور مولانا عبدالرحمن سے پائی۔ مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں عربی کی تعلیم "کافیہ" تک حاصل کی۔ ایک سال مدرسہ قاسمیہ نگینہ (ضلع بجنور) میں "شرح جامی" تک پڑھا۔ پھر چار پانچ سال دارالعلوم دیوبند میں رہے اور ۱۹۳۶ء میں سند فراغت حاصل کی۔ مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دو سال بعد جامع الازہر، مصر چلے گئے۔ وہاں سے دو سال میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ واپسی پر حیدر آباد دکن چلے آئے۔ وہاں سے لاہور آکر انجمن حمایت اسلام کے شعبہ تصنیف و تالیف سے بحیثیت مصنف وابستہ ہو گئے۔ "شاہکار" کے مدیر رہے۔ ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں استاد مقرر ہوئے اور یہاں سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر ۱۹۷۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

مولانا کے اساتذہ میں اکابر دارالعلوم دیوبند...... مولانا سید حسین احمد مدنی، میاں سید اصغر حسین، مولانا رسول خان، مولانا عبدالسمیع اور مولانا اعزاز علی رحمہم اللہ کے نام آتے ہیں۔ جامع الازہر کے اساتذہ میں الشیخ زنکلونی، الشیخ قطیشی قابل ذکر ہیں۔ علامہ طنطاوی جوہری سے بھی استفادہ کیا۔ پروفیسر عبدالوہاب عزام سے دوستی رہی۔ اپنے "شیوخ" کے بارے میں مولانا کا کہنا ہے کہ...... "میں کبھی کسی سے بیعت نہیں ہوا۔ کیونکہ کسی کا پابند نہیں رہ سکتا۔ ویسے میرے بہت سے پیروں، فقیروں، اور اولیاء اللہ سے تعلقات رہے ہیں۔"

مولانا کے مطالعہ و تحریر کے موضوعات بیشتر مذاہب عالم، ادبیات، تراجم، شخصیات، سفر ناموں، اور بچوں کے ادب سے متعلق ہیں۔ شاعری اور سیاحت بھی کرتے ہیں۔ طب و حکمت سے بھی لگاؤ ہے۔ "ایم ڈی" (ہومیو پیتھک) اور "زبدۃ الحکماء" (طب) کی اسناد بھی حاصل کیں۔ تصنیفات و تالیفات کی تعداد لگ بھگ اڑھائی سو ہے، جو عربی فارسی اور اردو میں ہیں۔ بعض کتابوں پر انعامات بھی ملے۔ چار کتابیں، پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے اسلامیات کے نصاب میں شامل ہیں۔

مولانا، آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔ اللہ انہیں سلامت باکرامت رکھے (آمین)

*

مصنف کی دیگر تصانیف

عربی میں: {1} البشائر (سیرت نبوی) {2} اللاٰکی (شاعری) {3} المقامات المحس للحریری (ترجمہ) {4} الکامل للمبرد (ترجمہ وحاشیہ) {5} استاذالعربیہ {6} اساس العربیہ {7} شعرالعرب (ترجمہ)

فارسی میں: {1} فارسی آموز {2} محمود و فردوسی {3} انتخاب فارسی

اردو میں: {1} ترجمہ المنجد {2} تاریخ القرآن {3} تاریخ الحدیث {4} تاریخ التفسیر {5} تاریخ الفقہ {6} سفرنامہ صارم {7} انتخاب تاریخ {8} سفرنامہ حج و زیارت {9} مقالات صارم {10} مضامین صارم {11} نامور بیٹیاں {12} رسول کریم کی تعلیم {13} تاریخ کشمیر {14} اردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن {15} اخلاقی کہانیاں {16} قرآنی اخلاق {17} خلق مسلم {18} زر خالص {19} تنقیدات طہ حسین {20} رابعہ بصریؒ {21} امیر معاویہؓ {22} عمر بن عبدالعزیزؒ {23} امام زین العابدینؒ (ترجمہ) {24} ابو ذر غفاریؓ {25} عثمان غنیؓ {26} اردو قواعد انشاء {27} ہماری زبان {28} سودیشی اردو {29} ضروری کہانیاں {30} خلق عظیم {31} زبان و قلم {32} عقائد الاحناف {33} اردو زبان اور ہندو {34} قاعدہ یسرناالقرآن {35} حضرت علیؓ {36} مقام غالب {37} روح کیاہے {38} فریاد رس {39} عائشہ صدیقہؓ {40} قصص القرآن {41} اسلام کھنڈ {42} امام اعظمؒ {43} امام شافعیؒ {44} امام ابن حنبلؒ {45} امام مالکؒ {46} امام بخاریؒ {47} ابن خلدونؒ {48} ابراہیم ادھمؒ {49} حسن بصریؒ {50} حاجی امداداللہؒ {51} قاسم نانوتویؒ {52} اشرف علی تھانویؒ {53} انور شاہ کشمیریؒ {54} شاہ عبدالعزیزؒ {55} رشید احمد گنگوہیؒ {56} شیخ الہندؒ {57} حسین احمد مدنیؒ {58} شبیر احمد عثمانیؒ {59} اچھی کہانیاں {60} تاریخی کہانیاں {61} اسلامی تاریخی کہانیاں {62} عظیم شخصیتیں {63} حضرت خدیجہ الکبریٰؓ {64} فاطمۃ الزہراؓ {65} زینب بنت فاطمہؓ {66} امام حسنؓ {67} ابن قیمؒ {68} امام رازیؒ {69} ابن تیمیہؒ {70} مولانا رومؒ {71} مولانا محمد الیاسؒ {72} فریدالدین عطارؒ {73} حافظ شیرازیؒ {74} سعدیؒ {75} شاہ ولی اللہؒ {76} محمد عبدہؒ {77} جمال

الدین افغانیؒ {78} سید احمد شہیدؒ {79} عبیداللہ سندھیؒ {80} جمال عبدالناصر {81} حضرت آدم علیہ السلام {82} حضرت ہود علیہ السلام {83} حضرت ذوالقرنین علیہ السلام {84} ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام {85} حضرت نوح علیہ السلام {86} حضرت صالح علیہ السلام {87} حضرت اسماعیل علیہ السلام {88} حضرت یوسف علیہ السلام {89} حضرت زلیخا {90} حضرت عزیر علیہ السلام {91} حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام (92} حضرت طالوت {93} حضرت داؤد علیہ السلام {94} حضرت ایوب علیہ السلام {95} معراج شریف {96} شکریہ نعمت {97} قابیل ہابیل {98} مومن آل فرعون {99} اصحابِ کہف رحمہ اللہ {100} بنی اسرائیل {101} سدرۃ المنتہیٰ {102} ملکۂ سبا {103} زم زم {104} عام الفیل {105} جُریج عابد {106} اصحاب الاخدود {107} قاضی عزالدینؒ {108} اصحاب القریہ {109} قارون {110} اصحاب الفیل {111} بنی اسرائیل کی گائے ... {*} اور، دیگر متعدد و متفرق مطبوعہ و غیر مطبوعہ مقالات، مضامین، کتابچہ جات اور کتب!

*

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مقدمہ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہٖ الکریم خاتم الانبیآء والمرسلین وعلٰی اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

یہ ننانوے اسمائے الٰہی توقیفی ہیں جن سے قرآن نے ہمیں واقف کیا ہے اللہ اسم ذات ہے باقی اسمائے صفات ہیں۔

علماء کرام نے ننانوے ناموں میں اسمائے الٰہی کو اس لئے محصور کیا ہے تاکہ ہماشما اپنی طرف سے کوئی نیا نام غلط ایجاد نہ کرلے ویسے اسمائے الٰہی ان کے سوا بھی ہو سکتے ہیں ننانوے میں محصور نہیں ہیں ہر اچھا نام اس کا نام ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں (لَہُ الۡاَسۡمَاءُ الۡحُسۡنٰی) جیسے اس کی ذات لا محدود ہے اس کی صفات بھی لا محدود ہیں۔ ہمیں اس کی ساری صفات کا علم نہیں ہے اس لئے عارفین کاملینؒ نے فرمایا **ما عرفناک حق معرفتک** ''ہم آپ کی معرفت کا حق ادا نہ کر سکے'' اس کتاب میں آپ کو چند پاک نام نئے ملیں گے جیسے ''رب العالمین'' ''فالق الاصباح'' ایک سو چالیس کے قریب نام تو میں بتا سکتا ہوں۔ سبحان اللہ چودہ صدیاں گزر گئیں اسمائے الٰہی کا حق کوئی بھی ادا نہیں کر سکا۔ کتابیں تو بہت سی لکھی گئیں مگر لفظی تحقیق اور خواص و اوراد و وظائف سے آگے کوئی بھی نہ بڑھ سکا جہاں تک لفظی تحقیق کا تعلق ہے عوام کو اس سے کوئی فائدہ نہیں اور علماء تو جانتے ہی ہیں۔ لہٰذا میں نے لفظی تحقیق کو چھوڑ دیا ہے کہیں کہیں کچھ لکھ بھی دیا ہے رہا اوراد و وظائف کا معاملہ سو ان کے فوائد سے کون انکار کر سکتا ہے مگر میں نے ان سے پہلو تہی کی ہے کہ ہمارے اسلاف اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ مگر ان اسماء کے حقائق و معارف پہ کم لکھا ہے اور وہ بھی علمی زبان میں جس سے عوام اور کم پڑھے لکھے افراد فائدہ نہیں اٹھا

سکتے چنانچہ میں نے حقائق اسماء پر روشنی ڈالی ہے۔ جدید مذاق کو مد نظر رکھتے ہوئے قلم اٹھایا ہے۔

خصوصا" وہ نوجوان طبقہ جو خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا ان حقائق کے پڑھنے کے بعد ممکن نہیں کہ خدا کی ذات سے انکار کرسکے علاوہ ازیں بفضل خدائے کریم یہ تحریریں اتنی دلچسپ ہیں کہ پر لطف ادبی تحریریں ان کے سامنے ہیچ ہیں وہ مسلمان بھائی جو دولت ایمان سے مالا مال ہیں ان کے لئے ان تحریروں میں معرفت الٰہی کے چشمے جاری ہیں خدا برکت دے آمین۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے میری کتاب شرح اسماء الحسنٰی کے بارے میں جو کاوش کی ہے میرے دل پر ہمیشہ نقش رہے گی۔ یہ نیک کام بڑی ہی محنت کا تھا۔ آپ کے شوق نے اسے تکمیل تک پہنچایا۔ اور میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ یقیناً" ان کو اللہ تعالیٰ اور اسلام سے بڑی والہانہ محبت ہے، ورنہ باوجود تہی دستی کے یہ کوہ گراں کیسے اٹھتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ خدمت پسند آئی لہٰذا اس نے آپ کی غیب سے مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کو مزید عظیم کاموں کے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور ان کو صحت و تندرستی و ہمت عطا فرمائیں کہ آپ مزید بڑے بڑے نیک کام کرسکیں۔ میں تو مایوس ہو کر بیٹھ رہا تھا کہ اس دور ادب و ادبی میں کون اللہ کے نام پر اپنا پیسہ اور محنت خرچ کرے گا مگر اللہ تعالیٰ نے انکو اس نیک کام کے لئے منتخب کیا اور اس کی مدد سے آپ نے اس کو پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ مولا آپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ اور آپ کے اس کام کو تاج قبولیت سے نوازے۔

بالوف الاحترام نیازمند

صارم

۴ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ

۲۳ فروری ۱۹۹۶ء



اللہ جل جلالہ
اللہ نور السموات والارض
اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے

اَللّٰهُ جلّ جلالہٗ

قرآن شریف میں یہ اسم پاک دو ہزار چھ سو اٹھانوے جگہ آیا ہے ' کہیں الف لام کے ساتھ اور کہیں بغیر الف لام کے ' یعنی کہیں بصورت معرفہ اور کہیں بصورت نکرہ ۔ یہی اسم اعظم ہے۔ ہیولیٰ بغیر صورت کے اور صورت بغیر ہیولیٰ کے نہیں پائی جاتی یعنی مادہ بغیر صورت کے اور صورت بغیر مادے کے نہیں پائی جاتی ان دونوں میں تلازم ہے یعنی جہاں کہیں بھی کوئی مادہ پایا جائے گا ضروری ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی صورت و شکل ہو اور جہاں کہیں کوئی صورت و شکل پائی جائے گی ضروری ہے کہ وہ کسی مادے سے لگی ہوئی ہو۔

مادہ یا بصورت نقطہ پایا جائے گا یعنی اس میں نہ طول ہو گا نہ عرض نہ عمق ۔ یا بصورت خط پایا جائے گا یعنی اس میں صرف لمبائی تو ہوگی مگر چوڑائی یا گہرائی نہیں ہوگی۔ یا بصورت سطح پایا جائے گا یعنی اس میں لمبائی چوڑائی تو ہوگی مگر گہرائی نہ ہوگی یا بصورت جسم پایا جائے گا یعنی اس میں لمبائی چوڑائی اور گہرائی تینوں چیزیں ہوں گی۔

خط یا سطح یا جسم ہمیں دکھائی دیتا ہے یا ہم اسے لمس و حس سے محسوس کر سکتے ہیں اور جس چیز کو ہم دیکھ سکتے یا چھو سکتے ہیں ' اس کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں اور جو چیز مادے اور صورت سے مرکب نہیں ہوگی تو ہم اسے نہ تو دیکھتے

ہیں ' نہ اس کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں چونکہ ذات الہی مادہ وہ صورت سے بے نیاز ہے لہٰذا نہ تو اسے دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے

اس دور میں ساری دنیا پر دو چیزیں چھائی ہوئی ہیں ایک سیاست اور دوسرے تجارت مگر آج تک کسی نے سیاست و تجارت کو دیکھا یا چھوا نہیں مگر ہم رات دن سیاست و تجارت کا ذکر کرتے رہتے ہیں کیونکہ یہ حقائق ہیں ۔ اور حقائق کو دیکھا یا چھوا نہیں جاتا ۔ جانا جاتا ہے ۔ دنیا نے علم اخلاق و نفسیات و سیاست و تجارت پر سینکڑوں کتابیں لکھ دیں مگر آج تک کسی نے ان چیزوں کو نہ تو دیکھا نہ کبھی چھوا جس کی مخلوقات کا یہ حال ہے اسے کون دیکھ سکتا یا چھو سکتا ہے '

معلوم ہوا علم یقینی کے لئے کسی چیز کا دیکھنا یا محسوس کرنا ضروری نہیں ہے ' ہم چیزوں کے اثرات سے ان کو پہچانتے ہیں اگر چہ نہ انھیں دیکھ سکتے ہیں ' نہ چھو سکتے ہیں ' نہ چکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں ۔ جو چیزیں حواس خمسہ ظاہرہ کی گرفت میں نہیں آتیں ۔ انھیں کم ہی پہچانتے ہیں ۔

ایک دفعہ ہمارے اورنٹیل کالج لاہور میں روسی پروفیسروں کا ایک وفد آیا یہ آٹھ دس تھے ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی ۔ اس لڑکی نے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ پر ایسا عمدہ ریسرچ پیپر پڑھا کہ بایدو شاید اور بے حد صاف شستہ اردو میں ۔

یہ ممالک جب کسی ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے وہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو مختلف وفود بھیج کر مرعوب کرتے ہیں ' جیسے امریکہ نے برسوں پہلے ایک ادارہ لاہور میں اردو کتابیں چھاپنے کے لئے قائم کیا تھا ۔

جب وہ لڑکی امام غزالیؒ پر اتنا اچھا مقالہ سنا چکی تو ایک طالب علم نے سوال کیا کہ پھر تم لوگ خدا کے قائل کیوں نہیں ہوتے ہو تو وہ لوگ کہنے لگے اگر خدا کا وجود ثابت ہو گیا تو روس سب سے پہلا ملک ہو گا جو اس پر ایمان لائے گا ۔

خدا مادہ و صورت سے نہیں بنا کہ تم لوگ سائنسی آلات کے ذریعہ تحلیل و تجزیہ کر کے اسے جان سکو ۔ تم لوگ نفسیات پر ایمان رکھتے ہو حالانکہ تم نے کبھی سائیکالوجی یا نفسیات کو نہیں دیکھا ۔ صرف اس کے اثرات کو دیکھ کر یقین

رکھتے ہو کہ نفسیات کی کوئی حقیقت ہے تو نفسیات کو دیکھ کر خالق نفسیات پر کیوں ایمان نہیں لاتے ۔ جس نے مخلوقات میں طرح طرح کے حکیمانہ نفسیات بھر دیئے ہیں جو ان کے لئے موزوں و مناسب تھے ۔

ایک لڑکے نے سوال کیا جب تم خدا اور مذہب کو نہیں مانتے تو عورت پر دست درازی کیوں نہیں کرتے ؟ کہنے لگے یہ اس کا حق ہے جو اس سے محبت کرے بھائی ! خدا بھی اس کا حق ہے جو اس سے محبت کرے ، جس نے اسے مانا ہی نہیں وہ اس سے کیسے محبت کر سکتا ہے اور جو محبت نہیں کر سکتا وہ پا بھی نہیں سکتا ۔ جیسے عورت کو وہی پا سکتا ہے جو اس سے محبت کرے اور وہی اس کا دعویدار ہو سکتا ہے اور وہ اسی کی ہو سکتی ہے دوسرے کی نہیں تو خدا بھی اسی کا ہو سکتا ہے جو اس سے محبت کرے دوسرے کا نہیں ۔

میرے مضامین پڑھ کر بعض لوگوں کو میرے بارے میں مغالطہ ہوگیا مختلف سالوں میں دو تین مختلف نوجوان میرے پاس آئے جن کے سینے عشق الٰہی سے فروزاں تھے ۔ کہنے لگے ہم ساری گدیوں پر پھر آئے سب ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے ، ہمیں کوئی بھی خدا کو نہ دکھا سکا ۔ آپ کرم کیجئے ۔ میں نے کہا میں تو ایک عالم بے عمل ہوں مگر یہ بتاؤ کہ آپ کے دل میں جو تڑپ ہے ، وہ کیسے پوری کروں وہ اگر مادہ و صورت سے مرکب ہوتا تو میں ضرور آپ کی اس سے ملاقات کرا دیتا ۔ بس صبر کرو ۔

؎ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

اور بھائی یہ بات بھی غلط ہے کہ کوئی صحیح پیر نہیں ملا خدا کی زمین خالی نہیں ہے جس سے عقیدت ہو جائے وہ خدا تک پہنچا دیتا ہے یہاں عقیدت شرط ہے ، جو پیر نیکی کی راہ دکھاتا ہے وہ صحیح پیر ہے ، کرامات پر نہ جاؤ نیکی کی راہ خدا تک پہنچاتی ہے ، یہ صراط مستقیم ہے ۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ زیادہ مصنوعی پیر ہیں ، جو خود خدا تک نہیں

پہنچا وہ کیسے کسی کو خدا تک پہنچا سکتا ہے؟
ایک صاحب کہنے لگے ہم نے تو کسی پیر سے کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ میں نے کہا پیر فقیر کوئی بازی گر ہوتے ہیں کہ لوگوں کو قائل کرنے کے لئے کرامات دکھاتے پھریں ؟ یہ معیار نہیں ہے آپ غلط معیار پر پیروں کو جانچتے پھرتے ہیں اور پھر ملول ہو جاتے ہیں۔ چلو اگر آپ کو کسی سے بھی عقیدت نہیں ہوتی تو نیکی کی راہ اختیار کرلو خدا تک پہنچ جاؤ گے۔

؎ اللہ اللہ گو کہ اللہ می شوی
ایں سخن حق است واللہ می شوی

میں اس شعر کا ترجمہ پیش کرنا پسند نہیں کرتا۔ بڑی تاکید سے مولانا رومؒ فرما رہے ہیں کہ میری یہ بات بالکل حق ہے اور پھر قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا تو کیا واقعی ایسا ہی ہو جائے گا جیسے کہ مولانا رومؒ فرما رہے ہیں ؟ میرے نزدیک تو وحدۃ الوجود کچھ حق ہے اور کچھ باطل ہے 'پورا حق نہیں ہے۔ نہ پورا باطل ہے جیسے کہ بعض علماء کہتے ہیں البتہ وحدۃ الشہود بلاشبہ پورے کا پورا حق ہے اور یہ بات بے غبار ہے۔
حدیث میں آیا ہے بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے سے قریب ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے وغیرہ۔ حدیث کے اسی مضمون کو مولانا روم نے باندھا ہے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں

؎ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یعنی اس کی گفتار اللہ کی گفتار ہوتی ہے اگرچہ اللہ کے بندے کے حلقوم سے نکلتی ہے۔ اگر اس حدیث اور مولانا روم کے شعر پر غور کیا جائے تو پھر معاملہ وحدہ الشہود سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور وحدہ الوجود کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

مولانا روم کے پہلے شعر کی اگر تاویل کر کے ترجمہ کروں تو ڈرتا ہوں کہ یہ ان کا مفہوم نہ ہوگا اور اگر سیدھا سادہ ترجمہ کردوں تو بات وحدہ الوجود تک پہنچ جائے گی جس کی بنیاد دراصل حلول پر ہے اور اتحاد کی بنیاد ویدانت پر ہے۔ اسلام پر نہیں۔ اسی لئے غزالی عراقی۔ بوصیری' حافظ اور رومی وغیرہ کو متبعین عبدالوہاب نجدی کچھ نہیں سمجھتے۔

میاں! دیکھا جائے تو سب جھگڑے ہی جھگڑے ہیں اور فلسفہ ہی فلسفہ ہے۔ مولانائے روم فرماتے ہیں تو نہ مانی این وصال است و بس یعنی تو نہ رہے بس یہی وصال ہے بس یہی ہے جو کچھ ہے آگے اور کچھ نہیں ملتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا پتہ ہی نہیں لگدا پتہ ہی نہیں لگدا۔

اس اسم پاک کے ورد سے محبت دنیا منقطع ہو جاتی ہے۔ یہ اسم جلالی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نظام تدریجی ہے جس قدر بچے کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کے مطابق ہاتھ پاؤں اور عقل و سمجھ عطا کرتے چلے جاتے ہیں ہم اپنی آنکھوں کے نور سے بقدر ضرورت دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے مصلحتاً اتنی بصارت ہمیں نہیں دی کہ ہم اسے دیکھ سکیں کیونکہ اگر ہم اسے دیکھ سکتے تو پھر بات ہی کیا رہ جاتی ہے۔ مرنے کے بعد اسی تدریجی نظام کے تحت وہ ہمیں نئی بصارت و بصیرت دے گا پھر بقدر استعداد ہر ایک اس کا دیدار کر سکے گا۔

لوگ کشف و کرامت کو معیار قرار دیتے ہیں یہی غلطی ہے مفتی محمد حسن بانی جامعہ اشرفیہ لاہور سے کبھی کوئی کشف و کرامت نہیں دیکھی گئی' ایسا ہی کچھ حال مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تھا۔ مفتی محمد حسن علیہ الرحمتہ کے ایک پاؤں میں پیل پا کا مرض تھا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ درد رہتا تھا پرنسپل میڈیکل کالج لاہور کرنل ضیاا للہ اور بہت سے ڈاکٹر ان کے مرید تھے۔ سب نے بڑی کوشش کی آرام نہ ہوا تو ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پاوں کاٹ دیا جائے۔ مفتی صاحب اس پر راضی نہ ہوتے تھے پھر عرصہ کے بعد مجبوراً راضی ہوگئے مگر یہ شرط لگائی کہ مجھے از قسم مسکرات کوئی چیز نہ سنگھائی جائے' ڈاکٹر حیران تھے تو پھر کیسے پاؤں کو کاٹا جائے گا۔ فرمایا میں جب تیسری بار اللہ کہوں تو پاؤں کاٹ دینا۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا انھوں نے تیسری بار اللہ کہا اور ڈاکٹروں نے پاؤں کاٹ دیا اور
انھیں خبر تک نہ ہوئی کہ کیا ہوا۔ سنا کرتے تھے کہ نماز پڑھتے میں فلاں
کے تیر لگا اور انھیں پتہ نہ چلا حیرت ہوتی تھی، یقین نہیں آتا تھا۔ اس دور میں
یہ بات دیکھ لی۔

الٰہ کے معنی معبود کے ہیں اسی سے الوہیت ہے اسی سے تالّہ ہے یعنی اللہ والا ہو جانا۔ الف لام کے ساتھ یعنی اللہ اس کا اسم ذاتی ہے اور بغیر الف لام کے معبودات باطلہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

*

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ زمین و آسمان کا نور ہے یعنی ہر جگہ اس کا نور ہے یا وہ آسمانوں اور زمین کا منور کرنے والا ہے جیسا کہ قدیم مفسرین یہی کہتے ہیں۔

اس کی تجلیات عام ہیں اس کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی البتہ صفات و تجلیات کا دروازہ کھلا ہے بقدر مجاہدہ ہر شخص اس کی تجلیات سے بہرہ ور ہو سکتا ہے مگر ان تجلیات میں خود صاحب مجاہدہ کے خیالات کا بڑا حصہ ہوتا ہے پھر بھی تجلیات الٰہی کو محض خیالی چیز نہیں کہا جا سکتا فلاسفہ جن کی ساری بنیاد خیال پہ ہوتی ہے تجلیات الٰہی کو ایک خیالی چیز کہتے ہیں ایسا نہیں ہے گو ان کی یہ بات بالکل غلط بھی نہیں جب اہل دل کو تجلیات الٰہی ہوتی ہیں تو وہ اپنے قدرتی ملکہ سے پہچان جاتے ہیں کہ کس قدر ہمارے خیال کو دخل ہے اور کس قدر اصل ہے وہ تجلیات رحمانی و خیالی میں فرق کر لیتے ہیں مخلوط تجلیات میں انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کتنا حصہ حقیقت کا ہے اور کتنا خیال کا۔ یہ لوگ شعور و لاشعوری اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے مگر یہ شعور و لاشعور سے واقف ہوتے ہیں اور فلاسفر کی کم عقلی پر ہنستے ہیں کہ یہ ہر چیز کو خیالی سمجھتے ہیں چونکہ ان کی تگ و دو یہیں تک ہے ایک عالم، شعور و لاشعور سے بھی بالا ہے جہاں ان کی پہنچ نہیں ہو سکتی اور فکر و نظر و علم و عقل سے وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ لوگ مجاہدات و مراقبات کی گھاٹیوں سے نہ گزریں۔ انسان پر

مجاہدات سے کچھ ایسی نئی راہیں کھلتی ہیں جہاں علم و فلسفہ، فکر و نظر سب سطحی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

فلاسفہ نے اللہ تعالیٰ روح و روحانیت اور الٰہیات کے بارے میں علم و عقل کی روشنی میں فکر و نظر کی رہبری سے بہت کچھ اونچی باتیں کہیں مگر اصحاب باطن کی روشنی میں وہ باتیں بالکل سطحی ہیں ان لوگوں نے علم و فکر کے گھوڑے دوڑائے تو کسی حد تک سرحد تک پہنچ سکے آگے جانے کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہ تھی تو یہ لوگ اسی کو منزل سمجھ بیٹھے اور لگے دون کی ہانکنے۔ افسوس ہے نور خداوندی جو ہر جگہ موجود ہے یہ لوگ اسے نہ دیکھ سکے۔

انسان کے لئے علم حاصل کرنے کی دو راہیں ہیں ایک کتابی اور دوسری غیر کتابی۔ کتابی علم والے دنیا میں ایسے پاکیزہ انقلابات نہیں لا سکے جیسے غیر کتابی والے۔ کتابی علم والوں نے مادیات و محسوسات میں ترقی کی روحانیات میں ترقی نہ کر سکے بلکہ اکثر تو انکار ہی کر بیٹھے تو ترقی کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اس دور کے فلسفی ہر غیر محسوس غیر معقول کا انکار کرتے ہیں اس لئے انہوں نے صرف محسوسات کے بارے میں ریسرچ کی اور اس کے علاوہ سے انکار کیا۔

بین الاقوامی **سائنسدانوں** نے ایک اصول وضع کر رکھا ہے کہ جو چیز بھی حس و عقل سے باہر ہو اس کا انکار کر دیا جائے جب تک کہ اس کے متعلق کھلا ثبوت مہیا نہ ہو اور اور اسے سائنٹیفک معیار پر جانچ لیا جائے۔ دنیا کا نوجوان طبقہ یہ سمجھ بیٹھا کہ واقعی خدا نہیں ہے کیونکہ **سائنسدانوں** نے اسے ڈھونڈا تو نہ پایا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے بغیر کدوکاوش کے انکار کر دیا ہے اور اپنے ایک غلط مسلمہ اصول کے تحت انکار کیا ہے۔

اگر روس یہ کہتا ہے کہ ہم نے خدا کو اپنی حدود سے باہر دھکیل دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا ہے ہی نہیں اول تو یہ بات غور طلب ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم نے خدا کو دھکیل دیا ہے یا اپنے گھر سے باہر نکال دیا ہے

یا اپنے دروازے سے باہر نکال پھینکا ہے تو اس نے اس کے وجود کا اقرار کر لیا ہے کیونکہ جو چیز ہے ہی نہیں اسے کیسے باہر پھینکا جا سکتا ہے دوسرے یہ کہ اگر کوئی ملک یہ کہتا ہے کہ ہم نے خدا کو اپنے حدود سے باہر نکال دیا ہے تو اس سے لازم نہیں آتا ہے کہ واقعی وہ ایسا کر چکا ہے یا کر سکتا ہے روس ہزار کہے کہ ہم نے خدا کو نکال دیا ہے مگر وہ پھر بھی نہیں نکلا وہ تو وہیں موجود ہے اور اس کے انوار ہر جگہ چمکتے ہیں جیسے پہلے تھا ویسے اب بھی ہے روس وغیرہ کی دسترس سے یہ باہر ہے کہ اسے نکال دے کیونکہ وہ پکڑا نہیں جا سکتا کہ نکالا جائے۔

اگر کوئی فلسفی کسی چیز کے وجود سے انکار کرتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز سرے سے موجود ہی نہ ہو کسی کے انکار سے اس کے ہونے یا نہ ہونے پر اثر نہیں پڑتا۔

انوار الٰہی ہر جگہ درخشاں ہیں خود انسان کی اپنی آنکھ میں اس کا نور چمکتا ہے اور اگر قلب سلیم ہے تو اس کے دل میں بھی اس کا نور چمکتا ہے۔ اور اگر صحیح الدماغ ہے تو اس کے دماغ میں نور عقل روشن ہے اور اسکی روح میں نور خداوندی ہے پتھروں اور جواہرات میں اس کا نور ہے الغرض اس کا نور کہاں نہیں ہے؟ ہر جگہ ہے آنکھیں کھولو تو ہر جگہ ہے اگر آنکھیں بند کر لو تو کہیں بھی نہیں آنکھیں بالکل موندلو تب بھی تھوڑی بہت تجلی نظر آئے گی۔

پتھر پر پتھر کو زور سے مارو تو اس سے نور کی چنگاری نکلے گی اسی طرح لوہے پر لوہا مارو تو چمک پیدا ہو گی اور اگر دل پر ضرب لگاؤ تو ضرور اس کا نور چمکتا ہوا دکھائی دے گا درختوں اور سوکھی لکڑیوں تک میں اس کا نور ہے تب ہی تو درختوں کی شاخوں کی رگڑ سے جنگلات میں آگ لگ جاتی ہے معلوم ہوا ہر چیز میں بیش و کم اس کا نور بھرا ہے۔

اگر آسمانوں اور زمین کے درمیان اس کا نور نہ ہوتا تو گھپ اندھیرا ہوتا اور ہم کچھ بھی نہ دیکھ سکتے نہ چل پھر سکتے نہ کام کر سکتے نہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دیتا۔

اگر ہمارے دل و دماغ اور عقل میں اس کا نور نہ ہوتا تو ہم طرح طرح کی ایجادیں نہ کر سکتے اور زمین و آسمان کے قلابے نہ ملا سکتے بالکل حیوانوں کی طرح

مجبور ہوتے فطرت جدھر ہانکتی ادھر ہنک جایا کرتے مگر اب ہم فطرت کے قبضے میں مجبور محض نہیں ہیں فطرت کو قابو میں کر سکتے ہیں فطرت کے خلاف چل سکتے ہیں ہم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ ذرا نور خداوندی دکھائی دیتا ہے تو چل پڑتے ہیں اور جہاں روشنی ختم ہوئی رک جاتے ہیں کبھی اس کے قائل ہو جاتے ہیں اور کبھی اس کے منکر۔

*

الاحد جل جلالہ

واحد ایک اور "احد" اکیلا۔ الواحد کے ہوتے ہوئے "الاحد" کی اس لئے ضرورت پڑی کہ واحد کے تصور سے تثنیہ کی طرف خیال جاتا ہے کہ یہ واحد ہے توکوئی اور بھی واحد ہو سکتا ہے یعنی ایک اور اکائی مستقل بالذات ہو۔ ہر "ایک" کا کوئی اور "دوسرا" بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے سورہ اخلاص میں بجائے واحد کے اللہ تعالیٰ "الاحد" لائے ہیں کہ اس سے تثنیہ کا تصور پیدا ہی نہیں ہوتا۔

قل ھو اللہ "احد"۔ آپ کہہ دیجئے اللہ اکیلا ہے۔ اس "احد" کی تشریح **لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ** سے کر دی کہ اس نے کسی کو نہیں جنا۔ نہ اس سے کوئی جنا گیا بس وہ اکیلا ہے۔ نہ بیٹا نہ بیٹی نہ بیوی نہ کوئی اور وہ یکتا اور اکیلا ہے۔ نہ عزیرؑ اس کا بیٹا جیسا کہ یہودی کہتے ہیں۔ نہ عیسیٰ علیہ السلام اس کا فرزند جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں نہ اس کے کوئی بیٹی جیسا کہ بعض مذاہب والے کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) کیا بیٹیاں اس کی اور بیٹے تمہارے یہ کیسا فیصلہ ہے؟ یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔

جب مکہ کی گلیوں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسی میں باندھ کر بچے گھسیٹے گھسیٹے پھرا کرتے تھے اور تپتی ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر گرم گرم پتھر رکھے جاتے تھے تو وہ "احد" "احد" کہا کرتے تھے واحد واحد نہیں کیونکہ جو بات "احد" میں ہے واحد میں نہیں ہے۔ جیسا کہ ابھی گزرا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا واقعی وہ ہے تو وہ اکیلا یا تنہا کیسے ہو گیا؟

ہم جو اسے "احد" اکیلا کہتے ہیں تو کس اعتبار سے اکیلا ہے؟ وہ اکیلا کہاں ہے ؟اس کے ساتھ تو ان گنت فرشتے' عرش اور کرسی اور نہ جانے کیا کیا

ہے کہ وہ یکتا اور بے نظیر و مثیل ہے۔ اس اعتبار سے وہ اکیلا یا تنہا ہے اور اس اعتبار سے سورہ اخلاص میں اس نے "احد" کا لفظ رکھا ہے کہ جیسے مشرکین عرب اس کے بیٹے یا بیٹیاں بتاتے ہیں ایسا نہیں ہے نہ بیٹا، نہ بیٹی وہ اکیلا ہے۔ وہ کوئی گھر بار والا نہیں ہے کہ بیوی بچے اس کے ساتھ ہوں۔ وہ تو بے نظیرو مثیل ہے۔ بیٹا یا بیٹی باپ کے نظیرو مثیل ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے وہ "احد" بے نظیرو بے مثیل ہے۔ تنہا ہے کوئی ساتھی شریک نہیں ویسے ساری مخلوق میں ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اکیلا نہیں ہے جس معنی میں اکیلا کا لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

فرماتے ہیں:۔

جب تین شخص سرگوشی کرتے ہیں تو وہ چوتھا ہوتا ہے اور جب پانچ فرد سرگوشی کرتے ہیں تو وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔

جب وہ ان میں چوتھا اور چھٹا ہو گیا تو اکیلا کہاں رہا ذرا "**رَابِعُهُمْ**" اور "**سَادِسُهُمْ**" کی "**ھم ضمیر**" پر غور کیجئے۔

میں صبح صبح فجر کی نماز سے پہلے سیر کرنے جناح باغ جایا کرتا تھا۔ شاہ عالم مارکیٹ سے گزر رہا تھا۔ ایک بے ریش، نوجوان، مجذوب لڑکا جس کا سینہ شدت عشق الٰہی سے ہانڈی کی طرح جوش مار رہا تھا بڑی درد ناک آواز سے گاتا جا رہا تھا۔

ے میں بھی اکیلا تو بھی اکیلا کب ہو گا تیرا میرا میلا؟

میں نے کہا ارے نہ تو اکیلا نہ وہ اکیلا تیرا میلا ہو تو گیا مگر تجھے شعور نہیں ہے۔ اگر تو اکیلا ہوتا تو یہ تیری حالت نہ ہوتی۔ وہی تو بول رہا ہے۔ بس اس سے اتنا ہی میلا ہوتا ہے۔ اکیلے تو ہم جیسے دنیا والے ہیں کہ کسی وقت بھی اکیلے نہیں رہتے اور بد قسمتی سے پھر بھی اکیلے ہیں۔ اکیلے ہی آئے اور اکیلے ہی جائیں گے بالکل خالی ہاتھ۔

دنیا کی کتنی ہی تیز شراب پی لو جو نشہ شراب عشق میں ہے کسی بھی

شراب یا نشے میں اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ یہ لڑکا اسی طرح لڑکھڑاتا، جھومتا جھامتا جا رہا تھا جیسے اس نے بہت پی لی ہو۔ زبان بھی لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے باز کی ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ان کے سینے سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے پکتی ہوئی ہانڈی۔ سے

دنیا میں جتنے بھی نفوس و قلوب ہیں اتنی ہی راہیں خدا تک پہنچنے کی ہیں۔ کوئی علم کے ذریعے خدا تک پہنچتا ہے۔ کوئی جہاد کے ذریعے کوئی سخاوت کے وسیلے سے تو کوئی شریعت کی پابندی سے مگر سارے راستے بڑے ہی طویل ہیں۔ صرف عشق ہی میں یہ طاقت ہے کہ وہ فوراً خدا تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ آتش عشق ذرا سی دیر میں سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

مگر یہ راہ بڑی ہی کٹھن ہے۔

؎ **الا یا ایها الساقی ادر کاسا وناولها**
که عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلها

حسینان جہاں اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

علم، جہاد، سخاوت و عبادت یہ سب اختیاری ہیں۔ ہم اپنے اختیار سے انہیں کر سکتے ہیں مگر عشق اختیاری چیز نہیں ہے خدا کی دین ہے جسے چاہے دے دے۔

؎ عشق پہ زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

*

الاول جل جلالہ و الاخر جل جلالہ

اگر باپ کی پیدائش بیٹے کی پیدائش پر اور بیٹے کی پیدائش باپ کی پیدائش پر منحصر ہو یعنی الف کا وجود بے کے وجود پر اور بے کا وجود الف کے وجود پر موقوف ہو تو یہ باطل ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی چیز اپنے پہلے سے پہلے ہو اسے مناطقہ وفلاسفہ کے ہاں دور سے تعبیر کرتے ہیں اور سب کا اتفاق ہے کہ دور محال ہے کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں کہ کوئی موقوف اپنے موقوف علیہ سے پہلے ہو جائے کوئی مسبب اپنے سبب سے پہلے ہو جائے تو جس بات جس حقیقت جس مسئلہ کے تسلیم کرنے سے دور لازم آئے وہ باطل ہے اس پر سارے **عقلاء** کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو چیز دور کو مستلزم ہو وہ باطل ہے۔ اگر کوئی چیز سلسلہ وار چلی جائے اور وہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہو تو ایسا ہونا بھی باطل ہے فلاسفہ و مناطقہ اسے تسلسل سے تعبیر کرتے ہیں اور سب متفق ہیں کہ تسلسل باطل ہے اور جو بات تسلسل کو مستلزم ہو وہ باطل ہوتی ہے۔

دور کا باطل ہونا تو اوپر کے بیان سے ہر شخص کی سمجھ میں آگیا ہو گا تسلسل کے بطلان کے لئے فلاسفہ و مناطقہ نے بہت سی دلیلیں دی ہیں وہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں لہٰذا ان کا ذکر یہاں مناسب نہیں مگر اتنا یاد رکھنا چاہئیے کہ جو مسئلہ بھی تسلسل کو مستلزم ہو وہ باطل ہوتا ہے۔

مولیٰ تعالیٰ "الاول" ہیں ان سے پہلے کوئی نہیں اگر اس سے پہلے کوئی ہو تو پھر وہ "اول" نہ رہا اور اگر اس "الاول" کا وجود کسی "اول" پر موقوف ہو اور وہ اس پر موقوف ہو تو دور لازم آجائے گا لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک ذات ایسی ہے جس سے پہلے کوئی اور نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ "اول" اس "اول" پر منحصر ہے اور وہ دوسرے پر اور یہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہو تو یہ تسلسل ہے اور

تسلسل باطل ہے لہٰذا یہ کہنا بھی باطل ہے۔ ماننا پڑے گا کہ کوئی ایسا اول ضرور ہے جس سے پہلے کوئی نہیں اب اس "اول" کو خواہ اللہ کہہ لو یا رام یا ایشور یا نیچر یا فطرت اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ مناطقہ و فلاسفہ کے نزدیک الفاظ و اصطلاح کوئی معنی نہیں رکھتے اصل چیز تو وہ ہے جو الفاظ واصطلاحات میں پنہاں ہے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے خدا محبت ہے اور محبت ہی خدا ہے تو اس سے مسئلہ مذکور میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس شخص نے خدا کو محبت سے تعبیر کر دیا ہے جیسے کسی نے یزدان و رام سے تعبیر کر دیا ہے گو وہ یزدان و رام کہنے والوں سے پیچھے ہی رہا کہ اس "الاول" کی ایک صفت ہی کو اس کی ذات سمجھ بیٹھا ہم اسے "الاول" کہتے ہیں اگر اسے فرسٹ کہہ دے تو کیا فرق پڑتا ہے بات ایک ہی ہے تعبیر و عبارت کا فرق ہے۔

کسی دھریے نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا خدا سے پہلے کون تھا اور تم کہتے ہو کہ خدا عرش پر ہے تو بتاؤ کہ اس وقت وہ عرش پر کس رخ بیٹھا ہے؟ فرمایا بتا ایک سے پہلے کیا ہے اور یہ چراغ جل رہا ہے اس کی روشنی کس رخ پر ہے۔

ہندوستان کے جتنے بھی رشی (سادھو عابد جوگی) منی (زاہد) ہوئے سب بالا تفاق وحدت الوجود کی تعلیم دیتے آئے ہیں اسی لئے بت پرستی وغیرہ کا رواج ہوا کہ آگ میں بھی وہی ہے گنگا میں بھی وہی ہے سانپ میں بھی وہی اور شجر و حجر میں بھی وہی یہی "فلسفہ ویدانت" اسلام میں گھس گیا پھر ہمارے شعرا اسے لے اڑے۔

صحابہ کرامؓ کہاں ان باتوں سے واقف تھے بلکہ صدیوں تک مسلمان ایسے نظریات سے نابلد رہے حالانکہ وہ ہم سے زیادہ پختہ مسلمان تھے۔ لا الہ الا اللہ ایک سیدھی سادھی' صاف شفاف بات ہے۔ سیدھے سیدھے چلو کہاں کی "وحدت الوجود" اور کہاں کی "وحدت الشہود" بات "الاول" سے چلی تھی تو الآخر پر ختم ہونی چاہیئے آخر بھی وہی ہے کیونکہ سلسلہ کہیں نہ کہیں ختم ہونا چاہیئے ورنہ تسلسل لازم آئے گا اگر یہ کہا جائے کہ خالق "اول" نے خالق ثانی کو پیدا کیا اور ثانی نے ثالث کو اور ثالث نے رابع کو اور اسی طرح سلسلہ چلتا ہی رہے کہیں ختم

ہی نہ ہو تو یہ تسلسل کا موجب ہو گا لہٰذا ایک آخر ضرور ہے مگر عجیب بات ہے جو "الاول" ہے وہی الآخر بھی ہے۔

موجودہ دور کے ایک عظیم ریاضی داں نے ان لوگوں پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے جو خدا کو نہیں مانتے۔ اس نے علم ریاضی کی رو سے آٹھ دلائل پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ سارا نظام عالم تو ریاضی کے ماتحت چل رہا ہے ہم کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ امر اتفاقی ہے۔ پہلی دلیل اس نے یہ دی ہے کہ اگر ہم دس کنکریاں لیں اور ان پر ایک سے لے کر دس تک کے اعداد لکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیں اور انہیں اچھی طرح گڈ مڈ کر دیں پھر ایک والی کنکری نکالنا چاہیں اور وہ ایک ہی نکل آئے تو اس ایک کے نکلنے کا امکان دس فیصد تھا اور اگر پھر اسے ڈال کر اسی طرح ہلائیں تو اب اس کے نکلنے کا امکان ازروئے ریاضی سو فی صد ہو جاتا ہے تو نظام عالم کی ترتیب بتاتی ہے کہ کسی زبردست ریاضی دان نے اس نظام کو ترتیب سے قائم کیا ہے کہ سرمو فرق نہیں آتا۔

ایک بات غورطلب ہے کہ ہم لوگ جو پابند زماں و مکاں ہیں پابند اعداد بھی ہیں۔ ہم ایک دو تین اور "اول" و آخر کے پابند ہیں اور آسمانی کتابوں کی تعلیم ہمارے دماغ کے مطابق ہے جو بات ہمارے دماغ میں نہیں آسکتی وہ ان میں نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی ذات "الاول" سے بھی بالاتر ہو آکاش بیل کا نہ کوئی اول ہے نہ آخر

ے هو الاول والآخر والظاهر والباطن بتائے تو کوئی مجھ کو کہاں ہے؟ مدعا کیا ہے؟

عبارا تنا شتی وحسنک واحد ہماری عبارتیں رنگ برنگی ہیں در آنحا لیکہ تیرا حسن ایک ہی ہے۔ اندھوں نے خواہش کی کہ ہم ہاتھی کو دیکھتے کیسا ہوتا ہے لوگوں نے کہا چلو دیکھ لو کسی اندھے کا ہاتھ اس کی دم پر پڑا کسی کا پیر پر کسی کا سونڈ پر کسی کا کان پر اندھے بڑے خوش ہوئے کہ آرزو بر آئی۔ ہم بھی جان گئے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے عجیب چیز دیکھی تھی لہٰذا خوشی خوشی ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے ایک نے کہا وہ ستون سا ہوتا ہے دوسرے نے کہا نہیں موسل سا تیسرے نے کہا بالکل غلط وہ تو مشک جیسا ہوتا ہے۔ چوتھا بولا نہیں

چھاج جیسا ہوتا ہے اور ہاتھی ایسا بھی تھا اور ویسا بھی ناحق جھگڑتے تھے مگر پورا ہاتھی کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔ ہاتھی کے وجود سے انکار تو کوئی بھی نہ کر سکا کیونکہ واقعتہ" انہوں نے دیکھا تھا یعنی چھو کر محسوس کیا تھا۔ دوستو یہ اندھوں کا ہاتھی ہے۔

دھری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اور جنہوں نے کسی اعتبار سے انکار بھی کیا وہ موت کا انکار نہ کر سکا جو اس کی ایک ادنی سے تخلیق ہے اور آلاخر ہے کوئی مائی کا لال اس سے انکار نہ کر سکا۔

موت نے کر دیا ناچار وگر نہ انسان
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

بعض فلاسفہ نے رفتار عالم کو ایک گول چکر سے تشبیہ دی ہے یعنی وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا مگر دائرے کی ابتداء کسی نہ کسی نقطے سے ہوتی ہے اور کسی نہ کسی نقطے پر ختم ہوتی ہے یعنی ایک نقطہ اول ہوتا ہے اور ایک آخر خواہ اسے کسی طرف سے بھی شروع کرو۔ نقطے کو کھینچتے چلے جاؤ تو وہ خط بن جاتا ہے۔ مگر وہ بھی کسی نقطے پر ہی ختم ہوتا ہے اور اگر اسے گول گھما دو تو دائرہ بن جاتا ہے مگر وہ بھی کسی نقطے پر ختم ہوتا ہے۔ ٹیڑھا میڑھا چلا جائے تب بھی کسی نقطے پر ختم ہو گا۔ ہر شکل کی ابتداء نقطے سے ہے اور اختتام بھی نقطے پر ہی ہوتا ہے۔

فلاسفر کہتے ہیں کہ روح اور مادہ قدیم ہیں نہ ان کا کوئی "اول" نہ "آخر"۔ تو پھر انہیں کیا چیز اس بات کے ماننے سے روکتی ہے کہ ایک ذات ایسی ہے جس کا نہ "اول" ہے نہ "آخر" دو کو ازلی وابدی ماننے میں بہ نسبت ایک کے ازلی وابدی ماننے کے زیادہ قباحت ہے جو شخص دو کو ازلی و ابدی مانتا ہے اسے ایک کے ازلی و ابدی ماننے میں کیا دشواری پیش آتی ہے جبکہ دو میں ایک موجود ہے؟

الباسط القابض جل جلالہ

قبض و بسط و بند و کشاد سب اسی "الباسط والقابض" سے ہے اس نے کائنات کے لئے بساط ارض کو اس سلیقے سے بچھا دیا ہے کہ کسی کو اس کی گولائی یا حرکت کا خیال تک نہیں آتا اور کسی قسم کی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی سب مزے مزے سے چلتے پھرتے اور لیٹتے بیٹھتے ہیں کیا مجال جو کوئی اس گول گیند سے نیچے گر سکے۔ پھر اس فرش یا کرہ پر بڑے بڑے پہاڑ بچھا دیئے تاکہ توازن قائم رہے زمین کو فرش بنا دینے کے اعتبار سے وہ "الباسط" ہے اور کائنات اور پہاڑوں کو اس کے اوپر رکھنے کے اعتبار سے وہ القابض ہے۔

ذات خداوندی متضاد صفات سے متصف ہے اور اس طرح وہ مجموعہ اضداد ہے مناطقہ و فلاسفہ اجتماع ضدین کو محال کہتے ہیں۔ مگر یہاں اس کے خلاف ہے وہ آن واحد میں باسط بھی ہے اور قابض بھی محیی بھی ہے اور صمیت بھی قہار بھی ہے اور رحیم بھی۔ یہاں ہمارا فلسفہ و منطق سربگریباں ہے اور ہمارا گھڑا ہوا منطق و فلسفہ اس کے بارے میں بالکل بے کار' لغو اور عاجز محض ہے۔

اس نے زمین پر پہاڑوں کا سلسلہ قائم کیا اور ان کے جگر میں طرح طرح کی معدنیات بچھا دیں قسم قسم کے جواہرات کوئلہ گندھک اور پانی بھر دیا اور ان کے اوپر بھی ہمارے فائدہ کے لئے طرح طرح کے پتھر بچھا دیئے اور قسم قسم کی جڑی بوٹیاں اور پھل اگا دیئے ان کے اندر اور ان کے اوپر رنگ رنگ کے جانور پھیلا دیئے۔

اس "الباسط" نے زمین کے اوپر سمندر اور دریاوں کا جال بچھا دیا اور اپنی صفت قبض سے ان کی ایک حد مقرر کر دی جس سے آگے وہ قدم نہیں اٹھا سکتے الا یہ کہ وہ اپنی کسی مصلحت سے انہیں اور زیادہ دراز کر دے اور پھر انہیں سکیٹر

دے۔

اس "الباسط" نے سمندروں کی تہوں میں قسم قسم کے جواہرات بچھا دیئے ہیں۔ اور قسم قسم کی نباتات پیدا کر دی ہیں۔ دریاؤں میں ہمارے لئے رزق پیدا کر دیا ہے۔ پھر سمندروں کے پانی کو آسمانوں پر پہنچا کر اور روک کر پیاسی زمین کو سیراب کرنے کا سامان پیدا کر دیا ہے وہ آسمانوں پر بادلوں کو بچھاتا ہے پھر انہیں روکے رکھتا ہے۔ تاکہ وہ مخلوق کی تشنگی کو دور کر سکیں۔

اس نے زمین پر فرش زمردیں بچھا کر ہمارے اور ہمارے حیوانوں کے لئے غذا مہیا کر دی ہے اور بعض تالابوں پر ایسا فرش زمردیں بچھا دیا ہے کہ قدرت خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روتے آب پر کائی

سطح زمین پر طرح طرح کے پھول' سبزیاں' ترکاریاں' بوٹیاں اور جانور بکھیر دیئے ہیں اور ساری کائنات کے لئے رزق پہنچا دیا ہے پھر سطح زمین کے اندر رنگ برنگے خزانے بھر دیئے ہیں جنہیں بچھا کر وہ انھیں روکے ہوئے بھی ہے۔ ایسے ایسے مادے زمین کے اندر بھرے ہوتے ہیں کہ وہ بھڑک اٹھیں تو ساری زمین جل کر راکھ ہو جائے پس وہ "القابض" ہی انہیں روکے ہوئے ہے۔

اس نے ہمارے اوپر افلاک کو پھیلا دیا ہے اور انہیں بغیر کسی ستون کے قائم کر دیا ہے کہ وہ ہماری زمین پر نہیں گر سکتے ۔ ان پر ستارے بکھیر دیئے کہ ہمارے سروں پر نہیں گر پڑتے۔ وہ افلاک خواہ فلسفہ قدیم کے مطابق اطلس کے ہوں یا فلسفہ جدید کے مطابق ایتھر کے ہوں یا حد نظر ہو' بہر حال وہ فضا ہمارے اوپر نہیں گر سکتی اس کی صفت قبض نے اسے روک رکھا ہے ہر چیز کے لئے فنا ہے لہٰذا ستارے بھی ٹوٹ کر گرتے ہیں مگر اس کے فضل و کرم سے وہ ہر گھڑی ٹوٹنے والے تارے یا ان کے ٹکڑے بالا ہی بالا جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔

ان افلاک' ستاروں اور کہکشانوں میں اس نے ایسی لہریں اور روشنیاں بھر دی ہیں جو ہمارے ان گنت کام انجام دیتی ہیں۔ گو ہمیں ابھی تک ان کے بہت

سے کاموں کا پتہ نہیں چلا۔ ان میں ایسے ایسے جواہرات' معدنیات اور پتھر بھر دیئے ہیں جو ہمارے بہت کام آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہماری ان تک رسائی ہو جائے اور رسائی نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ ہماری بہت سی خدمات انجام دیتے ہیں۔ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً۔

فضا میں مختلف قسم کی لہریں' جراثیم' شعاعیں اور فرشتے بھرے ہوئے ہیں جنہیں چاہے دیوتا کہہ لو یا جنات یا کچھ اور بہر حال فضا بھی خالی نہیں ہے۔ قدیم فلسفہ تو خلاء کو محال کہتا ہے اور اسے بڑے شدومد سے ثابت بھی کیا ہے فضا میں خواہ بقول فلاسفہ عالم امثال ہو یا بقول متکلمین عالم برزخ ہو یا بقول علماء جنت یا دوزخ ہو وہ سب پر قابض ہے۔

اس نے ہمارے جسم میں رگ اور پٹھے بچھا دیئے ہیں اور وہ "الباسط" ان کے لئے القابض بھی ہے کہ سب اپنی اپنی جگہ چپکے ہوئے ہیں اس پورے جسم کے اعصاب ذرا سے دماغ میں بچھا دیئے ہیں اور وہ اس کی صفت قبض کی وجہ سے مقبوض و محصور ہیں۔ اس دماغ میں اس نے قوت مدرکہ' قوت حافظہ' قوت خیال و قوت وہم و حصہ مشترک کو اس قرینے سے استوار کیا ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ مقید و محفوظ ہیں۔

ہمارے دل میں اس نے طرح طرح کی آرزوئیں اور امیدیں بھر دی ہیں اور دل کو قبض و بسط کی ایسی طاقت عطا فرمائی ہے کہ وہ ان آلام و آمال سے پھٹتا نہیں ورنہ یہ حسرتیں اور آرزوئیں ایسی ہیں کہ دل کو پھاڑ ڈالیں۔

دل میں ہر آن قبض و بسط ہوتا رہتا ہے ایک تو قبض و بسط اصطلاح اطباء ہے اور ایک قبض و بسط اصطلاح صوفیہ بھی ہے حالت بسط میں سالک خوب خوب کام کرتا ہے اور خوب ترقی کرتا ہے خوشی خوشی مراقبات و مجاہدات میں لگا رہتا ہے کیونکہ اپنی محنت کا نقد معاوضہ پاتا رہتا ہے مگر حالت قبض تو بڑی ہی ظالم چیز ہے قبض کی حالت میں سالک بڑا سست پڑ جاتا ہے اور بعض تو سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں حالت قبض میں اسی شوق کے ساتھ مجاہدات کرنا بڑا کام ہے ہر صوفی کو اس سے واسطہ پڑا اور بہت سے صوفیہ بڑے پریشان رہے کہ

کسی طرح حالت قبض دور ہو مگر پختہ کار پرواہ نہیں کرتے وہ اسی ذوق و شوق کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں کسی مرید نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے قبض کی شکایت کی تو فرمایا پروا نہ کیا کرو دیکھو مجھے سال بھر سے قبض تھا اور کسی کو پتہ تک نہ چلا۔

جب غار حرا میں پہلی وحی سورۃ اقراء کی آیات اتریں تو دو ڈھائی سال تک سلسلہ وحی منقطع رہا اور آپ پر سخت انقباضی کیفیت طاری رہی کہ کئی بار پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں اور ہر دفعہ جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور عرض کی بلاشبہ آپ خدا کے رسول ہیں اس بات سے آپ کو تسلی ہو جاتی تھی اور آپ اس ارادہ سے باز رہتے تھے۔

بحالت انقباض یہ حالت محبوب خدا کی ہو جاتی تھی تو ان کے مقابلے میں تو صوفیہ کس شمار و قطار میں ہیں بے چاروں کی زندگی وبال جان ہو جاتی ہے اور بہت سے خام صوفی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بلھے شاہ، بابا عبداللطیف بھٹائی شیخ فرید وغیرہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عرصے تک ایسی حالت میں مبتلا رہے تب ہی تو کلام میں سوزو گداز پیدا ہوا صاحب وصل کا کلام صاحب فراق سے بہت مختلف ہوتا ہے۔

کچھ صوفیہ مسلسل قبض کے رہنے سے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے۔

؎ سائیں کا گھر دور
جیسے لمبی کھجور
چڑھے تو چاکھے پریم رس
گرے تو چکنا چور

جوگ کی کتابوں میں لکھا ہے بگڑا ہوا جوگی بہت برا ہوتا ہے یہ بات ایسے ہی جوگیوں کے بارے میں ہے جنہوں نے سخت تپسیا کی اور کچھ نہ ملا تو دنیا کے کتے بن گئے اور عام لوگوں سے بھی نیچے گر گئے پھر رد عمل اتنا سخت ہوا کہ ہوس دنیا میں دنیا داروں سے بڑھ گئے اسی پر ہمارے صوفیہ کو قیاس کرنا چاہئے اللہ تعالی نے دنیا کی ہر چیز میں قبض و بسط رکھا ہے اسی طرح اس "القابض والباسط" کی

صفت قبض و بسط ہر جگہ کارفرما ہے سمندر میں مدوجزر ہوتا ہے فضا میں بھی مدوجزر ہوتا ہے جس کی وجہ سے موسم تبدیل ہوتے ہیں طوفان آتے ہیں امراض اور وبائیں پھوٹتی ہیں قحط آتے ہیں حتیٰ کہ سطح ارض پر جنگیں شروع ہو جاتی ہیں۔

امراض میں بھی قبض و بسط ہوتا ہے خصوصاً" مزمن امراض میں اور دورے والی بیماریوں میں کہ کبھی مریض خود بخود تندرست ہو جاتا ہے اور کبھی پھر بیمار پڑ جاتا ہے کبھی دورے ہلکے پڑ جاتے ہیں کبھی تیز ہو جاتے ہیں اور کبھی کچھ دنوں کے لئے رک جاتے ہیں کیونکہ امراض مزمنہ کے مریض بالخصوص قبض و بسط کا شکار رہتے ہیں لہٰذا جو دوائیں انہیں ایک وقت فائدہ کرتی ہیں دوسرے وقت بے فائدہ ہو جاتی ہیں بلکہ بظاہر مریض کو اس سے نقصان محسوس ہوتا ہے حالانکہ دوا نقصان رساں نہیں ہوتی وہ دوا کیسے نقصان دے سکتی ہے جو کسی مرض کے لئے بنائی گئی ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ فائدہ نہ کرے پیداوار میں بھی قبض و بسط ہوتا ہے ایک سال پیداوار اچھی ہوتی ہے تو دوسرے سال کم ہوتی ہے ایسا کچھ تو زمین کی طاقت کم زور پڑ جانے سے ہوتا ہے اور کچھ موسمی حالات سے سائنس نے اس پر کچھ قابو پالیا ہے مگر ابھی تک بعض پھلدار درختوں کے بارے میں ایسا نہیں ہو سکا مثلاً" آم کی پیداوار ایک سال کم ہوتی ہے تو دوسرے سال زیادہ ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں اس دور میں زلزلے اس لئے زیادہ آنے لگے ہیں کہ زمین سکڑنے لگی ہے اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو زمین کو بھی انقباضی کیفیت لگنے لگی ہے اگر سمندر بڑھنے لگے ہیں۔ تو سمندروں میں انقباضی کیفیت پیدا ہو گئی ہے سنا ہے کہ پہاڑوں میں بھی مدوجزر ہوتا ہے مگر اتنا آہستہ کہ لوگوں کو پتہ نہیں چلتا دریا تو سکڑتے اور پھیلتے ہی رہے ہیں پرانی تاریخوں میں لکھا ہے "دیو بند برلب گنگ" مگر اب تو وہاں میلوں تک بھی کسی دریا کا نام و نشان نہیں ہے۔

غیر مادی چیزوں میں بھی قبض و بسط ہوتا ہے کبھی دنیا میں دیانت داری زور پکڑ جاتی ہے اور کبھی بددیانتی، کبھی صداقت و شجاعت کا زور ہوتا ہے اور کبھی

بزدلی کا، کبھی صلح وامن میں بسط ہوتا ہے اور کبھی صلح وامن و انقباظی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو جنگ میں مد پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں کو بھی قبض و بسط لگتا ہے بسط کے دور میں قوم ترقی کرتی چلی جاتی ہے اور قبض کی صورت میں سست اور کاہلی پڑ جاتی ہے اسی طرح افراد کو بھی قبض وبسط لاحق ہوتا ہے ایک وقت ایک انسان انتہائی سخی بن جاتا ہے تو دوسرے وقت بخیل ایک وقت فرد بڑا چست و چالاک ہوتا ہے اور دوسرے وقت وہی فرد ست اور بلید بن جاتا ہے۔

اسی طرح روحانیت میں بھی قبص وبسط ہوتا ہے ایک وقت خوب خوب روحانی ترقیاں ہوتی ہیں تو دوسرے وقت کم بعض صوفیہ نے لکھا ہے کہ موسم بہار اور موسم برسات میں روحانی ترقیاں زیادہ ہوتی ہیں ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ موسم بہار اور موسم برسات میں عموماً" ہر چیز پر حالت بسط طاری ہوتی ہے طرح طرح کے پھول اور قسم قسم کے جانور پیدا ہوتے ہیں گویا خلاق عالم کی صفت بسط زوروں پر ہوتی ہے۔

اگر سیاہی نہ ہوتی تو ہم سپیدی کو نہ پہچان سکتے اگر قبض نہ ہوتا تو ہم بسط کو کیسے پہچانتے اس کی ہر تخلیق رحمت ہی رحمت ہے بعض صوفیا کو ساری عمر قبض رہا یعنی مجاہدات و مراقبات کا انہوں نے کوئی بھی ثمرہ نہ دیکھا اور بعض کو ساری عمر بسط رہا یہی لوگ اصحاب کرامات ہوتے ہیں یہ بھی تقدیری امور سے ہے۔

صرف فرد تک ہی یہ حالات محدود نہیں ہیں ساری کائنات میں قبض و بسط اور مدو جزر ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ حقائق میں بھی **وَهُوَ يَقْبِضُ وَ يَبْسُطُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔**

اَلْبَاعِثُ جل جلالہٗ

کوئی جسم کبھی فنا نہیں ہوتا نہ کوئی روح کبھی فنا ہوتی ہے جب جسم جو ایک مادی شے ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا رہتا ہے فنا نہیں ہوتا تو روح کیسے فنا ہو سکتی ہے؟ انتقال ہے' فنا نہیں ہے بظاہر فنا ہے لیکن دراصل انتقال ہے۔

ایک خود رو پودا زمین سے سر اٹھاتا ہے' وہ زمین کے سینے سے کچھ کھا پی کر پروان چڑھتا ہے اور اجزائے ارضی کو ھضم کر کے اپنے اندر منتقل کر لیتا ہے گویا روح ارضی روح نباتی کا جامہ پہن لیتی ہے اور اجزائے ارضیہ اجزائے نباتیہ میں منتقل ہو جاتے ہیں اس پودے کو ہرن کھا جاتا ہے تو اجزائے نباتیہ اجزائے حیوانیہ میں منتقل ہو جاتے ہیں اور روح نباتی روح حیوانی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ہرن کو شیر کھا جاتا ہے۔ تو وہ شیر کا جزو بن جاتا ہے۔ شیر کو شکاری مار ڈالتا ہے اور اس کی کھال اور کھوپڑی کو اپنے کمرے میں سجا دیتا ہے۔ پودے ہرن اور شیر کے ناخن سم اور ہڈیاں وغیرہ فنا نہیں ہوتے ان سے کچھ کیڑے مکوڑے اور ذرات وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

جب جسم فنا نہیں ہوتا تو روح کیسے فنا ہو سکتی ہے کہ وہ "جوہر مطلق" ہے۔ میں تناسخ کا قائل نہیں ہوں۔ یہ آواگون والا مسئلہ نہیں ہے وہ اور بات ہے یہ اور بات ہے وہاں جزاء سزا کا سوال ہے اور بہت سی دوسری باتیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے سارے حقائق سارے مذاہب نے نہیں لئے۔ کسی نے کسی حقیقت پر زور دیا ہے تو کسی نے کسی حقیقت پر بلکہ اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کیونکہ مذہب کی بنیاد اگرچہ کسی نہ کسی فلسفے پر ہوتی ہے مگر مذہب فلسفہ تو نہیں ہے۔ مذہبی کتابوں میں سیدھی سادی اصلاحی باتیں ہوتی ہیں وہاں ایٹم یا آکسیجن وغیرہ کا مذکور نہیں۔

کسی انگریز کا قول ہے۔ موت ہماری روح کو ہاتھ نہیں لگا سکتی یہ مقولہ ایک عالمی حقیقت بن چکا ہے۔ ساری دنیا یہی کہتی ہے کہ موت ہماری روح کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ ساری دنیا کے واعظ و خطیب، مضمون نگار اور مصنف یہی کہتے اور لکھتے چلے آئے ہیں کہ موت ہماری روح کو ہاتھ نہیں لگا سکتی اور حود ہم نے بھی بارہا ایسا کہا یا لکھا ہو گا۔ مگر ایک روز میں نے اس مقولہ پر غور کیا تو معاملہ برعکس پایا کیونکہ موت صرف ہماری روح پر ہاتھ ڈالتی ہے اور اسے نہ معلوم کہاں اڑا کر لے جاتی ہے۔ ملک الموت یا اس کے ایجنٹ ہماری روح کو نہ معلوم کس مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ جسم کو تو موت یہیں چھوڑ جاتی ہے۔ اسے ہمارے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو صرف ہماری روح کی گاہک ہے۔ اس کے حساب جسم گلے سڑے، جلے یا غرق آب ہو جائے اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔

موت ہمارے جسم کو ہرگز ہاتھ نہیں لگاتی۔ جسم کو تو امراض و آفات شمشیر و سناں اور آگ، پانی، گولہ بارود جیسی چیزیں ہاتھ لگاتی ہیں اور اسے برباد کر دیتی ہیں جب موت دیکھتی ہے کہ یہ جسم اس قابل نہیں رہا کہ روح اس میں ٹھہر سکے تو وہ روح کو نکال کر لے جاتی ہے۔

اکثر و بیشتر مردوں کا جسم بالکل سالم ہوتا ہے بلکہ مرنے کے عرصۂ دراز تک جسم سالم رہتا ہے اگر موت جسم کی گاہک ہوتی ہے تو یہ زمین پر پڑا نہ رہتا۔ موت جس چیز کو ہاتھ لگاتی ہے وہ صرف روح ہے۔ جسے وہ لے اڑی جسم سے اسے کوئی دلچسپی نہیں اور ہے بھی یہی بات کہ جسم تو صرف روح کی سواری ہے موت سوار کی خریدار ہے۔ سواری کی نہیں۔

اس دور کے مردوں کو دیکھ کر تو یہ بات باسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ایک شخص جو ہر طرح بالکل تندرست مستعدی کے ساتھ کام کاج میں لگا ہوا ہے اک دم اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا جسم بالکل صحیح سالم ہوتا ہے۔ بس ذرا سا سدہ دل میں پیدا ہو کر مر جاتا ہے موت اگر جسم کو ہاتھ لگاتی تو کہیں تو ٹوٹ پھوٹ نظر آتی۔ سدے تو جسم میں جگہ جگہ پیدا ہوتے رہتے ہیں پھر بھی جسم زندہ رہتا ہے معلوم ہوا موت روح کو اڑا کر لے گئی۔

مذاہب کے نظریات سزا و جزا خواہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف ہوں مگر سارے مذاہب روح کے فنا ہونے کے قائل ہیں زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ معلوم ہوا یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

بہت سے خود رو پودے اور بہت سے حشرات الارض جنہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ موسم خزاں میں نیست و نابود ہو چکے اور کہیں بھی ان کا نام و نشان تک نہیں رہا۔ پہلی ہی بارش میں از سرنو زندہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا وہ فنا نہیں ہوئے تھے۔ مٹی ذرات خس و خاشاک پوڈریا کسی اور صورت کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔

وہ "الباعث" اسی طرح سب کو مرنے کے بعد پھر سے زندہ کر دے گا خواہ وہ قبر میں ہو یا درندوں کے شکموں میں یا مچھلیوں کے پیٹوں میں یا دریاؤں اور سمندروں کی تہوں میں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وہ ہمارے منتشر اجزاء کو کیسے جوڑ دے گا۔ اگر کوئی شخص اپنی لاش جلوا کر اپنی راکھ کو سارے اقلیم میں بکھیروا دے گا تب بھی وہ اس کے جسم و روح کو جوڑ دے گا مگر کیسے؟ پتہ نہیں۔

اس نے آگ، ہوا، پانی، مٹی، نمک چونے، شکر، لوہے، تانبے کو کہاں کہاں سے جوڑ جاڑ کر ہمیں پیدا کر دیا جیسے ان اجزائے منتشرہ کو جوڑ کر ایک کا بعد بنا دیا۔ اسی طرح جب یہ اجزا منتشر ہو جائیں گے تو انہیں جوڑ دے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور چونا بن جائیں گے تو پھر سے اٹھا لئے جائیں گے۔ آپ کہہ دیجئے انہیں وہی زندہ کر دے گا۔ جس نے پہلی بار پیدا کیا وہ ہر طرح کی تخلیق کو جانتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا وہ ہمارے بکھرے ہوئے اجزا کو کیسے جمع کر دے گا۔ ہماری سمجھ ہی کتنی ہے جو یہ بات سمجھ میں آئے۔ یہ بات ہی ایسی ہے جو سمجھ میں نہیں آسکتی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ قوموں کو پھر سے زندہ کر دیتا ہے ان کی طرف کسی ایسے مسیحا نفس کو بھیج دیتا ہے جو ان میں نئی روح پھونک دیتا ہے اور قوم از سرنو جوان ہو جاتی ہے۔

اگر کسی کو گولی لگ جانے یا جسم کے کسی حصے کے جل جانے یا آفت زدہ ہو جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے تو جسم میں کچھ شکست و ریخت ہو جاتی ہے مگر وہ اپنے بستر پر پڑا تو ہوتا ہے۔ اگر نہیں ہے تو روح بستر پر نہیں ہے اور یہ ایسے چپکے سے نکل جاتی ہے کہ ذرا سی بھی آہٹ نہیں ہوتی۔

؎ دوش از برم چو رفتی آگاہ نہ گشتم آرے

جانی و رفتن جان آواز پاندارد! ★

اگر کوئی شخص بجلی کے جھٹکے۔ زہریلی گیس یا کسی حادثے سے مرجاتا ہے تو اس کا جسم تقریباً سالم ہوتا ہے بس روح ہی نہیں رہتی۔

"النوم اخو الموت" نیند موت کی بہن ہے۔ بوقت خواب ہم عموماً" تن درست ہوتے ہیں مگر جو موت طاری ہو گی وہ روح کے نہ ہونے یا سکڑ جانے سے ہوئی فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ اللہ بوقت خواب روح کو قبض کر لیتا ہے۔ پھر جس پر موت لکھ دی گئی اسے روک لیتا ہے اور دوسری کو بھیج دیتا ہے۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ موت روح کو ہاتھ لگاتی ہے جسم کو نہیں۔

یہ بحث تو ضمنی طور پر درمیان میں چھڑ گئی تھی ہمیں اس سے غرض نہیں کہ موت کیسے شکار کرتی ہے بہر حال وہ "الباعث" پھر سے سب کو زندہ کر دے گا۔ آیا اسی جسم میں روح ڈالے گا یا جسم مثالی میں جیسے کہ بعض فلاسفہ و صوفیہ کہتے ہیں بہر صورت بعثت ثانیہ ہونی ضروری ہے۔ پیغمبروں سے ایسے معجزات کا صدور ہوا ہے کہ انہوں نے مردوں کو زندہ کر دیا اور بعض کو قبروں سے اٹھایا تو وہ "الباعث" ایسا کیسے نہ کر سکے گا۔

★ گزشتہ شب میرے پہلو سے جب رخصت ہوئے تو مجھے خبر ہی نہ ہوئی ہاں تم میری جاں ہو۔ اور جان جب جسم سے نکلتی ہے تو آہٹ نہیں ہوا کرتی۔

اَلْبَاقِی جل جلالہٗ

ہم رات دن اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ آج سو میں سے نوے خرچ ہو گئے دس باقی بچے ہزار میں سے نوسو خرچ ہو گئے سو بچے پانچ میں سے ایک ضائع گیا چار بچے۔ سو میں سے دس کو' ہزار میں سے سو کو' پانچ سے چار باقی کو ہم نے نوے فانی' سو فانی اور ایک فانی سے پہچانا۔ سو میں سے نوے خرچ نہ ہوتے تو ہم دس باقی کو نہ پہچانتے اور اگر ہزار میں سے نو سو خرچ نہ ہوتے تو ہم سو باقی کو نہ پہچانتے اور اگر پانچ میں سے ایک ضائع نہ جاتا تو ہم چار باقی کو کیسے جانتے؟

معلوم ہوا ہم فانی سے باقی کو جانتے ہیں کیونکہ ہم چیزوں کو ان کے اضداد سے پہچانتے ہیں اگر سیاہی نہ ہوتی تو ہم سپیدی کو نہ جان سکتے۔ اگر تلخی نہ ہوتی تو شیرینی کو نہ جانتے اور اگر ظلمت نہ ہوتی تو نور کو نہ پہچان سکتے۔ اگر فنا نہ ہوتی تو بقا کو کیسے جانتے اور اگر ہم فانی نہ ہوتے تواس "الباقی" کی معرفت سے محروم ہی رہتے پھرتو ہر شخص خدائی کا دعویدار ہوتا۔

ے "موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انسان
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا"

معلوم ہوا فنا بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے جب کہ اس فنا کے بعد بقا ضروری ہے۔ ایسی فنا کے سو جان سے قربان جو بقائے ابدی عطا کرے۔ بعض مذاہب کے نزدیک ایسا ہے کہ پہلے ہم جماد تھے۔ پھر نبات کا چولا بدلا پھر حیوانات کی صف میں داخل ہوئے اور پھر انسان بنے اس کے بعد روح خالص اور فانی ہونے کے بعد باقی بنے تو یہ فنا کتنی اچھی ہے۔

ے "مرنے والے تجھے مرنے کا بھی کچھ ہوش نہیں
ماں کا آغوش ہے یہ موت کا آغوش نہیں"

موت واقعی ماں کا آغوش ہے بڑے آرام کی نیند آتی ہے سب تکلیفیں ختم ہو جاتی ہیں اور سب جھگڑے مٹ جاتے ہیں اور ایک پاکیزہ عالم ارواح سے ہمارا تعلق ہو جاتا ہے اسی لئے تو حفیظ جالندھریؒ نے اقبالؒ کے مرثیہ میں کہا تھا۔

"اقبال بلند تھا ہمارا
اب اور بلند ہو گیا ہے"

یعنی پہلے فانی تھا اور اب باقی ہو گیا ہے خودی سے خدا تک پہنچ گیا ہے گندی دنیا سے نکل کر ایک مقدس عالم میں پہنچ گیا ہے۔ میری بیوی کا اچانک ایک حادثے سے انتقال ہو گیا تو میری آنکھوں میں سے ایک بھی آنسو نہ ٹپکا کیونکہ معاً" یہ خیال آیا کہ پہلے وہ فانی تھی اب باقی ہو گئی ہے اپنا سفر طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ گئی ہے گندی دنیا سے نکل کر ایک جاودانی دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ ایک دن عقل کا غلبہ رہا دوسرے دن عقل مغلوب ہو گئی اور جذبات غالب آ گئے تو میں رو پڑا کیونکہ چونتیس سال سے ہم کبھی جدا نہ ہوئے تھے اور میں نے ایسے دردناک کئی مرثیے لکھے کہ دوست احباب نے کہا آپ نے بیوی کے مرنے کا بڑا ہی صدمہ کیا ہے میں نے کہا یہ تو فطرت ہے حضور رسالت مآب ؐ کے فرزند کا انتقال ہوا تو آنسو بھر لائے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا یا رسول اللہ یہ کیا فرمایا یہ رحمت ہے۔ آپ جانتے تھے کہ عالم بقا سے فرزند کا تعلق ہو گیا ہے مگر فطرت مجبور پر کچھ قابو نہیں چلتا۔

اس "باقی" نے جہاں اپنی اور صفات سے مخلوق کو حصہ دیا ہے اس صفت سے بھی حصہ عطا کیا ہے اور عموماً" حصہ بقدر جثہ ہے چھوٹے چھوٹے جراثیم صبح سے شام تک ختم ہو جاتے ہیں بڑے کیڑے زیادہ دنوں تک زندہ رہتے ہیں اور بڑے اجسام والے جانور بڑی عمریں پاتے ہیں پہاڑوں اور زمینوں اور دریاؤں کو بقا سے بڑا حصہ عطا کیا ہے مگر یہ بھی ایک دن زلزلوں وغیرہ کی نذر ہو جاتے ہیں تاکہ کوئی خدائی کا دعویدار نہ بن بیٹھے۔

جسموں کی بقا کو محدود کر دیا ہے اور روحوں کی بقا غیر محدود ہے۔ موت

ہمارے جسم کو ہاتھ لگا سکتی ہے روح کو نہیں کیونکہ یہ اس باقی کے ساتھ باقی رہتی ہے فنا نہیں ہوتی۔ اس ''الباقی'' کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں بقائے ابدی سے نوازا۔

محدود بقا کا تعلق صرف جسم والی چیزوں ہی سے نہیں ہے غیر جسمانی چیزوں سے بھی ہے حقائق بھی مضمحل اور فنا ہوتی رہتی ہیں۔ نام اور شہرت کو بھی فنا ہے ایک عرصۂ دراز تک کسی انسان کی بڑی شہرت رہتی ہے پھرامتداد زمانہ سے رفتہ رفتہ پگھل کر نابود ہو جاتی ہے بس بقا ہے تو صرف اسی کے لئے ہے۔

نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا
فقط ایک رب العلا ہی رہے گا

جس طرح اس کی ذات باقی ودائم ہے اسی طرح اس کی صفات بھی دائم وباقی ہیں اور جس طرح اس کی ذات موثر ہے اس کی صفات بھی موثر ہیں کسی کے رنگ کو عارضی بقادی ہے تو کسی کی بو کو، کسی کے مزے کو، کسی کے حسن کو، کسی کی نرمی کو بقا ہے تو کسی کی سختی کو، کسی کی کسی ادا کو بقا ہے تو کسی کے کسی انداز کو اور یہ سب عارضی بقائیں اس ''الباقی'' کی بقا کی گواہی دیتی ہیں۔

وہ ہمیشہ سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا ہمیشہ سے خالق ہے اور ہمیشہ خالق رہے گا۔ ہمیشہ سے رازق ہے اور ہمیشہ رازق رہے گا وہ مرنے کے بعد ہماری روحوں کو غذا پہنچاتا رہے گا کیونکہ کھانے پینے سے برتر صرف اسی کی ذات ہے مرنے کے بعد رزق کے اطوار بدل جائیں گے اور اس طرح اس کی صفت رزاقیت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔

عموماً ہر فنا کے بعد ایک بقا ہے تخم فنا ہوتا ہے تو پودا نمودار ہو جاتا ہے کلی فنا ہو کر پھول بن جاتی ہے اور پھول فنا ہو کر پھل یا تخم بن جاتا ہے یا گرد راہ۔ طفولیت ختم ہوتی ہے۔ تو شباب سر اٹھاتا ہے شباب رخصت ہوتا ہے تو اسکی جگہ بڑھاپا لیتا ہے بڑھاپا فنا ہوتا تو موت طاری ہو جاتی ہے موت طاری ہو چکتی ہے تو احیات ابدی ملتی ہے بعض لوگ اسی دنیا میں اپنی بقائے ابدی سے

سرفراز ہو جاتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

صوفیہؒ پہلے "فنافی اللہ" پر لگاتے ہیں جب مرید پوری طرح فنا ہو چکتا ہے تو "بقا باللہ" سے سرفراز کرتے ہیں۔

"ملتی ہے عمرابد عشق کے میخانے میں"

ایک صوفی "فنافی اللہ" کہلاتے تھے اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ تو اس میں طاق ہو چکے تھے۔ دلی میں خواجہ باقی باللہ کا قبرستان مشہور ہے جہاں وہ آرام فرما رہے ہیں اس قبرستان کے دروازے کے باہر بالکل دہلیز کے قریب ویراں شاعر کی قبر ہے جس پر لکھا ہے

"فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو ہیں اس در سے گزرنے والے"

اس احاطہ میں میرے جواں مرگ بھائی حسن عثمان کی قبر ہے جس کے مرنے کے بعد ہمارے گھر میں سوائے خدا کے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

کوئی بھی جان دار مرنا نہیں چاہتا خصوصاً" انسان تو یہی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہوں بقا کی یہی خواہش نامورانِ دہر کو کار ہائے نمایاں انجام دینے پر مجبور کرتی ہے کہ خواہ ہم نہ رہیں ہمارا نام ہی رہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مرے تو گئے اور بالکل ہی گئے ان کی موت بڑی ہی حسرت ناک ہوتی ہے موت ان کے لئے بڑی ہی بھیانک چیز ہوتی ہے مگر وہ لوگ جن کا اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ملے گی۔ اس قدر حسرت سے دنیا سے رخصت نہیں ہوتے جیسی بری حالت اس شخص کی ہوتی ہے جو "حیات بعد الموت" پر یقین نہیں رکھتا۔

"حیات بعد الممات" کا نظریہ جسے تمام آسمانی مذاہب نے پیش کیا ہے اگر بالفرض غلط بھی ہو تب بھی یہ نظریہ عالم انسانیت کے لئے بڑا ہی خوش کن ہے اور موت کے کرب کو بڑی حد تک کم کر دیتا ہے امید جو ہماری زندگی کا سہارا ہے

مرتے دم تک ہمیں بقائے دوام کی امید لگائے رکھتی ہے جو یقیناً ایک بڑی ہی خوش کن امید ہے آپ تصور تو کریں کہ ایک شخص مر رہا ہے اور جانتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے گیا اور دوسرا شخص جو مر رہا ہے مگر یقین رکھتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہوا ان دونوں کی موت میں کتنا عظیم فرق ہے ایک کی موت سراپا حزن وملال ہے اور دوسرے کی سراپا امید و وصال۔

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اس دنیا پر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے نے یہ سارا کھیل تماشا فنا کے لئے نہیں رچایا ہم ذرا سی گڑیا بناتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ یہ باقی رہے تو اتنا بڑا کارخانہ بنانے والا کب چاہے گا کہ یہ باقی نہ رہے۔ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ** یہ انسان یونہی تو پیدا نہیں کیا گیا **اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَا کُمْ عَبَثًا** کوئی خالق اپنی تخلیق عبث پیدا نہیں کرتا تو "احسن الخالقین" کیسے ایسا کرے گا؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اسے ایک بہتر ہیئت میں تبدیل کر دے اور توڑ پھوڑ کر ایک نئے فارم میں تبدیل کر دے اور ایک نیا فارمولا بروئے کار لائے **کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ** اس کی شانیں بدلتی ہوتی ہیں۔ اس کی صفت بقا بدلتی سدلتی رہتی ہے مگر فنا تو نہیں ہو سکتی وہ باقی ہے تو ہم بھی باقی رہیں گے یہ دوسری بات ہے کہ ہماری بقا محتاج فنا ہے اور یہی فرق ہماری اور اس کی بقا میں ہے۔

ہم نے بقا کو پیدا نہیں کیا ہماری اور ہماری چیزوں کی بقا مستعار ہے لہٰذا وہ "الباقی" جب چاہتا ہے جس سے چاہتا ہے بقا کو چھین لیتا ہے اگر ہم بقا کے خالق ہوتے تو ہم بھی ہمیشہ باقی ہی رہتے ہم پر یا اس کائنات پر کبھی فنا طاری نہ ہوتی اگر ہماری بقا ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تو ہم فنا کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔

شاید انسان ہمیشہ سے بقا کی کوشش کرتا رہا ہے بہر حال فراعنہ اور سکندر رومی وغیرہ نے تو کی تھی گوتم بدھ نے تخت و تاج کو ٹھکرا کر انسان کو غم بیماری بڑھاپے اور موت سے نجات دلانی چاہی تھی مگر اسے معلوم ہو گیا کہ بقائے دوام بغیر موت کے دروازے سے نکلے میسر نہیں آسکتی۔ اور بغیر نروان حاصل کئے کام نہیں بن سکتا۔ ہمارے اس دور کے سائنس دان بھی اس کوشش میں ہیں کہ کس طرح موت سے خلاصی ہو روسی سائنس دانوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ

انسان کو دو سو سال کی بقا میسر آسکتی ہے مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن موت کو بھی موت آنی ہے کیونکہ اس کی یہ عارضی بقا خود اس کی پیدا کردہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ یہ جامہ زیب تن کئے رہے نہ وہ خود پیدا ہوئی کہ مخلوق پر خدائی کرتی رہے پھر سب ہی باقی رہ جائیں گے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

؎ موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دراصل فنا بقا کی سیڑھی ہے ہمیں مرنے کے بعد پر پرواز مل جاتے ہیں جیسے نیند میں ہم کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں کیونکہ اس وقت ہماری مادیت ذرا ست پڑ جاتی ہے تو روح قوی ہو جاتی ہے اس طرح مرکر روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس میں اڑنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جیسے نیند میں ایسا ہی ہوتا ہے **النوم اخت الموت** نیند موت کی بہن ہے دونوں کے حالات قریب قریب ہیں نسبت برادری جو ٹھہری۔

لوگ ہمارے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں دل و جان سے ہماری خدمت کرتے ہیں مگر جب روح نکل جاتی ہے تو سب نفرت کرنے لگتے ہیں اور زمین میں گاڑ دیتے ہیں یا جلا دیتے ہیں حالانکہ مرنے کے بعد ہمارا جسم وہی جسم رہا ہمارے ہاتھ پاؤں وہی رہے۔ سب کچھ وہی رہا تو وہ کونسی چیز نکل گئی جس کے رخصت ہو جانے کے بعد سب ہم سے نفرت کرنے لگے اسی سے ہم خواب میں اڑے اڑے پھرتے ہیں اسی سے مرنے کے بعد اڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے اور یہ اسی قدر معظم و مکرم ہو گی جیسی کہ زندگی میں تھی جس درجے کی وہ زندگی میں عظیم تھی اسی درجے کی مرنے کے بعد عظیم ہو گی دینوی

عظمت کے اعتبار سے نہیں اس کی اپنی ذاتی عظمت و استعداد کے اعتبار سے کیونکہ جس طرح دنیوی جسم بے وقعت ہے دنیوی عظمت و عزت بھی بے وقعت ہے جسم کی عزت و عظمت جسم کے ساتھ رہ جائے گی اور روح کی عزت و عظمت اس کے ساتھ وابستہ رہے گی۔

اسی لئے علامہ صاحبؒ نے موت کو "سنجیدنِ پر" (اڑنے کے لئے پر تولنا) سے تعبیر کیا ہے اور جوہرِ انسان یعنی روح کو عدم نا آشنا فرمایا ہے۔ انسان کا جوہر تو دراصل یہی روح ہے جو ہر وقت انا انا کہتی رہتی ہے اور میرا تیرا اپنا پرایا کرتی رہتی ہے جسم بے چارہ تو کچھ بھی نہیں یہ تو صرف اس کی سواری ہے۔ اگر جسم سے ایک ہاتھ، پاؤں کاٹ ڈالا جائے تو یہ اسی طرح سالم رہتی ہے اسے کوئی گزند نہیں پہنچتا تو مرنے کے بعد اسے کیسے گزند پہنچ سکتا ہے۔

یہ اسم پاک قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا البتہ اس جیسے الفاظ متعدد جگہ آئے ہیں جیسے **یبقی، باق، باقیات، باقین، باقیتہ، بقی، بقیہ۔**

سورہ الرحمٰن کا دوسرا رکوع اس طرح شروع ہوتا ہے۔ **کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ** جو کچھ بھی زمین پر ہے سب فنا ہو جائے گا اور تمہارے رب کی ذات باقی رہے گی **وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ** وہ کہتا ہے کہ میری ذات باقی رہے گی تو وہ "الباقی یقیناً" ہوا۔

عالم کے حادث یعنی نو پید ہونے کے بارے میں ارباب منطق یہ دلیل لاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ عالم حادث ہے۔

ہر وہ چیز جو نو پید ہے فنا اس کا مقدر ہے چونکہ کائنات بھی نو پید ہے۔ لہٰذا فنا ہونے سے نہیں بچ سکتی اور چونکہ ذات باری تعالیٰ نو پید نہیں ہے لہٰذا وہ کبھی بھی فنا نہیں ہو گا۔

؎ دارا رہا نہ جم، نہ سکندر سا بادشاہ
تختِ زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے

کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَه ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے مگر اس کی ذات۔

نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا
فقط ایک "ربّ العلا" ہی رہے گا

اس کی ذات ازلی و ابدی ہے اس کی نہ کوئی ابتداء اور نہ کوئی انتہا وہ زمان و مکان سے پاک ہے جو زمان ومکان سے پاک ہو گا فانی کیسے ہو سکتا ہے۔

صوفیہؒ کے بہت سے مقامات واحوال ہیں۔ جن میں سے ایک مقام "فنا فی اللہ" کا اور ایک "بقابا اللہ" کا ہے۔ مقامات اولیاء میں فنا فی اللہ کا مقام بہت بلند ہے مگر "بقاباللہ" کا مقام اس سے بھی بہت بلند ہے یعنی "فنا فی اللہ" والے "بقاء باللہ" والوں کے نزدیک خام اور کم درجے کے لوگ ہیں۔ منصور حلاج۔ سرمد وغیرہ "فنافی اللہ" کے مقام سے گزر کر "بقا باللہ" کے مقام کی طرف نہ آسکے۔ اس مقام میں انسان کو اپنا وجود نظر نہیں آتا صرف ذات الٰہی ہی کو دیکھتا ہے لہٰذا انا الحق وغیرہ کہہ اٹھتا ہے حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا **مافی الجبہ الا اللہ** میرے جبے میں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ مگر یہ ان کا ایک حال تھا مقام نہ تھا۔ وہ اس سے گزر گئے اور منصور حلاج و سرمد وغیرہ پھنس کر رہ گئے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سب سے کمزور تصنیف "سرمد شہید" ہے۔ وہ اس کتاب کے نام سے بھی شرماتے تھے انہوں نے اس کتاب میں اس دور کے علماء پر بہت لعن طعن کی ہے کہ انھوں نے قتل کا فتویٰ کیوں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سرمد واجب القتل تھا۔ اسی طرح منصور حلاج بھی۔ سرمد دہلی کی جامع مسجد کے نیچے لال قلعہ کے پاس کفریات بکتا رہتا تھا۔ اہلِ دہلی نے بار بار عالمگیر بادشاہ سے اس کی شکایت کی تو فرمایا برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی نہ اس کی لاف و گزاف وجہ قتل ہو سکتی ہے پھر اہل دہلی نے شکایت کی تو عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ نے نواب عنایت خان بن نواب مظفر خاں کو تحقیقات پر تعینات کیا یہ موروثی نواب تھے بڑے عالم اور صوفی تھے اور ترک دنیا کر کے گوشہ نشیں ہو چکے تھے۔ خواجہ اعظم نے تاریخ اعظمی میں ان کی بزرگی کی بڑی تعریف کی ہے۔ الغرض بادشاہ نے کسی درباری کو نہیں ایک عالم باعمل گوشہ نشین صوفی کو تحقیقات پر متعین کیا تو انہوں نے یہ رپورٹ دی۔

؎ بر سرمدِ برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ثابت است ازو، کشفِ عورت است

اہلِ دہلی نے پھر سلطان رحمتہ اللہ علیہ سے شکایت کی تو انہوں نے اسے طلب کر لیا علماء نے اس سے کہا کلمہ پڑھ اس نے کہا لا الٰہ علماء نے کہا پورا کلمہ پڑھ تو اسنے کہا میں ابھی مقام فنا میں ہوں لہٰذا علماء نے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ عالمگیر خود بڑے بھاری فقیہ عالم اور صوفی تھے اور ان کے دربار میں ابوالکلامؒ جیسے نہ جانے کتنے عالم تھے۔ یہ بھی غلط ہے کہ اس کا قتل سیاسی تھا کیونکہ وہ داراشکوہ کے قتل کے تین سال بعد قتل کیا گیا بعض مصنّفین نے بڑی غلطی کی ہے۔

سرمد ایک ہندو لڑکے "ابھی چند" پر عاشق تھے کہتے ہیں۔

؎ نمی دانم دریں چرخ کہن دیر
خدائے من ابھی چند است یا غیر

ان کے اس قسم کے کفریات سے اہل دہلی کو شکایت تھی۔ یہ مجذوب لوگ فانی فی اللہ ہوتے ہیں لہٰذا نماز وغیرہ سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہ کم درجہ ہے۔ بلند درجہ باقی با اللہ کا ہے جس میں صوفی فنا سے بقا کی طرف آتا ہے۔

جب حضرت مجدد الف ثانیؒ دہلی پہنچے تو وہاں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی شہرت سُنکر لوگ حاضر خدمت ہوئے اور ان سے بیعت کی، دیکھئیے باقی باللہؒ کا فیض کہاں کہاں تک پہنچا اقطارِ عالم میں ان کے مرید پھیلے ہوئے تھے اور فانی فی اللہ لوگ اپنے کفریات سے لوگوں کو گم راہ کر گئے اور ان گنت صوفی قعرِ "وحدۃ الوجود" وغیرہ میں جا گرے۔

مجاذیب عموماً" بے دین، گندے اور بکواسی ہوتے ہیں مگر ان کی دنیا بھی عجیب و غریب ہے۔ مولانا عبدالسلام نیازی چاروں ابرو کا صفایا کراتے اپنے بالا خانے پر بیٹھے رہتے تھے دہلی میں ان کی بڑی شہرت تھی کہتے ہیں۔ علمائے دہلی مشکل مسائل کے حل کے لئے ان کے پاس جاتے تھے حتیٰ کہ مفتی کفایت اللہؒ بھی۔ منطق و فلسفہ وغیرہ کے استاد بھی پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے ان کے پاس جاتے تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی کتاب تھی نہ نماز نہ روزہ۔

ایک دفعہ سر اکبر حیدری وزیر اعظم ریاست حیدر آباد دکن بھی اس عجوبۂ روزگار کی خدمت میں پہنچ گئے چلتے وقت پانسو روپے پیش کئے پھر کیا تھا مولانا کو غصہ آگیا خادم سے کہا جا بے اوپر ردی کے بنڈل رکھے ہیں نیچے پھینک دیے تو ہر بنڈل میں سو سو کے نوٹ تھے۔ سر اکبر حیدری بڑے شرمندہ ہوئے۔ جب وہ چلے گئے تو خادم سے کہا جا بے انہیں اوپر رکھ آ۔ وہ اوپر رکھ آیا ایک دن اسے لالچ نے جو گھیرا تو کیا دیکھتا ہے۔ بجائے نوٹوں کے ردی کاغذات ہیں۔

ایک دفعہ جواہر لال نہرو بھی ان سے ملنے کے لئے گئے تین چار سیڑھیاں چڑھی تھیں کہ اوپر سے آواز آئی کون ہے؟ واپس چلے جاؤ خبردار جو اوپر آئے۔

اہل دنیا فقیروں کے پاس اپنے دکھ درد کے لئے دعا کرانے جایا کرتے ہیں۔ مولانا نیازی کے پاس لوگ اپنے غموں کا اظہار کرتے تو فرماتے یہ ورد پڑھا کرو چونکہ اس ورد میں گالی تھی۔ لہٰذا لوگ نفرت کرتے مگر بعض نے یہ ورد پڑھا تو کہا بڑا فائدہ ہوا۔

جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر موسم گرما میں ننگے لیٹنا ناممکن ہے موسم سرما میں یہ سیڑھیاں بڑی سرد ہو جاتی ہیں کیونکہ پتھر کی بنی ہوئی ہیں دہلی میں ایک حافظ صاحب کی بڑی شہرت تھی ہندو تک ان کے معتقد تھے اور مقدمہ کے فیصلے کے دن خاص طور سے انہیں ڈولی میں بٹھا کر کچہری لے جایا کرتے تھے۔ میں نے جیسا سنا تھا حافظ صاحب کو ویسا ہی پایا۔ موسم گرما میں وہ بڑے آرام سے بالکل ننگے جامع مسجد کی سیڑھی پر لیٹے ہوتے تھے۔ پاخانہ پھرتے تو اپنی داڑھی سر اور بدن پر مل لیتے تھے۔ نہ بدبو نہ مکھی!

عالم مجاذیب بھی عجیب و غریب عالم ہے مگر ہم ارباب ظاہر ہیں ان کی کفریات پر گرفت ضرور کریں گے ورنہ عوام گمراہ ہو جائیں گے ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ جیسا بھی ہو مگر ان کے کفریات پر ان کا سر ضرور قلم کر دیں گے۔

تفریق و تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے علم الحساب والے اسے باقی کہتے ہیں۔ بس سب کچھ تفریق تقسیم ہونے کے بعد وہ "الباقی" ہی باقی رہے گا۔

"بابا گرو نانک" کا ایک "دوھا" ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ہر چیز میں نام محمدؐ ہے وہ فرماتے ہیں دنیا کی کسی بھی چیز کے اعداد نکالو اسے چار میں ضرب دو حاصل ضرب میں سے دو کو نکال دو (تفریق کرو) حاصل تفریق کو پانچ میں ضرب دو، حاصل ضرب کو بیس سے تقسیم کرو تو باقی دس بچے گا۔
اس باقی کو جو تقسیم کے بعد باقی بچا نو سے ضرب دو اس کے بعد دو بڑھا دو تو بانوے بنے گا۔ یہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کا عدد ہے۔

ہم اسے حل کر کے ایک مثال سے سمجھائے دیتے ہیں۔ جیسے قلم کا لفظ ہے اس کے اعداد یہ ہیں۔ ق ۱۰۰۔ ل ۳۰۔ م ۴۰

678:2_68:4x70

3390:5x678·

339 , 20=10

اس باقی دس کو نو سے ضرب دیا تو نوے ہوئے اب دو بڑھا دیئے تو بانوے ہو گئے جو اسم محمد کے اعداد ہیں۔

وہ دو ہا یہ ہے۔

ے لیو نام ہرلیتو کا اور چوگن کرلو وائے
دو دو لاؤ اوپکا پنج گن کر لو اور بست بھاگ بھاؤ
باقی بچے کو نو گن کر لو اور اس میں دو دو لاؤ
گرونا نک یوں کہے ہر شے میں نام محمدؐ پاؤ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ أَمَلًا** ۔ باقیات صالحات بہتر ہیں اللہ کے ثواب اور اس سے اچھی امید رکھنے کے لئے۔ باقیات ان اعمال کو کہتے ہیں جن کا فیض مرنے کے بعد بھی جاری ساری رہتا ہے نماز، روزہ، حج، و زکوٰۃ ہمارے ساتھ چلے جائیں گے مگر اعمال باقیہ ہمارے مرنے کے بعد بھی فعّال رہیں گے۔ ان میں سب سے پہلا درجہ تو صالح اولاد کا ہے جس کی تمنا ابراہیمؑ و دیگر انبیاءؑ و اولیاءؒ نے کی کہ وہ ہمارے مرنے کے بعد

اللہ کو یاد کرتے رہیں اور نمازیں ادا کرتے رہیں۔ اس طرح ہمارے مرنے کے بعد بھی اللہ والے زندہ رہیں دنیا میں نیکی پھیلائیں اور نیک اعمال کریں۔ دوسرا نمبر صدقات جاریہ کا ہے جیسے سرائے تعمیر کرنا کنواں بنوانا مسجد و مدرسے وغیرہ بنانا کہ جب تک یہ چیزیں باقی رہیں گی ہمیں ثواب پہنچتا رہے گا۔

مجھے پوری طرح حدیث یاد نہیں شائد کچھ ایسا مضمون ہے تیرے مال کے تین حصے ہیں ایک وہ جو تو نے کھا پی لیا تو اسے فنا کر دیا۔ ایک وہ جسے تو پیچھے چھوڑ گیا تو وہ دوسروں کا ہے۔ ایک وہ جو تو نے راہ خدا میں خرچ کیا وہ تیرا ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

پہلے زمانے کے بزرگ اکثر کہا کرتے تھے **اللّٰہ باقی من کل فانی** اور خطوط کے آخر میں عموماً" لکھا کرتے تھے والباقی عندا لتلاقی یعنی باقی باتیں ملاقات کے وقت ہوں گی۔ ہمارے ایک دوست پروفیسر عبدالباقی عباسی جو امروہا کے عباسی خاندان سے تھے۔ کپور تھلہ میں فارسی کے پروفیسر رہے تھے پھر لاہور چلے آئے اپنے آپ کو بڑا بھاری فلسفی سمجھتے تھے اور اس فلسفے کی مار میں وہ خدا سے منکر ہو چکے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا اگر کوئی شخص روز روشن میں مجھ سے یہ کہے کہ آفتاب کا کوئی وجود نہیں تو مجھے آفتاب کے بارے میں شک لاحق ہوسکتا ہے لیکن اگر کوئی شخص مجھ سے یہ کہے کہ خدا نہیں ہے اور لاکھوں دلائل بھی دے تو مجھے اس کے وجود کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک لاحق نہیں ہو گا۔ کیونکہ میں سورج سے زیادہ واضح اسے اپنے سامنے دیکھتا ہوں ناراض ہو گئے پھر کبھی مجھ سے اس مسئلہ پر بات نہیں کی کیونکہ دیکھا کہ یہ تو بڑا ہی پکا ہے۔

مولانا عبدالسلام نیازی شاہ نیاز احمد بریلویؒ کے مرید یا خلیفہ تھے۔ شاہ نیاز ہندوستان کے مشہور اولیاء اللہ سے تھے۔ ان کا بڑا اچھا فارسی کلام ہے جو عشق الٰہی سے بھرا ہوا ہے انہوں نے اپنے مریدوں کو پہلے سے اطلاع دے دی تھی کہ ہمارا فلاں دن فلاں وقت انتقال ہو گا۔ چنانچہ وقت معین پر غسل کیا کفن پہنا اور چارپائی پر لیٹ کر کلمہ پڑھا اور انتقال کر گئے۔

بریلی میں ان کے خلیفہ سے ملا تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں مچان بنا رکھا تھا اس پر بیٹھتے اٹھتے اور سوتے تھے ایک پیالہ صبح اور ایک بڑا سا پیالہ شام نیم کے پتوں کا عرق پیا کرتے تھے۔ بس یہی ان کا کھانا پینا تھا۔

ان پیروں فقیروں کی باتیں کچھ عجیب سی ہیں ریاست رام پور میں میاں شیر محمد بڑے بزرگ گزرے ہیں یہ سبز کپڑے پہنتے تھے میں جس زمانے میں جامعہ الازہر سے فارغ ہو کر آیا تھا۔ تو ان کے ایک خلیفہ کو کوئی شخص میرے وطن سیوہارہ بجنور لایا تھا انہوں نے لوگوں سے پوچھا یہاں کوئی عالم ہے تو لوگ انہیں میرے پاس لے آئے بڑے حسین و جمیل نوجوان تھے سبز کپڑے پہنتے تھے باشرع تھے۔ عصر مغرب کے درمیان وہ میرے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے بڑے نیک بھولے بھالے تھے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ سرمد کا تھا یہ یہودی النسل تھا۔ ان کا مقبرہ ایک یہودی سیاح نے تعمیر کرایا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے تک تو معمولی پختہ قبر تھی۔ جہاں سقے مشکوں میں پانی بھرے پھرا کرتے تھے اور لوگ انھیں پیسے دے کر چھڑکاؤ کرایا کرتے تھے۔ داراشکوہ سرمد کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ اسے پیروں فقیروں سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ حضرت میاں میر رحمتہ اللہ علیہ سے بھی بڑی عقیدت تھی اس نے دو کتابیں سکینہ اور سفینۂ اولیاء لکھی۔ سفینۂ اولیاء میاں میرؒ کی سوانح حیات ہے۔ مگر وہ بے دین ہو کر مرا اپنے جد امجد اکبر کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا اسی لئے عالم گیر نے اس سے جنگ کی۔ بعض نے اسے سیاسی قتل قرار دیا مگر یہ نہ سوچا کہ اس کا قتل داراشکوہ کے قتل کے تین سال بعد ہو اور عالمگیر بادشاہ ولی کامل و عالم باعمل صوفی تھا وہ ہرگز ایسا نہ کر سکتا تھا۔

سرمد کا کلام وارفتگی سے بھرپور ہے مجھے اس کی یہ رباعی بہت پسند ہے۔

ے

ے سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد
یا قطع نظر زیار می باید کرد

اگر خطوط میں لین دین یا دنیوی جھگڑوں کی باتیں ہوتیں تو پرانے بزرگ عموماً خطوط کے آخر میں لکھا کرتے تھے۔ "اللہ بس' باقی ہوس"۔

*

البدیع جل جلالہٗ

یہ اسم پاک، قرآن شریف میں صرف دو جگہ آیا ہے پہلے پارے کے چودھویں رکوع میں ہے **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** وہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

دوسری جگہ پارہ ہفتم کے انیسویں رکوع میں ہے **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے کوئی بیٹا نہیں اور نہ بیوی۔

عربی زبان میں بدع کے معنی **اختراع** و ایجاد کے ہیں۔ یعنی ایسی چیز پیدا کرنا جس کی پہلے سے کوئی نظیر و مثیل نہ ہو۔ اور بدع کے معنی نادر ہونے کے بھی ہیں تو **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** کا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا نادر ہے کہ زمینوں اور آسمانوں میں اس جیسا کوئی نہیں تو اس کا مثیل و نظیر کوئی شخص اس کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے نہ اس کی کوئی بیوی ہے کہ وہ بھی نظیر و مثیل شوہر ہوتی ہے تو چونکہ وہ نادرِ روزگار ہے لہٰذا نہ اس کے کوئی بیٹا نہ بیوی۔

اس دوسری آیت میں اپنے نادر ہونے کی یہ دلیل بھی دی ہے کہ اس کے نہ کوئی بیٹا نہ بیوی چنانچہ فرمایا **وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ** اس کی کوئی بیوی نہیں۔ صاحبہ کا لفظ صاحب کا مذکر ہے عورت کے لئے صاحبہ لایا جاتا ہے جیسے والدہ صاحبہ ہمشیرہ صاحبہ وغیرہ۔

ایک دوست کہنے لگے مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلویؒ کے مطب میں مولانا ابوالکلام آزادؒ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا بیگم صاحب آئی ہیں تو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے برہم ہو کر کہا صاحبہ کیا ہوتا ہے۔ صاحب سے لوگوں نے صاحبہ بنالیا میں نے یہ بات سنی تو دماغ چکرا گیا۔ میں نے کہا مولانا نے

بڑی غلط بات کہی۔ صاحب کا مونث تو صاحبہ ہی ہے۔ قرآن شریف میں ہے **وَلَمْ تَكُنْ لَّهُ صَاحِبَة۔**

پھر سوچتا رہا مولانا نے ایسی غلط بات کیسے کہہ دی میں نے ان صاحب سے کہا ہاں مولانا نے صحیح فرمایا راوی نے پوری بات نہیں بیان کی۔ صاحبہ ہی صاحب کا مونث ہے مگر بیگم کے ساتھ صاحب لگتا ہے۔ صاحبہ نہیں۔ اس لئے مولانا نے اعتراض کیا۔

یہ بات سن کر وہ پھڑک اٹھے کہنے لگے میں بہت دنوں سے اس شش و پنج میں تھا کئی صاحب سے ذکر کیا مجھے کوئی مطمئن نہیں کر سکا۔ ہاں آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے دوسرے معنی یعنی نادر روزگار کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ یقیناً نادرِ روزگار ہے کہ اس جیسا کوئی بھی نہیں اس ذات کے "بدیع" ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جس کی ذات تو ذات اس کی ہر صفت بھی نادر و یکتا ہے۔

جو لوگ اس کے رنگ میں رنگے گئے۔ وہ بھی باوجود ہیچ و پوچ ہونے کے خود اپنے بارے میں **سبحانی مااعظم شانی** وغیرہ جیسے کلمات کہنے پر مجبور ہو گئے۔ گو صوفیہ کے ایسے اقوال ازقسم شطحیات تصور کئے جاتے ہیں۔ لیکن میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ان لوگوں پر زرا سا رنگ چڑھ گیا تو اپنے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے سبحان اللہ میری شان کتنی عظیم ہے۔ اگرچہ وہ ایک انسان بے بود تھے۔ ہیچ در ہیچ تھے تو جس کا ایک ادنیٰ سارنگ یہ رنگ لائے اس "البدیع" کے کیا کہنے؟

عجائب مخلوقات پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ دور کیوں جائیے خود اپنے آپ کو دیکھئے یہ انسان جسے صوفیہ عالم صغیر کہتے ہیں اس "البدیع" کا ایک عجوبۂ روزگار ہے چوپائے جانور چار ہاتھوں پیروں پر چلتے ہیں بات سمجھ میں آتی ہے کہ چار ستونوں پر جسم کا وزن درست رہتا ہے مگر اس احسن تقویم والے کا صرف دو پاؤں پر چلنا پھرنا حیرت انگیز ہے اتنے بڑے وزنی جسم کو دو پیروں پر کھڑا

کر دینا۔ اس ''البدیع'' کا کمال ہے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ اپنے دو پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے بلکہ دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔چلنا پھرنا اور دوڑنا ہےاور وزن کا متوازن رہنا بڑا ہی عجیب ہے۔ یہ چاہے تو ایک پاؤں پر بھی ایک دو گھنٹہ نہیں کئی کئی دن کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ساری عمر بھی ایک پاؤں پر کھڑا رہ سکتا ہے جیسا کہ بعض جوگی ایسا ہی کرتے ہیں۔ وزن کا یہ تناسب ایک دو من کی لاش پر اس ''البدیع'' کا بڑا ہی عجیب کارنامہ ہے پھر یہ کہ یہ دراز قدموں کا وزن لے کر بھی باسانی چل پھر سکتا ہے اور توازن نہیں بگڑتا۔ سارس اور بعض آبی جانو بھی گھنٹوں ایک پاؤں پر کھڑے رہتے ہیں۔ دو پائے جانوروں اور پرندوں میں اس ''البدیع'' نے اس خوبی سے توازن قائم کیا ہے جیسے کہ زمین و آسمان و کواکب کا حسن توازن قائم کر رکھا ہے۔

ایک دفعہ ہم مرحومہ بیگم صاحب کے ساتھ چڑیا گھر سیر کے لئے گئے۔ سارس اپنی ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ آتے جاتے انھوں نے اسے ایک ٹانگ پر ہی کھڑا دیکھا تو کہنے لگیں اس بے چارے کے ایک ہی ٹانگ ہے میں نے کہا ہاں مرغ کی وہی ایک ٹانگ شرمندہ ہو گئیں۔

چونکہ یہ انسان خلیفۂ ارضی ہے لہٰذا یہ بھی چھوٹا موٹا ''بدیع'' ہے اسی لئے طرح طرح کی ایجادات کرتا رہتا ہے بڑی سے بڑی ایجاد کرنے والے بڑے سے بڑے موجد کو جو ہم ''موجد'' کہتے ہیں۔ یہ دراصل موجد نہیں ہوتے صرف تالیف و ترتیب و ترکیب دینے والے یا انکشاف کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ وہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اس ''البدیع'' کی مختلف چیزوں کو ترکیب دے کر ایک نئی چیز بنا دیتے ہیں یا اس کی کسی مخفی چیز کو بر سر عام لے آتے ہیں جس شخص نے لاسلکی ریڈیو یا ٹیلی ویژن یا لیزر شعاعیں ایجاد کیں اس نے ایجاد تو کچھ بھی نہیں کیا صرف انکشاف کیا ہے سب چیزیں پہلے سے موجود تھیں مگر لوگوں کو علم نہ تھا اس نے ترتیب و تالیف سے ایک ہی چیز بنا دی تو سارے موجد بدیع و مبدع و موجد نہیں ہیں۔ صرف اسی کی ذات ''البدیع'' ہے۔ ہم مجازاً انہیں بدیع کہہ دیتے ہیں۔

روس، امریکہ، یورپ، فرانس و جرمنی وغیرہ ترقی یافتہ ممالک نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں میں کہا کرتا ہوں کہ یہ لوگ جیب تراش ہیں افراد تو افراد یہ پورے ملک و قوم کی جیبیں کاٹتے رہتے ہیں مگر یہ ایسے جیب تراش ہیں کہ لوگ بخوشی ان سے اپنی جیب کٹواتے ہیں اور ان سے جیب کٹوا کر خوش ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ساری دنیا کی دولت نت نئی ایجادوں سے لوٹتے رہتے ہیں ایک نئی چیز ایجاد کرتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ اب یہ چیز پرانی ہو گئی ہے تو اس سے بہتر کوئی اور چیز ایجاد کر دیتے ہیں اس طرح یہ جیب تراشی کا چکر چلاتے رہتے ہیں۔ یہ موجد بھی ہیں اور جیب تراش بھی صرف فرق اتنا ہے کہ جیب تراش صرف فرد کی جیب کاٹتا ہے اور اسے کچھ نہیں دیتا بلکہ غم دیتا ہے تکلیف پہنچاتا ہے اور یہ جیب تراش خوشی و آرام و سکون دیتے ہیں اور کچھ لیتے ہیں تو دیتے بھی ہیں کم ترقی یافتہ ممالک کو چاہیئے کہ سامان تعیش کی خریداری کم کریں ۔ آرائش و زیبائش کی چیزیں خریدنے سے اقتصادی حالت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

یہ بدیع مجازی، "بدیع حقیقی" کا نقال ہے جب شروع شروع اس نے گاڑی ایجاد کی تو وہ چوپایوں کو دیکھ کر چار پہیوں کے بغیر گاڑی نہ بنا سکا۔ اس کے خیال میں چار پہیوں کا ہونا ایسا ہی ضروری تھا جیسے چار پائے کے لئے چار پاؤں اس نے بیل بھینسوں وغیرہ کو دیکھا کہ منوں کا بوجھ چار پاؤں ہی اٹھا سکتے ہیں لہٰذا اس نے اور ذرا ترقی کی اور پرندوں کو دیکھا کہ دو پیروں پر بھی توازن قائم رہ سکتا ہے تو گاڑی کے دو پہیے نکال کر صرف دو پر اکتفاء کی پھر سائیکل والے نے ایک ہی پہیہ کر دیا میں ان دو کو ایک ہی تصور کرتا ہوں۔ اس طرح بہت سی مشینیں حقیقتہً صرف ایک ہی پہیے سے چلتی ہے۔

میں نے جو یہ کہا کہ انسان چھوٹا موٹا بدیع ہے۔ یہ ہماری زبان کا ایک محاورہ ہے۔ ایک سرحدی پٹھان نے یہ محاورہ کہیں سے سن لیا تھا اور کچھ بوڑھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے ایک بوڑھے نے کہا خدا بوڑھے کی بیوی نہ مارے۔ بڑھاپے میں بیوی ماں کا کام دیتی ہے کہ اگر بوڑھا شوہر معذور و مجبور ہو جاتا ہے۔ تو وہ اس کا پیشاب و پاخانہ اٹھانے میں باک محسوس نہیں کرتی۔ ایک

روز خان صاحب لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے فرمانے لگے بھائیو بیوی بھی چھوٹا موٹا مال ہوتا ہے۔

علم و حکمت کی باتوں سے دماغ ڈل ہو جاتا ہے ذرا لطائف و ظرائف بھی ساتھ ساتھ چلتے رہیں تو ذہن کھل جاتا ہے اور اس میں بات کے سمجھنے کی طاقت کچھ زیادہ ہو جاتی ہے ہمیں پٹھانوں کے بہت سے لطیفے یاد ہیں ایک دو سنائے دیتے ہیں۔

آم کا درخت گرم ملک میں ہوتا ہے۔ سرد ممالک میں نہیں ہوتا شاید یہ شعر غالب کا ہے۔

جا کے یورپ میں آم کا پودا
کبھی ہرگز ہرا نہیں ہوتا

آم اور جامن کا چولی دامن کا ساتھ ہے سرحد میں جامن کہاں۔ ایک نو وارد افغانی پٹھان ہندوستان آیا جامن کھائی تو پسند آئی۔ ایک دن جامن کے درخت پر چڑھ کر **جامنیں** کھانے لگا۔ بد قسمتی سے درخت پر ایک بھونرا بھی بیٹھا تھا اس نے اسے بھی جامن سمجھا وہ قسمت کا مارا بھوں بھوں کرنے لگا تو خان صاحب نے فرمایا بھوں بھوں کرے یا چوں چوں کالا کالا ایک نہیں چھوڑے گا سب کو کھا جائے گا۔

ہندوستان میں حلوائی قلاقند اکثر بناتے ہیں یہ ذرا موٹی سی بھر بھری سی چوکور ڈلی ہوتی ہے پاکستان والے اس کے بجائے برفی بناتے ہیں۔ مگر یہ چپٹی اور مثلث ہوتی ہے اور وہ چوکور او رموٹی سی۔ کسی نے خان صاحب کو قلاقند کھلائی بہت پسند آئی۔ سوچا پھر کسی دن کھائیں گے چلے جا رہے تھے بقّال کی دکان پر کپڑے دھونے کا صابن رکھا تھا۔ قلاقند سمجھ کر خرید لیا بیٹھے کھا رہے تھے۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ کسی نے پوچھا خان بابا یہ کیا کھا رہے ہو فرمایا کیا پوچھتا ہے کیا کھا رہے ہو خان اپنا پیسہ کھا رہا ہے۔

یہ بدیع مجازی بڑا شریر ہے۔ اس نے دل بہار قسم کی بعض ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں کہ اگر ان کا ذکر کروں تو اخبار والے اسے کاٹ دیں گے۔ یہ لذت

پرستی کا دور ہے اور یار لوگوں نے قدرت کی دیکھا دیکھی ایسی ایسی چیزیں ایجاد کر دی ہیں کہ پناہ بخدا۔

یہ **ظلوم و جہول** بدیع مجازی اب بہت ہی شریر ہوتا جا رہا ہے۔

چیونٹی کے جو پر نکل آئے
جانئے بس کہ اب اجل آئے

اب سلطنتوں کو اپنے راز چھپانا مشکل ہو گیا ہے۔ اور امن و سلامتی ایک خواب ہوتی جا رہی ہے کسی کا راز تو راز اس دور میں کسی کا جان و مال بھی محفوظ نہیں ہے۔

یہ "بدیع مجازی" "بدیع حقیقی" کے اسرار تخلیق پر واقفیت حاصل کر کے ایسی ایسی چیزیں بنانے لگا ہے جو خود اس کے لئے باعث ہلاکت ہیں ہمارے اس دور کے موجدوں کا ذہن تخریب کی طرف زیادہ ہے۔ حد ہے' سنا ہے ایسا بم ایجاد کیا گیا ہے جو صرف انسانوں کو مارے گا۔ جانوروں یا درختوں کو کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ یہ تو کتا پن ہے۔ اس دور کا انسان کتا بن گیا ہے کہ ہم جنس کا دشمن بن گیا ہے کہتے ہیں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف ایک کتا بھاگا جا رہا تھا لوگوں نے پوچھا میاں کتے اس قدر افتاں و خیزاں حیران و پریشاں کیوں بھاگے جا رہے ہو کہنے لگا بھائی بندوں کے ڈر سے۔

اس "بدیع مجازی" کو پتہ چل گیا کہ اس "البدیع" نے عالم کا خود کار نظام قائم کر رکھا ہے اور آواز' روشنی اور حرکت سی بے شعور چیزوں سے نظام کائنات چلوا رہا ہے۔ کہیں آواز سے کہیں صرف روشنی سے اور کہیں حرکت سے اور کہیں ان تینوں سے تو اس نے بھی حیرت انگیز خود کار میزائل' سیارے' جہاز اور ریلیں بنانی شروع کر دی ہیں۔ یہ ان میں سے موجد کسی بھی چیز کا نہیں ہے۔ صرف نقال یا ترکیب دہندہ ہے۔ یہ خود تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے **لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ** یہ ایک مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے اگرچہ سارے کے سارے جمع ہو کر کوشش کریں۔ یہ اگر پیدا کریں گے تو اسی "البدیع" کے پیدا کردہ مواد اور طور و طریق کے مرہون منت ہوں گے۔

سادہ لوح نوجوان حالیہ سائنس والوں کی نئی نئی ایجادات کو سن کر یا دیکھ کر ایمان کھو بیٹھتے ہیں کہ دیکھو قرآن تو کہتا ہے سارے انسان بھی مل کر ایک مکھی نہیں بنا سکتے۔ یہ تو انسان بنانے لگے ہیں جراثیم کی کاشت کرنے لگے ہیں۔ مردے کو زندہ کرنے لگے ہیں بھائی ہم مانتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے لگے ہیں مگر کس کے بنائے ہوئے قانون تخلیق کے تحت ایسا کرنے لگے ہیں۔ کس کے پیدا کردہ مواد کو جمع کر کے ایسا ویسا کرنے لگے ہیں۔ یہ سب کچھ ہیں مگر پھر بھی یہ موجد نہیں ہیں۔ موجد تو صرف وہی "البدیع" ہے جس کے بنائے ہوئے سرمائے سے یہ چیزیں بناتے ہیں اور جس کے قوانین کا مطالعہ کر کے یہ قدم اٹھاتے ہیں۔

*

"البدیع"

اگرچہ میں اسم پاک پر پہلے لکھ چکا ہوں مگر اس "مجموعۂ عجائبات" کے عجائبات چونکہ بے انتہا ہیں لہٰذا اب کچھ نئی باتیں ذہن میں آئیں۔ انہیں قلم بند کئے دیتا ہوں۔

مولیٰ تعالیٰ غیر محدود ہیں اور ہر جگہ موجود ہیں مگر پھر بھی حد بندی ہے "غیر" غیر ہی ہے اور "وہ" وہی ہیں اور وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ ایک بال برابر جگہ بھی خالی نہیں۔ لطف یہ کہ ہر جگہ موجود ہوتے ہوئے بھی کسی گندگی سے ملوث نہیں ہوتے جیسے نور کی شعاعیں کسی بھی گندگی سے ملوث نہیں ہوتیں۔

ہم لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ "ذات الٰہی" غیر محدود ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ جسے ہم نے غیر محدود کر دیا اس کی حد بندی کر دی اگرچہ محدود کے ساتھ غیر کا لفظ لگا دیا۔ بہر حال ہم ایسا اپنے اور دوسروں کے سمجھانے کے لئے کہہ دیتے ہیں وہ حدود سے بالاتر ہے نہ محدود نہ غیر محدود۔

وہ "مجموعۂ عجائبات" ہی نہیں۔ "مجموعۂ تضادات" بھی ہے۔ "قہار و جبار" ہوتے ہوئے "رحمان و رحیم" بھی ہے یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ ایک ذات بیک وقت "مجموعۂ اضداد" ہو زید ایک آن میں یا کھڑا ہو گا یا بیٹھا۔ جس آن میں کھڑا ہو گا بیٹھا نہیں ہو سکتا اور جس آن میں بیٹھا ہو گا کھڑا نہیں ہو سکتا چیز یا سیاہ ہوگی یا سپید۔ جس آن میں سیاہ ہو گی سپید نہیں ہو سکتی اور جس آن و مقام میں سپید ہو گی سیاہ نہیں ہو سکتی ہماری عقل تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک جگہ ایک آن میں "اجتماع ضدین" ہو مگر اس کی ذات ہماری عقل ہماری منطق اور ہمارے فلسفہ سے بالا تر ہے یہاں ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے اور عقل و فلسفہ کو خیر باد کہنا پڑتا ہے ہمارا علم اور ہماری عقل جس پر ہمیں ناز ہے دونوں

یہاں بالکل عاجز اور حیران ہیں۔

علم کی کیا حقیقت ہے؟ آج تک فلاسفہ اس کا فیصلہ نہیں کر سکے۔ جب ہماری علم و عقل کی یہ حالت ہے کہ وہ خود اپنی تعریف نہیں کر سکتے تو خدا کی کیسے تعریف کر سکتے ہیں جو خود اپنے آپ کو نہ پہچان سکا وہ دوسرے کو کیا پہچانے گا؟ وہ مدہوش جسے خود اپنا پتہ نہیں وہ کیسے کسی کا پتہ بتا سکتا ہے؟

یہاں علم و عقل سے کام نہیں چلتا البتہ ایمان سے کچھ روشنی ملتی ہے اسی لئے قرآن کی دوسری سورت میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ یہ کتاب "اہل ایمان" کے لئے ہے یہ نہیں فرمایا کہ یہ کتاب "اہل عقل" کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ عقل انسانی بے حقیقت ہے البتہ ایمان ایک حقیقت ہے لہٰذا ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر ایمان بھی وہ جو "عقل" کا مرہون منت نہ ہو۔ "غیب" کا مرہون منت ہو۔ ایمان کے بعد پھر علم و عقل سے کام لینے کا حکم ہے کہ ایمان کے بعد اب انہیں اپنا رہبر بنا سکتے ہو پھر **يَعْلَمُوْنَ يَعْقِلُوْنَ يَتَفَكَّرُوْنَ** کا ذکر آتا ہے کہ یہ کتاب اہل علم و عقل و فکر کے لئے ہے۔

ہم زندگی کے سارے معاملات علم و عقل ہی سے طے نہیں کرتے بلکہ تجربہ تخمین اور ظن سے بھی کرتے ہیں اور ایمان کو بھی مشعل راہ بناتے ہیں لہٰذا یہاں ایمان و یقین کو مشعل راہ بنانا چاہیئے علم و عقل کو نہیں علم و عقل کا جو بھی سہارا لے گا۔ اس میدان میں کامیاب نہ ہو گا بلکہ غلطی کھائے گا۔ کیونکہ یہ میدان علم و عقل کے گھوڑے دوڑانے کا نہیں ہے یہ ایمان و یقین کے گھوڑوں کا میدان ہے جو بہت آگے نکل گیا۔ فلاح پا گیا اور اس نے اسے پالیا۔ کم میدان طے کرنے والے نے کم اور زیادہ قطع کرنے والے نے زیادہ۔

جب کسی کو دولت ایمان نصیب ہو جاتی ہے تو اس کی چشم بصیرت وا ہو جاتی ہے اور وہ اسے ہر جگہ دیکھ لیتا ہے سورج سے بھی زیادہ روشن حالت میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ خالق و مخلوق کو علیحدہ علیحدہ دیکھ لیتا ہے اور ہر مخلوق میں خالق کو جلوہ گر دیکھتا ہے مگر بے بصیرت کو کچھ دکھائی نہیں دیتا وہ صرف مخلوق کو دیکھ پاتا

ہے خالق کو نہیں اس کی نظر مخلوق پر جا کر رک جاتی ہے۔ دیکھنے والے اسے ہر جگہ دیکھ لیتے ہیں اور نابیناؤں کو وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کسی چیز سے ملوث نہیں ہوتا اور ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کی ذات سراپا تاثیر ہے۔ "تاثر" کو قبول نہیں کرتی وہ "موثر" ہے "متاثر" نہیں۔ فاعل ہے مفعول نہیں وہ اثر کا خالق ہے تو کیسے اثر کے زیر اثر ہو سکتا ہے؟

وہ تو وہ اس کی بہت سی مخلوق ایسی ہے کہ ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی۔ ہم کچھ ایسی چیزوں کا رات دن مشاہدہ کرتے ہیں اور کچھ چیزیں ہماری نظروں سے اوجھل ہیں ایک بجلی کے کرنٹ ہی کو دیکھ لیجئے جسے انسانی ایجاد کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں من گندگی میں سے گزرتا ہے پھر بھی پاک ہی رہتا ہے۔

وہ ذات کتنی لطیف ہو گی جس نے ایسی لا تعداد چیزیں پیدا کر دی ہیں جنہیں ہم دیکھ نہیں سکتے یا مختلف شیشوں یا رنگوں کی مدد سے دیکھ سکتے ہیں اس ذات کی لطافت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک اقلیم میں بات کرتے ہیں تو دوسری اقلیم میں سنائی دیتی ہے اور اس کے حاضر و ناظر ہونے تک کیسے رسائی کی جا سکتی ہے۔ جب کہ اس کی بہت سی مخلوق ہر جگہ حاضر و ناظر ہو سکتی ہے اس کی مخلوق دور دور تک اثر انداز ہو سکتی ہے تو اس کی دسترس سے کوئی چیز کیسے باہر جا سکتی ہے؟

اَلْبَرُّ جلّ جلالہٗ

ستائیسویں پارے کے تیسرے رکوع میں ہے۔

اِنَّہٗ ھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ

بے شک وہ محسن رحم والا ہے۔

"اس محسن" کے مخلوقات پر اتنے احسانات ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے قرآن فرماتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَافِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّانَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ

اگر سرزمین کے سارے درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی اور ان سمندروں کی سات سمندر اور مدد کریں تب بھی پروردگار کی ثنا ختم نہیں ہو سکتی۔ ختم کیسے ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ قلم اور روشنائی بھی اس کے احسانات سے ہے تو قلم اور روشنائی اسپر ڈال دیں گے اور اس کی ثنا نہ لکھ سکیں گے۔

اس نے ہمارے اور جانوروں کی خدمت کے لئے درخت اور جڑی بوٹیاں پیدا کیں چونکہ یہ غلام اور خادم ہیں لہٰذا انہیں ہر وقت خدمت کے لئے اپنی جگہ پر قائم رہنا ہے انہیں چلنے پھرنے کی اجازت نہیں۔ خادم جو ٹھہرے کہ جب کوئی انسان یا حیوان ان سے استفادہ کرنا چاہے تو یہ خدمت میں کھڑے رہیں۔ مخلوق خدا میں سے کوئی انہیں کھاتا ہے۔ کوئی ان کے زیر سایہ آرام کرتا ہے تو کوئی دیگر اقسام کے فائدے حاصل کرتا ہے چونکہ یہ خادم ہیں لہٰذا ملکی سیاست جنگ و جدل جیسے افکار سے آزاد ہیں۔ انہیں بولنے کا حق نہیں چپ چاپ کھڑے رہنے کا حکم ہے۔ انہیں ماں باپ بھائی بہن دوست احباب کے فنا ہو جانے کا کوئی صدمہ لاحق نہیں ہوتا۔ نہ انہیں تدبیر مدن کی فکر۔ نہ تدبیر منزل کی۔

یہ ہر قسم کے افکار سے آزاد ہیں۔ ان کی راحت و تکلیف صرف ان تک ہی محدود ہے۔ بس اپنے وجود کی پرورش و حفاظت ان کا کام ہے۔ اگر برابر والا درخت کٹ جائے یا جل جائے تو ان کی بلا سے بلکہ یہ خوش کہ پھیلنے پھولنے کے لئے مزید جگہ ملی اور دھوپ وغیرہ میسر آئی۔ "اس محسن" کا اس مخلوق پر کتنا بڑا احسان ہے کہ یہ غم والم سے بے فکر ہیں۔ "اس محسن" نے ہمارے لئے ان گنت درختوں کی طرح ان گنت جانور پیدا کئے کسی سے ہم گوشت کسی سے دودھ اور کسی سے دیگر اشیاء حاصل کرتے ہیں کسی کو بار برداری کے کام میں لاتے ہیں اور کسی پر سواری کرتے ہیں ان خادموں کو چلنے پھرنے کی اجازت ہے بولنے کی نہیں۔ ہم کتنا ہی ظلم کریں یہ فریاد نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے انہیں دم مارنے کی اجازت نہیں۔ بس کام اور کام۔

"اس محسن" نے اس مخلوق کو ماں باپ اور عزیز و اقارب کے غم سے تقریباً بے نیاز کر رکھا ہے۔ بقدر ضرورت ماں باپ سے تعلق رہتا ہے پھر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کس سے پیدا ہوئے تھے اور ماں باپ بھی انہیں بھول جاتے ہیں۔ یہ "اس محسن" کا اس مخلوق پر کتنا بڑا احسان ہے کہ بس اپنی ذات کی فکر ہے دنیا جہاں کی نہیں۔ انہیں کھانا پینا سونا اور آرام ملنا چاہیئے اور کچھ نہیں نہ کپڑے لتے کی کوئی فکر نہ آرائش و زیبائش کی۔

جمادات افکار و آلام سے بے پروا۔ ہماری خدمت کے لئے ایک جگہ پڑے رہتے ہیں۔ اس طرح اشیائے عالم پر نظر ڈالی جائے تو "اس محسن" کے بے شمار احسانات نظر آتے ہیں۔

جمادات و نباتات و حیوانات کا اپنا اپنا عالم بڑا ہی مختصر سا ہے وہ اس کے بے شمار احسانات سے محروم ہیں اور ہم اس کے بے شمار احسانات کے ممنون ہیں اس نے ہمیں نطق و عقل عطا کر کے سب کا سردار بنا دیا ہے اور طرح طرح کے حواس و مدارک عطا فرمائے۔

کبھی صرف اپنے سر کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے بے شمار احسانات کو دیکھ کر سر بسجود ہو جاتا ہوں اس ذرا سے دماغ میں اس نے کتنی بڑی کائنات سمو

دی ہے کروڑوں خلیے بھیجے کے اندر ہیں جو طرح طرح کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔

اس نے کیسی پرکاری سے کانوں کے سوراخ ٹیڑھے میڑھے بنائے ہیں کہ ہر چیز داخل بھی نہ ہو سکے اور جو چیز داخل ہو گئی ہے اور اسے وہاں رہنا چاہیئے وہ وہاں رہ سکے۔

چونکہ جانور اپنے کان صاف نہیں کر سکتے لہٰذا اس نے ان کے کانوں پر بے شمار بال اگادیئے ہیں جو گردوغبار کو اندر جانے نہیں دیتے اور کیڑے مکوڑوں کو داخل نہیں ہونے دیتے مرغیوں بطخوں اور پرندوں کے کانوں کو بالکل ہی بند کر دیا ہے کہ گردوغبار وغیرہ سے محفوظ رہیں کانوں کے اندر ایسی رطوبت رکھ دی ہے کہ کیڑے اس کی تلخی سے اندر گھسنے سے باز رہتے ہیں اس طرح اس نے سماعت کے پٹھے کی حفاظت کا پورا پورا سامان پیدا کر دیا ہے ورنہ انسان اور حیوان بڑی جلدی بہرے ہو جایا کرتے۔

اس نے سات پردوں سے آنکھوں کے نور کی حفاظت کی ہے آنکھ جو جسم کا سب سے نازک عضو ہے اسے ایک گڑھے میں جڑ دیا ہے اس کے اوپر ایک قوس اور ناک کی ہڈی قائم کر دی ہے پلکیں اور پپوٹے اتنے حساس بنائے ہیں کہ ذرا غیر چیز سامنے آئی اور وہ بند ہوئے۔ شکاری جانوروں کی آنکھیں ذرا اور زیادہ گڑھے میں رکھی ہیں کہ شکار انہیں گزند نہ پہنچا سکے دماغ میں ایک بجلی گھر بنا دیا ہے جو ہر وقت بیٹری پیدا کرتا رہتا ہے۔

ناک کے سوراخ کو کج مج بنایا ہے اور گردوغبار سے حفاظت کے لئے اس کے اندر بال پیدا کر دیئے ہیں تاکہ ہوا فلٹر ہو کر اندر جائے اور انسان و حیوان نزلہ و زکام سے محفوظ رہیں پھر ایک ایسی رطوبت پیدا کر دی ہے کہ کیڑے مکوڑے اندر نہ جا سکیں اس طرح "اس محسن" نے عصبۂ شامہ کی پوری پوری حفاظت کی ہے۔

حلق میں کھڑکیاں لگا دی ہیں کہ کھانے پینے کی چیز اپنی راہ لے اور سانس اپنی راہ پر چلے حلق کے سوراخ کی طرح اس نے معدے کو بھی ٹیڑھا میڑھا بنایا

ہے تاکہ غذا اس میں محفوظ رہے اور آسانی سے باہر نہ نکل سکے اسی طرح بول و براز (پیشاب، پاخانہ) کے سوراخ کج مج بنائے ہیں کہ غیر اندر نہ آسکے اور جو فضلہ نکلنا ہے آسانی سے نکل سکے انسان و حیوان پر یہ اس کے کتنے عظیم احسانات ہیں۔

ان گنت جراثیم رگوں کے اندر رات دن بغیر تھکے اور آرام کئے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہتے ہیں جہاں کہیں انھوں نے دیکھا کہ مضر جراثیم خون کے ساتھ آرہے ہیں اور انہوں نے جھٹ پٹ انہیں چٹ کیا۔ جہاں رگوں نے دیکھا کہ فاسد مادہ خون میں آرہا ہے اپنی دیواروں سے انہیں نگل لیا۔

میرا دماغ کیا ہے ایک اچھا خاصا عجائب گھر ہے جو کچھ دیکھتا ہوں "حس مشترک" میں چھپ جاتا ہے پھر جسے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں وہ "حافظہ" کے خانہ میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ "قوت خیال" میں کچھ "قوت واہمہ" میں اور کچھ "قوت مدرکہ" میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

بھیجے کی تجاویف (خالی جگھوں) ہیں اس نے کیا کیا قوتیں بھر دی ہیں جنہیں ہر انسان و حیوان بوقت ضرورت کام میں لے آتا ہے اور سارے کام ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں طے پا جاتے ہیں جن سے ڈرنا اور بچنا ہوتا ہے "قوت واہمہ" اس کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے "قوت خیالیہ" اپنا کام انجام دیتی ہے اور "قوت حافظہ" اپنا پھر جو بات سوچ بچار سے تعلق رکھتی ہے "قوت مدرکہ" اس پر غور کرتی ہے۔

ذرا ذرا سے پٹھے کیسے کیسے بڑے بڑے کام انجام دیتے ہیں ذرا جسم کو تکلیف پہنچی اور اس نے درد کا احساس کیا اور ایک دوسرے پٹھے نے حکم دے دیا کہ اسے دفع کر دیا جائے دماغ سے ایک سیکنڈ میں طرح طرح کے احکامات صادر ہوتے رہتے ہیں اب پیشاب کرنا ہے اب پاخانہ کرنا ہے اب کھانا ہے، اب پینا ہے، اب آرام کرنا ہے، اب سونا ہے، اب جاگنا ہے اور نہ جانے کیا کیا احکامات ہضم و صحت کے متعلق چلتے رہتے ہیں۔

بھیجے کی بال سے باریک رگیں اور ذرا ذرا سی تجاویف کیسے عظیم کام انجام

دیتی ہیں اور ہمارے دشمنوں کو بڑی چابک دستی سے ہلاک کر دیتی ہیں اپنی آنکھوں کی بال سے باریک رگوں کو ہی دیکھ لیجئے سپلائی صفائی وغیرہ کا کام کس خوبی سے کرتی ہیں کونے میل کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ انسان اس میل کو اپنے ہاتھوں سے صاف کر لیتا ہے۔ اور جانوروں کی آنکھوں کا میل کوے اور گرسل (مینا کی قسم کا زرد چونچ والا پرندہ) وغیرہ صاف کر دیتے ہیں۔

"اس محسن" کا سب سے بڑا احسان زندگی ہے جو نباتات جمادات حیوانات اور انسانوں کو دی اور پھر ہمیں ایک اور بڑے احسان سے نوازا یعنی ہمیں عقل عطا کی عقل نے طرح طرح کی خواہشات افکار اور مسرت و آلام پیدا کر کے زندگی کو رنگین بنا دیا اگر وہ محسن ہمیں عقل نہ دیتا تو ہم بھی ایک قسم کے جانور ہوتے چنانچہ جب وہ کسی انسان کی عقل سلب کر لیتا ہے تو وہ حیوانوں جیسا ہو جاتا ہے اس کا یہ لطیف عطیہ اس قدر طاقتور ہے کہ کئی کئی ٹن کے جہاز فضا میں اڑا دیتا ہے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالتا ہے اس کے عجیب و غریب مظاہر ہم رات دن دیکھتے ہیں اور وہ ہمارے دماغ میں کس جگہ ہے؟ معلوم نہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اسکی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا گو اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی طرف ہم اپنی انگلیوں سے اشارہ کر سکتے ہیں اور انہیں چھو سکتے ہیں۔

فلاسفہ کہتے ہیں عقل دماغ میں ہوتی ہے صوفیہؒ کہتے ہیں عقل دل میں ہوتی ہے بظاہر تو فلاسفہ کا خیال ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم دماغ ہی سے سوچتے ہیں صوفیہ چونکہ دل کی طرف زیادہ متوجہ رہے تو انہوں نے خیال کیا کہ دل میں عقل ہوتی ہے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ دل کو بھی سوچ بچار میں بڑا دخل ہے اس لئے صوفیہؒ کی بات کچھ غلط معلوم نہیں ہوتی مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ عقل نہ دماغ میں ہوتی ہے نہ دل میں ہوتی ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان کوئی مقام ہے جہاں اس کا بسیرا ہے دل سے ہماری مراد یہ مضغۂ گوشت نہیں ہے بلکہ حقیقت قلبیہ مراد ہے جو دراصل دل ہے سوچ سمجھ کا تعلق ظاہر ہے کہ دماغ سے ہے یہ "قوت مدرکہ" کا کام ہے جو یقیناً دماغ میں ہے مگر "قوت عاقلہ" "اس لامکانی" کی طرح لامکانی ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

البصیر جل جلالہ

اگر ایک طباق میں ہمارے سامنے چاول دھرے ہوں تو ہم ایک نظر میں ان سب کو دیکھ لیتے ہیں پھر ان میں سے جس چاول کو چاہیں اٹھالیں جسے چاہیں ادھر سے ادھر رکھ دیں اور جسے چاہیں مسل دیں بالکل اسی طرح یہ سارا عالم اللہ کی نظروں کے سامنے ھے جسے چاہے اٹھالیتا ھے جسے چاہے ادھر سے ادھر رکھ دیتا ہے اور جسے چاہے تڑوڑ مڑوڑ دیتا ہے جیسے ہمارے لئے یہ کام آسان ہے اس کیلئے وہ ہے۔ وہ کیسے دیکھتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے ہمیں معلوم نہیں بہر حال وہ بصیر ضرور ہے اگر بصیر نہ ہوتا توصاحب بصارت مخلوق کس نے پیدا کی اور قسم قسم کی بصارتیں کہاں سے آئیں کہ کوئی میلوں دور سے دیکھ سکتا ہے تو کوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے اور کوئی صرف رات میں دیکھ سکتا ہے دن میں نہیں کسی کے لئے شب و روز برابر ہیں۔ کسی کی بینائی ایک حد تک کام دیتی ہے تو کوئی صرف قریب کی چیزیں ہی دیکھ سکتا ہے۔ کوئی قریب نظری کا شکار ہے تو کوئی بعید نظری کا۔

یہ اختلاف نظرو بصر کس نے پیدا کیۓ اور یہ طرح طرح کی آنکھیں کس نے بنائیں انسانوں کی آنکھیں اور طرح کی ہیں جانوروں کی اور طرح کی درختوں کی اور طرح کی یہ درخت بھی دیکھتے ہیں دیکھو ان کے سامنے کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو یہ اپنی شاخ یا بیل کا رخ بدل دیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں تب ہی تو ایسا کرتے ہیں فرشتوں کی آنکھیں اور طرح کی ہیں تو جنات کی اور طرح کی! ہمیں معلوم نہیں کہ نباتات و جنات و ملائکہ کی آنکھیں کیسی ہیں ہم اگر ان کی آنکھوں اور بینائی کی ساخت سے ناآشنا ہیں تو کوئی جائے تعجب نہیں۔

خود حضرت انسان کی آنکھیں بھی طرح طرح کی ہیں کسی ملک کے باشندوں کی آنکھیں ابھری ہوئی کسی کی گڑھے میں دھنسی ہوئی کسی کا گوشۂ چشم

تنگ ہے کہ عجیب لطف دیتا ہے اس لئے ہمارے فارسی شعراء نے تنگی چشم کے مضامین باندھے ہیں اور ترکان تنگ چشم کو پسند کیا ہے چینیوں کی آنکھیں دیکھو بعض کی آنکھیں تو ایسی ہوتی ہیں۔ جیسے بلیڈ سے شگاف مار دیا ہو۔ حسینان چین کی ایسی آنکھ پسند کی جاتی ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کی پتلیاں کالی سیاہ کسی کی بھوری اور کسی کی نیلی پھر ہر ایک کے ڈھب نرالے ہیں کہ عشاق دل نچھاور کرنا چاہتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کی آنکھیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ زنانہ و مردانہ آنکھ میں قدرت نے خفیف سا فرق رکھا ہے۔

ہر آنکھ سونے کی محتاج ہے مگر اس کی ذات نیند اور اونگھ سے بری ہے وہ تو وہ اس کی بیشتر مخلوق **لَاتَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَانَوْمٌ** کا مرقع ہے جیسے چیونٹیاں اور مچھلیاں وغیرہ۔ وہ کبھی نہیں سوتا لہٰذا اس کی آنکھ سے کوئی چیز کسی وقت اوجھل نہیں ہو سکتی۔

؎ آنکھوں والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے ۔۔۔ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

آنکھوں کی دنیا اور آنکھوں کی قسمیں اس قدر ہیں کہ بیان میں نہیں سما سکتیں۔ بعض مخلوق بے چشم ہے وہ کانوں یا پنکھوں وغیرہ سے دیکھتی ہیں بچھو اپنی سماعت سے بصارت کا کام لیتا ہے جیسے سانپ بصارت سے سماعت کا کام نکالتا ہے بہت سے حشرات الارض اپنے سر کے دو زائدوں سے بصارت کا کام لیتے ہیں جو مختلف طرح کے ہیں۔ میں نے دو نابینا ایسے دیکھے جو اپنے ہاتھوں سے دیکھتے تھے اور چھو کر رنگ کی پہچان کر لیتے تھے۔ اپنی جیبی گھڑیوں سے وقت دیکھ لیتے تھے جس پر آئینہ چڑھا ہوتا تھا۔

جس نے ایسی بصارتیں پیدا کر دیں جو سمندر کی تہہ میں بھی دیکھ سکتی ہیں اور طبقات الارض میں بھی تو اس سے کوئی چیز کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے ہدہد ذرا سا جانور معلوم کر لیتا ہے کہ کس زمین کی تہہ میں پانی ہے اور کس میں نہیں تب ہی سلیمان علیہ السلام کو اس کی ضرورت پڑی تھی کیونکہ فوج پیاسی تھی اور پانی ملتا نہ تھا۔ مٹی کی منوں تہیں اس کی بصارت سے مانع نہیں ہوتیں۔

ایک تو یہ بصارت ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا جو آلات کی اور دوسری اشیاء کی محتاج ہے مگر اس نے ایک اور بصارت بھی پیدا کی ہے جو ان چیزوں سے بے نیاز ہے اور زمان و مکان کی پابند نہیں یعنی بصیرت جسے دل کی بصارت کہنا چاہیئے اس کا آنکھوں یا دماغ سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ دل کی آنکھ کی روشنی ہے جو پاکیزہ دل والوں کو ملتی ہے ایران میں غازیان اسلام لڑ رہے تھے انہیں معلوم نہ تھا کہ دشمن پہاڑ کے پیچھے سے آ رہا ہے مگر حضرت عمر بن الخطاب مدینہ میں یہ دیکھ پائے کہ دشمنان اسلام کدھر سے یلغار کرنے والے ہیں لہٰذا دوران خطبہ جمعہ چیخ کر کہا **یا ساریتہ الجبل** کہاں مدینہ کہاں فارس دیکھ بھی لیا اور آواز بھی پہنچا دی۔ زمانہ کفر میں حضرت عمرؓ کا ایک دوست تھا وہ آپ کے دور میں ایسا ہی ہو گا آپ سے بے تکلفی تھی پوچھا اے عمر میں تو اتنی دور نہیں دیکھ سکتا تمہاری نظر کب سے اتنی تیز ہو گئی ہے؟ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے! قرآن میں اس کو حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے **وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا** ○ جسے حکمت ملی اسے بڑی دولت مل گئی۔ بہر حال اپنی تو ایک زمانے میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی کام میں کامیابی یا ناکامی کا علم اس کے شروع کرنے سے پہلے ہو جاتا تھا۔ کسی دوست سے ملنے کا ارادہ کیا گھر سے قدم نکالا تو پتہ چل گیا کہ نہیں ملے گا تو میں بڑا تنگ آ گیا تھا کیونکہ نہ غم رہا تھا نہ خوشی خوشی۔ زندگی بے لطف سی ہو گئی تھی زندگی کا مزا اسی میں ہے کہ ہمیں ہونے والی باتوں کا پتہ ہی نہ چلے اور کوشش کا مزا ہی جب ہے کہ انجام معلوم نہ ہو پردہ غیب اور حجاب ہی میں لطف ہے۔

غزوہ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کدال چلاتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ ایران و روم فتح ہو جائیں گے میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ کام بصارت کا نہ تھا بصیرت ہی کا تھا۔ منافقوں نے مذاق اڑایا کہ بھوکے پیٹ چٹان پر تو کدال مار رہے ہیں اور روم و ایران کے فتح کی باتیں کر رہے ہیں؟ کیونکہ وہ ناآشنائے بصیرت تھے ان کے نزدیک یہی بصارت سب کچھ تھی جس کے ذریعہ وہ سب کچھ دیکھتے تھے گو آج تک کسی نے بصارت کو بھی نہیں دیکھا کیسی عجیب بات

ہے جس سے ہم سب کچھ دیکھتے ہیں ہم نے آج تک خود اس کو نہیں دیکھا۔

کیا طرفہ تماشا ہے کہ مانند نگاہ   آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے مستور ہے تو

میں کئی ایک ایسے اولیاء اللہ سے ملا ہوں کہ ان سے ماضی و مستقبل کے بارے میں جو کچھ بھی پوچھا جاتا تھا وہ بتا دیتے تھے۔ ان میں سے ایک میڈھوشاہ تھے جو علی گڑھ میں اللہ تعالیٰ نے انگریزی داں کافروں کی ہدایت کے لئے وہاں پیدا کئے تھے اور بڑے بڑے پروفیسر اور طالبعلم ان سے باتیں دریافت کر کے حیران رہ جاتے تھے میڈھو شاہؒ بالکل ان پڑھ اور مادر زاد ولی تھے۔ میں ان پر کئی مضمون لکھ چکا ہوں۔

بصیرت کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں اگر لاکھوں فلسفی اور ماہرین نفسیات یہ کہیں کہ اس کا تعلق عقل سے ہے قلب سے نہیں تو میں ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کروں گا میں نے اچھی طرح محسوس کیا کہ بصیرت کا دماغ یا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کا تعلق تو دل سے ہے شاید اسی لئے صوفیہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ عقل دماغ میں نہیں دل میں ہوتی ہے مجھے ان کے اس قول سے اگرچہ اختلاف ہے مگر یہ بات ضروری ہے کہ بصیرت کا تعلق دل سے ہے۔ میں جس زمانے میں دیوبند میں پڑھا کرتا تھا چونکہ مجھے مذہبیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے کہ میں منطق و فلسفہ کا دل دادہ تھا تو خیالی کے سبق میں پڑھا کہ صوفیہؒ کہتے ہیں عقل دل میں ہوتی ہے اور فلاسفہ کہتے ہیں کہ دماغ میں تو میں نے صوفیہؒ کو بہت برا بھلا کہا کہ یہ ہمیشہ الٹی بات کہتے ہیں   اصل یہ لوگ صاحب بصیرت تھے اس لئے   ایسا کہنے پر مجبور ہوتے۔ میری بیوی اور چھوٹی سالی سدا کی بیمار تھیں بڑی سالی تندرست تھی خوب کھاتی پیتی تھی میں سوچا کرتا تھا اپنی بہنوں میں یہ خوب تندرست ہے ہم سب ایک جگہ رہتے تھے ایک دفعہ خیال آیا کہ یہ عنقریب مرجائے گی وہ بالکل تندرست تھی اور عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی کچھ دنوں کے بعد پیٹ میں کینسر ہو گیا اور وہ تین ماہ کے اندر اندر مرگئی میں راستے دیکھا کرتا تو دل میں سوچا کرتا دیکھو مردہ کھا رہا ہے مردہ ہنس رہا

ہے مردہ چل پھر رہا ہے مگر یہ بات کسی سے کہہ نہ سکتا تھا کہ پہلے سے گھر والوں کو کیوں غمگین کروں؟ زندگی کا مزا غیب ہی میں ہے یہ جو کہتے ہیں کہ "جن پر اسرار الٰہی کھلتے ہیں وہ گونگے ہو جاتے ہیں" اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتے یا انہیں حکم ہوتا ہے کہ نہ کہیں یا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر اسرار کا انکشاف کریں گے تو انکشاف بند ہو جائے گا اور درحقیقت ایسا ہی ہے کہ اسرار کے واشگاف کر دینے سے سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو پردہ غیب میں رکھنا چاہتے ہیں دیکھتے نہیں ہو فطرت اپنے اسرار بتانے میں بے حد بخیل ہے برسوں فلسفی سر مارتے رہتے ہیں تب کہیں جا کر تھوڑا سا بھید کھلتا ہے میری بیوی مری تو سلسلہ ملاقات جاری رہا ایک دوست تعزیت کرنے لگا چونکہ اس سے روحانیات پر گفتگو چھڑ گئی میں نے کہا میری بیوی میرے لئے تو نہیں مری اوروں کے لئے البتہ مر گئی ہے کیونکہ ہماری ان کی ملاقات ہوتی رہتی ہے بس اسی دن سے یہ سلسلہ بند ہو گیا اگر اللہ تعالیٰ سارے اسرار کھول دیتے تو زمین پر ایک بھی کافر نہ ہوتا اور یہ اختلافات اور چہل پہل قتل وغارت اور جرم و سزا کی داستانیں نہ ہوتیں۔ **فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِى الْاَبْصَارِ**

*

اَلتَّوَّابُ عزجلالہ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں متعدد جگہ آیا ہے اس کا مصدر اور اس کے مشتقات بھی متعدد جگہ آئے ہیں (التواب - تواباً" - توابین - توب - توبتھم - تاب - توبو اور توبہ) کئی جگہ آئے ہیں۔

پہلے پارے کے چوتھے رکوع میں ہے ترجمہ آدمؑ نے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے تو اس کی توبہ قبول کرلی وہ توبہ قبول کرنے والا رحم والا ہے۔

وہ الفاظ کیا تھے جن کی برکت سے توبہ قبول کی گئی اقرارِ جرم' اقرار ظلم نفس' رجوع الی اللہ اور استغفار وغیرہ۔ سو یہی توبہ کا طریقہ اولاد آدمؑ کے لئے ہے۔

اسی پارے کے چھٹے رکوع میں قوم موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے (ترجمہ) اپنے نفوس کو مارو تمہارے لئے یہ بہتر ہے تمہارے پروردگار کے نزدیک وہ تمہاری توبہ کو قبول کرے گا۔ وہ درگزر کرنے والا مہربان ہے

اسی پارے کے سولھویں رکوع میں بزبان حضرت ابراہیم علیہ السلام آیا ہے (ترجمہ)ہماری توبہ قبول کرلے ۔بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

یہ آیت اس واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جبکہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا مگر پھر بھی توبہ کر رہے ہیں معلوم ہوا توبہ و استغفار بغیر گناہ کئے بھی زیب دیتا ہے۔

دوسرے پارے کے تیسرے رکوع میں ہے ترجمہ میں ان کی توبہ کو قبول کرتا ہوں میں توبہ قبول کرنے والا رحم و کرم والا ہوں۔

اس سے پہلے ہے **اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَیَّنُوۡا** ۝ مگر وہ جنھوں نے توبہ کی اپنی اصلاح کی اور راہِ ہدایت دیکھی۔ معلوم ہوا توبہ جب قبول ہوتی ہے کہ

انسان اپنے آپ کو بدل دے اور راہ رشد و ہدایت اختیار کرے۔
گیارہویں پارے کے تیسرے رکوع میں ہے (ترجمہ) پھر ان کی توبہ قبول کی تا کہ وہ رجوع ہوں بے شک اللہ تواب و رحیم ہے۔
معلوم ہوا قبولیت توبہ سے رجوع الی اللہ میسر آتا ہے اور انسان گناہ سے باز رہتا ہے۔یہ آیت ان تین اصحابؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو غزوۂ تبوک میں سستی و کاہلی کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے تھے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم جہاد سے واپس تشریف لائے تو یہ تینوں حاضر خدمت ہوئے آپ نے عدم شرکت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اپنے قصور کا اقرار کیا اور اللہ تعالی نے ان کی توبہ قبول کی۔
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (ترجمہ) اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی سے برائی کر بیٹھتے ہیں۔
یعنی نادانی و لاعلمی سے برا کام کر بیٹھتے ہیں تو اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس آیت شریفہ کا یہ مطلب وہ ہے جو ہمارے علماء مترجمین و مفسرین بیان کرتے چلے آتے ہیں مگر میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کیونکہ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اگر ہم بہ قصد و ارادہ' جان بوجھ کر گناہ کرتے ہیں تو اس کے لئے توبہ نہیں ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے نادانی و لاعلمی سے گناہ پر کوئی گرفت نہیں۔ مجنوں پر کوئی گرفت نہیں خواہ وہ کسی کو قتل ہی کر دے۔ اگر حیوان اپنے مالک کو مار ڈالے تو اس پر کوئی گرفت نہیں کیونکہ وہ نادان و بے علم ہے گرفت تو علم پر ہے۔
جہالت کے دو معنی ہیں ایک تو یہی مشہور معنی یعنی علم کی ضد اور ایک معنی کے اعتبار سے جہالت حلم کی ضد ہے علم کی نہیں یعنی جسے نادانی و لاعلمی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ جسے "سبک سری" یا "کمزوری طبع" وغیرہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے چنانچہ حماسی کہتا ہے (وبعض الحلم عند الجهل للذلة اذعان) بعض وقت بردباری' سبک سری کے مقام پر ذلت کے آگے جھک جانا ہے۔
شاعر نے اس شعر میں جہل کو حلم کا مقابل قرار دیا ہے علم کا یہاں کوئی

تعلق نہیں تو میرے خیال میں یہاں اللہ تعالیٰ نے جہالت کو حلم کی ضد کے طور پر استعمال کیا ہے یعنی جو لوگ "عدم متانت" و "سبک سری" و "ضعف طبع" سے گناہ کر بیٹھتے ہیں میں ان کی توبہ کو قبول کر لیتا ہوں۔

اگر اس آیت کے یہ معنی لئے جائیں تو بات بڑی لطیف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں نے ابن آدم کے خمیر میں شرارت کا جزو شامل کیا ہے لہٰذا یہ ضرور شرارت کرے گا شرارت کرنے سے باز نہیں آئے گا تو چونکہ میں نے اس کے کالبد میں شرارت کو داخل کیا ہے لہٰذا اس کا یہ حق ہے کہ وہ بخشا جائے۔

اللہ تعالیٰ بندوں کا بڑا ہی پاس لحاظ رکھتے ہیں۔ اس نے مخلوق کو پیدا کیا اور اسے بھوکا بنایا تو رزق کی ذمہ داری اپنے اوپر لی چنانچہ فرماتے ہیں۔(ترجمہ) سطح زمین پر جو بھی جانور ہے اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کا رزق ہے۔ دیکھئے تخلیق کے ساتھ ہی ترزیق شروع ہو جاتی ہے ہر نو پید کو اس کی طبیعت کے مطابق رزق پہنچایا جاتا ہے رحم مادر اور بیضہ وغیرہ میں حسب حالات نومولود کو رزق پہنچنا شروع ہو جاتا ہے شکم مادر میں خون انڈے میں رطوبت اور دوسرے اطوارِ تخلیق میں ان کے مطابق آنے والے کو رزق پہنچتا رہتا ہے تو یہ بات اس آیت کی بالکل آئینہ دار ہو جاتی ہے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے اسی طرح توبہ کی قبولیت کی ذمہ داری اسی پر ہے بتایئے اگر وہ اس کی ذمہ داری نہ لیتا تو ہم کہاں جاتے وہ الحق ہے اور حق و انصاف اس کا خاصہ ہے بقول شاعر

نہ ہوتا گر تری رحمت کا سایہ ہم کہاں جاتے؟

شاید کہیں حدیث شریف میں پڑھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پرانے زمانے میں ایک شخص بڑا گنہگار تھا اللہ نے اسے نیکی کی توفیق دی تو ایک عابد زاہد راہب کے پاس گیا اور کہا میں نے ننانوے قتل کئے ہیں کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے اس نے کہا نہیں تو اس نے اس راہب کو قتل کر دیا اور ایک دوسرے راہب کے پاس پہنچا اور اس سے کہا میں نے سو قتل کئے ہیں کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے کہا کیوں نہیں تو فلاں بستی کی طرف چلا جا وہاں

کے لوگ نیک ہیں وہاں رہنے لگ۔ توبہ کر اور عبادت کر خدا بخش دے گا وہ خوشی خوشی وہاں سے اس بستی کی طرف روانہ ہوا اور راہ میں مرگیا تو دوزخ والے فرشتوں نے کہا ہم اسے دوزخ میں لے جائیں گے اور جنت والے فرشتوں نے کہا ہم اسے جنت میں لے جائیں گے دونوں فریقوں میں اختلاف ہوا تو طے پایا کہ اگر یہ اپنی بستی سے قریب ہے تو دوزخ والے اس کے حق دار ہوں گے اور اگر نیکوں کی بستی سے قریب ہے جہاں یہ جانا چاہتا تھا تو جنت والے اس کے حقدار ہوں گے چنانچہ زمین ناپی گئی تو وہ نیکوں کی بستی سے کچھ قریب نکلا لہٰذا جنت کے فرشتے اسے جنت میں لے گئے"۔(او کما قال)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ در توبہ ہر وقت باز رہتا ہے مگر قبولیت کے کچھ شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ صدق دل سے ہو صرف زبان سے "توبہ توبہ" کہنے سے کام نہیں بنتا جیسے ہم لوگ خالی دل کے ساتھ زبان سے توبہ توبہ کرتے رہتے ہیں دوسرے یہ کہ عزم بالجزم ہو کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے اگر یہ نہیں ہے تب بھی توبہ بے کار ہے تیسرے یہ کہ آئندہ ایسا نہ کرے اگر پھر ویسا ہی کیا تو توبہ ٹوٹ گئی۔

توبہ کی قبولیت کی یہ علامت ہے کہ توبہ کرنے کے بعد انسان کی حالت پہلی جیسی نہیں رہتی اگر حسب سابق ہے تو سمجھ لو کہ توبہ مقبول نہیں ہوئی سچی توبہ کو **توبتہ النصوح** کہتے ہیں ڈپٹی نذیر احمد کی ایک کتاب کا نام توبتہ النصوح ہے بڑی اچھی کتاب ہے اپنے بچوں کو پڑھانی چاہیئے۔

باز آ باز آ از آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نامیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

تم جو کچھ بھی ہو اس سے باز آ جاو خواہ کافر آتش پرست یا بت پرست ہو یہ ہماری بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے سو بار بھی توبہ توڑ دی ہو تو پھر بھی باز آ جاؤ ارشاد خداوندی ہے(ترجمہ)

بے شک اللہ توبہ کرنیوالوں اور پاک بازوں کو پسند کرتا ہے۔

الجامع جل جلالہ

یہ اسم پاک بطور اسم صفت کے قرآن شریف میں دو جگہ آیا ہے چنانچہ پارہ سوم رکوع نہم میں ہے **رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْہِ** اے پروردگار تو لوگوں کو جمع کر دے گا اس دن جس میں کوئی شک نہیں۔ پارہ پنجم کے سترھویں رکوع میں ہے **اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَھَنَّمَ جَمِیْعًا** اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کر دے گا پارہ اٹھارہ رکوع پندرہ میں ہے **عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا** مگر یہاں بطور اسم صفت ربانی استعمال نہیں ہوا امر کو جامع کہا گیا ہے۔ اس جامع کا کمال جامعیت دیکھئے کہ اس نے مختلف اضداد کو یعنی آگ ہوا پانی اور مٹی کو انسانوں اور حیوانوں کے جسموں میں اس خوبی سے جمع کر دیا ہے کہ سب کے سب ایک ساتھ مل کر رگوں میں دوڑتے ہیں اور سب بھائی بندوں کی طرح مل کر اجسام کی تعمیر کرتے ہیں۔

مناطقہ کہتے ہیں اجتماع ضدین محال ہے مگر یہاں چار بلکہ کئی اضداد اجسام میں جمع ہیں یہ اس کی کمال جامعیت کی دلیل ہے انسان چونکہ خلیفۂ ارض ہے اس لئے اس نے اس "الجامع" کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کر کے آگ ہوا اور پانی کو ایک جگہ جمع کر کے طرح طرح کی مشینیں بنادی ہیں وہ ہواؤں اور سمندروں میں دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔

اسی طرح وہ ایک دن کافروں اور مومنوں سب کو ایک میدان میں جمع کر دے گا اور پھر کسی کو جہنم رسید کرے گا اور کسی کو بہشت کا مکیں بنا دے گا۔

اس "جامع" نے مختلف اضداد کو جمع کر کے تعمیر کائنات ایسی خوبی سے کی ہے کہ اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا خیر و شر کو ملا کر رونق عالم کو دوبالا کر دیا ہے سیاہ و سپید کو یک جا کر کے دنیا کو رنگین بنا دیا ہے اس بات کو پیش نظر رکھ

کر اگر کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب عجیب تماشا ہائے قدرت سامنے آئیں گے اور بہت سے اسرار الٰہی واشگاف ہوں گے۔

اس نے شکم زمین میں پانی اور آگ کو جمع کر کے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ مختلف قسم کے تخموں کو بطن ارض میں دبا کر طرح طرح کے پھل اور پھول پیدا کئے ہیں اور بھانت بھانت کے خود رو پودے پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک ہی زمین گندم اگاتی ہے تو وہی زمین جو پیدا کرتی ہے اسی سے کپاس کے پودے پھوٹتے ہیں اور چنے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ شریروں اور نیکوں کو یک جا کر کے بستیوں اور شہروں میں گہما گہمی پیدا کر دی ہے شر اور خیر کے آپس میں ٹکراؤ سے کبھی شر پیدا ہوتا ہے اور کبھی کوئی عمدہ خیر۔ فضائے آسمانی میں بھی متغائیر کواکب کو جمع کر دیا ہے اس طرح کہ وہ آپس میں ٹکراتے نہیں اپنی اپنی راہ چلتے ہیں اگرچہ ان کی تاثیریں متضاد و مختلف ہیں مگر پھر بھی ان ہی سے نظام سماوی و ارضی قائم ہے۔

نظام سماوی و ارضی کواکب سے قائم ہے **وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ** ہم نے آسمان وزمین کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے۔ یہ ستارے چمکیے چمکیے بڑے بڑے کام اپنی روشنیوں سے انجام دیتے رہتے ہیں ان ہی کے اثرات سے ہماری پیداوار ہے اور انہی کے اثرات سے وبا قحط جنگ اور صلح و خیر آتی ہے۔

اس نے جنگلوں میں متضاد جانور جمع کر کے وہاں بھی گہما گہمی پیدا کر دی ہے کوئی نباتات خور ہے کوئی گوشت خور کوئی نازک کوئی جبار کوئی دوڑتا ہے کوئی اڑتا ہے کوئی اچھلتا کودتا ہے کوئی رینگتا ہے کوئی ست رفتار ہے کوئی تیز رفتار کوئی گونگا کوئی بولنے اور چہچہانے والا کوئی سطح ارض پر رہنا پسند کرتا ہے کوئی قعر دریا میں اور کوئی زیر زمین اپنا نشیمن بنائے ہوئے۔ رونق عالم متضاد اشیاء کے اجتماع سے ہے۔

اس ”الجامع“ نے میرے گھر میں مختلف اضداد کو بڑی خوبی سے جمع کر رکھا ہے اور سب ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں پل بڑھ رہے ہیں اور پروان

چڑھ رہے ہیں میرے مکان کی چھت میں چڑیا کے بچے چوں چوں کر رہے ہیں بلی کے بچے میری کوٹھڑی میں میاؤں میاؤں کر رہے ہیں۔ بلوں میں چوہے رہ رہے ہیں چھپکلیاں پھر رہی ہیں ذرا بلی کے ہاتھ لگ جائیں پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے بچھو اور سانپ آباد ہیں اگر مجھے ڈس لیں تو میں بے تاب ہو جاؤں یا مر جاؤں۔ سینکڑوں لال بیگ گھر کی نالیوں میں بھرے پڑے ہیں اگر چھپکلی کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ انہیں ہڑپ کر لے اس طرح کے رنگ رنگ کے متضاد و معاند حشرات الارض سے گھر بھرا پڑا ہے۔ پھر میرے گھر کے افراد متضاد طبائع کے مالک ہیں کوئی خاموشی پسند ہے تو کوئی بلاوجہ باتیں کرنا پسند کرتا ہے کوئی حلیم ہے تو کوئی غصہ ور کوئی مذکر ہے تو کوئی مؤنث اس طرح کے متضاد افراد سے مل کر گھر کا ایک مناسب مزاج بن گیا ہے بچے بوڑھے اور جوان ہر ایک' ایک متضاد مزاج رکھتا ہے پھر بھی نظام خانہ قائم ہے مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ یہی حال ساری کائنات کا ہے۔

*

الجبار جل جلالہ

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ زمین متحرک ہے یا ساکن مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کی حرکت یا سکون جبری ہے اور کسی "الجبار" نے اسے اس کی حالت وضعی پر مجبور کر دیا ہے سورج متحرک ہو یا ساکن ہمیں اس سے سروکار نہیں مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کی حرکت یا سکون کسی "الجبار" کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا چاند خواہ متحرک ہو یا ساکن ایک شکنجے میں جکڑا ہوا ہے کہ اس سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا یہی حال سارے سیاروں یا غیر سیاروں کا ہے کہ اپنی وضع نہیں بدل سکتے اور اگر بدلتے ہیں تو جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں گویا ان کے جرم کی سزا ہے کہ اپنی حد سے تجاوز کیوں کیا؟

افلاک پر سخت قدغن لگی ہوئی ہے وہ ایک دوسرے کے اندر نہیں گھس سکتے اور متعینہ حد سے آگے متموج نہیں ہو سکتے افلاک میں جو عظیم جثے بغیر کسی سہارے کے تیرتے ہیں اس "الجبار" کے جبر کی گواہی دیتے ہیں۔

میں نہ جبریہ فرقے سے تعلق رکھتا ہوں نہ قدریہ سے میں تو کچھ بھی نہیں مگر آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سارا عالم مجبور محض ہے ایک بھی ذرہ ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا وہ حقائق جنہیں میں محسوس کر رہا ہوں آپ کے سامنے رکھے دیتا ہوں فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔

فرشتے اور جن انسان نہیں بن سکتے انسان فرشتہ یا جن نہیں بن سکتا ہاتھی چیونٹی نہیں بن سکتا چیونٹی ہاتھی نہیں بن سکتی۔ کہتے ہیں اس "الجبار" کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی نہیں ہل سکتا اس کا یہی مطلب ہے کیا مجال کوئی ذرہ بھی اپنی

جگہ سے ہل سکے جب تک کہ اس کی بھیجی ہوئی ہوائیں اس ذرے یا پتھر کو حرکت میں نہ لائیں انسان پرندوں کی طرح نہیں اڑ سکتا مچھلی کی طرح پانی میں زندہ نہیں رہ سکتا اور حشرات الارض کی طرح زیر زمین زندگی نہیں گزار سکتا مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی اور حشرات الارض پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے۔الغرض سارا عالم مجبور محض ہے اور اس "الجبار" کے قبضہ قدرت میں ہے۔

انسان جو بڑا مختار کل بنا پھرتا ہے دیکھو کس قدر مجبور ہے ابتدائے وجود سے لے کر انتہائے وجود تک مجبور محض ہے وہ مجبور ہے کہ نو ماہ ماں کے پیٹ میں رہے پھر مقرر کردہ راہ پر گامزن ہو کر زمین پر قدم رکھے وہ اپنی مدت قید یا راہ کو نہیں بدل سکتا پیدا ہوا تو مجبور محض نہ کھا سکتا ہے نہ پی سکتا ہے نہ بول سکتا ہے البتہ اپنے جبر پر رو سکتا ہے تڑپ سکتا ہے چیخ سکتا ہے۔اپنی بے بسی پر آنسو بہا سکتا ہے اس حد تک اسے کچھ اختیار سا ہے جسے اختیار نہیں اضطرار کہنا بجا ہو گا مگر ایسی حالت نہیں ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

؎ نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

تڑپنے اور فریاد کرنے کی اجازت ہے گھٹ کے مرجانے کی اجازت نہیں کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا پھر یہ پوپلا انسان کچھ پی سکتا ہے کھا نہیں سکتا مجبور محض ہے پھر کچھ دنوں کے بعد کھانے کی اجازت مل جاتی ہے تو بہت معمولی سی غذا کھا سکتا ہے پھر بڑے ہو کر بھی پابند غذا ہے ہر چیز نہیں کھا سکتا بس وہی چیز کھا سکتا ہے جو بنی نوع انسان کا مقدر بن چکی ہیں پھر اسے کشاں کشاں عالم شباب کی طرف لایا جاتا ہے پھر عالم شیخوخت (بڑھاپا) کی طرف اور پھر عالم بقا کی طرف پھر جنت میں دھکیل دیا جاتا ہے یا جہنم میں بچہ ایک دم جوان نہیں ہو سکتا جوان بچہ نہیں بن سکتا اور نہ یک دم بوڑھا ہو سکتا ہے عالم فنا سے عالم بقا کی طرف جانے پر مجبور ہے اور پابہ زنجیر جنت یا جہنم میں جانے پر مجبور ہے۔

کہتے ہیں "بچے کے پاؤں پالنے میں پہچان لئے جاتے ہیں" یہ کہاوت صرف کہاوت نہیں حقیقت ہے جو سعید ہے وہ ماں کے پیٹ میں سعید بنا اور

جو شقی ہے وہ ماں کے پیٹ میں شقی پیدا ہوا قاتل قتل کرنے پر مجبور ہے اور چور چوری پر مجبور ہے ڈاکو راہزنی پر مجبور ہے شاعر غیر شاعر نہیں ہو سکتا اور غیر شاعر شاعر نہیں ہو سکتا جس کی قسمت میں بادشاہت لکھی گئی وہ ضرور بادشاہ بن کر رہے گا خواہ کیسے ہی گرے پڑے گھرانے میں پیدا ہوا ہو اور جس کی قسمت میں فقرو فاقہ لکھا ہے اس کا سابقہ فقرو فاقہ سے پڑے گا۔ خواہ شاہی محل میں پیدا ہوا ہو داراشکوہ کی بہن حضرت میاں میرؒ کی معتقد ہو گئی تھی شاہی محل میں ہوتے ہوئے بھی فقرو فاقہ اور بے آرامی کی زندگی گزار دی کیونکہ تقدیر میں تھوڑا رزق اور بہت سی کلفت لائی تھی۔

یہ جو میں کہتا ہوں کہ رزق اور رزق کی نوعیت مقرر ہے بے دلیل نہیں ہے دیکھو شیر کے مقدر میں گوشت ہے تو وہ پھل نہیں کھا سکتا انسان خنزیر کی طرح پاخانہ نہیں کھا سکتا اور درندوں کی طرح خون نہیں پی سکتا انسان کا رزق اور طرح کا ہے حیوانوں کا اور طرح کا اور نباتات کا اور۔ کوئی اپنے رزق کو نہیں چھوڑ سکتا اور جتنا رزق لکھا ہے اس سے زیادہ نہیں کھا سکتا رزق مقدر ہے۔

سارا عالم اس "الجبار" کے دست قدرت میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہو سکتا ہے جیسے وجود ملا فنا ضرور ملی۔

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

سب اس "الجبار" کے سامنے مجبور محض ہیں۔ میں نے اپنے مقالات میں بعض باتیں تقدیر کے بارے میں اس قسم کی لکھ دی تھیں تو بعض ناقدوں نے اس پر بڑی سخت تنقید کی کہ ایسا نہیں ہے کہ انسان تقدیر کا پابند ہو اور اگر ایسا ہے تو پھر جزاو سزا کیسی؟ بات تو یہی ہے جو میں نے لکھ دی ہے مگر اس مسئلے کا سمجھنا بڑا ہی مشکل ہے۔

مذکورہ بالا حقائق سے کون انکار کر سکتا ہے؟ کیا یہ حقائق نہیں بتاتے کہ کسی "الجبار" کے جبرو قہر کے تحت سارا نظام عالم ہے لیل و نہار اس پر شاہد ہیں۔ ہو نہیں سکتا کہ دن کی بجائے رات آجائے اور رات کی بجائے دن۔ موسم

اپنے اپنے وقت کے پابند ہیں الا یہ کہ وہی کوئی تبدیلی چاہے کس قدر مجبوری اور کتنی لاچاری ہے۔ اس لئے شعراء نے اپنی مجبوری کا رونا رویا ہے۔ کٹھ پتلیوں کا سا تماشا ہے کہ ڈور پس پردہ بیٹھنے والے کے ہاتھوں میں ہے وہ جیسے چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

انبیاء و اولیاءؒ' دانا و فلاسفہ' سلاطین و حکام سب مجبور ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں آب و بادوناروتراب'(پانی' ہوا' آگ' مٹی) اپنی خاصیت نہیں بدل سکتے جب یہ مجبور تو سارا عالم مجبور کیونکہ انہی سے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔

انسان کچھ کرنا چاہتا ہے تو شاطران تقدیر اسے ایسا مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی سوچی سمجھی راہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بادل ناخواستہ ان کی بنائی ہوئی راہ پر چل پڑتا ہے تقدیر منٹوں میں بنے بنائے گھر اجاڑ کر رکھ دیتی ہے اور غلط اقدام کرنے والوں کو رسا بسا دیتی ہے۔ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ایک ڈرامہ ہے جو رچایا جا رہا ہے اور کرداروں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ انجام کیا ہو گا؟

اب قارئین کے دلوں میں یہ خلجان پیدا ہو گا کہ جب تقدیر ہی سب کچھ ہے تو عذاب و ثواب کیوں؟ بات یہ ہے کہ یہ بڑا ہی باریک مسئلہ ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اس مسئلہ پر گفتگو کرتے دیکھا تو اظہار ناراضگی کی؟ا یہ مسئلہ لاینحل ہے اور اسرار الٰہی سے ہے بس ہمارا مقدر یہ ہے کہ ہم اس پر بے چون و چرا ایمان لائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مختلف اوقات میں مختلف افراد نے اس مسئلہ کا حل چاہا آپ نے جو جوابات دیئے ہیں اچھے خاصے ہیں مگر ان کا ایک جواب مجھے بڑا پسند آیا کسی شخص نے آپ سے تقدیر کے بارے میں دریافت کیا وہ شخص کھڑا ہوا تھا فرمایا اپنا ایک پاؤں اٹھالو اس نے ایسا ہی کیا فرمایا دوسرا بھی اٹھالو تو وہ ایسا نہ کر سکا فرمایا بس انسان اتنا مجبور ہے اور اتنا مختار ہے۔ساری مخلوق مجبور محض سہی مگر انسان کسی نہ کسی حد تک مختار ضرور ہے اور اسی لئے وہ مسئول ہے کہتے ہیں کہ سرسید احمد خاں تقدیر کے مسئلے پر کسی

سے گفتگو کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے جو کچھ ہے تدبیر ہے سامنے بھنے ہوئے چنے دھرے تھے انہوں نے ایک چنا منہ میں ڈالتے ہوئے فرمایا دیکھو یہ چنا میں کھاتا ہوں اسے کوئی میرا رزق بننے سے روک سکتا ہے؟ چنا منہ میں ڈالنا چاہا دانتوں سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا نیچے مرغ پھر رہا تھا وہ کھا گیا لاجواب ہو گئے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے رحمت کا فرشتہ وہاں نہیں آتا سنا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ جس گھر میں کتا ہو گا تو اس کے مالک کی روح قبض کرنے فرشتہ نہیں آئے گا تو وہ کیسے مرے گا شاید یہ بات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے ہو رہی تھی انہوں نے فرمایا جو فرشتہ کتوں کی روح قبض کرتا ہے وہی اس کی کرے گا۔

مولانا محمد قاسمؒ بڑے حاضر جواب انسان تھے ان کا اکثر مناظرہ دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج سے ہوا کرتا تھا اس کی توند خوب بڑی تھی اور مولانا محمد قاسمؒ کا شکم مبارک کمر سے لگا ہوا تھا کسی نے حضرت سے کہا حضرت اگر آپ کا مقابلہ دیانند سرسوتی سے کھانا کھانے میں ہو جائے تو فتح اس کی ہو گی فرمایا بھائی تو نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اگر نہ کھانے میں مقابلہ ہو تو فتح کس کی ہو گی؟

بات سے بات یاد آتی ہے شاہ جہاں پور کے میلہ خداشناسی میں جو عالمی مقابلہ ہوا تھا مولانا محمد قاسمؒ سب مذاہب والوں پر غالب رہے تھے کسی نے پادری فنڈر سے پوچھا کہیے کیسا مقابلہ رہا؟ کہنے لگا بیٹا! محمد قاسم ریت کی دیوار کو لوہے کا پشتہ لگاتا تھا مگر حق تو ہمارے ہی ساتھ تھا۔

بات اس "الجبار و القہار" کی ہو رہی تھی حقیقت یہ ہے کہ جائے دم زدنی نہیں سب مجبور ہیں اور اس کے جبرو قہر کے شکار ہیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

يَامَعْشَرَالْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَاتَنْفُذُوْنَ اِلَّابِسُلْطَانٍ

الجلیل جل جلالہ و الجمیل جل جلالہ

جلیل،ذوالجلال وجل جلالہ اسی "الجلیل" کی ذات پاک ہے جو "الجمیل" بھی ہے اس کی ذات جلال و جمال متضاد صفات سے **متصف** ہے جو بیک وقت متضاد ہوتے ہوئے اس کی ذات میں جمع ہیں اور ہر آن بیک وقت ان دونوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

ظالم' جابر' قاتل' ڈاکو' مغلوب الغضب' شرارت پسند' تخریب کار انسان' درندے' موذی جانور' پہاڑ' سمندر اور مصائب و امراض' آتش 'صرصر' طوفان' قحط اور وبائیں' زلزلے' بجلیاں' اسباب ہلاکت' اس کی صفت جلال کی مظہر ہیں پھول' بوٹے' پتیاں' خوشبوئیں' تتلیاں' حسین و جمیل مناظر' خوبصورت پرندے' حیوان' انسان' جمادات' خوشیاں اور صحت و مسرت مظہر جمال ہیں۔

ان دو متضاد صفات کی کارگزاری سے دنیا میں گھما گھمی رونق اکھاڑ پچھاڑ اور آبادی و بربادی ہے اگر پھول مظہر جمال ہے تو اس کے ساتھ کانٹا مظہر جلال لگا ہوا ہے اس طرح ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر کبھی خوشی وخوش حالی ہے تو کبھی غم اور بدحالی ہے۔

بعض چیزیں مظہر جمال بھی ہیں اور مظہر جلال بھی خوبصورت سانپ مظہر جمال ہوتے ہوئے مظہر جلال بھی ہیں بھڑ اور بہت سی حسین مخلوقات مظہر جمال بھی ہے اور مظہر جلال بھی شیر اور چیتے جیسے درندے مظہر جمال ہوتے ہوئے مظہر جلال بھی ہیں جب کہ ہرن اور چیتل (ایک قسم کی نیل گائے) جیسے جانور محض مظہر جمال ہیں۔

سیاہ رنگ مظہر جلال ہے اس لئے جج اور پروفیسر حضرات وغیرہ کو سیاہ جبے پہنائے جاتے ہیں عموماً" خطرناک چیزوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے جیسے ہاتھی' ریچھ'

گینڈا، سانپ، بچھو، بجو۔ بلا اور مصائب و آلام وغیرہ۔

بگلا کتنا حسین و جمیل پرند ہے مگر مچھلیوں کے حق میں سراپا جلال ہے صاحب جمال ہوتے ہوئے بھی بڑا جلالی ہے بے چارہ کیا کرے مچھلیاں ہی اس کا رزق ہیں یہ چونکہ مچھلیاں ہی کھاتا ہے اس لئے اس کے جسم میں مچھلیوں کی باس۔بو ہوتی ہے ایک دفعہ میں نے اسے پکڑ لیا تو ہاتھوں اور کپڑوں میں سخت بدبو رہی خدا کی قدرت دیکھئے کہ مچھلی کو اس کا رزق ٹھہرایا تو اس کے لعاب دہن میں یہ خاصیت رکھ دی کہ مچھلی کا کانٹا اس کے مونہہ میں موم ہو جاتا ہے۔جوگ کی کتابوں میں تپ کے ہزاروں قسم کے آسن ہیں ان میں سے ایک آسن یہ بھی ہے کہ بگلے کی طرح ساکت وصامت کھڑے رہو تو انسان بھگت بن جاتا ہے اردو والے بگلا بھگت اس شخص کو کہتے ہیں جو بظاہر بڑا سیدھا سادہ ہو اور باطن میں بڑا ہی ظالم ہو۔

اچھی آوازیں، نغمے، چہچہے، عمدہ عمدہ خوشبوئیں اور خوش کن رنگ، مظہر جلال ہیں ہم چیزوں کو ان کے اضداد ہی سے پہچان سکتے ہیں لہٰذا ان کا ہونا بھی ضروری تھا۔ (تُعرَفُ الاَشیاءُ بِاَضدَادِھَا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو پراگندہ بال دیکھا تو فرمایا کہ بالوں کو درست رکھو یہود و نصاریٰ کی طرح نہ بنو اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ زیب و زینت کو پسند نہ کرتے تھے جیسے ہندومت میں بھی جوگی کا میلا کچیلا رہنا پسند کیا جاتا ہے اسلام اسے ناپسند کرتا ہے انسان کو اپنے کپڑوں اور بالوں وغیرہ کا خیال رکھنا چاہیئے ایک مالدار شخص کو معمولی سے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا تیرے جسم پر نعمت الٰہی کا اثر ہونا چاہیئے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میلے کچیلے خستہ حال رہنے کو پسند نہیں کرتا جیسا کہ دیگر مذاہب میں اس کے خلاف ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اپنے گھربار گلی محلے کو صاف ستھرا رکھنا چاہیئے اسلام میں اسی لئے مختلف مواقع پر غسل کو کہیں فرض کہیں سنت اور کہیں مستحب قرار دیا ہے کہ بندہ

مومن صاف ستھرا اور بھلا لگے چونکہ اسلام میں غسل کرنا بھی ایک قسم کی عبادت ہے لہٰذا مسلمان اہل عرب غسل کرنے کے عادی تھے جب اسپین میں ان کی حکومت ہوئی تو جگہ جگہ خوبصورت حمام تعمیر ہو گئے ہندو مذہب کی طرح وہاں کے عیسائی غسل کرنے کو برا سمجھتے تھے اور غسل کرنے کو عیاشی میں داخل سمجھتے اس لئے وہاں کے عیسائی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے چنانچہ ایک پادری نے مسلمانوں کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں پر جہاں اور بہت سے الزمات لگائے تھے وہاں بڑی شد و مد سے ایک بھاری الزام یہ بھی لگایا تھا کہ یہ لوگ نہاتے بہت زیادہ ہیں اور انہوں نے جگہ جگہ بڑے پر تکلف حمام تیار کئے ہیں اس نے بڑے فخر سے یہ بات کہی تھی کہ میں تیرہ سال سے نہیں نہایا ہوں۔میں سوچتا ہوں لاٹ پادری کتنا گندہ بھوت ہوگا اس کے جسم سے کیسی گندی بو آتی ہوگی جو تیرہ سال سے نہیں نہایا ہوگا۔

جمال و جلال کے امتزاج سے مزید ایک اور حسن پیدا ہو جاتا ہے جیسے شیر اور چیتے وغیرہ میں ہے اور جب جمال حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہ خود بخود صاحب جلال ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حسن کا بھی ایک رعب ہوتا ہے اور وہ بھی مرعوب کن ہوتا ہے علامہ المبرد لکھتے ہیں کہ اہل عرب کہتے ہیں **(جمال ہائل)** کیونکہ جب جمال حد سے بڑھ جائے تو وہ رعب و جلال والا ہو جاتا ہے۔ **يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ** " بادل کی بجلی کی چمک کا یہ عالم ہے کہ گویا اس نے آنکھوں کی بینائی سلب کر لی ہے۔"

*

الحسیب جل جلالہٗ

فلاسفہ نے حرکت کی بہت سی تقسیمیں کی ہیں ہمیں ان سب سے کوئی سروکار نہیں یہاں صرف دو حرکتوں سے ہمارے بیان کا تعلق ہے جو حرکت کی بنیادی تقسیم ہے یعنی ایک حرکتِ طبعی اور دوسری حرکتِ قسری یعنی ایک وہ حرکت جو کسی کی فطرت و طبیعت کا تقاضا ہوتی ہے اور دوسری وہ حرکت ہے جو قسرٗ قاسر جبرِ جابر کے تحت ہوتی ہے یعنی وہ حرکت جو اس چیز کی فطرت و طبیعت کا تقاضا نہیں ہوتی بلکہ کسی خارجی اثر و جبر کے تحت ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں حرکتِ قسریہ کو حرکتِ جبریہ کہنا چاہیئے اور پہلی کو حرکتِ فطریہ۔

دھواں اور بھاپ ہمیشہ اوپر کو جاتے ہیں کیونکہ ان کی فطرت کا یہی تقاضا ہے ان کے اوپر کے طرف جانے میں کسی خارجی چیز کو دخل نہیں ہوتا بس ان کی طبیعت و فطرت ہی ایسی ہے دھویں اور بھاپ کی یہ حرکتِ طبعی حرکت کہلاتی ہے۔

ایک روڑا پتھر یا گیند اور جمادات وغیرہ زمین پر ہی پڑے رہتے ہیں وہ دھوئیں اور بھاپ کی طرح خودبخود اوپر کو نہیں اٹھ سکتے مگر جب ہم پتھر یا گیند کو اچھالتے ہیں تو وہ اوپر کی طرف بلند ہو جاتے ہیں ان کی یہ حرکتِ فوقانی قسر قاسر و جبر جابر کی وجہ سے ہوتی ہے پھر جتنی قوت کے ساتھ ہم انہیں اوپر کی طرف پھینکتے ہیں اسی قدر وہ اوپر کی طرف بلند ہوتے ہیں مگر جب یہ خارجی طاقت ختم ہو جاتی ہے تو وہ نیچے گر پڑتے ہیں۔

ایک ذرا سی گیند فضا میں معلق نہیں رہ سکتی تو یہ زمین و شمس و قمر کی اتنی بھاری بھرکم گیندیں کیسے فضا میں ٹھہری ہوئی ہیں؟ **مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ** انہیں وہ "الحسیب" ہی روکے ہوئے ہیں۔ **وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ** ہر چیز اس کے

نزدیک ایک مقدار سے ہے لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ سورج چاند کو نہیں پا سکتا اور رات دن سے آگے قدم نہیں مار سکتی۔ وہ ""الحسیب"" ان سب کے لئے کافی ہے۔

ایک ارض و شمس قمر ہی نہیں ان گنت ان سے بھی بڑے بڑے اجسام اس ""الحسیب"" کی کفایت و حسبان سے فضا میں تیر رہے ہیں اور اس خوبی سے کہ ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں الاان یشاء اللہ مگر یہ کہ اللہ ہی چاہے۔

یہ بھاری بھرکم معلق گیندیں چلتی پھرتی بھی ہیں گھومتی ہیں حرکت کرتی ہیں پھر بھی نہیں گرتیں اور آپس میں نہیں ٹکراتیں ایک حیران کن تماشا ہے سحر ہے مگر یہ ساحری بھی نہیں بس اس ""الحسیب"" کی قدرت کا کرشمہ ہے عقلیں حیران ہیں فَارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ دیکھو اور بار بار دیکھو تو نگاہ تھک کر واپس آ جائے گی۔ عجیب و غریب انجینئرنگ ہے اور عجیب و غریب نظام مساحت و حسبان ہے۔ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ہم اپنے اچھے برے اعمال کی جزا و سزا کے لئے کسی کے محتاج نہیں کیونکہ وہ ""الحسیب"" ہمارے لئے کافی ہے الحمدللہ ہمیں اپنے نیک اعمال کی جزا کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑتا۔ اور اپنے اعمال بد کی سزا کی معافی کے لئے کسی کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ ہمیں اس کے در کے سوا کسی کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑتا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ""اے نبی آپ کے اور آپ کے پیروکار مومنوں کے لئے اللہ کافی ہے""۔ ""جب ان اللہ والوں سے کہا گیا کہ لوگ تمہارے خلاف جمع ہو گئے ہیں ڈرو تو انہوں نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ"" کیسے کیسے تنگ مقامات سے اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے متبعین کو نکالا ہے کہ ماننا پڑتا ہے وہ ""الحسیب"" یقیناً کافی و وافی ہے اور ساری قوتیں اور وسائل اس کی کفایت کے سامنے بیکار ہیں۔

تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے واقعات مذکور ہیں کہ خلیفہ یا گورنر نے کسی سے ناراض ہو کر اسے قتل کرنے کے لئے بلایا مگر وہ دربار سے انعام و اکرام لے کر نکلا ایسے ہی ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ کسی گورنر نے انہیں قتل کرنے کے

لئے طلب کیا جب دربار سے نکلے تو انعام و اکرام لیکر نکلے لوگ اردگرد جمع ہو گئے اور سوالات کرنے لگے تو انہوں نے کہا میں تم میں سے ہر ایک کے سوالات کا جواب تو نہیں دے سکتا لیکن اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اللہ میرے لئے ایک جابر انسان سے کافی ہو گیا اور جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اس سے مجھے ولا دیا۔

حجاج بن یوسف نے ایک بزرگ عالم کو قتل کرنے کے لئے طلب کیا جب گفتگو ہوئی تو ان سے بہت خوش ہوا اور انعام و اکرام کے ساتھ واپس کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا فرمایا میرے لئے اللہ کافی ہو گیا۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ جب اجمیر میں قیام پذیر ہوئے تو ہندو ان کے معتقد ہونے لگے راجہ پرتھوی راج کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت برہم ہوا حکم دیا کہ اجمیر سے نکل جائیں! انہوں نے کہا کہ میں دیکھوں مجھے یہاں سے کون نکال سکتا ہے؟ شہاب الدین غوری نے حملہ کیا پرتھوی راج کو شکست ہوئی اور اس کی راج دھانی ختم ہو گئی اللہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے لئے ایک ظالم و جابر بادشاہ کے خلاف کافی ہو گیا۔

اولیاء اللہ کی سیرت ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہیں کہ انہوں نے اپنے لئے اللہ کو کافی سمجھا تو وہ ان کے لئے کافی ہو گیا۔ بے آب و گیاہ جنگلوں میں گھس گئے بے سروسامان اور انہیں ہر جگہ پکی پکائی روٹی حلوا اور پانی ملتا رہا جب کہ وہاں نہ آدم تھا نہ آدم زاد ایک بزرگ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ایک کنویں میں گر گئے ایک رات ایک قافلہ اس کنویں کے قریب آکر ٹھہرا مگر انہوں نے سوائے خدا کے کسی سے مدد لینی پسند نہ کی۔ کئی دن وہ کنویں میں رہے ایک رات ایک اژدھے نے ان کی مدد کی اور وہ اسے پکڑ کر کنویں سے باہر نکل آئے۔ کیونکہ وہ اس "الحسیب" و الکافی کا بھیجا ہوا تھا۔

اس "الحسیب" کی کفایت کے یوں تو میں نے بہت سے تماشے دیکھے اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ لکھے دیتا ہوں جس کی ایک معمولی سی تاریخی اہمیت بھی ہے میں "الازھر قاھرہ" سے فارغ التحصیل ہو کر آیا نوجوان تھا مجھے لاہور میں کوئی جانتا نہ تھا اورینٹل کالج میں ایڈیشنل مولوی کی جگہ نکلی کیونکہ مولانا نورالحق

مرحوم ریٹائرڈ ہو گئے تھے مولانا نورالحق فارسی کے بڑے فاضل عالم تھے یہ واقعہ ۱۹۴۴ء کا ہے انگریزی دور تھا اس پوسٹ کے لئے پورے ہندوستان سے تقریباً دو سو درخواستیں آئی تھیں جن میں سے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے بیس کا انٹرویو کے لئے انتخاب کیا تھا مولوی محمد شفیع اورینٹل کالج کے ریٹائرڈ پرنسپل تھے اور اورینٹل فیکلٹی کے ڈین تھے وہ چاہتے تھے کہ اپنے منظور نظر مولانا عبدالقدوس کو یہ جگہ دلائیں کیونکہ انہوں نے ابن الفوطی پر بڑا اچھا ریسرچ کیا تھا جو اورینٹل کالج میگزین میں چھپتا رہا ہے۔ مولانا عبدالقدوس قابل اور محنتی عالم تھے مولوی صاحب کی رائے اس انٹرویو میں سب سے زیادہ وقعت رکھتی تھی کیونکہ وہ عربی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ اس پوسٹ کے لئے ایک امیدوار مولانا غلام مرشد خطیب شاہی مسجد بھی تھے پنجاب کی سیاست میں بھی ان کا بڑا دخل تھا اور وہ پنجاب کے مشہور عالم بھی تھے میاں عبدالحی وزیر تعلیم تھے ان کا حکم تھا کہ مولانا غلام مرشد کو لیا جائے تو یہ بات لاہور کے علمی حلقوں میں یقین کے ساتھ کہی جاتی تھی کہ غلام مرشد ہی لئے جائیں گے۔

پروفیسر عبدالباقی مرحوم نے فلیمنگ روڈ پر اینگلو اورینٹل کالج کھول رکھا تھا میں ان کے پاس رہتا تھا جب میں انٹرویو کے لئے تیاری کرنے لگا تو عبدالباقی عباسی مرحوم کہنے لگے میاں صاحبزادے کہاں جا رہے ہو؟ کیوں اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو؟ غلام مرشد کے مقابلے میں تمہیں کون پوچھے گا یہاں تمہیں کون جانتا ہے؟ غلام مرشد کا ان وزراء کے الیکشن میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ عبدالباقی صاحب کوئی تو میاں عبدالحی کے سہارے آ رہا ہے اور کوئی مولوی شفیع کے آسرے اور میں تو خدا پر بھروسہ کر کے جا رہا ہوں جو ان لوگوں سے بہت قوی ہے ان لوگوں کی تو اس کے سامنے پر کاہ کی برابر بھی وقعت نہیں بلکہ کچھ بھی نہیں حَسْبُنَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۔ پورے ہندوستان سے بڑے بڑے عالم و فاضل ایم اے عربی پاس اساتذہ آئے تھے سب کو اس "الحسیب" نے رد کرا دیا۔

پروفیسر عبدالباقی عباسی بڑے مزیدار آدمی تھے۔ انٹرویو سے پہلے مجھے علم

ہو چکا تھا کہ انٹرویو تو برائے نام ہے دراصل انتخاب تو ہو چکا ہے لہٰذا میں ڈاکٹر برکت علی قریشی سے ملا وہ اورنٹیل کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور ان سے کہا انصاف ہونا چاہیئے تو وہ کہنے لگے وہاں ضمیر کا سالم رکھنا مشکل ہے' میں بڑا مایوس ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میاں عبدالحی اور وہ دونوں دوست ہیں اور عبدالحی نے ان سے کہا ہے کہ غلام مرشد کو ضرور لینا ہے۔

مولانا عبد المجید سالک میرے دوست تھے مگر انہوں نے انتخاب کے اگلے دن اور پھر اس کے بعد بھی میرے خلاف بہت سخت لکھا کہ مولانا غلام مرشد کے مقابلے میں ایک چھوکرے کو لے لیا گیا ہے پھر جب میں مستقل ہو گیا تو پھر انہوں نے میرے خلاف لکھا۔ لوگوں کی کوشش تھی کہ میں مستقل نہ ہونے پاؤں میرے خلاف پروپیگنڈے کیئے گئے مگر سب کے لئے وہ "الحسیب" کافی ہو گیا۔

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

*

الحفیظ جل جلالہ

انڈوں کے اندر اور ماؤں کے رحموں میں وہ "الحفیظ" نطفوں اور بچوں کی کس اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتا ہے کہ اسے سب سے بڑا اور سب کا محافظ ماننا ہی پڑتا ہے انڈے اور رحم کے اندر بچہ کس قدر آسائش و حفاظت کی زندگی گزارتا ہے کہ اسے وہ ایک وسیع دنیا محسوس ہوتی ہے مزے مزے غذا حاصل کرتا ہے حرکت کرتا ہے اور خون پانی رطوبت اور ہوا سے مستفید ہوتا ہے پھر بڑی حفاظت کے ساتھ اپنے مقررہ وقت پر باہر آ جاتا ہے تو اس کے مادر و پدر وغیرہ یا چشم آفتاب و قمر اس کی حفاظت میں لگ جاتے ہیں اس کی خدمت کرتے ہیں اس کی پرورش کرتے ہیں اس کے آرام و آسائش و غذا کا خیال رکھتے ہیں اگر وہ "الحفیظ" ذرا سے قطرے کی حفاظت نہ کرتا تو یہ کیسے پروان چڑھتا؟

ایک ذرا سا حقیر بیج سخت زمین کے سینے کو چیر کر باہر نکل آتا ہے زمین کے اندر اس "الحفیظ" نے اس کی حفاظت کی اسے خرابی سے بچایا اور پھر اس ناتواں کو اتنی طاقت دی کہ وہ سخت زمین کے سینے کو چیر کر باہر نکل پڑتا ہے اس ناتواں مخلوق کی چشم آفتاب و قمر حفاظت و پرورش کرتی ہے تو وہ ایک تن آور درخت بن جاتا ہے خوب پھلتا پھولتا اور قد آور ہو جاتا ہے۔

سیپیوں کے اندر گھونگھوں اور سمندروں کی تہوں میں وہ لاتعداد مخلوق کی حفاظت کرتا ہے اور جب وہ کسی مخلوق سے اپنی حفاظت کو اٹھا لیتا ہے تو وہ فنا ہو جاتی ہے خشخاش کے دانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی چھوٹے چھوٹے انڈوں میں وہ کس کمال حفاظت سے نطفۂ مادر و پدر کو محفوظ کر کے انہیں ایک زور آور مخلوق بنا دیتا ہے زمینوں پتھروں آتش و آب میں وہ بے شمار مخلوق کی رات دن حفاظت کرتا ہے۔

اس کی حفاظت کے بھی عجیب و غریب طریقے ہیں وہ فرعون جیسے بنو اسرائیل کے دشمن سے موسیٰ کو پروان چڑھا دیتا ہے خونخوار درندوں سے انسانوں کے بچوں کی پرورش کرا لیتا ہے ابھی کچھ سالوں کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ کے ہسپتال میں ایک ایسے فرزند آدم کو زیر علاج رکھا گیا تھا جسے بھیڑیے نے بچپن میں اپنے کھانے کے لئے اٹھا لیا تھا مگر حفظ الٰہی سے وہ دشمن اس کا تربیت کنندہ بن گیا حتیٰ کہ وہ جوان ہو گیا۔

ابھی کچھ دنوں کا واقعہ ہے کہ کراچی میں ایک بلی نے بچے دیئے پھر وہ مر گئی ایک کتیا ادھر سے گزری تو وہ اسے اپنے دودھ سے پرورش کرنے لگی یہ عجوبۂ قدرت اہالیان کراچی نے بڑے تعجب سے دیکھا

سچ ہے جسے خدا رکھے اسے کون چکھے

میرے لڑکپن کے زمانے میں ایک ایسا ہی عجیب واقعہ ہمارے ضلع میں ہوا تھا رات کے وقت ایک عورت ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ریل گاڑی سے اتری اس کا گاؤں ذرا دور تھا لہٰذا کرائے کے تانگے میں بیٹھ گئی تانگے والے کو لالچ ہوا کہ اس کا زیور چھین لوں جنگل میں تانگہ روک کر اس عورت کو رسی سے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور کلہاڑی سے اس پر وار کیا تو کلہاڑی کا سرا دور کھیت میں جا گرا وہ اسے اٹھانے کے لئے گیا تو ایک سانپ اس کے سارے جسم پر لپٹ گیا صبح تک ایسا ہی رہا لوگ جمع ہو گئے مگر حیران تھے کہ کیا کریں کہ جس سے سانپ تو مارا جائے اور تانگے والے کی جان بچ جائے؟ تحصیل قریب تھی اور وہاں پر تحصیلدار بڑا نمازی پرہیز گار انسان تھا وہ آیا اور اس نے سانپ سے کہا اب تم جاؤ اپنا فرض ادا کر چکے یہ بات سنتے ہی سانپ اس کے بدن سے اتر کر کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ دنیا میں کتنے ہی ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ درندہ اپنے شکار پر مہربان ہو گیا سانپ بچے کے ساتھ کھیلتا رہا قاتل خود مر گیا یا مہربان ہو گیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسے کئی واقعات ہوئے کہ قاتل پشیمان ہوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارادہ قتل سے آئے اور گرویدہ ہو گئے۔ مجھے خود کئی بار حفاظت خداوندی کے کرشمے دیکھنے کا موقعہ ملا ایک واقعہ لکھے دیتا ہوں

میں جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پاتا تھا ہم چند لڑکوں نے ایک انجمن اصلاح القریٰ بنائی تاکہ ہر جمعہ کو کسی قریب کے گاؤں میں جاکر تبلیغ کیا کریں لڑکپن کی باتوں میں بیوقوفی کا عنصر ضرور ہوتا ہے اس انجمن میں یہ سوال سامنے آیا کہ اگر ہم لوگ دیہات میں جائیں گے تو وہاں کے لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ کھانے پینے کے بہانے آتے ہیں مولوی ویسے ہی بدنام ہیں لہٰذا یہ طے پایا کہ کوئی بھی کسی گاؤں میں جاکر کھانا نہ کھائے اور اگر کوئی خلاف ورزی کرتے پکڑا گیا تو وہ دو آنے جرمانہ دے۔ اس زمانے میں دو آنے کی بڑی قیمت تھی ہم دو دو کی ٹولیاں بنا کر کسی گاوں میں عموماً" جمعرات کے دن عصر کی نماز کے بعد کھانا کھا کر روانہ ہو جاتے اور عشا کی نماز کے بعد تقریر کر کے یا تو رات ہی میں واپس آ جاتے یا پھر صبح کی نماز پڑھ کر لوٹ آتے گاؤں والے بڑا برا مانا کرتے کہ تم نے ایسا قانون کیوں بنایا ہے؟ کہتے ہم تمہیں کھانا بھی نہیں کھلا سکتے؟ بڑی خاطر کرتے۔ایک دفعہ حسب دستور میں اور ایک صاحب ایک گاؤں میں گئے برسات کا موسم تھا چھتری اور بیٹری ہمارے ساتھ ہوتی تھی ہم نے عشاء کی نماز کے بعد تقریر کی اور پھر اسی وقت واپسی کی ٹھان لی ہر چند لوگوں نے روکا کہ بادل چھا رہے ہیں کہیں بھیڑیا مل گیا تو کیا کرو گے ہم نہ مانے آدھے راستے پر پہنچے تو موسلادھار بارش شروع ہو گئی راستہ بھول گئے تو حسب عادت دیوبند کی شوگر مل کو جو میلوں سے دکھائی دیتی تھی اپنا ہدف بنا لیا کھیت دریا کا نمونہ بنے ہوئے تھے اور ہم بٹیا بٹیا(پگڈنڈی) چل رہے تھے چونکہ میں اس انجمن کا صدر تھا لہٰذا آگے آگے چل رہا تھا نائب صدر میرے پیچھے پیچھے تھا میرے ہاتھ میں بیٹری تھی جس کا رخ گاہے گاہے پیچھے کو رکھتا تھا تاکہ پیچھے آنے والا دیکھ سکے اچانک جو بیٹری کی روشنی میرے سامنے پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک بڑے بھاری کنویں کے بالکل کنارے پر کھڑا ہوں جس میں سڑا ہوا پانی بھرا ہوا ہے اور اس پختہ غیر آباد کنویں کی دیواروں میں جھاڑیاں پیدا ہو گئی ہیں میں نے اپنے ساتھی کو یہ عجیب و غریب منظر دکھایا تو وہ لپٹ کر رونے لگا قاضی جی! آپ گر جاتے تو میں کیا کرتا یہاں تو دور دور بھی کوئی آبادی نہیں ہے اس طرح دو تین دفعہ میں ڈوبنے سے

بچا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ فرشتوں کے ہاتھ تھے جنہوں نے مجھے ڈوبنے سے بچایا تب سے میں پانی سے بہت ڈرنے لگا ہوں۔

وان علیکم لحا فظین(بے شک تم پر محافظ متعین ہیں) جس روز ہم سے اس کی حفاظت اٹھ جائے گی ہم دنیا سے اٹھ جائیں گے۔

جس طرح دنیوی نظام چلانے کے لئے اس نے کچھ سیاستدان پیدا کر دیئے ہیں کچھ دست کار کچھ مزدور کچھ اہل فن اور کچھ علمی و ادبی لوگ اسی طرح فرشتے بھی مختلف طبائع، ہنر اور خدمات و احساسات کے ہیں۔ کچھ فرشتے ایسے ہیں جو ہماری حفاظت کرتے ہیں الہام کرتے ہیں اور یہ الہام ہر شخص کو بقدر اس کی علمیت و ذہنیت کے ہوتا ہے کچھ ایسے ہیں جو ہمارے لئے رزق کھینچ کر لاتے ہیں اگر اس "الحفیظ" کی حفاظت نہ ہو تو حیوان انسان اور شجر و نباتات لقمہ اجل بن جائیں **قُلْ مَنْ یَّکْلَئُکُمْ بِا للَّیْلِ وَالنَّہَارِ قُلِ اللّٰہ** آپ ان کافروں سے دریافت کریں کہ رات میں اور دن میں تمہاری کون حفاظت کرتا ہے (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ)۔

ہم خشکی کے راستے حج کرنے گئے تھے تقریباً سو بسیں تھیں جن میں عرب و عجم کے بہت سے حاجی سوار تھے واپسی پر ہماری بس کے ایک حاجی صاحب کو یہ شوق چرایا کہ قافلے کی بسوں میں سب سے آگے ہماری بس ہو انہوں نے ڈرائیور سے کہا کہ تجھے دو سو روپے دوں گا ہماری بس کو سب سے آگے کر دے وہ لالچ میں آگیا اور اس نے آگے نکلنے کے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا اس زمانے میں سڑکوں کا کوئی وجود نہ تھا قافلہ تبوک و عمان کے درمیان چل رہا تھا صحرائے عرب نرا صحرا ہی صحرا ہے وہ قافلے سے بڑی دور نکل گیا اور راستہ بھول گیا اس طرح کہ نہ واپس ہو سکتے تھے نہ آگے بڑھ سکتے تھے نہ ہمارے ہاں ان کی صدا قافلے تک پہنچ سکتی تھی تپتی ہوئی ریت چلچلاتی دھوپ مزید براں باد سموم نہ پانی نہ سایہ سب اسے ملامت کرنے لگے۔ اور پیاسے مرجانے کا انتظار کرنے لگے کوئی بس کے نیچے لیٹ گیا تو کوئی بس کے اندر ہی دراز ہو گیا مگر گرمی اور لو کہیں چین نہ لینے دیتی تھی اچانک سامنے کی بلند پہاڑی کی چوٹی سے سپید گھوڑے پر ایک سوار نظر آیا سب حیران تھے کہ ڈھلوان پہاڑی سے وہ اتنی بلندی سے اتنی

جلدی کیسے گھوڑا اتار لایا؟ وہ کچھ نہ بولا ہاتھ سے اشارہ کر کے راہ بتا کر پھر اسی طرف چلا گیا اور تھوڑی دور چڑھا تھا کہ غائب ہو گیا میدان اور پہاڑی بالکل صاف اور ہموار تھے وہاں کوئی درخت یا غار یا اونچ نیچ نہ تھا تب سارے حاجی بہت پچھتائے کہ ہم نے ان سے مصافحہ تک نہ کیا وہ تو خضر علیہ السلام تھے۔

خضر ایک مرد صالح تھا جسے اللہ تعالیٰ نے علم باطنی عطا کیا تھا کہ علم ظاہری والے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نباہ نہ ہوسکا اور موسیٰؑ کو ان سے معافی مانگنی پڑی اشیاء کا ظاہر کچھ اور ہے اور باطن کچھ اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ خطائے بزرگان گر فتن خطاست ہمارے اعمال کا ظاہر کچھ اور ہے باطن کچھ اور مُلّائے مکتبی موسیٰ کی طرح خواہ مخواہ اعتراض کر بیٹھتا ہے مگر وہ بھی حق پر ہے کہ اس کی نظر ظاہر ہی تک محدود ہے ایک حاجی صاحب لوگوں کو ڈرانے کے لئے کہنے لگے کہ میں پہاڑ کے اس طرف گیا تھا کہ شاید کہیں پانی مل جائے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شیر بھاگا جا رہا تھا یہ بات سن کر حاجی صاحب نے نہلے پر دہلا مارا ہاں آپ سچ فرماتے ہیں میں نے بھی دیکھا کہ ایک ہرن کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا وہ حضرت بہت خفیف ہوئے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ صرف فرشتے ہی اس "الحفیظ" کی طرف سے ہماری حفاظت کے لئے متعین نہیں ہیں کچھ افراد و ارواح بھی ہماری حفاظت کرتی ہیں انسان تو ہماری حفاظت کرتے ہی ہیں جو صاف عیاں ہے بعض ارواح بھی حفاظت کرتی ہیں جسمانی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی۔

ایک زمانے میں کثرت مجاہدات و مراقبات اور فاقوں کی وجہ سے مجھے بکثرت پیشاب آنے لگا تھا تو میں پاکی کی زیادہ پروا نہ کرتا تھا ایک رات خواب میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں "بعض لوگ پیشاب میں احتیاط نہیں کرتے" میں اپنے کسی خیال یا نفسیات پر محمول نہیں کر سکتا کیونکہ یہ الفاظ وہ اسی طرح استعمال کیا کرتے تھے وہ کسی کا نام لے کر یا مخاطب کر کے نصیحت نہیں کرتے تھے بس یہی سے فرمایا کرتے تھے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں۔

معلوم ہوا جسمانی و روحانی طور پر بھی وہ "الحفیظ" اپنے بندوں کے ذریعہ

ہماری حفاظت کرتا ہے کئی دفعہ تصانیف اور دیگر امور کے سلسلے میں مردہ اور زندہ بزرگوں نے خواب میں میری رہنمائی کی اور مجھے غلطی سے بچایا حالانکہ وہ زندہ بزرگ ہندوستان میں تھے اور انہیں پتہ تک نہ تھا کہ میں لکھ رہا ہوں الغرض اس "الحفیظ" کی حفاظت کے عجیب عجیب طریقے ہیں اور عجیب و غریب باتیں مشاہدے میں آئیں کہ قائل ہونا پڑتا ہے کہ دنیوی اور روحانی اعتبار سے بھی ہمارا کوئی محافظ ہے ہم سمجھتے ہیں اور ایک حد تک ہمیں ایسا سمجھنا بھی چاہیئے کہ پولیس چوکیدار یا ہمارے عزیز و اقارب یا پڑوسی ہماری جان و مال کی حفاظت کر رہے ہیں مگر دراصل ایسا نہیں ہے حفاظت دراصل اسی "الحفیظ" کی ہوتی ہے وہ اپنی حفاظت کو جس دم اٹھا لیتا ہے چور مال چرا کر لے جاتے ہیں اور قاتل ہمیں قتل کر جاتا ہے خواہ کتنے ہی پہرے دار محافظ اور نگہبان کیوں نہ ہوں شاہ فیصل رحمتہ اللہ علیہ ایک مضبوط قلعے میں ایک محفوظ مقام پر محافظوں کی نگرانی میں بیٹھے ہوئے تھے یہ ساری حفاظتیں بے سود ثابت ہوئیں کیونکہ وقت آگیا تھا کہ وہ "الحفیظ" اپنی حفاظت کو ان سے اٹھالے۔

سارے پہروں اور محافظوں میں بے خوف و خطر بیٹھے تھے کہ سب کے سامنے دن دہاڑے قاتل نے ان کا کام تمام کر دیا حالانکہ وہ اس سے پہلے ہزاروں خطرناک مقامات میں گئے اور سالم رہے مگر اب ان کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا لہٰذا محافظ فرشتوں کی حفاظت ان سے اٹھا لی گئی تھی۔

کیسے بڑے بڑے بادشاہ مضبوط قلعوں میں بیٹھے بٹھائے اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں مارے گئے وہ محافظ جنھوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی محبت سے برسوں ان کی حفاظت کی تھی تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ محافظ قاتل بن گیا مہربان مائیں کیسے قاتل بن جاتی ہیں اور سایہ پدری کیسے ایک خون آشام درندہ بن جاتا ہے جو اپنے خون اور پانی سے ایک نونہال کو تناور درخت بنا دیتا ہے کیسے اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں ان کی وہ رات دن کی حفاظت محبت و عطوفت کہاں چلی جاتی ہے معلوم ہوا ان کے پیچھے کوئی اور ہی طاقت کارفرما ہوتی ہے کہ جب وہ کنارہ کش ہو جاتی ہے تو سب کچھ دھرا رہ جاتا ہے اور وہ خود ہی اپنے سب کچھ کیئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

الحق جل جلالہ

ہر چیز کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ مرکز حق و حقانیت و صداقت اس "الحق" سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک ہے ہر قسم کی حقانیت اس کی ذات پاک سے پھوٹتی ہے اور مرکز باطل و کذب و شرِ ابلیس ہے ہر باطل بات کا وہی سرچشمہ ہے یا دوسرے الفاظ میں آتش پرستوں کے نظریہ کے مطابق یوں کہہ لو کہ مرکز حقانیت یزداں ہے اور مرکز باطل و شر اھرمن ہے اگر وہ "الحق" حق نہ ہوتا تو حق وصداقت کہاں سے آتی معلوم ہوا وہ بے شک الحق ہے اس نے جس چیز کو حق قرار دیا وہ حق ہے اور جسے باطل ٹھہرایا وہ باطل ہے اگر نعوذ باللہ اس کی ذات مرکز حق و صداقت نہیں ہے تو پھر حق و صداقت کہاں سے آئی اس کی حقانیت میں کون شبہ کر سکتا ہے مگر وہی جو بے بصر ہیں اگر وہ الحق حق نہ ہو گا تو پھر حق اور کون ہو گا؟

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَاتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (القرن)

ترجمہ۔ حق آپ کے پروردگار کی جانب سے ہے لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ بنیں۔

وہ اپنی حقانیت کے جلوے اپنے پاکیزہ بندوں کو دکھاتا رہتا ہے لہٰذا وہ عام لوگوں کی نسبت سے زیادہ پختہ ایمان و یقین والے ہوتے ہیں ویسے اس نے اپنی حقانیت کے جلوے جگہ جگہ بکھیر دیئے ہیں بشرطیکہ انسان صاحب نظر ہو شب و روز کا آنا جانا موسموں کی تبدیلی اور انقلاباتِ دھر اس کی حقانیت پر شاہد ہیں

؎ انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں دیکھو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

یہ شعر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ کا ہے ایک شعر اور یاد رہ گیا ہے۔

ے بے نمک ہیں میرے الفاظ مگر تلخ نہیں
خالی از درد نہیں گرچہ ہیں لشٹم پشٹم

عربی زبان میں حق کے معنی ثبت کے ہیں کہتے ہیں حق الامر یعنی ثبت الامر بات ثابت ہو گئی- اس سے حق ہے جس کی جمع حقوق ہے ہم رات دن کہتے ہیں یہ میرا حق ہے یعنی یہ بات ثابت ہے- جب ہمارے حق و حقوق ثابت ہیں تو تعجب ہے اس "الحق" کے ثبوت کے لئے لوگ کیوں دلیل طلب کرتے ہیں؟

حق میں بڑی طاقت ہوتی ہے کہتے ہیں **اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَایُعْلٰی** حق خود بلند ہوتا ہے بلند نہیں کیا جاتا جب حق و صداقت میں یہ طاقت ہے تو وہ الحق کتنا طاقتور ہو گا جس نے حق و صداقت میں یہ طاقت رکھی ہے-

ایک بدو نے کسی کا اونٹ چرا لیا تھا وہ قبیلے میں بیٹھا ہوا تھا کہ جس کا اونٹ چرایا تھا وہ شخص ادھر آ نکلا تو اس نے چور کی چادر بڑے زور سے کھینچی کہ وہ ساتھ کھنچتا چلا گیا جب وہ چلا گیا تو لوگوں نے اس سے کہا ارے تو تو اس سے بہت طاقتور ہے تو کیسے کھنچتا چلا گیا کہنے لگا اس نے مجھے اس طرح گھسیٹا جیسے صاحب حق گھسیٹتا ہے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حق میں ایک طاقت ہوتی ہے اور باطل ضعیف ہوتا ہے- **اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا** باطل مٹنے ہی کے لئے ہے- وہ یقینی بات جو اچھی طرح ثابت ہو جائے اسے حق الیقین کہتے ہیں اگر کوئی معتبر شخص یہ خبر دے کہ فلاں جگہ آگ لگ رہی ہے تو اس ثقہ آدمی کی خبر دینے کی وجہ سے ہمیں جو آگ کا علم حاصل ہوا یہ علم الیقین کا درجہ ہے اگر ہم خود اس طرف سے دھواں اٹھتا دیکھ لیں تو اس کو دیکھنے سے جو آگ کے بارے میں علم حاصل ہوا وہ حق الیقین کا درجہ ہے اور جب آگ کو بچشم خود دیکھ لیا تو یہ عین الیقین کا درجہ ہے جس کے بارے میں سورہ تکاثر میں ہے-

لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّھَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ تم دوزخ کو دیکھو گے اور پھر دیکھ کر تمہیں عین الیقین ہو جائے گا-اس سے پہلے کی آیت میں ہے **کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ**

الْيَقِيْنِ کاش تم اپنے انجام کو علم الیقین کے طور پر جان لیتےاس آیت میں علم الیقین کا بیان ہے جو یقین کا پہلا درجہ ہے اور عین الیقین آخری عام مومنوں کو جو اس الحق کا علم ہے وہ علم الیقین کے درجے میں ہوتا ہے اولیا کو حق الیقین کے درجے میں اور انبیاء اور بعض اولیاء اللہ کو عین الیقین کے درجے میں اور بعض لوگ ساری عمر تذبذب میں رہتے ہیں۔

اہل عرب رات دن کہتے ہیں ہذا حقی یہ میرا حق ہے **ہذا حقک** یہ تیرا حق ہے بات بات پر حقی اور حقک کہتے ہیں مگر افسوس وہ اس کے باوجود اس "الحق" کو بھول چکے ہیں اسلام عرب میں غریب الوطن ہے اگر کچھ ہے تو ہندوپاک اور افریقہ وغیرہ میں ہے یہ حق کو اس حد تک بھول چکے ہیں کہ حق کے تلفظ کو بھی بھول گئے ہیں کہتے ہیں **ہذا حگی ہذا حگک**

ہم مکہ شریف میں وضو کر رہے تھے کہ ایک مکی آیا اور وہیں بیٹھ کر استنجا کرنے لگا ہمارے ایک ساتھی نے اعتراض کیا تو بولا تم کافر ہو تم اسلام کو کیا جانو؟ حضور نے فرمایا تھا میں تمہارے بارے میں شرک سے نہیں ڈرتا البتہ مال و دولت سے ڈرتا ہوں مال و دولت نے ان لوگوں کو خدا سے غافل کر دیا ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایران کے زر و جواہر لا کر ڈھیر کر دیئے گئے تو آپ آب دیدہ ہوئے لوگوں نے کہا کہ یہ تو خوشی کا مقام ہے فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ یہ مال تمہیں خراب نہ کر دے۔

سعودی عرب کے سوا باقی اہل عرب برائے نام ہی مسلمان ہیں ایران میں شاہ کے بعد اب اسلام داخل ہوا ہے شاہ تو شراب و رقص و سرود کو رواج دے کر اسلام کو مٹانا چاہتا تھا بلکہ بڑی حد تک مٹا چکا تھا یہی طرز ہمارے ملک میں ایک سابق حاکم نے اختیار کیا تھا زبان سے اسلام اسلام کرتے تھے اور درحقیقت اسلام کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے بالکل اسی طرح جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوارج کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ اسلام اسلام کریں گے مگر اسلام ان کے حلقوم سے نیچے نہیں اترے گا انہوں نے حق کو مٹانا چاہا تھا تو خود ہی مٹ گئے ایران میں پانی کی طرح شراب پی جاتی تھی اور اس کا نام آب انگور رکھدیا گیا تھا

کہتے تھے یہ شراب نہیں ہے یہ تو آب انگور ہے اس میں کیا ہرج ہے اور سور کے گوشت کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ وہ خنزیر نہیں ہے جو حضور کے زمانے میں تھا ہمارے پرنسپل باقر صاحب فرماتے تھے کہ میں ایران گیا تو بار بار وہاں کا پروفیسر سور کے گوشت کے کھانے پر اصرار کرتا یہ ڈش تو بڑی اچھی ہے انہوں نے انکار کیا تو کہا کہ وہ خنزیر نہیں ہیں جو حضور کے زمانے میں تھے وہ البتہ حرام تھے یہ حرام نہیں ہیں یہ شراب نہیں ہے جو اسلام میں حرام ہے یہ تو آب انگور ہے پی بھی لو۔ شاہ نے عریانیت و زنا کاری کو اس قدر عام کر دیا تھا کہ امریکہ کی فلمیں بھی اتنی عریاں نہیں ہوتی تھیں جتنی کہ ایران کی۔ حق و باطل کی جنگ ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی اہل باطل اہل حق کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے رہے ہیں مردان حق کو گھبرانا نہیں چاہیئے دیر یا سویر نتیجہ ضرور اچھا ہی نکلتا ہے۔

؎ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس الحق کے لئے اور اپنے حق و حقوق و صداقت کے لئے ہمارے کتنے ہی اسلافؒ نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

؎ بنا کر دندخوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ایک شخص کو جو خارجی تھا ولید بن عبدالملک کے سامنے پیش کیا گیا اس نے اس کے قتل کا حکم دیا اتنے میں اس کا بیٹا روتا ہوا آیا کہ اتالیق نے اسے مارا ہے تو ولید اسے تسلی دینے لگا وہ خارجی بولا امیرالمومنین اسے رونے دیجئے کہ اس سے گلا کھلتا ہے اور طاعت رب کے وقت اسے رونا آ جایا کرے گا۔ ولید نے بڑے تعجب سے کہا تو جس حالت میں ہے کیا یہ حالت تجھے نصیحت کرنے سے نہیں روکتی! وہ کہنے لگا امیرالمومنین انسان کو مرتے دم تک کلمہ حق کہنے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے ولید نے اسے معاف کر دیا۔

باب کے ایک مرید کے بارے میں شاہ ایران نے حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے جلاد نے تلوار ماری تو اس کے عمامہ پر لگی اور عمامہ سر سے نیچے گر

پڑا تو اس نے اسی وقت ایک شعر کہا جس کا یہ مطلب ہے میں حیران ہوں کہ محبوب کے قدموں پر پہلے عمامہ ڈالوں یا سر؟

کہتے ہیں کہ ایک ان پڑھ بوڑھا قرآن شریف کو سامنے رکھ کر ہر سطر پر انگلی پھیرا کرتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا یہ بھی حق ہے یہ بھی حق ہے یہ بھی حق ہے جب وہ مر گیا تو کسی بزرگ نے اسے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہو حق نے تیرے ساتھ کیسا معاملہ کیا کہنے لگا میرے اس عمل کی وجہ سے بخش دیا۔

ایک قلندر جو دریائے راوی کے قریب ایک کٹیا میں رہتا ہے جب کبھی بیمار ہو جاتا ہے مجھ سے دوا لے جاتا ہے ہر وقت سبز عمامہ اور ستھرے کپڑے جوتا پہنے آتا ہے واڑھی یک مشت اور مونچھیں سنت کے مطابق ہیں اس کی ظاہری وضع قطع سے یہ خیال کیا کرتا تھا کہ تارک الدنیا ہے اور شریعت کے مطابق ہے تو نماز روزہ کرتا ہو گا اللہ کی شان وہ ایک روز مغرب کی اذان ہوتے ہی مطب میں داخل ہوا تو میں نے کہا آؤ پہلے نماز پڑھ لیں پھر میں آپ کو دوا دوں گا وہ کہنے لگا ہم تو کبھی نماز نہیں پڑھتے میں نے کہا کیوں کہنے لگا باباجی نے فرمایا ہے نماز روزہ مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں بس ہر وقت حقہ پیتے رہو اور اس پر خیال جمائے رہو ہمارے باباجی ہر وقت حقہ پیتے رہتے ہیں اور اس کے خیال میں مگن رہتے ہیں میں نے کہا بہت خوب! ہاں نماز کبھی نہیں پڑھنا اس سے برا تو دنیا میں کوئی عمل نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ آیا اور کہنے لگا حکیم صاحب میں نے باباجی سے آپ کی تعریف کی تھی وہ ابھی ابھی چنیوٹ سے آئے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں میں نے کہا بلا لاؤ کہنے لگا وہ باہر بیٹھے ہیں ایسے تو نہیں آئیں گے جب تک آپ خود انہیں بلا کر نہ لائیں میں نے کہا چلو میں بلائے لاتا ہوں وہ باباجی باہر گلی میں بیٹھے تھے میں نے کہا باباجی چلو تو وہ میرے ساتھ ہو لئے باباجی کی بھی وضع قطع بالکل اسی جوان قلندر کی سی تھی اور ہاتھ میں حقہ تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چنیوٹی باباجی کے معتقد ہیں جو یہاں رنگ محل میں رہتے ہیں باباجی ان کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں ایک رات وہ قلندر میرے پاس آیا حکیم جی! باباجی آپ کے

پڑوس میں ٹھہرے ہوئے ہیں بڑے بڑے لوگ ان سے ملنے آ رہے ہیں آپ بھی چلیں میں نے کہا میں بڑے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔

ایک شب کوئی رات کے دو بجے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ایک چنیوٹی کی نوجوان بیوی کو دل کا دورہ پڑا تھا کہ لوگ اسے گود میں اٹھا کر لائے تھے انہوں نے میرے مطب میں اسے زمین پر لٹا دیا میں نے نبض دیکھی اور دوا دے دی اور کہا کہ صبح مجھے ضرور اطلاع دینا کہ کیا حال رہا مگر پھر میرے پاس کوئی نہ آیا کچھ دنوں کے بعد اس کا شوہر مطب میں آیا تو میں نے دریافت کیا بیوی کا کیا حال ہے کہنے لگا پھر اسی وقت ہم نے سوچا بھئی اسے جھٹ باباجی کے پاس چنیوٹ لے چلیں ہم بس کے اڈے تک گئے تو وہ بابا جی کی برکت اور ان کے نام لینے ہی سے بالکل اچھی ہو گئی پھر ہم اسے ان کی خدمت میں لے گئے اب وہ بالکل تندرست ہے۔ کیسی بھی سخت قسم کی پابندیاں لگا لو روحانیت پیدا ہو جاتی ہے ایسے لوگوں کی روحانیت سے اور کچھ عقید تمندی سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے تو پھر جاہل لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

؎ نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند　　نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

؎ ہزار نکتہ باریک ترزموا ینجاست　　نہ ہر کہ خواجہ شود بندہ پروری داند

یہ قلندروں کی دنیا بھی عجیب ہے یہ لوگ اپنے پیر کی بات پر بڑا پختہ ایمان رکھتے ہیں اور بڑی سختی سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں کوئی انہیں کتنا ہی سمجھائے بجھائے یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے مذہبی لوگوں کی بہ نسبت یہ لوگ اپنے پیر کو بہت ہی زیادہ مانتے ہیں جیسے اس نے کہہ دیا ساری عمر تج دیتے ہیں اور بڑی بڑی ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھاتے ہیں انہیں کچھ نہ کچھ تو رحمان یا شیطان سے ضرور ملتا ہے دنیا بے وقوف بھی نہیں ہے کہ ساری عمر مفت میں تکالیف برداشت کرے؟ کسی کے پیر نے اسے بتا دیا کہ ایک بہت بڑا گھنٹا اپنے پیروں کے درمیان باندھے پھر اس سے حق حق کی آواز آتی رہے گی بس اس سے لو لگائے رکھ نہ نماز کی ضرورت نہ کسی اور چیز کی۔ بعض دونوں پیروں میں گھونگرو باندھے ناچتے پھرتے ہیں کہ ان گھونگروں سے انہیں حق حق کی آواز آتی رہتی ہے بس

یہی کافی ہے بعض بھاری بھرکم بوجھ ہر وقت کاندھے پر دھرے پھرتے ہیں بعض ایک جگہ بیٹھے بیٹھے زندگی گزار دیتے ہیں اور بعض مسلسل کھڑے رہتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر ہر وقت ایک قلندر بیٹھا رہتا تھا نہ نماز نہ روزہ بس ہر وقت ان کے مزار پر نگاہ رکھتا تھا اس کی حالت بڑی ہی قابل رحم تھی اس کے پیر نے کہا ہو گا دن رات یہیں بیٹھا رہ اور مزار کو دیکھتا رہ وہ کچھ پڑھتا بھی نہ تھا خاموش بیٹھا رہتا تھا معلوم نہیں کیسے کھاتا پیتا اور کیسے طہارت کرتا ہو گا کیونکہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سوکھ کر لٹک گئی تھیں اور ناخن بہت بڑھ گئے تھے اس کے پیر نے اس کی ساری انگلیاں ایک ایک کر کے لوہے کے موٹے تار سے جکڑوا دی تھیں یہ بات کتنی تکلیف دہ ہے معلوم نہیں کیسے نیند آتی ہو گی؟

بعض ساری عمر نہ نہاتے ہیں نہ دھوتے ہیں نہ کپڑے بدلتے ہیں نہ حجامت بنواتے ہیں انہیں جوئیں ستاتی ہیں اور صبر کرتے ہیں حق شناسی اور حق یابی کے یہ سب طریقے ہندوانی ہیں اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے جہلاء ان کی ریاضتوں کو دیکھ دیکھ کر مرعوب و معتقد ہو جاتے ہیں اور علماء کو کچھ بھی نہیں سمجھتے کیونکہ یہ جاہل صوفی لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ کیا؟ یہ کتابی لوگ کچھ نہیں جانتے! یہ علم کی قدر کیا جانیں؟ ہر دم تقدیس و تسبیح کرنے والوں پر آدمؑ علم کی بنا پر سبقت لے گیا انہیں کیا معلوم اگر ہزار سال بھی ایسے جاہل صوفی ریاضت و مجاہدات میں لگے رہیں تو وہ عالم کی ایک رات کی عبادت سے نہیں بڑھ سکتے۔

الحق حق وما سواہ باطل۔

اَلحَکَمُ جل جلالہ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں نہیں آیا لیکن چونکہ حکم و فیصل و حاکم و آمر اسی کی ذات ہے لہٰذا اسے اسمائے الٰہی میں شامل کر لیا گیا خیر و شر کے درمیان حکم و فیصل صرف اس کی ذات ہے اور وہی حاکم حقیقی ہے۔ باقی تو حاکم و حکم مجاز ہی ہیں۔ وہ فرماتا ہے۔ **اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ۔** کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے بیشک، وہی حکم و حاکم و فیصل و آمر ہے۔ اس جیسے الفاظ بکثرت قرآن شریف میں آئے ہیں جیسے **احکم - احکم - احکمت - حکلم - حکم - حکم - حکما - حکمت - حکمتم - حکمہ - حکمتہ - حکمهم - حکیم**

بعینہ یہ لفظ زن و شوہر کے اختلاف کے سلسلہ میں آیا ہے اور اسی معنیٰ یعنی فیصلہ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہے **فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ** بھیجو ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم بیوی کے خاندان سے۔

یعنی اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو ایک مرد خاوند کی طرف سے اور ایک بیوی کی طرف سے لے لو۔ پھر وہ دونوں ملکر جو فیصلہ کریں اسے قبول کر لو معلوم ہوا انسان بھی حکم ہو سکتا ہے اگر چہ وہ مجازی حکم ہے حقیقی حکم تو وہی ہے۔

حاکم حقیقی اسی کی ذات ہے مگر اس نے ہمیں بھی حاکم کہا ہے چنانچہ فرمایا "**تُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ**" آپس میں ناحق ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ اور حکام کے پاس اپنے جھگڑے نہ لے جاؤ۔ وہ فرماتا ہے۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ جب لوگوں کے درمیان فیصل بنو تو عدل کے ساتھ حکم کرو صرف لوگوں ہی کے درمیان نہیں ہر چیز کے بارے میں عدل ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے اپنے مال کے ساتھ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ

اسے بے جا نہ اڑاؤ۔ اپنی جان کے ساتھ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ خوامخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ جسم پر زیادہ ظلم نہ کرو۔ صحت کا خیال رکھو۔ نفس کو خواہ مخواہ مبتلائے عذاب نہ کرو کہ ترک دنیا کر بیٹھو۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ عدل یہ ہے کہ انہیں صاف ستھرا رکھو۔ اپنے گھر اور گلی کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ انہیں صفائی کا مرقع بنا دو۔ اپنے سامان کا حق یہ ہے کہ ہر چیز قرینے سے اور اپنی جگہ پر رکھو ادھر ادھر بے قاعدہ سامان کو نہ پھیلاؤ۔

اسی طرح اپنے جانوروں، درختوں، دوستوں، عزیزوں الغرض ہر ایک کے ساتھ عدل کرو کہ اسلام کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے خدا اور رسول کے معاملے میں عدل کرو نہ تو ان کے مرتبے کو گراؤ نہ رسول کو خدا کے برابر کر دو۔

خیر اور شر کے درمیان حکم و فیصل صرف اسی کی ذات ہے جس چیز کو اس نے شر قرار دیا ہے وہ شر ہے اور جسے خیر قرار دے دیا ہے وہ خیر ہے اگرچہ اس نے عقل دے کر انسان کو بھی حکم و فیصل بنایا ہے مگر درحقیقت عقل انسانی پوری طرح خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فلاسفر و عقلاء بعض ایسی باتوں کو جو بری تھیں اچھا سمجھتے رہے کہتے ہیں سقراط سورج کی پرستش کیا کرتا تھا زرتشت نے آگ کی پرستش کو خیر سمجھا۔ اہل ہنود نے گائے کو مقدس جانا۔ عقلائے ہند نے ستی کو برحق قرار دیا گوتم بدھ نے عورت کو سانپ اور بچھو سے بھی زیادہ زہریلا قرار دیا۔ اہل یونان نے بہت سے دیوتا مانے اور ان کی پوجا کی ہزاروں برس عقلاء، فلاسفر، امراء، علماء اور سلاطین بتوں کی پوجا کرتے رہے زندگی کو مہاپاپ سمجھا۔ خود کشی، جسم کو سکھا دینا اور ترک لذات کو عبادت جانا۔ چین و جاپان وغیرہ میں جوگ تقدس کی علامت قرار دیا گیا۔ بڑی بڑی عظیم تہذیبوں میں عورت کو سامانِ خانہ سے زیادہ وقعت نہیں دی گئی اسی لئے ایک ایک مرد نے سوسو بیویاں کیں اور شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کو بھی ساتھ زندہ دفن کیا بڑے بڑے عقلائے دہر نے عورت کو شادی سے پہلے باپ کی محکوم شادی کے بعد شوہر کی محکوم اور شوہر کے مرنے کے بعد بڑے بیٹے کی محکوم قرار دیا۔

ہمارے اس دور میں جبکہ انسان علم و تہذیب کا بڑا دعویدار ہے عقلائے

دہر عورت کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں اس کی حیثیت اب بھی ایک ضمیمے کی سی ہے یا شہوت رانی کے لئے ہے۔

حکم و فیصل کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب عقل و دانش ہو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب حکمت ہو سکتا ہے؟ اس لئے جگہ جگہ اپنے آپ کو اس نے حکیم کہا ہے اور بتایا ہے کہ تم نہیں سمجھتے جیسا کہ اللہ سمجھتا ہے تم نہیں جان سکتے جیسا کہ وہ تمہارے خیر و شر کو جان سکتا ہے ارشاد ہے **لَا تَعْلَمُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا**۔ تم نہیں جانتے کہ کون تمہارے لئے زیادہ نافع ہے۔

شراب کے بارے میں اس کا فیصلہ ہے کہ اس میں نفع کم اور ضرر زیادہ ہے۔ اس دور کے عقلائے دہر کی اکثریت شرابی ہے اور چونکہ یہ ام الخبائث ہے اسی لئے دنیا کا امن و امان ڈانواں ڈول ہے۔ حکومتیں شرابیوں کے ہاتھوں میں ہیں اور تقریباً" سارا نظام عالم شرابی چلا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بعد حکم و فیصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی لئے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ رسول جس چیز سے روکے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دے اسے لے لو۔ اسی لئے فرمایا ہے **مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ** کسی مومن یا مومنہ کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول فیصلہ کر دیں تو وہ صاحب اختیار بن بیٹھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ایک یہودی اور مسلمان میں کسی بات پر اختلاف ہوا تو وہ فیصلہ کرانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا تو وہ مسلمان بولا چلو عمرؓ سے فیصلہ کراتے ہیں۔ وہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہودی نے سارا ماجرا بیان کیا تو حضرت عمرؓ اندرون خانہ گئے اور تلوار لا کر مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ اور فرمایا جو شخص رسول خدا کا فیصلہ نہ مانے اس کے بارے میں یہی فیصلہ ہے۔ (واضح رہے یہ شخص منافق تھا)

اللہ اور رسول نے ہماری زندگی کے بارے میں جو فیصلہ دیا ہے وہ ہمیں قبول کرنا چاہیئے۔ اپنی رائے نہیں چلانی چاہیئے۔ بعض مرد اور عورتیں یہ کہتے ہیں

کہ ہم فلاں بات نہیں مانتے۔ یہ لوگ **اَفَتُؤمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** کے مصداق ہیں کہ ہم یہ تو مانتے ہیں مگر وہ نہیں مانتے تو ایسوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی سزا یہ ہے کہ دنیا میں ذلیل اور آخرت میں عذاب الیم۔

حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب قدرت ہو چونکہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اس لئے وہ حاکم مطلق ہے۔ اگر **نعوذ باللہ** وہ قادر نہ ہوتا تو حاکم بھی نہ ہوتا۔ اب اس کے سوا جتنے بھی حاکم ہیں وہ حاکم مجازی ہیں کیونکہ وہ قادر مطلق نہیں ہیں لہٰذا حاکم حقیقی نہیں بن سکتے البتہ حاکم مجازی بن سکتے ہیں کہ اس حاکم مطلق نے ہمیں اولی الامرو حاکم کہہ کر پکارا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنہیں ہم پر حاکم بنایا ہے خواہ وہ کیسے ہی ہوں ہمیں ان کا حکم ماننا چاہیئے بشرطیکہ خلاف حکم الٰہی نہ ہو اور ان کی تعظیم کرنی چاہیئے۔ اگرچہ وہ کردار کے اعتبار سے کمزور ہوں۔

صوفیۂ صافیہ حکام کا احترام کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے ہمیں بتایا ہے کہ قوم کے سردار کی تعظیم کرو۔ چنانچہ جو سرداران قبائل حاضر خدمت ہوتے تھے آپ ان کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ بڑوں کی عزت کا حکم ہے خواہ وہ عمر میں بڑا ہو یا علم میں یا عزت دنیوی میں۔

صوفیۂ صافیہ حکومت کے معمولی دنیوی احکامات کی خلاف ورزی کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں جیسے ٹریفک وغیرہ کے قوانین ہیں عالم ہوں یا جاہل مہذب ہوں یا غیر مہذب ان جیسے قوانین کی پابندی ہم لوگ نہیں کرتے۔ جہاں نوپارکنگ لکھا ہوتا ہے وہیں گاڑی کھڑی کرتے ہیں۔

اہل تقویٰ و طہارت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملکی قوانین کی پابندی کریں۔ ایسے قوانین جو شریعت سے نہ ٹکراتے ہوں اور ایسے چھوٹے چھوٹے قوانین جن کا ابھی ذکر گزرا ان کی خلاف ورزی کرنا خلاف تقوی ہے ہمارے علماء و صلحا یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں چلو بھئی یہ کوئی شرعی حکم تھوڑی ہے حکومت کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ ان کی پابندی ضروری نہیں جہاں چاہتے ہیں سڑکوں پر

کاغذ ڈال دیتے ہیں بس سے اترے اور ٹکٹ بیچ سڑک پر پھینک دیا ہم صرف طہارت کا خیال کرتے ہیں نظافت کا نہیں حالانکہ نظافت بھی جزو ایمان ہے۔

بلاوجہ کسی بھی چھوٹے بڑے حاکم کی توہین کرنا گناہ ہے دوسروں کی عزت کرو تاکہ یہ لوگ تمہاری عزت کریں۔ حکام کے ساتھ ادب سے بات کرو کہ خدا نے انہیں ہم پر حاکم بنایا ہے۔

*

الحکیم جل جلالہ

حکیم مطلق کی ہر بات حکمت سے بھری ہوئی ہے ایک شخص آم کے درخت کے نیچے لیٹا تھا کہنے لگا اللہ میاں آم کے درخت پر تو اتنے اتنے چھوٹے پھل لگائے اور کدو کی معمولی سی نازک بیل پر اتنے بڑے بڑے کدو لگا دیئے۔ میں بناتا تو آم کے بلند درخت پر کدو لگاتا اور کدو کی بیل پر آم۔ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے سو گیا اتفاقاً ایک آم ٹپکا اور ناک پر لگا کہنے لگا اے خدا تیری قدرت کے قربان تیرا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

ابھی دو سال کی بات ہے میں اکثر سوچا کرتا تھا اللہ میاں نے جو ناک میں بال پیدا کئے ہیں بھلا ان کی کیا تک ہے؟ یہاں بال پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ ریزش بھری ہوئی ہے ایک روز کسی ڈاکٹر کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہا تھا اس نے لکھا تھا ناک کے بال کاٹنے نہیں چاہئیں یہ گردوغبار جراثیم کو سانس کی نالیوں میں جانے سے روک لیتے ہیں تب مجھے ان بالوں کی حکمت معلوم ہوئی ورنہ دل ہی دل میں اللہ میاں پر اعتراض کرتا رہتا تھا مگر کانوں کے بالوں کی تک ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ بھی شاید گردوغبار کے روکنے یا تذکیر و تانیث میں امتیاز کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

چونکہ میں عرصہ دراز تک دہریہ رہا ہوں لہٰذا میں خوب جانتا ہوں کہ دہریوں کو کس قسم کے اعتراضات و اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور ان کا تشفی بخش کیا جواب ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے کئی دہریہ دوستوں کو خدا کا قائل کیا اور یہ بات میرے لئے بہت ہی آسان ہے کوئی کتنا ہی کٹر دہریہ ہو میں ذرا سی دیر میں اسے خدا کا قائل کر سکتا ہوں ایک دفعہ میرا ایک دہریہ دوست کہنے لگا خدا کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ میں نے کہا آپ دنیا کی حقیر سے حقیر چیز کی

طرف اشارہ کریں تو میں اس سے خدا کی گواہی دلا سکتا ہوں یہ کون سی مشکل بات ہے کہنے لگا اچھا تو یہ جو میری ناک ہے اس سے خدائی کا اثبات کرو میں نے کہا دیکھو یہ ناک جو تمہارے منہ کے اوپر بنائی ہے کسی حکیم نے بڑی حکمت سے بنائی ہے کہ جو چیز بھی تمہارے منہ میں جائے یہ منہ کا داروغہ بتا دے کہ وہ سڑی بسی تو نہیں ہے بدبودار ہے یا خوشبودار۔ میرا یہ دوست بڑا ذہین تعلیم یافتہ اور حق کا متلاشی تھا اس نے مجادلہ نہیں کیا خاموش ہی ہو گیا اور قائل ہو گیا۔

ہم اپنے اعضا پر غور کرتے ہیں تو ان میں بڑی بڑی حکمتیں مضمر پاتے ہیں۔ حکیم مطلق کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں یہ بات تو میں برسوں سے جانتا ہوں کہ میرے اعضا احسن تقویم کا نمونہ ہیں اور ان میں بڑی بڑی حکمتیں بھری ہوئی ہیں مولا کریم نے ہمارے ہر عضو سے کم سے کم دو کام لئے ہیں اور بعض اعضا سے تو اتنے مختلف و متضاد کام لیئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کچھ دن ہوئے میں شیخ الرئیس بوعلی سینا کا قانون پڑھ رہا تھا شیخ نے جس باب میں اعضاء کی تشریح کی ہے میں حیران رہ گیا کہ اپنے اعضا کی ساخت پر پہلے بھی حیران تھا مگر القانون کے پڑھنے کے بعد تو میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی میں تو یہ سمجھتا تھا کہ فلاں پٹھا فلاں کام انجام دیتا ہے اور فلاں رگ یہ کام کرتی ہے مگر شیخ کی تشریح کو پڑھ کر اور زیادہ حیرانی ہوئی کہ کس حکمت سے اس نے اعصاب و اوتاد کو ایک دوسرے سے گزارا ہے اور کہیں کسی عصبے کا اول حصہ باریک رکھا ہے تو درمیان میں اسے موٹا کر دیا ہے اور پھر آخر میں باریک کر دیا ہے اور پھر اسے ٹیڑھا ترچھا گزار دیا ہے تاکہ دوسرے کی رگڑ سے محفوظ رہے پھر ایک ہی وتد کو کہیں پٹھے کے اوپر سے گزارا ہے کہیں نیچے سے اور کہیں مستقیم اور کہیں ٹیڑھا میڑھا۔ پشت کے مہروں کی ساخت کہیں کیسی کہیں کیسی؟ کہیں سوراخ کسی طرف کہیں کسی طرف تاکہ اعصاب و اوتاد محفوظ بھی رہیں اور ٹکرائیں بھی نہیں۔ میں اس طرح اگر تفصیل کرنے بیٹھ جاؤں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا قارئین اسی سے اندازہ لگا لیں گے۔ اور اعضاء کو تو چھوڑیئے صرف آنکھ ہی کو دیکھ لیجئے کتنے پردے اور کتنی باریکیاں رکھی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

؎ دیکھو اللہ ہے چھوٹوں کو بڑائی دیتا آسمان آنکھ کی پتلی میں دکھائی دیتا

اعضاء کی حکمتوں کو بیان کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور طول بیانی میرا مقصود نہیں ہے عقل مند کے لئے تھوڑا سا اشارہ کافی ہوتا ہے لہٰذا اس بحث کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

حکیم مطلق ہر آن مخلوق پر اپنی حکمت کی بارش کرتا رہتا ہے جیسے وہ رزق وغیرہ کی بارش کرتا رہتا ہے مگر سنگلاخ زمین میں حکمت کی باتیں ضائع جاتی ہیں عوام اور ان پڑھ جاہلوں کو بھی حکمت کی باتیں سوجھتی ہیں یہ اسی کے فیض سے ہوتا ہے مگر وہ طاقت بیان نہیں رکھتے یا صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے کیونکہ منطق و فلسفہ و بیان سے ناآشنا ہوتے ہیں پھر یہ کہ ہر ایک کو بقدر اس کے ظرف کے الہام ہوتا ہے۔ شاعر کو شاعرانہ زاہد کو زاہدانہ سیاسی آدمی کو سیاسیانہ اور اہل حرفہ کو ان کے حرفے کے مطابق۔

ایک فلسفی کہتا ہے کہ انسان کو سونے کی بالکل ضرورت نہیں مگر وہ نسلاً بعد نسلٍ عادی ہوگیا ہے اس جیسی بات کا الہام اگر جاہل آدمی کو ہو تو وہ کہتے ہوئے ڈرتا ہے کہ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے مگر وہ فلسفی تھا اس لئے جرائت کے ساتھ کہہ گیا میں نے ان پڑھ چودھریوں میں بڑے بڑے سیاسی لوگ دیکھے ہیں اور جاہلوں میں اچھے خاصے فلسفی۔ جتنے بھی فلسفی گذرے ہیں سب نے باقاعدہ کسی استاد سے تعلیم پائی ہے مگر جتنے بھی نبی گذرے ہیں انھوں نے کسی انسان سے تعلیم نہیں پائی مگر انکے مذاہب کی ہر بات فلسفیانہ ہے اور انکے مذھب کا ایک خاص فلسفہ ہے تو انھیں حکمت کی باتیں کہاں سے ملیں؟ ظاہر ہے حکیم مطلق سے۔

عربی میں مال کو خیر کہتے ہیں چنانچہ سورہ والعادیات میں ہے **وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ**، کہ انسان کو مال کی بڑی محبت ہے یہاں خیر کے معنی ظاہر ہے بھلائی یا نیکی کے نہیں ہو سکتے اور حکمت کو بھی قرآن نے خیر کثیر کہا ہے یعنی مال کثیر کہا ہے یعنی بڑی بھاری دولت سے تعبیر کیا ہے اگر **وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا** کے ساتھ **كَثِیْرًا** کا لفظ نہ ہوتا تو بات کچھ بھی نہ بنتی اسی لئے کثیرا لایا گیا ہے

تاکہ یہ خیر اس خیر کے برابر نہ ہو جائے جو لِحُبِّ الْخَيْرِ میں ہے۔
میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا ہے انہیں بڑی بھاری دولت سے نوازا ہے بسا اوقات میرے عالم دوست کہتے ہیں اللہ نے ہمیں مال نہیں دیا جاہلوں کو خوب دیا ہے تو میں ان سے بھی کہتا ہوں آپ کو تو وہ دولت دی ہے جو جاہلوں کو نہیں دی۔ بھائی علم کے سامنے مال کیا چیز ہے مال کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے تو جاہلوں کو تو کچھ بھی نہیں دیا جس پر تم رشک کرتے ہو حضرت علیؓ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا ۔ لنا علم وللجھال مال

ہم تقدیر الٰہی پر خوش ہیں کہ ہمیں علم دیا اور جاہلوں کو مال

حضرت رابعہ بصریؒ کے پاس بڑے بڑے صوفی آیا کرتے تھے ایک صوفی دنیا کی مذمت کرنے لگا رابعہ نے کہا جو کچھ بھی نہیں ہے اس کا تذکرہ ہی کیا یہی بات میں اپنے غریب عالم دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ بھائی مال تو کچھ ہے ہی نہیں تو اس کا ذکر ہی کیوں کرتے ہو۔

میں صوفیہ میں رابعہؒ اور جنیدؒ کے اقوال سے بہت متاثر ہوا ان دونوں کے اقوال فلسفہ ہوتے ہیں ایک صوفی دنیا کی مذمت کرتا ہے تو دوسرا اور نمک مرچ لگا دیتا ہے اور اس طرح صوفیہ میں دنیا کی مذمت ہوتی رہتی ہے جسے وہ کارِ ثواب سمجھتے ہیں مگر رابعہؒ نے تو جڑ ہی کاٹ دی فرمایا جو ہے ہی نہیں اس کا کیا ذکر کرتے ہو واہ! کیا بات کہی ہے یہی بات میں اہل علم سے کہا کرتا ہوں کہ جو کچھ ہے ہی نہیں اس کا ذکر ہی کیا ورنہ ایک عالم مال کی مذمت کرتا ہے تو دوسرا اور اضافہ کر دیتا ہے اور تیسرا اور اس طرح اہل علم کی مجلس میں بجائے علم کے مال کا ذکر در آتا ہے۔

ایک دفعہ موسم سرما آگیا بیوی بچوں کے کپڑوں جوتوں وغیرہ کے لئے پیسے مانگنے لگی پیسے تھے نہیں میں اللہ سے شکایت کرنے لگا تو نے میرے فلاں پبلشر کو لاکھوں دیا اور مجھے کچھ بھی نہیں اس پبلشر نے مڈل سکول کے لئے منظور شدہ میری چار کتابوں کی ایک سال کی رائلٹی پانچ روپے گیارہ آنے بھیجی تھی فرمایا تجھے

مال کیسے مل سکتا ہے تو رات دن مال کو ٹھکراتا ہے اور وہ رات دن مال کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے نہ عزت و آبرو کی پرواہ نہ آرام کی نہ ایمان کی نہ حرام کی نہ حلال کی اور تو مال کے لئے ذرا سی بات بھی طبیعت کے خلاف برداشت نہیں کرتا۔

حکیم مطلق کی حکمتوں کے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں پھر بھی بات کہیں ختم نہ ہو اس کی کچھ حکمتیں ایسی ہیں جن تک ہمارے علم و عقل و روحانیت کی رسائی ہو سکتی ہے مگر بہت سی حکمتیں ایسی بھی ہیں جہاں تک نہ علم و عقل کی رسائی ہو سکتی ہے نہ ہماری روحانیت کی دیکھو موسیٰ اپنے وقت کے عالم یگانہ' عارفِ یکتا اور روحانیت کے مرتبۂ عظمٰی والے تھے مگر حضرت خضرؑ کے سامنے طفل مکتب بن کر رہ گئے اور طفل مکتب بھی کیسے؟ ایسے طفل مکتب جو کچھ بھی نہ سمجھ سکے بالاخر استاد نے اپنے مکتب سے ان کا نام ہی خارج کر دیا کہ یہ تو کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

اس قسم کے اسرار قدرت اور حکمتیں ایسی ہیں جنہیں مدرسوں اور کالجوں کے پڑھنے پڑھانے والے نہیں سمجھ سکتے صرف روحانی لوگ ہی کچھ کچھ سمجھ سکتے ہیں اور وہ اگر ان باتوں کو بیان کرتے ہیں تو لوگ انہیں جھوٹا مفتری طالب شہرت و عزت و جاہ سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے دشمن ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہوئی کہ لوگوں نے پیغمبروں کو قتل کیا۔

*

الحلیم جل جلالہٗ

علمائے فن اخلاق نے لکھا ہے کہ غصہ شیر ہے جو اپنے مقابل کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھ کر ہی خوش ہوتا ہے اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ زندگی میں سیکڑوں ایسے موقع آئے کہ کسی شریر نے بلاوجہ مجھے ستایا بلاوجہ میں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ میں اس کی اس حرکت کو بلاوجہ سمجھتا تھا۔ نہیں واقعتاً زندگی میں ایسے کئی مواقع آئے کہ حقیقتاً بالکل بے وجہ کسی نے مجھے ستایا تو مجھے بڑا غصہ آیا جو ایک فطری بات تھی اور میں اس کی اس خفیف سی حرکت پر اس کے قتل کر دینے سے کم پر راضی نہ ہوا مجھے اس وقت سولی پر چڑھنا بھی آسان اور گوارا معلوم ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ نیکی کی یا کچھ بھی نہیں کیا تو اس نے ایسا کیوں کیا؟ مگر اللہ تعالیٰ نے حلم کو پیدا کر کے نہ معلوم کتنوں سے کتنوں کی جانیں بچا دی ہیں۔

انسان غلطی نسیان اور شرارت و عصیان کا پتلا ہے بہ تقاضائے فطرت کچھ نہ کچھ کر بیٹھتا ہے گذشتہ زمانوں کے بادشاہ اپنے درباریوں وزیروں اور نوکروں چاکروں کو ذرا سی بات پر بڑی سخت سزائیں دیتے تھے بس یونہی قتل نہیں کرا دیتے تھے کسی کو زمین میں گاڑ کر کتے چھڑوا دیتے تھے کسی کی کھال کھچواتے تھے کسی کو بوری میں بند کر کے اونچی عمارت سے نیچے پھکوا دیتے تھے کسی کو پنجرے میں بند کرا کے جسم پر شہد ملوا دیتے تھے تاکہ مکھیاں بھڑ وغیرہ اسے تنگ کریں اور رعایا کو حکم دیتے تھے کہ ان پر تھوکیں کسی کے کان ناک کٹوا کر سلاخیں ٹھکواتے تھے بادشاہان وقت پبلک سے بھی مجرموں کو پٹواتے اور تھکواتے تھے۔ بچہ سقہ کے کانوں میں میخیں ٹھونکی گئیں اور اسے مُثلہ کر کے مارا گیا الغرض پرانے زمانے میں مجرم کو بری طرح ستا ستا کر مارتے تھے اور اس دور ترقی

میں بھی کیا کچھ نہیں ہوتا کہ انسانیت آنکھیں موند موند لیتی ہے یہ تھا شاہان عالم کے انتقام و غضب کا حال۔

اب دیکھو بادشاہوں کے بادشاہ اس "الحلیم" کے غضب و انتقام کا حال۔ شیطان اور آدم و حوا نے نافرمانی کی تو فرمایا یہاں سے چلے جاؤ اگر وہ چاہتا تو انہیں سخت سے سخت سزائیں دیتا مگر اس "الحلیم" کے حلم نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔

آج کل سب سے ہلکی سزا یہ ہے کہ ہم مجرم سے کہہ دیتے ہیں "گیٹ آوٹ" سو اس "الحلیم" نے ان تینوں سے فرمایا "گیٹ آوٹ" جو ہلکی سے ہلکی سزا ہے اور جب آدم نے توبہ کی تو معاف کر دیا بلکہ تاج خلافت ان کے سر پر رکھ دیا اور شیطان کو اسی طرح مردود بارگاہ رہنے دیا۔

"الحلیم" کتنے عظیم حلم والا ہے قادر مطلق ہوتے ہوئے بھی بدلہ نہیں لیتا حالانکہ اس سے کوئی سوال تک نہیں کر سکتا کہ تو نے ایسا کیوں کیا ہم دن رات بے شمار نافرمانیاں کرتے ہیں اور وہ اپنے حلم کی دولت سے ہمیں مالا مال کرتے رہتے ہیں۔

دنیا میں کیسے کیسے بڑے گنہگار گزرے ہیں۔ مگر اس حلیم نے ان سے انتقام نہیں لیا کتنے ہی نمرود شداد اور فرعون گزرے جنھوں نے خم ٹھونک کر اس جیسے ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کی مخلوق پر ظلم کئے مگر اس "الحلیم" نے انہیں کچھ بھی نہ کہا سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے اس کے سفیروں کو ستایا اور مقابلہ کیا فرعون صرف فرعون موسیٰ ہی نہیں تھا اس سے پہلے بھی بہت سے فرعون گزر چکے تھے جو خدائی کے دعویدار تھے۔ اسی طرح نمرود اور شداد بہت سے گزر چکے تھے جو سب کے سب غضب الٰہی سے بالکل محفوظ رہے اور بندگان خدا پر خدائی کر گئے اور عیش کی زندگی گزار گئے۔

ایک ڈاکو لوگوں کی جان و مال کو لوٹتا ہے اور عیش کی زندگی گزار کر مرتا ہے۔ ایک ظالم بادشاہ بری طرح رعایا کا خون چوستا ہے عزت داروں کو بے عزت کرتا ہے طرح طرح کے ظلم ڈھاتا ہے اور عیش و عشرت میں بسر کر کے مرجاتا ہے ایک چور اور خائن لوگوں کے مال مزے لے لے کر کھاتا رہتا ہے اور اسے

کوئی گزند نہیں پہنچتا۔وہ اس کی مخلوق کو جو اس کی عیال ہے ستاتے رہتے ہیں اور وہ الحلیم سب کچھ دیکھتے اور جانتے چشم پوشی کرتا رہتا ہے وہ بڑا بھاری حلیم ہے۔

چونکہ وہ جبار و منتقم بھی ہے لہٰذا کبھی کبھی کوئی ظالم اس کی ان صفات کی گرفت میں آجاتا ہے۔ ورنہ عموماً سب پر اس کی صفت حلم سایہ فگن رہتی ہے۔ اپنی اس صفت سے بعض انسانوں کو بھی اس نے بڑا حلم عطا کیا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے پتھروں سے ایڑیاں لہولہان کر دی جاتیں دانت شہید کر دیئے جاتے کہ روئے مبارک خون سے تر ہو جاتا۔ پھر بھی آپ ان کے حق میں دعا ہی کرتے آپ کو اور آپ کے دوستوں کو ستایا جاتا اور لوگ کہتے کہ آپ بددعا کریں تو فرماتے میں بددعا کرنے کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ وطن جو ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے کہیں اور ٹھکانہ کیا تو وہاں بھی چین نہ لینے دیا مگر جب وہ آپ کے قبضہ میں آ گئے تو فرمایا جاؤ آرام سے رہو۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم کے واقعات تو بے شمار ہیں ہی اصحابؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی حلم کے پیکر تھے۔ اہل عرب میں اَحْنَفْ بن قیس حِلم میں ضرب المثل تھا چنانچہ اہل عرب اگر کسی کے حلم کی تعریف کرتے تو کہا کرتے تھے (ترجمہ) فلاں شخص اَحْنَفْ سے بھی زیادہ حلیم ہے اصحابؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے حلیم مشہور تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی قبیلے کا سردار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آیا آپ نے مجھ سے فرمایا انہیں فلاں صحابی کے ہاں لے جا کر مہمان بنا دو میں اسے لے کر گیا راہ کی گرمی اور تپش سے میرے پاؤں جلنے لگے وہ اونٹنی پر سوار تھا میں نے کہا چچا دھوپ سخت ہے میرے پاؤں جلتے ہیں مجھے اپنے پیچھے بٹھالو وہ بولا تو اس قابل نہیں کہ سرداروں کا ردیف بنے میں نے کہا چچا اپنے جوتے مجھے دے دیجئے کہ پہن لوں اس نے کہا تو اس قابل نہیں کہ سرداروں کے جوتے پہنے۔ البتہ میری اونٹنی کے

سائے میں چل سکتا ہے پھر وہ زمانہ آیا کہ میں خلیفہ وقت بنا تو وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا میں نے اسے اپنے برابر اپنی مسند پر بٹھایا اور کچھ نہ کہا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حلم کا ایک اور واقعہ تاریخ کی کتب میں مذکور ہے انہوں نے ایک قدیم انصاریؓ کو مال غنیمت میں سے کچھ رقم بھیجی تو انہیں کچھ خفت محسوس ہوئی کہ مجھے میرے رتبہ سے کم بھیجی ہے اپنے بیٹے سے کہا جاؤ یہ رقم حضرت امیر معاویہؓ کے منہ پر مار آؤ بیٹا دربار خلافت میں گیا اور جو کچھ باپ نے کہا تھا بیان کر دیا تو حضرت امیر معاویہؓ نے مسکراتے ہوئے فرمایا بھتیجے! ذرا اپنے چچا کے ساتھ نرمی برتنا جیسے انہوں نے فرمایا ہے کر لے اور اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر فرمایا مار! اور بہت کچھ انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔

حضرت علیؓ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک مقابل حریف کو پچھاڑا سر تن سے جدا کرنا چاہتے تھے کہ اس نے روئے مبارک پر تھوک دیا تو اس کے سینے پر سے کھڑے ہو گئے کہ اس قتل میں نفس کی خواہش شامل نہ ہو جائے۔

حضرت حسنؓ کو کسی نے سب و شتم کی تو آپ نے اسے کچھ رقم بھجوائی وہ بڑا شرمندہ ہوا اور کہا بے شک آپ نواسہ رسول ہیں۔

حضرت زین العابدینؒ کا قصہ مشہور ہے کہ غلام سے گرم گرم شوربا آپ پر گر گیا تو اسے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ آزاد کر دیا اور ایک معقول رقم بھی اسے دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے قاتل غلام سے کہا بھاگ جا ورنہ تجھے لوگ مار ڈالیں گے۔

حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کی خانقاہ میں ایک قلندر رہتا تھا معلوم نہیں کیوں اس نے ان پر چھری کے پے درپے وار کئے تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا آپ نے اسے معاف کر دیا اور فرمایا اسے کچھ دے دینا کیونکہ چھری سے وار کرنے میں اسکے ہاتھوں کو تکلیف ہوئی ہو گی۔ کسی حلیم کا مشہور شعر ہے

؎ وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيمِ يَسُبُّنِي   فَمَضَيْتُ ثُمَّ قُلْتُ لَا يَعْنِيْنِي

(ترجمہ) ایک کمینے کے پاس سے میں گزرا جو مجھے گالیاں دے رہا تھا تو میں چلا آیا

اور دل میں کہا کسی اور کو گالیاں دیتا ہو گا۔ قرآن و حدیث میں حلم و عفو کی بڑی تاکید کی گئی ہے اَحنَفؒ بن قیسؓ فرمایا کرتے تھے جب مجھے کوئی شخص تکلیف دیتا ہے تو دیکھتا ہوں اگر وہ مجھ سے بڑا ہے تو میں اس کا احترام کرتا ہوں اور اگر مجھ سے ادنیٰ ہے تو اپنے نفس کو اس کے ساتھ ملوث ہونے سے برتر کرتا ہوں احنف صرف تحمل کی وجہ سے اپنی قوم کے سردار بن گئے تھے ان سے کسی نے دریافت کیا آپ نے تحمل کس سے سیکھا؟ فرمایا قیس بن عاصم سے ہم انکے پاس حلم و بردباری سیکھنے اس طرح جایا کرتے تھے جیسے تم لوگ فقہا کے پاس فقہی مسائل سیکھنے جاتے ہو ایک دن میں ان کی خدمت میں گیا ان کے سامنے ایک قاتل طوق در گلو لایا گیا جس نے ان کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا یہ قاتل ان کا بھائی تھا فرمایا تم لوگوں نے میرے بھائی کو خوف زدہ کر دیا اسے چھوڑ دو اور مقتول کی ماں ام ولد کو اس کی دیت دے دو کیونکہ وہ ہماری قوم سے نہیں ہے پھر یہ شعر کہے۔

اقول للنفس تَأُسَّاً وَ تَعزِيَۃً　　احدی یدی اصابتنی ولم ترد

(ترجمہ) میں دل کو تسلی دینے کے لئے کہہ رہا ہوں میرے ایک ہاتھ نے بلا ارادہ دوسرے ہاتھ کو مار دیا

کلاھما خلف لمن فقد صاحبہ　　ھنا اخی حین ادعوہ وھنا ولدی

دونوں ایک دوسرے کے مرنے پر اس کی جگہ پر کر سکتے ہیں یہ میرا بھائی ہے اور وہ مقتول میرا بیٹا احنفؒ کہا کرتے تھے حلم مجھے ایک پورے لشکر سے مستغنی کر دیتا ہے۔

مامون الرشید حلم و بردباری میں مشہور تھا جب اس کے چچا ابراہیم بن مہدی نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اہل بغداد نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مامون الرشید کو چھوڑ دیا تو خراسان میں مامون کو اس بات کی اطلاع دی گئی مامون نے عراق کا رخ کیا وہ بغداد پہنچا تو ابراہیم روپوش ہو گیا اور بغدادیوں نے مامون کے ہاتھ پر بیعت کر لی مامون اس کی تلاش میں رہا حتیٰ کہ اسے گرفتار کر لیا جب وہ سامنے آیا تو کہا السلام علیک یا امیرالمومنین ورحمتہ اللہ وبرکاتہ مامون نے کہا تجھ پر سلامتی نہ ہو شیطان نے تجھے گم راہ کر دیا تھا ابراہیم نے کہا چاہے تو

قصاص لے لے اور چاہے تو معاف کر دے عفو' تقوی کے زیادہ قریب ہے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف قرابت ہے اور عدل وسیاست رکھتے ہو اللہ نے آپ کو ہر مجرم پر فوقیت دی ہے جس طرح کہ ہر مجرم کو آپ سے کم تر رکھا ہے اگر معاف کر دو گے تو یہ آپ کا احسان ہو گا۔مامون نے جو یہ باتیں سنیں تو آنکھوں میں آنسو بھرلایا اور کہا اے ابراہیم! ندامت توبہ ہے اور عفو الٰہی تیری امیدوں سے بھی بڑھ کر ہے اچھا جاؤ کوئی بات نہیں۔ پھر حکم دیا کہ بیڑیاں کھول دی جائیں حمام کرایا جائے اور اس کی حالت کو درست کیا جائے پھر خلعت دی جائے اس کی تمام جائداد و اموال جو ضبط کر لئے تھے واپس کر دیئے۔

ایک بادشاہ نے اپنے خصوصی ارکان دولت کی دعوت کی ایک خادم سے ذراسا شوربا بادشاہ کے دامن پر گر گیا تو اس نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے غلام نے جو یہ بات سنی تو شوربے کا سارا پیالہ بادشاہ کے سر پر انڈیل دیا بادشاہ نے کہا ارے تو نے یہ کیا کیا کہنے لگا آقا یہ میں نے اس لئے ایسا کیا ہے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ غلام کو ذرا سی خطا پر قتل کرا دیا لوگ آپ کو ظالم نہ کہیں مگر اب تو اگر کوئی سنے گا تو کہے گا غلام نے بڑی بے ادبی کی تھی۔ لہٰذا قتل کرا دیا تو ٹھیک ہی کیا۔ بادشاہ نے اس کی یہ بات سنی تو کہا ارے بد کردار اور حسن اعتذار والے غلام! جا میں نے تجھے معاف کیا اور آزاد کیا پھر لور بہت سے انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا۔

حدیث میں آیا ہے اخلاق الٰہی اختیار کرو یہ حکم ایسی ہی صفات الٰہی کے بارے میں ہے ۔ البتہ جو صفات صرف اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تکبر و جبر وغیرہ ان کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

*

الحمید جل جلالہ

لائق حمد و ستائش صرف اسی "الحمید" کی ذات پاک ہے جس نے حمد کو پیدا کیا جس نے اپنی کتاب کو الحمد سے شروع کیا جس کے معنی ہیں ساری تعریفیں جتنی بھی ہیں اسی کے لیے ہیں جو اللہ رب العالمین ہے۔

اس نے اپنی تعریف کی ابتداء "رب العالمین" سے کی یعنی وہ ذات جو سارے جہانوں کی پرورش کنندہ ہے اور اپنی تعریف کا اختتام "مالک یوم الدین" پر کیا یعنی جو روز جزا کا مالک ہے تو پھر اور کیا رہ گیا وہ پروردگار عالم ہے اور روز قیامت کا مالک ہے۔ وہ ابتداء کا بھی مالک ہے اور انتہا کا بھی

اپنی حمد کے ابتداء و انتہا کے درمیان وہ الرحمان الرحیم لایا ہے جو بہت سی صفات پر مشتمل ہے گویا باقی محامد دونوں کے درمیان آ گئے اور رحمان و رحیم جیسی بقیہ صفات ان دونوں محامد کے درمیان ساری کی ساری آ گئیں۔

قرآن شریف میں حمیدا صرف ایک جگہ آیا ہے باقی مقامات پر حمید اور "الحمید" آیا ہے چنانچہ پانچویں پارے کے ساتویں رکوع میں ہے

ترجمہ:۔ اللہ غنی و حمید ہے

پارہ سوم رکوع پنجم میں ہے۔ ترجمہ:۔ جان لو کہ اللہ غنی و حمید ہے۔

بارہویں پارے کے سترہویں رکوع میں ہے۔ ترجمہ:۔ وہ حمید و مجید ہے تیرہویں پارے کے رکوع میں ہے

ترجمہ:۔ عزیز و حمید کی راہ کی طرف اسی پارے کے چودھواں رکوع میں ہے۔

ترجمہ:۔ بے شک اللہ غنی و حمید ہے۔

"وہ جو بعد از خدا بزرگ ہیں" اپنے آپ کو عاجز دیکھ کر فرماتے ہیں **لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ** "میں تیری تعریف نہیں کر سکتا

تیری تعریف وہ ہے جو تو نے خود کی" تو پھر کس کا حوصلہ کہ تعریف کا حق ادا کر سکے

کہہ سکے اس کو کون کیسا ہے
آپ ہی جانتا ہے جیسا ہے۔

فرماتے ہیں۔

اس کا جو وصف ہے سو کامل ہے
نہ کسی سے جدا نہ شامل ہے

فرماتے ہیں۔

اس کی ثناء میں ہر دم مصروف رکھ زبان کو
اک روز بے صدا ہوگا آخر یہ ساز تیرا

اس کی حمد و ثناء سارا جہاں کرتا ہے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں

ہر مرغ باغ تیری تسبیح پڑھ رہا ہے
ہر برگ کی زبان سے سنتا ہوں نام تیرا

ہو شوق مرتے دم بھی اے خوش خرام تیرا
آنکھوں میں دم ہو اپنا لب پر ہو نام تیرا

مذکورہ بالا حدیث کے مضمون کو کئی شعراء نے لیا ہے

حضرت انجم فرماتے ہیں

مقدور کیا جو وصف خدائے علیم ہو
یارا نہیں، جو شرح الف لام میم ہو

حضرت اعجاز نے بھی یہ مضمون باندھا ہے

ثناء خدا کی بشر سے ہو، یہ نہیں ممکن
بشر ثناء کے نہ قابل نہ ہے زبان بشر

لے رہا ہے غنچہ غنچہ کھل کے نام اللہ کا
بھر رہا ہے پتہ پتہ دم مدام اللہ کا

حضرت احسن فرماتے ہیں

کون پائے کنہہِ ذاتِ کبریاء
چشمِ بینا میں بھی بینائی نہیں

حضرت ارشد فرماتے ہیں۔

؎ عذر ”لا علم لنا“ جب کہ فرشتوں نے کیا
تیری توصیف، میں اے پاک خدا کیونکر کروں

ولی دکنی فرماتے ہیں۔

؎ تیری تعریف کرتے ہیں ملائک
ثنا تیری کہاں حد بشر ہے

نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں۔

؎ کیا ہدہدوں کی حق حق، کیا فاختاؤں کی ہو ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھکو کیا پنکھ کیا پکھیرو

اس کی ”تسبیح و تقدیس“ ہر چیز کرتی ہے مگر اسے صاحب دل ہی سن سکتے ہیں مندرجہ بالا بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے چونکہ شعراء کی حس بہت تیز ہوتی ہے لہٰذا انہوں نے بھی اس بات کا مشاہدہ کیا مذکورہ بالا اشعار میں بہت سی کام کی باتیں ہیں اس لیے درج کیے ہیں۔

قرآن شریف میں ہے۔

ترجمہ:۔ ہر چیز اس کی تسبیح کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ وحوش و طیور آپس میں باتیں کرتے ہیں مگر ہم ان کی بولی کو نہیں سمجھتے جیسے ایک ملک کے انسان دوسرے ملک کے انسان کی بولی کو نہیں سمجھتے اور نئی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حشرات الارض بھی ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ درخت بھی ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں تو جب یہ سب بولتے ہیں تو ”تسبیح و تحمید“ بھی کرتے ہوں گے مگر ہم ان کی ”تسبیح و تحمید“ کو نہیں سمجھ سکتے قرآن شریف کا یہ کہنا **وَلٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ** صحیح ثابت ہوتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ اسلام نے فرمایا۔

ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پرندے بولتے ہیں جب بولتے ہیں تو "تسبیح و تحمید" بھی کرتے ہوں گے جیسے ہم کھاتے پیتے گاتے بجاتے لڑتے جھگڑتے حوائج ضرور یہ سے نمٹتے اور برے برے کام کرتے بھی "تسبیح و تہلیل" کرتے ہیں یہ بھی ایسے کام کرتے ہیں اور "تسبیح و تہلیل" بھی کرتے ہیں عرصہ دراز ہوا میں محمد خاں ڈاکو سے اس کی جائے رہائش پر ملا تھا میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بھی خدا اور رسول کو یاد کرتے ہیں جیسے ہم یاد کرتے ہیں مگر پولیس کی آئے دن کی بلا وجہ کی گرفت نے ایک غریب چور کو ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا تھا تو وہ خواہ کیسا ہی قاتل یا ڈاکو کیوں نہ ہو خدا کو یاد کرتا ہے اسی طرح درندوں کی وحشت و بربریت سے اور و حوش و طیور کی بے عقلی سے آپ یہ سن کر تعجب نہ کریں کہ یہ کیا "تسبیح و تہلیل" کرتے ہوں گے بلکہ سب اس کی حمد بیان کرتے ہیں مگر تم سمجھ نہیں سکتے۔

ہر باغ مرغ تیری تسبیح پڑھ رہا ہے
ہر برگ کی زبان سے سنتا ہوں نام تیرا

*

الحیُّ جل جلالہ

ہمارا معبود زندہ ہے اور زندہ رہیگا۔ جبکہ دوسرے مذاہب کے معبود مردہ ہیں اور اگر ایک دو زندہ ہیں تو باقی مردہ ہیں مگر ہمارا معبود ایک ہی ہے اور وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے تو اس کی زندگی کیسی ہے؟ آیا اس کی زندگی ایسی ہی ہے جیسی ہماری ہے یا ایسا نہیں ہے؟ ہم جس طرح اس کی ذات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس کی صفات کے بارے میں بھی تقریبا کچھ نہیں جانتے کہ وہ کیسے دیکھتا اور سنتا ہے آیا آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے جیسے ہم دیکھنے کے لیے آنکھوں کے محتاج ہیں اور سننے کے لیے کانوں کے مرہون منت ہیں؟

بعض مذاہب اسے کانوں اور آنکھوں والا مانتے ہیں مسلمانوں میں بھی ایک ایسا فرقہ تھا جو اب ناپید ہو گیا ہے وہ کہتا تھا کہ اللہ کے ہاتھ پاؤں آنکھیں اور کان وغیرہ ہیں کیونکہ قرآن میں اس کے ہاتھ پاؤں کا ذکر آتا ہے بہرحال یہ تو ماننا پڑے گا کہ وہ زندہ ہے' کیونکہ زندہ ہستی ہی دوسروں کو زندگی بخش سکتی ہے' جو ذات خود زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کسی کو زندگی بخش سکتی ہے؟ جو شخص خود جاہل ہو ' وہ کیسے کسی کو عالم بنا سکتا ہے؟ جو شخص صفت نجاری سے محروم ہو وہ کیسے میز کرسی بنا سکتا ہے الغرض جس میں خود کوئی کمال نہ ہو وہ دوسرے میں کیسے کوئی کمال پیدا کر سکتا ہے؟

اس نے اپنی روح ہمارے اندر ڈالی تو ہم صاحب روح ہو گئے چنانچہ فرماتے ہیں

"اے ملائکہ جب میں آدم میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے

سجدے میں گر پڑنا۔" حضرت عیسیٰ کو اس نے اپنی روح بتایا ہے و روح منہ جبریل علیہ السلام کو روح اللہ کہتے ہیں' اسی طرح قرآن وغیرہ کو روح کہا گیا ہے "اترتے ہیں ملائکہ اور روح اس شب میں' اور روح کیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے امر ربی ہے۔"

زندگی کے اتنے کثیر انواع و اقسام ہیں کہ ہم ان کا احاطہ نہیں کرسکتے اور بعض مخلوقات کی زندگی کے بارے میں تو ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں کہ ان کی زندگی کا کیا نہج ہے' جنات یا فرشتے' شیاطین یا بلائیں کیسے زندہ ہیں کوئی نہیں بتا سکتا' دور کیوں جائیے آس پاس کی چیزوں کو دیکھئے تو زندگی کے مختلف رنگ نظر آئیں گے۔ ان پتھروں میں بھی زندگی ہے مگر بے حد دھیمی اور بے معلوم سی ہے اگر ان میں زندگی نہ ہوتی تو یہ ہتھوڑا مارنے سے چور' چور نہ ہوجاتے جہاں کہیں تاثر اور اثر پذیری ہے وہاں احساس ضرور ہے اور جہاں احساس ہے' وہاں زندگی ہے معدنیات آگ سے پگھل جاتے ہیں معلوم ہوا ان میں اثر پذیری ہے اور اثر پذیری دلیل حیات ہے کہ وہ تیز گرمی کو برداشت نہ کرسکنے کی بنا پر اپنی زندگی کھو بیٹھتے ہیں' جیسے اور چیزیں جل کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں مگر ان میں' زندگی و احساس اس قدر معمولی درجے پر ہے کہ تیز اثر کو قبول کرتے ہیں معمولی چیز سے اثر پذیر نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"بعض چٹانیں ایسی ہیں کہ خشیت الٰہی سے گر پڑتی ہیں"

ہم مخلوق کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے تو اس "الحی" کی زندگی کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں کہ اس کی زندگی کا کیا طور ہے؟ کیا وہ بھی مخلوقات کی طرح کھانے پینے کا محتاج ہے؟ مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے وہ غنی و صمد ہے اور اس جیسا کوئی نہیں ہے جب اس جیسا کوئی بھی نہیں تو اس کی زندگی بھی کسی کی زندگی کے مشابہ نہیں ہو سکتی۔

اس "الحی" نے پانی سے ہر چیز کو زندگی دی' فرماتا ہے' "ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی" پانی سبب حیات ہے' اگر انسان و حیوان و اشجار کو پانی نہ ملے تو وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں پانی کے بغیر زندہ رہنا محال ہے' یہ پتھر بھی

پانی یا نمی سے بنتے ہیں مگر عرصہ دراز لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی بڑی ہی دھیمی سی ہے کیونکہ مابہٖ "الحیات" یعنی پانی یا نمی کی ان تک رسائی نہیں ہوتی دنیا میں قاعدہ کلیہ کوئی بھی نہیں ہے یہ بات میں نے صرف بعض پتھروں کے بارے میں لکھی ہے تخلیق کا تو کوئی محدود اصول نہیں ہے بے شمار اطوار سے تخلیق ہوتی ہے۔

اس "الحی" نے پانی کو سبب حیات ٹھہرایا یہ پانی مختلف رنگوں' حالتوں اور مختلف کیفیتوں کے ہیں انسان و حیوان کی پیدائش پانی سے ہے یہ پانی مختلف رنگ کے ہیں' سپید' سرخ' پیلے' نیلے اور ہرے۔ نر کا پانی مادہ کے پانی سے مختلف رنگ کا ہے انڈوں کے پانیوں کا رنگ مختلف قسم کا ہے حیوانات میں تو یہ بات واضح ہے کہ انسان اور حیوان کی تخلیق پانی سے ہوتی ہے۔ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ

اشجار و نباتات کی تخلیق بھی پانی سے ہوتی ہے یہ پانی بعض بیجوں میں تو صاف دکھائی دیتا ہے' اور اکثر و بیشتر تخموں میں منجمد صورت میں ہوتا ہے اس "الحی" نے کسی کو پتلے پانی' رقیق رطوبت اور منجمد سے پیدا کیا اور کسی کو زمینی پانی' زمینی رطوبت اور زمینی نمی سے زندہ کر دیا بیشتر حشرات الارض کسی قسم کے مادے میں ذرا سا پانی یا رطوبت پہنچنے سے پیدا ہو جاتے ہیں جیسے موسم برسات میں عموماً" بغیر مادر و پدر کے ان گنت مخلوق پیدا ہو جاتی ہے۔

پھولوں اور پھلوں کی زندگی اور نشوونما اسی پانی سے ہوتی ہے جو ان کی رگوں میں دوڑتا ہے پھولوں کے چہروں پر تازگی دراصل اس پانی سے ہوتی ہے جو اس کی پتیوں میں سرایت کیئے ہوتا ہے جب یہ خشک ہو جاتا ہے تو پھول مرجھا کر گر جاتا ہے انسان و حیوان کے چہروں کی تازگی بھی پانی ہی سے ہے۔

ہمارے چہروں کی شگفتگی و تازگی پانی ہی سے ہوتی ہے اسی لیے عزت کو آبرو (آب رو) کہتے ہیں کہ جس شخص کی بے آبروئی کی جاتی ہے اس کے چہرے کی شگفتگی زائل ہو جاتی ہے کیونکہ جو آب و تاب اس کے چہرے پر ہوتی ہے ذلت اسے مٹا دیتی ہے۔

نیک شریف اور اچھے کردار والے لوگ خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق

رکھتے ہوں ان کے چہروں پر ایک خاص پانی کی چمک ہوتی ہے جس سے اگر وہ کیسی ہی انجانی بستی میں ہوں لوگ پہچان جاتے ہیں کہ یہ کوئی شریف آدمی ہے مجرم کے چہرے پر یہ آب رو نہیں ہوتی لہٰذا پردیس میں بھی وہ پہچانا جاتا ہے اچھا آدمی نہیں ہے چور' ڈاکو' جوئے باز' نشہ باز وغیرہ کے چہرے آب رو سے محروم ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر لعنت برستی ہے مگر متقی پرہیزگار تو **سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ** کا مصداق ہوتے ہیں معلوم ہوا پانی نہ صرف ہماری جسمانی زندگی کے لیے باعث رونق ہے بلکہ ہماری روحانی زندگی کا بھی آئینہ ہے۔

چونکہ پانی سبب حیات اور مابہ الحیات ہے اس لیے بہت سے امراض کا علاج پانی کے ذریعے کیا جا سکتا ہے شاید علاج بالماء ایجاد کرنے والے نے اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیا تھا کہ چونکہ ہماری زندگی کا دارومدار پانی پر ہے لہٰذا اس کے ذریعہ علاج کرنا مفید ہو سکتا ہے۔

مجھے نام یاد نہیں رہا انگریزی کے ایک مشہور ادیب یا شاعر کو ڈاکٹروں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تم مختلف مقامات کا پانی پیا کرو کیونکہ ڈاکٹر لوگ اس کے امراض شکم کے علاج سے عاجز آ گئے تھے تو وہ ساری عمر ایک گدھے پر اپنا سامان سفر رکھ کر ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا بعض شکمی امراض تو آب و ہوا کی تبدیلی سے بڑی جلدی درست ہو جاتے ہیں خصوصاً سات کنوؤں کا پانی ملا کر پینا بہت ہی مفید ہوتا ہے' سل دق کے مریضوں کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے سمندر کے پانی سے غسل کرنا جلدی امراض اور گنٹھیا وغیرہ کے دردوں میں مفید ہوتا ہے کیونکہ زندگی سمندر ہی سے پھوٹی وکان عرشہ' علی الماءاس کا عرش پانی پر تھا۔

میں چھ سات گھنٹے مسلسل بے حس و حرکت مراقبے میں روزانہ بیٹھا رہا کرتا تھا کثرت سے پیشاب آنے لگا بڑی اچھی اچھی دوائیں استعمال کیں ذرہ برابر فرق نہ ہوا ایک دفعہ سوات جانا ہو گیا منگورہ پہنچا سخت گرمی تھی میں نے ایک گلاس پانی پیا' کھانے میں دیر تھی صرف اس ایک گلاس پانی سے میری تکلیف دور ہو گئی میں نے کہا واہ مولا تیرے ایک گلاس پانی نے وہ کرشمہ دکھایا جو ہماری قیمتی معجونیں نہ کر سکیں سوات کے کسی بھی علاقے کا پانی میرے اوپر یہی اثر کرتا ہے

ایک دفعہ زیارت گیا چوبیس گھنٹے میں آٹھ بار کھانا کھایا پھر بھی بھوکا ہی رہا چنے چبا چبا کر گزارا کیا ایک دفعہ ایبٹ آباد کی الیاسی مسجد کا پانی پیا تو چند گھنٹوں کے بعد دماغ کے ایک ایسے مرض سے مستقل طور پر نجات مل گئی جسے بڑھیا سے بڑھیا خمیرے بھی دور نہ کر سکے تھے۔

سچ ہے اس کا یہ فرمان وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی)

*

الخافض جل جلالہ الرافع جل جلالہ

بلندی و پستی اسی کی ذات سے ہے وہ جسے چاہے بلند کر دیتا ہے اور جسے چاہے پست' ہم لوگ جو زمان و مکان اور جہات کے پابند ہیں اپنے ہی اعتبار سے باتیں کرتے ہیں ایسا چاہیئے بھی حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو انہیں اللہ تعالیٰ نے پستی کی طرف پھینک دیا' کیوں کہ پستی لغزش کرنے والے کا مقدر ہے اور بے گناہ فرشتوں کو عالم بالا میں رہنے دیا' کیوں کہ غیر مجرم کا مقدر بلندی ہے' گو بعض انسان قبولیتِ خداوندی سے فرشتوں سے بھی بلند ہو گئے۔

اللہ نے زمین کو پست بنایا اور آسمان کو بلند ' فلک کو بلندی سے سرفراز فرماکر نجوم سے اسے زینت دی مقدس روحوں کو بلند مقامات پر رکھا' فضا کو بلندی عطا کی ہمارے خیال کے اعتبار سے یہ سب بلند ہیں' معلوم نہیں ان بلندیوں میں اور کیا کیا پنہاں ہے' فلاسفہ کہتے ہیں جو کچھ نظر آتا ہے نظر کے سوا کچھ نہیں' بے شک ایسا ہی ہے مگر ہماری نظر کی ایک حد ہے' اس سے آگے وہ نہیں دیکھ سکتی ہو سکتا ہے کہ اس حد نظر سے پرے کچھ اور چیزیں ہوں' کیوں کہ اس" الرافع " نے اتنی بلندیاں پیدا کر دی ہیں کہ ہماری نظر ان بلندیوں کو نہیں پا سکتی اور تھک کر واپس آجاتی ہے۔

اس "الخافض" نے زمین کو پستی عطا کر کے پھر پستی در پستی عطا کر دی جیسے فضا میں رفعت در رفعت پیدا کر دی پست زمین پر بلند پہاڑ پیدا کئے اور ان کے اندر غار اور پستیاں پیدا کیں' پھر ان کی تہوں میں قسم قسم کی مخلوق پیدا کی طرح طرح کے جواہرات و معدنیات بھر دیئے' وہ زمین کو پست کرتا چلا گیا اور اس کی پستیوں میں قسم قسم کی چیزیں اور حیوانات پیدا کر دیئے' سمندروں کی گہرائیوں کو مخلوقات سے پر کر دیا اور ان کی تلی کے اندر طرح طرح کی چیزیں بھر دیں' کہ

اٹلانٹک کے برف کے نیچے اس "الخافض" نے تہ در تہ مخلوقات بنا دی ہیں۔

جس طرح مادیات میں بلندی و پستی ہے ارواح میں بھی بلندی و پستی ہے' روحِ سنگ پست ترین ہے۔ روحِ اشجار روحِ سنگ سے بلند ہے' روحِ اشجار سے روحِ حیوانات بلند ہے اور روحِ حیوانات سے روحِ انسان بلند ہے پھر انسانوں کی روحیں بھی مختلف درجات کی ہیں بعض انسانوں کی روحیں حیوانات کی روحوں سے بے حد قریب ہیں بعض کی درمیانی اور بعض مقدس بندوں کی بہت بلند ہیں اس نے ہر چیز میں پستی اور بلندی رکھی ہے۔

ہمارے جسم میں اس نے سر کو بلندی سے سرفراز فرمایا تو وہ سارے جسم پر حکومت کرتا ہے پیروں کو پست کیا تو وہ سر کا حکم ماننے پر مجبور ہیں' اسی طرح ہر ادنیٰ ہر اعلیٰ کا حکم ماننے پر مجبور ہے' سلاطین' امراء حکام کو بھی اللہ نے سر بلندی عطا کی' لہٰذا وہ اپنے ماتحتوں پر حکومت کرتے ہیں' کیوں کہ اللہ نے انہیں بہ نسبت ان کے پست بنایا ہے' اسی طرح پستی و بلندی کے بہت سے درجات ہیں۔

وہ "الخافض" جسے چاہے پست کر دیتا ہے اور جسے چاہے بلند کر دیتا ہے' بڑے بڑے سربلند سلاطین غلامی کرتے پھرے وہ ان کی بیگمات اور ان کی اولاد مونہہ چھپاتی اور گری پڑی' خدمت گاری کرتی پھری اور بہت سے گرے پڑے انسان اور غلام سلاطین زمانہ بنے۔

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بڑے بڑے زمیندار اور رئیسوں کو ہم نے زلزلے اور جنگ کے دوران بھیک مانگتے دیکھا ہے' بقول سعدی شیرازیؒ وہ لوگ "از بسترِ نرمش بر خاکسترِ گرم نشاند" (یعنی نرم و نازک بستروں سے اٹھا کر خاک پہ لا پٹخا) کا مجسمہ تھے۔

اس "الخافض" "والرافع" نے ایسی بلندیاں اور پستیاں پیدا کردی ہیں کہ انسان کی پشتیں گزر گئیں پستیاں اور بلندیاں اسی طرح اتھاہ رہیں مادی پستیاں ہوں یا روحانی مادی رفعتیں ہوں یا روحانی کسی کی کوئی حد نہیں انسان کتنی ہی مادی ترقیاں کرے پھر بھی اس کے سامنے ایک وسیع میدان نظر آتا ہے یہی

حال روحانی ترقیوں کا ہے کہ ان کی بھی کوئی حد نہیں ہے سارے علماء کا اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی روحانی ترقیاں حاصل کیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ پھر بھی آپ "مقام محمود" کے متمنی ہیں، اذان کے بعد جو مسنون دعاء پڑھی جاتی ہے اس میں اس بات کا ذکر ہے حدیث شریف میں ہے مقام محمود، صرف ایک شخص کو ملے گا مجھے امید ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا۔

یہی حال مادی اور روحانی پستیوں کا ہے اب پتہ چلا ہے کہ بحرِ منجمد جنوبی کی برف کی تہہ میں براعظم، پہاڑ، نباتات و جمادات و حیوانات پوشیدہ ہیں، ان گہرائیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے، اسی طرح روحانی پستی کی بھی کوئی حد نہیں ہے انسان گرتے گرتے شیاطین و حیوانات سے بھی نیچے گر جاتا ہے، متمدن ممالک کے حالات اور بلیو پرنٹ (BLUE PRINT) کے واقعات سننے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان حیوانوں سے بھی نیچے گر سکتا ہے تمام متمدن ممالک کے خاندان سوائے چند ایک شریف خاندانوں کے کوئی شخص گارنٹی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جسے اپنا فرزند سمجھتا ہے وہ واقعی اس کا فرزند اور اس کا صحیح وارث ہے ایک انگریز نے بیان کیا کہ میں جب بھی اپنے بچوں کو پیار کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کیا واقعی، یہ میری اولاد ہے؟ کیا واقعی یہ میری دولت کے جائز وارث ہیں؟

عربی میں **نجد** مرتفع زمین کو کہتے ہیں حجاز کا یہ صوبہ چونکہ بلندی پر واقع ہے لهذا **نجد** کہلایا، خفض و خافض و غائط پست زمین کو کہتے ہیں اس "الخافض" نے پست زمین پیدا کر کے، انسان و حیوانات و نباتات پر بڑا احسان عظیم کیا ہے عرب اور اس جیسے دیگر ممالک میں اور ہمارے ملک میں بھی بعض خطوں میں پست زمینیں نعمت غیر مترقبہ ہیں کہ ان میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے اور بستی کے انسان و حیوانات سارے سال اس سے سیراب ہوتے رہتے ہیں اور نباتات کی پیاس بجھتی رہتی ہے ترائی میں پانی کے جمع ہو جانے سے درخت اور سبزہ اگ جاتا ہے پست زمین اہل عرب کے لیے ایک نعمت ہے کہ وہاں گرمی کی شدت کم ہو جاتی ہے، ہم لوگ مکان بناتے ہیں تو مرتفع زمین کو پسند کرتے ہیں مگر اہل عرب پست زمین کو پسند کرتے ہیں ہم کوٹھی مکان بناتے ہیں، کرسی کو اونچا کر کے دو

چار سیڑھیاں بنانا پسند کرتے ہیں' اہل عرب ہمارے برعکس نیچے کو سیڑھیاں رکھتے ہیں' کربلا اور نجف اشرف کے اکثر و بیشتر مکانوں کا زینہ نیچے کو اترتا ہے کیوں کہ ترائی میں مکان ٹھنڈا رہتا ہے' جیسے قلعہ اٹک کا زینہ نیچے کی طرف اترتا ہے' ہمارے ملک میں بھی جب بجلی کے پنکھے وغیرہ نہ تھے ہر بڑے مکان میں تہہ خانہ ہوتا تھا' تاکہ گرمی سے بچاؤ رہے' یہ تہ خانے موسم گرما میں بڑا فائدہ دیتے تھے کیوں کہ پست زمین میں ہوتے تھے' جیسے آج کل جگہ کی قلت کی وجہ سے بڑی بلڈنگوں میں ایک منزل زمین کھود کر نیچے بنائی جاتی ہے' پست زمین کی پسندیدگی کی وجہ سے عربی میں حفضِ عیش خوش عیشی کو کہتے ہیں حالانکہ اس کا لفظی ترجمہ پست عیش ہے' رفعِ حاجت کے لیے بھی اہلِ عرب پست زمین کا رخ کرتے ہیں اسی لیے قرآن شریف میں آیا ہے **اَوْجَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ** یا تم میں سے کوئی پست زمین کی طرف سے لوٹے پھر عربی زبان میں غائط پاخانہ کو کہنے لگے۔

عربی زبان میں سرب تہہ خانے کو کہتے ہیں عبیداللہ بن زیاد کو ایک مفرور خارجی کی تلاش تھی' اس کے گورنر نے اسے چھٹی لکھی کہ میں نے اسے ابو العلاء کے سرب میں پالیا ہے اس دور میں نقطوں کا رواج نہ تھا' ابن زیاد کے سیکرٹری نے وہ خط سنایا تو کہا کہ میں نے اسے ابو العلاء کے شرب میں پالیا ہے یعنی شراب پینے والوں کے گروہ میں پالیا ہے تو ابن زیاد بہت ہنسا کہنے لگا بد بخت یہ شرب نہیں سرب ہے تو نے خوامخواہ نقطے لگا دیئے میں تو تمنا کرتا ہوں کہ کاش وہ شرابی ہوتا۔

الغرض اس الحافظ والرافع نے پست و بلند زمین پیدا کر کے مخلوق پر بڑا احسانِ عظیم کیا ہے۔

خداوندِ بالاؤ پستی توئی ——— ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

پستی و بلندی دنیا کی ہر شے میں ہے' جس طرح افراد پست و بالا ہوتے ہیں اقوام و مذاہب بھی پست و بلند ہوتے ہیں دیکھو دنیا میں بعض پست اقوام ہیں اور بعض بلند' بعض مذاہب پست ہیں اور بعض بلند بعض مذاہب بلند ہو کر پست ہو گئے۔

ـ اسلاف کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے۔

سمندروں کا مدو جزر' طوفانوں اور آندھیوں کا چڑھنا اور اترنا' صلح و جنگ کا اتار چڑھاؤ' دوستی و دشمنی کا کم اور زیادہ ہونا بتاتا ہے کہ ہر شے میں پستی و بلندی ہے اور حقائق بھی مدو جزر سے محفوظ نہیں ہیں' کبھی اشیاء کے بھاؤ چڑھ جاتے ہیں کبھی اتر جاتے ہیں۔ کبھی پیداوار بڑھتی اور کبھی گھٹ جاتی ہے آگ بلند ہوتی ہے تو پھر پست ہوتی ہے محبتیں۔ بڑھتی اور پھر گھٹ جاتی ہیں آلام و مصائب سربلند ہوتے ہیں اور پھر سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ ایک قوم سربلند کرتی ہے اور "ہم چو ما دیگرے نیست" کا راگ الاپتی ہے اور دوسری اقوام کو پست کر کے انہیں اپنا غلام بنا لیتی ہے ایک مذہب اٹھتا ہے اور دوسرے مذاہب کو نیچا دکھا کر چھوڑتا ہے انقلاب اٹھتے ہیں اور پھر بیٹھ جاتے ہیں۔

جو باتیں ایک فرد کو بلندی سے پستی کی طرف لاتی ہیں بعینہ وہی باتیں اقوام کو بھی بلندی سے پستی کے گڑھے میں ڈال دیتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ فرد اپنے مذاہب کی پابندی سے بلند ہوتا ہے خواہ اس کا کوئی بھی مذہب ہو لیکن ایسا شخص امانت دار' دیانت دار اور اخلاق حسنہ کا حامل نہ ہو تو وہ کتنا ہی اپنے مذہب کی عبادتوں کا پابند ہو بلند نہیں ہو سکتا اور لوگوں میں عزت نہیں پا سکتا مثلاً اگر کوئی شخص نماز روزے حج اور زکوٰۃ کا' پابند ہو مگر بددیانت' خائن اور دھوکے باز ہو تو وہ بلند نہیں ہو سکتا۔ یہی حال اقوام عالم کا ہے اپنے مذہب کی خواہ کتنی ہی پابند کیوں نہ ہو مگر معاملات و اخلاق میں ناپختہ ہو تو وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی' متمدن قوموں نے گو اپنے مذہب کو چھوڑ دیا ہے' مگر ان میں دیانت اور امانت' وقت کی پابندی' شوق عمل زیادہ ہے لہٰذا وہ سربلند ہیں' ہر گھر میں ان کی تیار کردہ دوائیں ہیں اس لیے کہ وہ جو کچھ دوا کی شیشی پر لکھتے ہیں اس میں جھوٹ نہیں ہوتا' یہ بات ہمارے اطباء اور دوا سازوں میں نہیں رہی تھی' لہٰذا وہ تجارت میں ذلیل ہو گئے' تجارت میں دیانتداری مسلمانوں سے اٹھ گئی تو وہ خوار ہو گئے اور دوسری قوموں کے محکوم بن گئے' وقت اور وعدے کی پابندی جیسی انگریزوں میں دیکھی بڑے سے بڑے عالم اور پیر فقیر میں بھی نہیں پائی' ہمارے

دوست احباب اچھے ہی لوگ ہیں' آنے جانے کے بارے میں وقت مقرر کرتے ہیں تو بالکل پرواہ نہیں کرتے ' اَوْفُوْبِالْعُقُوْدِ (قول و قرار کو پورا کرو) کو تو سارے مسلمان بھول چکے ہیں' صرف نماز روزے سے کیا ہوتا ہے جب تک کہ اخلاق درست نہ ہوں؟ یورپ و امریکہ وغیرہ کے باشندوں پر اعتراض کرتے ہیں جو چیزیں ان کے مذاہب اور مسلک میں جائز ہیں اور ہمارے مذہب میں جائز نہیں انہیں کیسے ان کے لیے معیار بنا سکتے ہیں۔

ولیکن خداوندِ بالا وپست
بعصیاں درِ رزق بر کس نہ بست

بُلندی اور پستی کا مالک ایسا ہے کہ گناہوں کی وجہ سے وہ کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا۔

الخلاق جل جلالہ

جس طرح ذات الٰہی کے بارے میں غور و فکر کرنے سے کچھ پتہ نہیں چلتا، اسی طرح اس کی صفات میں غور کرنے سے بھی حیرانی ہی رہتی ہے کتنا ہی غور کرو اس کی گہرائی تک رسائی نہیں ہوتی۔ اس قدر سائنس کی ترقی کے باوجود بھی یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ مرغی پہلے تھی یا انڈا؟ میں اس مسئلے پر کئی دن تک غور کرتا رہا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلے انڈا تھا۔ اس سے مرغی پیدا ہوئی، پہلے بیج تھے پھر درخت پیدا ہوئے یعنی پہلے خالق کائنات نے ہر قسم کے درختوں کے بیج پیدا کئے اور ان سے اس سرزمین پر درخت اگائے

درختوں کے بارے میں تو مجھے اس مسئلے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی کیونکہ میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اللہ تعالیٰ نے بیج پیدا کیے اور زمین نے ان سے درخت اگا دیئے مگر انڈے کے بارے میں یہ سوچ کام نہ دے سکی کیونکہ انڈا اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتا جب تک کہ مرغی یا پرندا اسے دس بیس دن تک اپنے پروں تلے رکھ کر سیتا نہیں ورنہ وہ گندہ ہو جاتا ہے۔

غور کرتے کرتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا وہ پہلا خیال غلط تھا کہ انڈا مرغی سے پہلے تھا بلکہ مرغی انڈے سے پہلے پیدا ہوئی اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل ہمیشہ فرع سے پہلے ہوتی ہے۔ مرغی اصل ہے اور انڈا اس کی فرع ہے۔ لہٰذا پہلے اللہ تعالیٰ نے مرغی پیدا کی اور پھر اس سے انڈا پیدا ہوا۔

میں اس دلیل سے مطمئن ہو گیا مگر دل میں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ نہیں مرغی کی اصل انڈا ہے۔ کیونکہ مرغی اس سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا خلاق عالم نے پہلے انڈا پیدا کیا اور پھر اس سے مرغی پیدا ہوئی اور اگر واقعی پہلے انڈا پیدا ہوا تو مرغی یقیناً اس کی فرع ہے اور انڈا اصل ہے۔

ان باتوں پر میں غور کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا کہ اصل مرغی ہے اور انڈا فرع ہے کیونکہ انڈے کو اصل ماننے میں بہت سی قباحتیں ہیں یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جانور کے انڈے پیدا کیئے ہوں اور ان سے جانور پیدا کیے ہوں بلکہ پہلے جوڑے پیدا کیے پھر ان سے نسل پھلی پھولی۔

اس نظریئے کے قائم کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ہر جانور انڈا نہیں دیتا بلکہ بچے دیتا ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ پہلے اس خالق و باری نے جوڑے پیدا کیے پھر ان سے نسل چلی کیونکہ یہاں انڈے والی بات بالکل نہیں چل سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مختلف قسم کے نطفے پیدا کیے ہوں اور پھر ان سے جانور پیدا ہوئے ہوں کیونکہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نطفے کس جگہ رہے اور ان کی پرورش کس طرح ہوئی؟ ہاں یہ بات تو ذہن میں آتی ہے کہ پہلے جانوروں کے ایک ایک جوڑے پیدا کیئے پھر ان کی مونثوں کے رحم میں نطفوں نے پرورش پائی اور نسل چلی۔

میرے اس خیال کی تائید تخلیق آدم سے بھی ہوتی ہے۔ آسمانی کتابوں کا تو یہی تصور ہے کہ پہلے ایک جوڑا پیدا ہوا اور پھر اس سے نسل چلی اگر انسان کے بارے میں یہ بات صحیح ہے تو حیوانات کے بارے میں بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے ہر جانور کا ایک جوڑا پیدا کیا اور پھر اس سے نسل چلی لہٰذا پرندوں میں بھی ایسا ہی ہوا کہ پہلے ان کے جوڑے پیدا ہوئے اور پھر انڈوں سے بچے نکلے، لہٰذا پہلے مرغی تھی اور پھر انڈا، پہلے درخت پیدا ہوئے اور پھر بیج۔

ابتدائے آفرنیش پر غور کرو تو دماغ چکرا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ تخلیق کی ابتداء سمندر سے ہوئی اور اس کی مخلوق سمندر سے باہر نکل کر ہیئت بدلتے بدلتے اس مرتبہ تک پہنچی اور رینگنے والے جانور پاؤں والے ہوگئے۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ، ''مولیٰ'' کی باتیں ''مولیٰ'' ہی جانے عقل کام نہیں کرتی اور علم ساتھ نہیں دیتا۔

اس سلسلے میں ہبوط آدمؑ پر غور کرنے لگا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی کیا صورت ہوگی؟ یہ تو ظاہر ہے کہ جنت یہاں سے اربوں میل دور ہوگی اگر

آدمؑ و حواؑ کو ان کے جسم کے ساتھ پھینکا گیا تو ان کی ہڈی پسلی کیسے سلامت رہ گئی؟ اور وہ کرۂ ہوا اور کرۂ نار وغیرہ کو پار کر کے زمین پر کیسے پہنچے؟

اور اگر آدمؑ و حواؑ کو اس کالبد خاکی کے ساتھ نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ ان کی روحوں کو بھیجا گیا تھا تو اس کے بعد کیا ہوا؟ الغرض بات بڑی پیچیدہ ہے اور جتنا غور کرو اس کی پیچدگی بڑھتی جاتی ہے

پھر سوال یہ ہے کہ جب آدمؑ و حواؑ زمین پر اترے تھے تو حضرت آدمؑ نے یہاں کھیتی شروع کردی تھی تو اس سے معلوم ہوا کہ یہاں پہلے سے جانور اور سبزہ و درخت وغیرہ تھے' تو پھر وہ ہبوط آدمؑ سے کتنے عرصہ پہلے پیدا ہوئے؟ اور کیا وہ بھی جنت ہی سے اتارے گئے تھے یا یہیں پیدا ہوئے تھے؟

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہبوط آدمؑ سے پیشتر یہاں ایک مخلوق آباد تھی تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں سب کچھ تھا۔ اور بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس آدمؑ سے پیشتر بھی اور کئی آدمؑ ہو چکے ہیں تو بات اور بھی گنجلک ہو جاتی ہے۔

پتہ نہیں چلتا کہ ابتدائے آفرینش کیسے ہوئی؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پانی ہی پانی تھا۔ پھر زمین پیدا ہوئی پھر پہاڑ' پھر سبزہ و درخت معدنیات وغیرہ اور جب یہ سب پیدا ہو گئے تو پھر حیوانات پیدا ہوئے۔ کیونکہ رزق کا پہلے پیدا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ حیوانات کیا کھائیں گے؟ اور جب ہر طرح کے حیوانات پیدا ہو گئے تب حضرت انسان پیدا ہوئے تاکہ وہ حیوانات وغیرہ کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کر سکے کیونکہ حیوانات سے پہلے انسان کی تخلیق سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لیے کہ انسان اس طرح حیوانات کا محتاج ہے' جس طرح کہ حیوانات نباتات کے۔

انسان بڑا معذور و مجبور سا ہے' ہر کام میں حیوانات کا محتاج ہے۔ کچھ ایسی صورت معلوم ہوتی ہے کہ پہلے خلّاقِ عالم نے ہمارے رہن سہن کے پورے بندوبست کئے اور پھر صاحب خانہ کو آباد کر دیا۔ جیسے کوئی شخص اپنے بچوں کے لیے گھر بناتا ہے' پھر اسے تمام ضروریات سے آراستہ کرتا ہے' پھر بیوی بچوں کو

لے کر گھر میں آتا ہے اور رہنا سہنا شروع کر دیتا ہے۔

اب اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ انسان اس تمام کائنات کی پیدائش کے لاکھوں بلکہ اربوں سال بعد پیدا ہوا۔ اس کی تخلیق، مخلوق کے ساتھ ساتھ ہرگز نہیں ہوئی اور اس کی تخلیق کے بعد قدرت نے سرزمین پر نئی تخلیق کا کام بند کر دیا۔

جب حضرت انسان پیدا ہو گئے تو انھوں نے اپنی عقل و فہم سے تخلیق کا کام شروع کر دیا اور ایک درخت کی قلم دوسرے قلم میں لگا کر نئے نئے درخت اور پھول بوٹے اور پھل پیدا کر دیئے آخر خلیفہ جو ٹھہرے۔

معلوم ہوتا ہے خچر جیسی قسم کے جانور بھی انسان ہی نے پیدا کیئے اور بے جان چیزوں کی تخلیق تو ظاہر ہے کہ بہت کچھ انسان کے ہاتھوں کی مرہون منت ہے کہ زمین تو زمین فضا میں بھی اس کے جہاز، راکٹ اور میزائل پہنچ گئے ہیں۔

اس خلّاق کا نظامِ تخلیق اس قدر حکیمانہ ہے کہ اگر لاکھوں بڑے بڑے فلسفی بھی یہ کہیں کہ یہ نظام کسی خدا نے قائم نہیں کیا بلکہ ایک "لاشعور فطرت" نے یہ سب کچھ بنایا ہے تو دل کسی طرح مطمئن نہیں ہوتا اور ہمارا "باشعور دماغ" اس "غیر شعور فطرت" کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اس نے بڑی حکمت سے تخلیق عالم میں جغرافیائی تقاضوں کا بڑی باریکی سے خیال رکھا ہے۔ ہر ملک کی آب و ہوا کے مطابق، جانور، پھل اور جڑی بوٹیاں پیدا کی ہیں۔ جہاں پانی کی قلت ہے وہاں اونٹ پیدا کر دیئے کہ وہ اپنے شکم میں کئی کئی دن کے لیے پانی کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ ان کے کھانے کے لیے ببول کے درخت پیدا کیے جو گرمی اور لو کے اثرات کو مارتے ہیں اور ان کے جبڑے ایسے بنائے کہ کانٹے ان کے لعاب وغیرہ سے بے اثر ہو جاتے ہیں چونکہ سبزیاں ترکاریاں نہیں ہوتیں اور انسان گوشت کھانے پر مجبور ہے لہٰذا سنا پیدا کر دی جو معدے کو صاف کر دیتی ہے اور وہاں کے جانوروں کے گوشت اور دودھ پر اثر انداز ہو کر انہیں انسانوں کے لیے قابل ہضم بناتی ہے اور ان کے معدوں کو صاف رکھتی ہے صندل وغیرہ جیسی خوشبوئیں اور مسکنات پیدا کر دیں۔

چونکہ کتا گرمی کا بہت زیادہ احساس کرتا ہے لہٰذا گرم ممالک کے کتوں کے جسم پر معمولی سے بال ہوتے ہیں مگر پہاڑی کتوں کے جسموں پر خوب بڑے بڑے بال ہوتے ہیں' پھر جس قدر برفانی علاقہ ہو گا بال بڑے ہوں گے۔ ورنہ درمیانی بقدر ضرورت کہ موسم گرما میں تکلیف دہ ثابت نہ ہوں۔ میں نے برفانی علاقوں کے کتوں پر بڑے بڑے بال دیکھے تو بے ساختہ زبان سے نکل گیا' واہ رے ربا! تجھے اپنی مخلوق کا کس قدر خیال ہے کہ یہ بے چارے روئی یا اون کے کپڑے نہیں بنا سکتے تو ان کے لیے تو نے گرم کپڑے بنا دیئے بکری چونکہ سردی کا شدید احساس کرتی ہے اور پانی اور برف سے بہت ڈرتی ہے۔ لہٰذا وہاں کی بکریوں کے بال بھی ایسے کہ برف ان کی کمر پر گرے تو پھسل جائے اور آزار نہ دے۔

ہر پرندے کے لیے اس کے ماحول کے مطابق غذا پیدا کی اور حسب طبیعت درختوں یا پہاڑوں پر ان کے آشیانے بنائے تو انھیں بتا دیا کہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں نگل جاؤ تاکہ دانے ان میں پھنس کر اچھی طرح پس سکیں۔ شتر مرغوں وغیرہ کے لیے صحرائے افریقہ جیسے مقامات بنائے' موروں اور سارسوں کے لیے ان کی طبیعت کے مطابق ماحول بنایا۔

آبی جانوروں کے شکار کے لیے مچھلیاں اور تالاب بنائے ان کی رہن سہن کے لیے جھاڑیاں اور بلند مقام بنائے کہ بچے محفوظ رہیں مچھلیوں کی غذا کے لیے کیڑے پیدا کیے اور کیڑوں کے لیے طرح طرح کی رطوبتیں اور جراثیم ہر جانور کے کام و دہن ایسے بنائے کہ وہ اپنی غذا سے لطف اندوز ہو ۔ مکھیاں گندگی شوق سے کھاتی ہیں۔ کسی کو چبانے میں لطف آتا ہے تو اس کا معدہ اور آنتیں اس کے مطابق بنائیں۔

اس کی شان ربوبیت و خلاّقیت کے قربان جایئے کہ اس نے ہر خطے کے فرزندان آدم کے لیے ان کے مناسب مزاج واقلیم و امراض ایسی جڑی بوٹیاں پھل اور سبزی ترکاریاں پیدا کی ہیں جو انہیں آرام پہنچا سکتی ہیں جن علاقوں میں جن امراض کا زور ہوتا ہے ان علاقوں میں تو وہ جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں مگر دوسرے علاقے میں نہیں کیونکہ وہاں ان کی ضرورت نہیں تھی۔

موسم گرما آتا ہے تو جگر کی تپش کو دور کرنے کے لیے کھیرا، ککڑی، تربوز، فالسہ، شہتوت، خوبانی، لیچی، انناس، خربوزہ، سنترہ، رس بھری، آلو بخارا، کیلا، کیسر کیوڑا، خس چیناں (ایک قسم کا غلہ) جیسی چیزیں پیدا کر دیتا ہے، موسم سرما کے لیے چلغوزے، اخروٹ چرونجی (ایک درخت اور اس کا پھل) بادام، پستے، کاجو، مونگ پھلی سیب گاجر مولی، بتھوا چولائی جیسی چیزیں بھیج دیتا ہے دکن میں بلغم بہت ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہاں دمہ کا مرض ہو جاتا ہے تو وہاں شریفہ بکثرت پیدا ہوتا ہے یہ بلغم کو چھانٹتا ہے اور رقیق کر دیتا ہے موسمی بھی بکثرت ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی بلغم کو خارج کر دیتی ہے انناس بھی کثرت سے ہوتا ہے، شریفہ اور ارنڈ خربوزہ اور انجیر یہ تینوں بکثرت ہوتے ہیں یہ فالج و لقوہ سے محفوظ رکھتے ہیں اور یہ امراض وہاں بکثرت ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا خراب ہے۔

سمندری اور مرطوب علاقوں میں جو پھل ہوتے ہیں وہ دوسرے علاقوں میں کم ہوتے ہیں اور جو لوگ پہاڑوں پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ اپنے امراض کو وہاں کی جڑی بوٹیوں سے دور کر لیتے ہیں اس قسم کی جڑی بوٹیاں میدانی علاقوں میں کم ہوتی ہیں کیونکہ وہاں ضرورت کم ہوتی ہے اور بعض بوٹیاں وہاں پیدا نہیں ہوتیں۔

دکن اور مدراس وغیرہ میں چونکہ وجع المفاصل گنٹھیا اور پیل پا جیسے امراض ہوتے ہیں لہٰذا وہاں تاڑی کے درخت بکثرت ہوتے ہیں ان سے میٹھا سفید دودھ نکلتا ہے جو ان امراض کے لیے فائدہ مند ہے تاڑی سورج نکلتے ہی جوش مارنے لگتی ہے اور نشہ آور ہو جاتی ہے لہٰذا وہاں اس کی دکانیں فجر کے وقت کھلتی ہیں اور سورج نکلنے سے پہلے بند ہو جاتی ہیں جو لوگ نشے سے پرہیز نہیں کرتے وہ اسے سورج نکلنے کے بعد ہی پیتے ہیں بڑی مزے دار ہوتی ہے ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا کسی علیم و حکیم کی بنائی ہوئی ہے، بے حس فطرت کی نہیں **فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ**۔

الخالق جل جلالہٗ

قرآن شریف میں ایک بہت ہی سادہ سوال کیا گیا ہے کیا وہ جو تخلیق کرتا ہے اور جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے برابر ہیں ؟ یہ ایک ایسا سادہ سا سوال ہے جسے ہر عامی و عالم سمجھ سکتا ہے اور بغیر کسی تامل کے اس کا جواب بھی دے سکتا ہے' ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے یہ تو ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں ہیں۔

ایسا ہی ایک بالکل سادہ سا سوال علم کے بارے میں بھی کیا گیا ہے' کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہیں؟ کیسے ہلکے پھلکے انداز میں عالموں اور جاہلوں کے فرق کو واضح کر دیا ہے کہ بات بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے کسی کو بری بھی نہیں لگتی مگر اسی سلسلے میں ایک انسانی کلام ملاحظہ ہو حضرت فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں۔

سرِ جاہلاں بر سرِدار بہ　　　　که جاہل بہ خواری گرفتار بہ

دیکھو انسانی اور رحمانی کلام کا فرق دونوں علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں مگر بشر کا لہجہ بڑا ہی سخت و کرخت ہے۔

بات "الخالق" پر ہو رہی ہے جیسا کہ قرآن میں ہے خالق صرف وہی ہے مگر بظاہر ہر تخلیق اسباب کے تحت ہوتی ہے مثلاً نرومادہ کے ملاپ سے بچہ پیدا ہوتا ہے انڈے سے بچہ نکلتا ہے اور وہ سڑ کر جراثیم و حشرات الارض پیدا کر دیتا ہے یہ سلسلہ تخلیق دیکھ کر بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ خالق فطرت ہے ان کی نظر اسباب تک محدود ہو کر رہ گئی مسبب الاسباب کو نہ دیکھ سکے ہم باپ کو خالق مجازی کہتے ہیں گو ایسا کہنا بہت ہی غلط ہے کیونکہ باپ کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس نے پیدا کیا یا نہیں' کب پیدا کیا اور کیسے پیدا کیا؟ لہٰذا وہ خالق

مجازی کیسے ہو سکتا ہے بس وہ بھی من جملہ اسباب تخلیق کے ایک سبب ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اگرچہ اس نے عمل تخلیق کو اسباب کا مرہون منت بنا دیا ہے مگر خالق تو وہی ہے۔ جیسے کسی کارخانے میں مختلف چیزیں بن رہی ہوں اور مشینیں بنا رہی ہوں مگر انہیں خالق نہیں کہا جا سکتا' خالق اشیاء تو دراصل پس پردہ ہے خواہ وہ مستری ہو یا مالک ہو یا موجد ہو یا کوئی اور ہو۔

قرآن شریف میں ہے' وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ وہ مردہ یعنی انڈے سے زندہ یعنی مرغی نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کے نکالنے کا یہ مطلب ہے کے مرغی سے انڈے کو نکالتا ہے جو کہ مردہ ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس آیت کا کیا مطلب ہے؟

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر چیز کی سب سے پہلی تخلیق اس "الخالق" نے خود بلاواسطہ کی اور یہ جو موجودہ فلاسفہ نے فلسفہ ارتقاء نکالا ہے کلیۃً صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ بعض اعتبارات سے صحیح ہے اور جو کچھ انہوں نے بعض انواع و اقسام میں دیکھا ہے' صحیح ہو مگر سارے عالم کو چند مثالوں پر قیاس کر لینا درست نہیں۔

ہم فلاسفہ کے علم و عقل' محنت و تحقیق اور شب و روز کی "کاوش" "وجاں کاہی" کا انکار نہیں کر سکتے وہ یقیناً بڑی عقل و علم و تجربہ والے ہیں مگر یہ بات تو ازروئے فلسفہ و منطق بھی غلط ہے کہ جزئیات کو کلیات نہیں بنایا جا سکتا اور ایک جزئیہ سے انکے مشاہدہ وتحقیق سے ارتقاء کا ثبوت ملاہو مگر ہر شے میں ارتقاء کو ہم بتسلیم نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے جب پہلے انسان کو بنایا ہو گا تو "لا علی مثال سبق" بنایا ہو گا کیونکہ وہ "مبدع و بدیع و مبدی و معید" ہے۔ اسے کسی سانچے یا نظیر کی ضرورت نہ پڑی ہو گی اس طرح ہر نوع و جنس کی پہلی پیدائش بلا اسباب کے ہوئی ہو گی کیونکہ پہلے کوئی سبب موجود ہی نہ تھا پھر "سلسلہ توالدو تناسل" و ارتقاء چل

پڑا ہو گا یہ مخلوقات اتنی منفرد و مختلف ہے کہ سب کو عمل ارتقاء کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا البتہ کچھ انواع و اقسام میں ایسا ہو گیا ہو گا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق کے جتنے بھی امکانات تھے سب پر تخلیق ہو چکی ہے عجیب عجیب صورتوں کے حیوانات و حشرات الارض و نباتات وغیرہ ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ ایک دفعہ میں بحری جہاز میں مصر جا رہا تھا' سمندر کی مچھلیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا کیسی کیسی عجیب و غریب مچھلیاں ہیں۔ بعض مچھلیاں اتنی دور تک اڑتی چلی جاتی ہیں کہ چڑیا کا گمان ہوتا ہے مگر جب پانی میں ڈوب جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چڑیا نہ تھی مچھلی تھی۔ ایک دفعہ ایسی مچھلی پر نظر پڑی جو بالکل پتنگ معلوم ہوتی تھی مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ساتھ پتنگ کی سی بڑی لمبی ڈور بھی لگی ہوئی ہے' میں نے کہا سبحان اللہ یہ کسر بھی پوری کر دی ۔ حشرات الارض اور مچھلیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ممکنہ صورت و شکل پر تخلیق ہو چکی ہے اور ہر مخلوق کے اس قدر مختلف کیرکٹر اور عادات و اطوار ہیں کہ سارے کیرکٹر ختم ہو چکے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں مجھے کہیں اللہ میاں مل جائیں تو دریافت کروں آپ کو تخلیق کا اس قدر شوق کیوں ہے؟ خلاقی کے ایسے ایسے نادر و نایاب نمونے دکھائے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے' شکلیں رنگ' خوشبوئیں' چال ڈھال اطوار و عادات' بھانت بھانت کے ۔دیکھو کتا ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرتا پھرتا ہے اور وقت ضرورت کے لیے بچا لیتا ہے' یہ بھی ایک کیرکٹر ہے سو یہ بھی پیدا کر دیا۔

اس خلاق نے کارخانہ قدرت میں سبھی کچھ پیدا کر دیا کہ چشم تماشا حیران رہ جاتی ہے اور **ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ**' کا معاملہ ہوتا ہے۔ پھر اپنے خلیفہ میں شوق تخلیق و قدرت تخلیق ایسی ودیعت کر دی ہے کہ وہ آئے دن نت نئی چیزیں بناتا رہتا ہے۔

ایک نوجوان کہنے لگا اب تو انسان بھی حیوانات و جراثیم و انسان پیدا کرنے لگا ہے' وہ اہل سائنس سے بڑا مرعوب تھا اور سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر بد عقیدہ ہو گیا تھا' میں نے کہا مگر یہ تو سوچو کہ جس چیز سے انہوں نے پیدا کیا' کیا

وہ بھی انہوں نے پیدا کی تھی تو یہ تخلیق تو نہیں' ترکیب و تالیف ہوئی جیسے لوہے سے انجن اور ہوائی جہاز وغیرہ انسان بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اس کے پیدا کئے ہوئے مادوں کو جمع کر کے ترکیب دے دیتا ہے سائنس سے مرعوب ہو جانے والوں کی سوچ ذرا ٹیڑھی ہوتی ہے۔

بے وقوفی کا کہاں تک رونا رویا جائے' اس کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے اور ہر بے وقوف ایک نئی حماقت کی بات کرتا ہے در آنحالیکہ اپنے آپ کو بے حد عقلمند سمجھتا ہے۔

آج کل کی ایجادات پر غور کرو کیسی کیسی عجیب و غریب ایجادات ہو رہی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ جس نے اتنے بے شمار خالق مجازی پیدا کر دیئے وہ کتنا بڑا خلاق ہو گا۔ گو خالق مجازی ان گنت ہیں مگر خلاق ایک ہی ہے۔

*

ذوالجلال والاکرام جل جلالہ

سورہ رحمان کے دوسرے رکوع میں ہے "زمین پر جو کچھ ہے سب فانی ہے اور باقی رہے گی ذات تمہارے رب کی جو "ذوالجلال و الاکرام" ہے" اسی سورت کے بالکل آخر میں ہے "بڑا برکت والا ہے تمہارے رب کا نام جو "ذوالجلال والاکرام" ہے"۔

قرآن شریف میں بس دو جگہ یہ نام آیا ہے اس نام پاک کے لئے خاص طور سے فرمایا گیا ہے کہ یہ نام بڑی ہی برکت والا ہے اسی لئے بعض علماء کا خیال ہے کہ "اسم اعظم" یہی ہے۔ "اسم اعظم" کے بارے میں شدید اختلاف ہے کیونکہ یہ نام پوشیدہ رکھا گیا ہے بعض نے "اللہ" کو "اسم اعظم" مانا ہے میرے خیال میں یہ بات صحیح ہے کیونکہ "اللہ اسم ذات" ہے اور باقی اسمائے صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ ذات کو صفات پر فوقیت و اولیت حاصل ہے۔

وہ صاحب جلال و عظمت و اکرام ہے اکرام و احسان وہی کر سکتا ہے جو جمیل و کریم و لطیف ہو تو گویا وہ "ذوالجلال والاکرام" یعنی "ذوالجلال" و الجمال ہے۔

سورج ہماری دنیا میں سب سے بڑا مظہر جلال خداوندی ہے جس کے سامنے ہماری نظر نہیں ٹھرتی

یہ اس "ذوالجلال" کا کرم ہے کہ اس نے سورج کو ہماری زمین سے اتنی دور قائم کیا ہے کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اس کے کرم سے فائدے ہی فائدے پہنچا سکتا ہے اس سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں اس کی شعاعوں سے ہماری صحت بنتی ہے نہ صرف ہم بلکہ پوری کائنات اس سے مستفید ہوتی ہے۔ حیوانات' چرند' پرند اور حشرت الارض ہماری طرح اس سے روشنی اور صحت

حاصل کرتے ہیں اس کی تمازت سے کتنی ہی مخلوق جنم لیتی ہے اور کتنے ہی مضر اثرات و جراثیم فنا ہو جاتے ہیں اس کی شعاعیں کائنات میں رنگ بھرتی ہیں پختگی پیدا کرتی ہیں رس بھرتی ہیں اور خوشبوئیں پھیلاتی ہیں درختوں اور پتھروں پر گل کاریاں کرتی ہیں۔

چاند ہماری دنیا میں اس ذوالاکرام کا سب سے بڑا مظہر جمال ہے چونکہ وہ سورج کی طرح مظہر جلال نہیں ہے بلکہ مظہر جمال ہے اس لئے ہم اس کی طرف دیکھ سکتے ہیں اس نے اپنے کرم سے اس شمع شبینہ (نائٹ لیمپ) کو اتنا اونچا رکھا ہے کہ ہماری زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جاتا ہے اس کی کرنیں بھی رنگ وبو اور رس پیدا کرتی ہیں آفتاب کی تمازت سے جو بد اثرات جلد و دماغ وغیرہ میں پیدا ہو جاتے ہیں انہیں دور کر کے فرحت و انبساط پیدا کرتی ہیں اور سورج جو خشکی پیدا کر دیتا ہے اسے تیزی سے بدل دیتی ہیں مخلوق خدا سکون محسوس کرتی ہے اور آرام کی نیند سو جاتی ہے۔

شمس و قمر کا جلال و جمال ان کا اپنا ذاتی نہیں ہے نہ شمس و قمر کبھی اس بات کے دعویدار ہوئے نہ آج تک کسی فلسفی نے اس بات کا دعوی کیا کہ ان کا جلال و جمال ان کا اپنا پیدا کردہ ہے نہ کوئی شخص ایسا دعویٰ کر سکتا ہے جب کہ مدعی خود خاموش اور بے بس ہے۔

پھر شمس و قمر میں یہ جمال و جلال کہاں سے آیا؟ ظاہر ہے اگر ان کا اپنا ذاتی نہیں ہے تو مستعار ہے اور کسی کا عطیہ ہے۔ وہ شمس و قمر ہوں یا کوئی اور صاحب جلال و اکرام ہو انہیں "جلال و جمال" اسی ذوالجلال والاکرام کا دیا ہوا ہے۔

جیسے "خالق حقیقی" صرف اسی کی ذات ہے اور خالق مجازی ان گنت ہیں اور جیسے "رب حقیقی" صرف اسی کی ذات ہے اور رب مجازی بے شمار ہیں اسی طرح "ذوالجلال والاکرام" دراصل وہی ہے باقی مجازی ہیں جن کا جلال و اکرام مجازی ہے آج ہے تو کل نہیں مگر اس کا جلال و اکرام ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور روز ازل سے ہے۔

کبھی اس بات پر غور کرتا ہوں کہ اس نے ہمارے چاند' سورج جیسے ان گنت چاند' سورج بنائے ہیں تو سوچتا ہوں کہ وہ خود کتنا صاحب جلال و جمال ہو گا اس کے بنائے ہوئے ایک سورج کی طرف ہم نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتے تو ان گنت سورج بنانے والے کی طرف کیسے کوئی دیکھ سکتا ہے؟ چاند سورج کے حسن و جمال کا یہ عالم ہے تو اس کے حسن و جمال کا کیا عالم ہو گا؟ اس کے بنائے ہوئے چاند سورج کا ہم احاطہ نہیں کر سکتے نہ ان کی تخلیق کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں تو جس ذات نے انہیں بنایا ہے اسے ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں وہ ذات کتنی عظیم ہو گی جس نے انہیں پیدا کیا اور انہیں مسخر کیا ہے۔

یہ ان گنت تارے جو اس کے جلال و جمال و اکرام کا مظہر ہیں ہمارے خادم ہیں صرف زیب و زینت کے لئے پیدا نہیں کئے گئے یہ بڑے بڑے کام سرانجام دیتے ہیں چنانچہ وہ "ذوالجلال والاکرام" فرماتا ہے ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ان کی پیدائش میں بہت سی حکمتیں ہیں جن کا ہمیں علم نہیں وہ فرماتا ہے "ہم نے آسمان دنیا کو کواکب سے آراستہ کیا اور حفاظت کی ہے ہر شریر شیطان سے۔ " معلوم ہوا یہ لشکر دفاع ہے۔

فنا ہر چیز کا مقدر ہے بقا صرف اسی کی ذات کے لئے ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے "ہر چیز فانی ہے باقی تمارے رب "ذوالجلال و الاکرام" کی ذات ہے"۔

ہر ستارہ ایک تاثیر کا حامل ہے چنانچہ سہیل ستارے کے دور میں حشرات الارض بہت کم پیدا ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض سالوں میں حشرات الارض کی کثرت ہوتی ہے اور بعض سالوں میں مکھیاں اور مچھر وغیرہ کم پیدا ہوتے ہیں جو بچے برج جوزا کی عمل داری میں پیدا ہوتے ہیں بڑے بولنے والے اور بڑے اچھے مقرر ہوتے ہیں سورج اور چاند کے گرہن کا اثر عورتوں اور جانوروں کے حمل پر پڑتا ہے یہ عجیب الخلقت بچے گہن لگ جانے سے پیدا ہوتے ہیں چودھویں کے چاند کا سطح سمندر پر اثر مسلم ہے چودھویں رات میں سمندروں میں بڑا جوش ہوتا ہے اسی لئے ایک شاعر نے کہا ہے۔ ؎

طوفان تھا شباب کسے اپنا ہوش تھا　　تھا چودھویں کا چاند سمندر کا جوش تھا

لوگ اس شعر کو پڑھتے ہیں مطلب نہیں سمجھتے کہ شاعر نے کیا بات کہی ہے شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ عالم شباب ایک طوفان کی مانند تھا جیسے چودھویں کے چاند سے سمندر میں طوفان اٹھتا ہے ہمارے کھیتوں اور پھلوں پر تاروں کی روشنیاں اثر انداز ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ حاملہ عورتوں پر بھی یہی وجہ ہے ایک سال لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور ایک سال لڑکیاں۔ ایک سال خوب پھل آتا ہے اور دوسرے سال کم۔

یہ ستارے ہمارے خیالات پر بھی بڑا اثر ڈالتے ہیں امن و امان اور صلح و جنگ کا ان سے بڑا گہرا تعلق ہے زلزلوں' طوفانوں اور وباؤں وغیرہ کا بھی ان سے تعلق ہے۔ ان میں آپس میں محبت و عشق ہے تب ہی تو یہ ایک دوسرے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

*

الرَّبُّ جل جلالہٗ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں متعدد جگہ آیا ہے۔ **رَبُّنَا رَبُّکُمَا رَبُّکُمْ رَبُّهُمْ اَرْبَابٌ** بھی کئی جگہ آیا ہے۔ اور **رِبِّیُّوْنَ رَبَّانِیُّوْنَ** دو جگہ اور **ربانیین** ایک جگہ اور اس کے مشتقات بھی کئی جگہ آئے ہیں۔

اس کے اسمائے **توصیفیہ** ننانوے ہیں۔ اگرچہ وہ ننانوے سے بھی زیادہ ہیں ایک سو چالیس کے قریب تو اس کے اسماء میں گنا سکتا ہوں اس کے لئے ہر اچھا نام زیبا ہے۔ لہ الا سماء الحسنی مگر علماء نے اس کے اسماء کو ننانوے میں محصور کر دیا ہے جن کو اسمائے **توقیفیہ** سے تعبیر کیا ہے۔ جیسے اس کی ذات لامحدود ہے اس کی صفات بھی لامحدود ہیں وہ خود فرماتا ہے **مَانَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ**

ظاہر ہے جو "رب" ہو گا۔ وہ رحمان و رحیم لطیف و خبیر کریم و بشیر غفور و غفار الغرض سب ہی کچھ ہو گا پرورش تو وہی کرے گا جو مہربان ورزاق وغیرہ بھی ہو گا تو گویا "رب" بہت سے اوصاف کا جامع ہے

بعض صفات الٰہی بعض صفات کے ضمن میں کام کرتی ہیں اگرچہ ہر صفت مستقل ہے جیسے رزاق کی صفت رزاقیت صفت ربوبیت کے تحت کام کرتی ہے کیونکہ جو پالنے والا ہو گا وہ کھلائے گا پلائے گا بھی ضرور، اسی طرح وہ رحمان و رحیم بھی ہو گا۔

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ تخلیق سے پہلے پروردگار کہاں تھا تو آپ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ تخلیق نہ ہوئی ہو بلکہ فرمایا معلوم نہیں۔

اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ الْخَلْقَ! قَالَ کَانَ فِیْ عَمَاءٍ مَافَوْقَهٗ عَمَاءٌ مَافَوْقَهٗ عَمَاءٌ بعض علماء نے عماء کو ایک حالت مشتبہ یا ملتبسہ وغیرہ سے تعبیر

کیا ہے۔ بہر حال اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہوا کہ کوئی وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ تخلیق نہیں ہوئی تھی ورنہ ساری مخلوق ازلی و ابدی قرار پا جائے گی اور خدا کی طرح مخلوق بھی ازلی و ابدی ہو گی جیسا کہ ہندو مذاہب وغیرہ میں ہے کہ روح و مادہ ازلی و ابدی ہیں یا جیسے کہ فلسفہ بھی روح مادے کو قدیم مانتے ہیں یہ دونوں مذہب والے اہل اسلام کے نزدیک مشرک فی الصفتہ ہیں۔ تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ایسا زمانہ بھی تھا جبکہ وہ "رب" نہ تھا اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے مناطقہ و فلاسفہ کی دو اصطلاحیں ہیں ایک بالقوۃ اور دوسرے بالفعل بالقوۃ کا یہ مطلب ہے کہ مثلاً زید جو بالکل ان پڑھ ہے ایک بالقوہ کاتب ہے کہ اگر وہ چاہے تو کاتب بن سکتا ہے اور جب لکھنے لگے گا تو اسے کاتب بالفعل کہا جائے گا۔ ہر انسان جو کبھی نہ ہنسا ہو ضاحک بالقوۃ ہے جب ہنسنے لگے گا تو اسے ضاحک بالفعل کہا جائے گا ہر بچہ ناطق بالقوۃ ہے جب بولنے لگے گا ناطق بالفعل کہلائے گا۔

تو اللہ ازل سے ابد تک "رب" ہے تخلیق سے پہلے بالقوۃ تھا اور تخلیق و تربیت کے بعد بالفعل "رب" ہو گیا اس میں کوئی قباحت نہیں وہ مالک یوم الدین ہے حالانکہ ابھی تک قیامت قائم نہیں ہوئی ضروری نہیں کہ سارے اوصاف خداوندی کا ہمیشہ ہمیشہ ظہور ہوتا رہے۔ اس کے بعد بہت سے اوصاف کا رفتہ رفتہ ظہور ہوا ہے بالخصوص اوصاف اضافی کا۔ دیکھو جب تک اس نے زمین کو پیدا نہیں کیا تھا وہ خالق ارض نہ تھا جب پیدا کر دیا تو خالق ارض ہو گیا جس طرح وہ تخلیق سے پہلے خالق تھا تخلیق سے پہلے "رب" بھی تھا کیونکہ اس کے اوصاف عین ذات ہیں ذات سے جدا نہیں ہیں۔ یہ مقام بڑا ہی نازک ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو کفر و شرک و ضلال سے محفوظ رکھے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جب اس نے کھانے پینے والے جانور پیدا کئے تب ہی وہ بالفعل "رب" بنا یا اس سے پہلے وہ بالفعل "رب" تھا؟ بات یہ ہے کہ ربوبیت اور ہے رزاقیت اور ہے ربوبیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کھانے پینے والے ہوں تب ربوبیت کا صدور ہو۔ ہم لوگ تراویح کے بعد

ایک دعا پڑھتے ہیں رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِکَۃِ وَالرُّوحِ تو ملائکہ یا ارواح کھانا تھوڑی کھاتے ہیں مگر وہ ان کا "رب" تو ہے۔ لہٰذا تخلیق کائنات سے پہلے جب ہم بصورت ارواح تھے تو وہ ہمارا "رب" تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ تخلیق کائنات سے پہلے بھی وہ "رب" تھا اور بالفعل "رب" تھا۔ آخر ارواح کی ترتیب و تنظیم و تربیت کا طریقہ ضرور کوئی نہ کوئی ہو گا اور جب ہم اجسام سے پاک ہو کر ارواح بن جائیں گے تب بھی وہ ہمارا "رب" رہے گا کیونکہ ہر مخلوق خواہ وہ تجسیم سے منزہ ہو محتاج ربوبیت ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جنت میں شراب و کباب شیر و شہد اور میوہ جات ہوں گے تب تو ربوبیت ظاہر ہے اور اگر ان چیزوں کو مثالی قرار دیا جائے تب بھی بعد الممات وہ ہمارا "رب" رہے گا۔ کیونکہ وہ کسی نہ کسی صورت میں ہماری تربیت و تنظیم کو برقرار رکھے گا اور وہاں بھی کچھ نہ کچھ اصول تو ضروری ہوں گے جیسے ملائکہ و ارواح کسی نہ کسی قسم کا رزق ضرور پاتے ہیں اسی طرح اہل بہشت بھی کسی نہ کسی رزق کے محتاج ہوں گے بے احتیاج تو صرف اسی کی ذات ہے اور وہی ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

چونکہ وہ صرف رزاق ہی نہیں "رب" بھی ہے لہٰذا اس نے ہر جسم میں ایک ڈاکٹر مقرر کر دیا ہے جو مفاسد و امراض کو دور کرتا رہتا ہے اور ہر عضو اپنی تھوڑی بہت مرمت خود کرلیتا ہے، چونکہ دل جسم کا بادشاہ ہے لہٰذا اسے تو اتنی قوت عطا کی ہے کہ وہ اپنی اصلاح بڑی خوبی سے خود کرلیتا ہے اور بڑے سے بڑے امراض کو دور کرلیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی جو رگیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ انہیں فوراً جوڑلیتا ہے یا ان کی جگہ ویسی ہی کام کرنے والی رگیں پیدا کرلیتا ہے۔

چونکہ وہ "رب" ہے لہٰذا اس نے ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھا ہے ہر رزق پر مہریں لگی ہوئی ہیں کیا مجال کہ دوسرے جان دار اسے خراب کرسکیں، مثال کے طور پر کیلے ہی کو لے لیجئے، اس کی پھلی کا غلاف ایک مہر ہے جو دوسرے جانوروں سے جن کے لئے وہ مقسوم نہیں ہوا۔ محفوظ رکھتا ہے، دیکھئے کیلے کی پھلی میں کیسا عمدہ نشاستہ بھرا ہوا ہے اگر اس پر چھلکے کی مہر نہ ہوتی تو کیڑے

مکوڑے اور چرند پرند اسے ہضم کرجاتے اور یہ جس مخلوق کے لئے بنایا گیا ہے وہ محرومی کا شکار ہوجاتی۔ اسی طرح بعض پھلوں کے چھلکے ایسے بنائے ہیں کہ پرند ان پر چونچ مار کر ان کے گودے کو نہیں نکال سکتے ورنہ سارے پھل پرند کھا جایا کرتے اور انسان منہ دیکھتا رہ جاتا۔ بعض پر بڑی سخت اور کرخت مہر لگادی ہے اور بعض پر تلخ۔ کہ چھلکے کی تلخی پرندوں کو ان سے دور رکھتی ہے' بادام اور اخروٹ وغیرہ کو سخت چھلکے سے محفوظ کردیا ہے۔ چونکہ درندوں کی غذا گوشت ہے لہٰذا وہ تو پھلوں کو سونگھتے تک نہیں۔ پرندوں کی غذائیں اور قسم کی ہیں' وہ گوشت کی طرف نہیں لپکتے۔ انسان کی غذائیں اور قسم کی ہیں لہٰذا گھاس پات پر گویا اس کے لئے مہریں لگی ہوئی ہیں کہ وہ بھیڑ بکری اور اونٹوں وغیرہ کی غذا پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔

پھر ہر ایک کے رزق کے مطابق اس کا جبڑا اور دانت بنائے ہیں تاکہ وہ دوسروں کا رزق ہڑپ نہ کرسکے۔ اپنا ہی رزق مقسوم کھائے' دانے دانے پر مہر ہے۔

پروردگار عالم نے ہر چیز کی پرورش کا بہترین انتظام کیا ہے چڑیا ابھی انڈا دینے بھی نہیں پاتی کہ آنے والوں کے لیے چڑیا اور چڑا بہترین گھر تیار کرتے ہیں گھونسلہ اس طرح سے بناتے ہیں کہ انڈے بچے گرنے نہ پائیں اور بچوں کو تنکے نہ ستائیں پھر ان انڈوں کو اپنے پروں میں چھپائے بیٹھے رہتے ہیں جب بچے نکلتے ہیں تو نہ معلوم کہاں کہاں سے ان کے لئے چھوٹے چھوٹے کیڑے تلاش کرکے لاتے ہیں جب وہ دانے ہضم کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں تو انہیں دانے چگاتے ہیں ان کی پرورش کے لئے بڑی جدوجہد کرتے ہیں' میلوں سے کشش ربانی انہیں گھونسلے کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ بڑے چاؤ چونچلے سے انہیں پالتے ہیں چڑیا کا چار دن کا بے پرو بے شعور بچہ جب بیٹ کرتا ہے تو گھونسلے سے باہر کی طرف رخ کرتا ہے یہ ادب اسے کس نے سکھایا اور کس نے بتایا کہ ایسا نہ کروگے تو گھر گندہ ہوجائے گا پھر جب یہ بڑے ہوجاتے ہیں تو انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اب اسی طرح تم دوسروں کی پرورش کرو اور رب مجازی بنو۔

شان ربوبیت کے کرشمے دیکھئے عجیب عجیب ہیں پرورش کا کوئی ایک قانون نہیں ہے لاتعداد قوانین ہیں جہاں ماں باپ انڈوں کو نہیں سے سکتے وہاں چشم آفتاب ان کی نگرانی کرتی ہے اور انہیں گرمی پہنچاتی ہے جب وہ پیدا ہوجاتے ہیں تو خود بخود پانی میں چلے جاتے ہیں اس مکڑی کو دیکھئے جو روپیہ برابر جالا تن کر بچوں پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک خفیف سا دروازہ ان کے لئے رکھ دیتی ہے تاکہ وہ اسے توڑ کر باہر نکل سکیں اور کوئی دشمن اندر نہ داخل ہوسکے وہ بچے انڈے سے نکلتے ہیں تو مزے مزے سے اپنی ماں کو چاٹ کر پروان چڑھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل آتے ہیں بچھو کے بچے اپنی ماں کو چاٹ چاٹ کر پل جاتے ہیں مکڑی اور مادہ بچھو بخوشی اپنی جان دے دیتی ہیں اس کے لئے پروردگار کا یہی حکم ہے اور اسے اسی میں لذت محسوس ہوتی ہے۔

میں کہا کرتا ہوں دنیا میں قانون کلی کوئی بھی نہیں ہے کیونکہ ہر قانون کلی میں کچھ نہ کچھ مستثنیات ہوتے ہیں جب مستثنیات ہوئے تو ہو پھر کلی ہی کیا ہوا۔پیدائش و ممات کے تو بے شمار قوانین ہیں وہ بغیر ماں باپ کے بھی پیدا کرتا اور پروان چڑھاتا ہے جیسے سیکڑوں کیڑے مکوڑے۔ اور بغیر باپ کے بھی پیدا کرتا ہے اور بغیر ماں کے بھی آدم بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے حوا کو بغیر ماں کے اور عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے ابھی کچھ دن ہوئے کہ یورپ میں ایک کنواری لڑکی کے لڑکا پیدا ہوا اور طبی معائنہ نے اس کی تصدیق کی مرغی بغیر مرغ کے انڈے دیتی ہے الغرض قانون پیدائش بے شمار ہیں۔

وہ "رب العالمین" ہے' بے شمار جہانوں کا پالنے والا ہے معلوم نہیں فارسی کتابوں میں الحمد اللہ رب العالمین کی تشریح میں کیوں لکھا گیا کہ وہ اٹھارہ ہزار عالم کا پالنے والا ہے پھر یہ خیال اردو میں بھی آگیا چنانچہ نورنامہ والا کہتا ہے

"کیتے کُنْ سے عالم اٹھارہ ہزار"

اٹھارہ ہزار تو بہت ہی چھوٹا عدد ہے وہ تو لاتعداد جہانوں کا پروردگار ہے ستارے لاتعداد ہیں اور ہر ستارے کا اپنا ایک عالم جداگانہ ہے تو اٹھارہ ہزار کیسے ہوگئے؟

یہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے اور یہاں کے کچھ قوانین ہیں جو دوسرے افلاک کے قوانین سے بالکل مختلف ہیں فلک پر اس کی شان ربوبیت نرالی ہے ہم بھی ایک فلک کے باسی ہیں اور ہمارے لئے مخصوص احکامات ہیں اس طرح دوسرے افلاک کے بھی مخصوص احکامات وقوانین ہوں گے معلوم نہیں فلاسفۂ یونان کو کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ افلاک میں خرق والتیام نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ اجزائے متشابہ سے بنے ہیں افلاک کے دھاتوں سے بننے کا تصور معلوم نہیں کب پیدا ہوا فلاسفۂ یونان نے تو ایسا نہیں کہا تھا کہ یہ دھاتوں کے بنے ہوئے ہیں لہٰذا ان میں خرق والتیام (پھٹنا اور جڑنا) نہیں ہوسکتا مگر اب تو ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ ہمارے میزائل وغیرہ افلاک پر چلے جاتے ہیں اور کوئی خرق والتیام نہیں ہوتا تو فلاسفہ یونان کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی لیکن میرے خیال میں فلاسفۂ یونان کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کیونکہ جب بھی ہمارے میزائل جہاز یا راکٹ وغیرہ اوپر جاتے ہیں تو خرق و التیام یقیناً" ہوتا ہے ہوا یا فضا پھٹتی ضرور ہے البتہ خرق کے فوراً" بعد ہی التیام ہوجاتا ہے جیسے سطح آب پھٹ کر فوراً" جڑ جاتی ہے کیونکہ پانی اجزائے متشابہ سے بنا ہوا ہے اتنی بات فلاسفۂ یونان کی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ افلاک اجزائے متشابہ سے بنے ہیں لیکن ان کی یہ دلیل غلط ہے کہ چونکہ اجزائے متشابہ سے بنے ہیں لہٰذا خرق والتیام نہیں ہوسکتا۔

جب یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا اور نوجوانوں نے بحث افلاک میں پڑھا کہ افلاک میں خرق والتیام نہیں ہوسکتا لہٰذا معراج ثابت نہیں ہوسکتی۔ نوجوان بدعقیدہ ہونے لگے تو علمائے اسلام نے فلسفہ ومنطق پڑھ کر ان کے دلائل کو انہی کے فلسفہ ومنطق سے توڑ مروڑ کر رکھ دیااور اس طرح نوجوانوں کو بدعقیدہ ہونے سے بچالیا۔

اللہ "رب العالمین" ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے جہانوں کے کیا اسرار ہیں عقل انسانی تو بڑی محدود اور بڑی ہی ناقص ہے۔

ربُّ العالمینُ

کسی حیوان یا انسان کے باپ کو پتہ نہیں چلتا کہ آیا اس کے نطفہ سے کوئی قید حیات میں آیا ہے یا نہیں؟ باپ کو تو بعض حالات میں اس وقت تک بھی علم نہیں ہوتا جب تک کہ بچہ پیدا نہیں ہو جاتا اور بعض حیوانوں اور انسانوں کو مرتے دم تک بھی اپنی اولاد کا علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا باپ کو تو کسی صورت میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے آنے والے مولود کے لیے رزق فراہم کیا ہے۔ رہی ماں تو اس کو مہینوں بھی پتہ نہیں چلتا کہ آیا وہ کسی کی ماں بننے والی ہے؟ لہٰذا اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنے بچے کے لیے رزق فراہم کیا ہے۔

ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بچے نے خود رزق مہیا کیا کیونکہ وہ تو اپنی ذات وغیرہ سے بھی بے خبر ہوتا ہے پروردگار عالم ہر انسان و حیوان کے بچے کے لیے رحم مادر میں ہر قسم کی حفاظت و رزق و پرورش کا انتظام کر دیتا ہے۔ ماں باپ کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کی پرورش و نگہداشت کریں پھر جب دودھ اس کے لیے کافی نہیں ہوتا تو دانت پیدا کر دیتا ہے تاکہ وہ سخت چیزوں کو چبا سکے۔

کہیں وہ شکمِ مادر میں تربیت کرتا ہے۔ کہیں انڈے کے اندر اور کہیں مٹی اور نجاست میں جو دو ماں باپ سے پیدا نہیں ہوتے جن کا اس عالم میں کوئی والی وارث نہیں ان کو کون رزق پہنچاتا ہے؟ بے شک وہ "رب العالمین" ہی سب کا پروردگار ہے۔

ایک دسترخوانِ کرم ہے جو ہر ایک کے لیے بچھا ہوا ہے جس میں کوئی تفریق نہیں حتیٰ کہ جو اسے گالیاں دیتے ہیں انہیں بھی ایسی ہی فراخ دستی کے

ساتھ دیتا ہے جیسے کے اوروں کو دیتا ہے بلکہ بسااوقات دوستوں سے بھی زیادہ دیتا ہے "برین خوان یغماچہ دشمن چہ دوست"؟

بظاہر ہمیں ماں باپ روٹی سالن دیتے ہیں مگر کیا انہیں رازق کہا جا سکتا ہے؟ کیا گندم انہوں نے پیدا کیا؟ کیا سبزی انہوں نے اگائی؟ کیا کسی جانور کے جسم کا گوشت انہوں نے پیدا کیا؟ ان کو تو علم بھی نہیں کہ یہ گندم کا دانہ کہاں پیدا ہوا۔

سبزی کس کھیت میں اگی؟ جانور کہاں پلا بڑھا کس نے بویا؟ کس نے کاٹا؟ پھر کس نے کوٹ پیس کر کھانے کے قابل بنایا ہے؟

پھر یہ غذا جوکسی حیوان ' نبات یا انسان نے کھائی اسے لائق انہضام و جزو بدن کس نے بنایا؟ آیا ماں باپ نے ؟ یا قوت ارضی نے ؟ ماں باپ کو تو پتہ ہی نہیں کہ وہ غذا جو انہوں نے بچے کو کھلائی پیٹ میں جا کر کس حالت میں ہے؟ زمین بے شعور ہے خود کھانے والے کو پتہ نہیں ہوتا کہ جو غذا کھائی ہے اندر جا کر اس نے کیا شکل اختیار کی کیسے ہضم ہوئی۔ کیسے خون یا رطوبت میں تحلیل ہوئی؟ کس گھڑی اس نے شکم میں کیا شکل اختیار کی ہے؟

غذا کو خون یا رطوبت میں تحلیل "رب العالمین" نے کیا۔ نہ معدے نے جگر نے نہ آلات انہضام نے ۔ کیونکہ یہ تو محض مجبور ہیں۔ سبب ہیں اور مسبب الاسباب کے تابع فرمان ہیں یہ سوکھی گھاس اور سوکھے پتے کیسے کسی جانور کے جزو بدن بن گئے۔ کیسے کوئی پودا زمین سے غذا حاصل کرنے پر قادر ہوا۔ اور کیسے زمین نے اسے پرورش کیا زمین کو کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی کہ اپنی چھاتی سے درختوں اور پودوں کو دودھ پلائے؟ اپنے چشموں سے مخلوق خدا کو سیراب کرے۔ اپنی ہوا سے ان میں زندگی بخشے اور پھر انہیں اپنی آغوش میں میٹھی نیند سلائے۔ اور جب وہ ہاتھ کھینچ لیتا ہے تو ساری مخلوق ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ نہ معدہ کام کرتا ہے نہ جگر نہ آب و دانہ ساتھ دیتا ہے نہ کوئی دوا یا معالج۔

اس کی شان ربوبیت کے قربان جایئے کہ وہ آسمان سے اپنی مخلوق کے لیے رزق اتارتا ہے اور ہر چیز کے آلات انہضام کے مطابق اتارتا ہے۔ اس کے

پیدا کردہ کانٹے بھی مخلوق مزے لے لے کر چباتی ہے۔

اس طرح ہمارے لیے خدا کے پہچاننے کے لیے یہ بات بہت کافی ہے کہ اس نے اپنی مخلوق کے آرام و راحت کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ ہر موسم اور ہر اقلیم کے مطابق پھل پیدا کیئے۔

اس کی شان ربوبیت کے قربان جایئے تخلیق میں ایسی ایسی باریک حکمتیں رکھی ہیں کہ بے شعور' دہر' فطرت 'نیچر' ایسی حکمتیں ایسی پر کاری کے ساتھ نہیں رکھ سکتی اس نے جسم میں جو بھی سوراخ بنایا ہے ٹیڑھا میڑھا اور کج بنایا ہے تاکہ اندر جانے والی چیز آسانی سے اندر جا سکے اور پھر باہر نکل سکے کان کا سوراخ ایسا ٹیڑھا میڑھا بنایا ہے کہ ہوا تو اس کے اندر جا سکے اور دماغ کی کوئی چیز اس راہ سے باہر نہ آ سکے

ناک کا سوراخ ایسا کج مج ہے کہ سانس بہ آسانی جا سکتا ہے اور رطوبتِ دماغی آسانی سے باہر آ سکتی ہے مگر رطوبت اور بالوں کی وجہ سے کیڑے اور گرد و غبار آسانی سے اندر نہیں جا سکتے۔

غذا کا سوراخ بڑا ہی ٹیڑھا میڑھا ہے کہ باہر سے اندر تو غذا جا سکتی ہے مگر وہ اندر سے باہر نہیں آ سکتی جہاں معدے میں گئی اور پھنس کر رہ گئی معدہ کج مج ہے مگر ہضم نہ ہو سکے تو اس کے لیے راہ کشادہ ہے کہ قے وغیرہ کی صورت میں بمشکل خارج ہو جاتی ہے۔ یہی حال بول و براز کے سوراخوں کا ہے۔ ان میں ایسی کیواڑیاں لگی ہیں جو اندر سے تو باہر کی طرف کھل سکتی ہیں مگر باہر سے اندر کے طرف نہیں کھلتیں البتہ بوقت ضرورت اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ رحم مادر و معدہ کو ایسا بنایا ہے کہ رہنے والی چیز رک سکے اور باہر نہ نکل سکے اس طرح دل کی کیواڑیاں ایسی بنائی ہیں کہ جو خون آگے بھیجنا ہے وہ تو نکل سکتا ہے مگر باہر سے اندر وہاں داخل نہیں ہو سکتا۔

اس کی شان ربوبیت کا تماشا دیکھیئے کہ انسان کے عام طور پر ایک ہی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیے دو پستان پیدا کیئے کہ اگر کسی وجہ سے ایک سے دودھ نہ کھینچ سکے تو دوسرا کام دے یا کم ہو تو دوسرے سے سیراب ہو سکے اور جن

جانوروں کے بہت سے بچے ہوتے ہیں ان کے بہت سے تھن ہوتے ہیں۔ کتیا اور بلی کے فرج سے لے کر سینے تک دودھ کی نہر جاری رہتی ہے۔

اس نے نووارد مہمان کے لیے ماں کے سینے میں ایک چھوڑ دو صراحیاں بنا دی ہیں جن پر مہر لگی ہوئی ہے کہ اندر سے **لبنا سائغا للشاربین** جاری ہے مگر باہر سے اندر کی طرف اس مہر کے سوراخ سے کوئی جرثومہ تک داخل نہ ہو سکے اس مہر کے سوراخ میں ایسی کیواڑیاں لگا دی ہیں جو اندر سے باہر کی طرف تو کھل سکتی ہیں مگر باہر سے اندر کی طرف نہیں پھر مزید احتیاط کے طور پر اس سوراخ کو دودھ یا رطوبت سے بند کر دیا تاکہ پینے والے کو کوئی تکلیف دہ جرثومہ دودھ میں شامل ہو کر تکلیف نہ پہنچا سکے۔

یہ دودھ اس نے ایسی حکمت سے تیار کیا ہے کہ گندہ خون چھاتیوں میں آکر صاف شفاف سپید رنگ کا ہو جاتا ہے اس میں مناسب شکر اور نمکیات شامل ہوتے ہیں اور پانی کی مناسب مقدار ہوتی ہے۔

دیکھئے یہ جو لوگ فطرت کو خالق مانتے ہیں کیا ایسی باریکیاں بے شعور فطرت پیدا کر سکتی ہے؟ "بریں عقل و دانش بباید گریست" لعنت ہے اس فلسفہ پر جو ایسی خارج از عقل باتیں سکھاتا ہے۔

*

الرحمٰن جل جلالہ و الرحیم جل جلالہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے دریائے رحمت وشفقت سے ایک بڑا حصہ قلب مادر کو عطا کیا ہے۔ اگر اس کے بچے کا کان بھی گرم ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے راتوں اس کے لئے جاگتی ہے اور چاہتی ہے کہ فوراً" اس کی تکلیف دور کردے وہ ذرا روتا ہے تو فوراً اپنا خون پلانے کے لئے تیار ہوجاتی ہے ایک لمحہ کے لئے وہ اس کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتی خود بھوکی رہتی ہے مگر اس کا پیٹ بھرتی ہے خود جاگتی ہے مگر اسے سلاتی ہے۔ خود گرم وسرد زمانہ برداشت کرتی ہے مگر اس پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ ہر وقت اس کی تکلیف کا خیال رکھتی ہے اور یہ "رافت وشفقت" جو اس کے دل میں ہے ظاہر ہے کہ خود اس کی پیدا کردہ نہیں ہے کسی دوسری ہستی کی پیدا کردہ ہے۔

محبت مادری کا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا صرف وہی ہستی اندازہ لگا سکتی ہے جو کسی بچے کی ماں ہو دنیا میں بے شمار ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ ماں نے اپنے ذرا سے بچے کی خاطر اپنی قیمتی جان بخوشی دے دی ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک ننھا سا بچہ کھیلتے کھیلتے ریلوے لائن پر چلا گیا اتفاقاً" ماں کی نظر پڑ گئی کہ سامنے سے ریل گاڑی آرہی ہے ایسا موقعہ نہ تھا کہ بچے کو لائن سے ہٹا کر اس کی جان بچالیتی تو وہ اس پر اس طرح لیٹ گئی کہ خود اس کے پرزے اڑ گئے اور بچہ سالم رہ گیا۔ مگر یہی مادر مہربان نازیبا ضد یا شرارت پر بچے کو مارتی بھی ہے غصہ بھی کرتی ہے اور بعض اوقات دوسروں سے بھی پٹواتی ہے ایسے بھی بہت سے واقعات ہوئے کہ اس مادر مہربان نے اپنے گوشہ جگر کو سزا دلوائی چوری پر اس کے ہاتھ قلم کرائے اور قتل کرنے پر اسے سولی پر لٹکوایا۔

ایسا ہی کچھ حال اس "رحمٰن ورحیم" کا ہے وہ مادر مہربان سے زیادہ اپنی

مخلوق پر مہربان ہے مگر عذاب و عتاب بھی کرتا ہے حشر و نشر کے بعد وہ اپنے خطا کار بندے سے پوچھے گا کہ اے میرے بندے تو نے فلاں وقت میرا حق ادا نہیں کیا فلاں وقت تو نے میرے ساتھ ایسا کیا فلاں وقت ایسا کیا وہ کہے گا ہاں اے پروردگار! تو اللہ فرمائے گا اے میرے بندے میں نے اپنے حقوق معاف کئے مگر تو نے جو دوسروں کے ساتھ جرائم کئے ان کی سزا بھگتنی پڑے گی وہ تو وہی لوگ معاف کرسکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے مادر مہربان اپنے بچے کو مارتی ہے یا سزا دلواتی ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو اسی طرح وہ بنظر اصلاح مجرموں کو داخل جہنم کردے گا مگر ایسا کرنے سے اسے خوشی نہ ہوگی جیسے مادر مہربان کو خوشی نہیں ہوتی ماں خود کھڑے ہوکر اپنے بچے کا فاسد ہاتھ کٹوا دیتی ہے۔ مجبوراً ایسا کرتی ہے مگر اس کا دل تو خوش نہیں ہوتا۔ اسی طرح قانون قدرت کی گرفت میں ہم خود آجاتے ہیں اور سزا پاتے ہیں خدا خود تو نہیں چاہتا کہ اس کے بندے مبتلائے مصیبت ہوں کیونکہ وہ "رحمٰن ورحیم" ہے آخر اتنے بڑے نظام عالم کے لئے کوئی نہ کوئی قانون تو ہونا ضروری تھا اور قانون بھی ایسا جو گرفت کرلے پھر بھی "رحمٰن ورحیم" کی بنا پر بڑی چھوٹ مل جاتی ہے۔

ہم رات دن اس قدر گناہ کرتے ہیں اس کا قانون گرفت کرتا رہتا ہے اور دریائے رحمت ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے اس طرح ہم مجرموں کا کام چلتا رہتا ہے کبھی گرفت ہوجاتی ہے اور کبھی چھوٹ مل جاتی ہے بلکہ ہر وقت چھوٹ ہی چھوٹ ہے گرفت نہ ہونے کے برابر ہے۔

وہ تو بڑا رحم وکرم والا ہے مگر اس کا قانون بڑا ہی جبار و قہار ہے فوراً گرفت کرلیتا ہے اگر کوئی شخص زہر کھاتا ہے خواہ مومن ہو یا کافر مرجاتا ہے۔

اسی طرح دیکھا جائے تو ساری بیماریاں ہماری اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ جس طرح امراض جسمانی ہمارے خودساختہ ہوتے ہیں اور ان پر فوراً قانون قدرت گرفت کرلیتا ہے اسی طرح روحانی امراض ہمارے خود پیدا کردہ ہوتے ہیں اور قانون الٰہی فوراً گرفت کرلیتا ہے۔ پھر وہ لوگ بڑے ہی خوش نصیب ہیں جنہیں اپنے

کردار کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے اور وہ بڑے ہی بدنصیب ہیں جنہیں آخرت میں ملے گی۔ اگر وہ "رحمٰن ورحیم" نہ ہوتا تو ان مجرموں کی زندگی دوبھر ہوجاتی اس کا "رحمٰن ورحیم" ہونا باعث رحمت بن گیا مگر ان کے لئے باعث زحمت بن گیا۔

کبھی "ظہور رحمت" بصورت زحمت ہوتا ہے ایک مہربان ڈاکٹر اپنے مریض کا پاؤں کاٹ کر پھینک دیتا ہے تاکہ بقیہ جسم سالم رہے دیکھو یہاں رحمت بصورت زحمت ہے اسی طرح کبھی اس کی رحمت کا ظہور بصورت زحمت ہوتا ہے میں نے کئی ایک سنگدلوں کو دیکھا کہ انہیں اچانک ایسی عظیم آفت پہنچی کہ ان کے قلوب موم ہوگئے۔

گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے گیہوں کی تو زیادہ سے زیادہ یہ خطا ہے کہ اس نے انسان کی غذا بننا کیوں قبول کیا مگر گھن بیچارے نے تو یہ ذمہ داری قبول نہ کی تھی تو وہ پیسا گیا۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس لئے پیسا گیا کہ وہ ایسوں کے ساتھ کیوں رہا جو پیسے جاتے ہیں تو جو بے گناہ ایسی بستیوں میں رہتے ہیں وہ بھی شامل عذاب کر لئے جاتے ہیں کہ وہاں کیوں رہے اور کیوں ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑا۔

جسطرح اس نے بہ تقاضائے رحمت ہماری ہر قسم کی راحت کا انتظام کیا ہے اور حفاظت جسم کے لئے میٹھی نمکین اور کڑوی کسیلی چیزیں پیدا کی ہیں۔ اسی طرح ہماری روحانی حفاظت کے لئے بھی تلخ و شیریں چیزیں پیدا کیں وہ ہماری اصلاح و فلاح روحانی کے لئے کسی پیغمبر یا مصلح کو رحمت بنا کر بھیجتا ہے تو شیطان کے ایجنٹ اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں' لہٰذا تصادم پیدا ہوجاتا ہے اور کشت وخون کا بازار گرم ہوجاتا ہے' بظاہر یہ لڑائیاں زحمت نظر آتی ہیں دراصل رحمت ہوتی ہیں کہ قوم کا فاسد مادہ کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے اور ایک تندرست قوم جنم لیتی ہے۔

جنگ عظیم اول اور دوم جن لوگوں کے لئے آفت بنی' اللہ ان کا حساب جانے مگر آنے والی نسلوں کے لئے یہ دونوں لڑائیاں باعث رحمت بن گئیں کہ

طرح طرح کی ایجادات ہوئیں جن سے مخلوق راحت پارہی ہے' اگر یہ لڑائیاں نہ ہوتیں تو ہم ان سیکڑوں ایجادات سے محروم رہ جاتے جو ضروریات جنگ کے لئے کی گئیں اور اب جو اگلی جنگ کے لئے تیاریاں اور ایجادات ہورہی ہیں ان سے بے شمار بد بختوں کو نقصان پہنچے گا مگر اختتام جنگ کے بعد جو دور آئے گا وہ امن و سکون اور راحت و رحمت کا دور ہوگا کیونکہ ان جنگی ایجادات سے وہ اپنی صحت و آسائش و آرام کے سلسلے میں بہت سے فائدے اٹھائیں گے۔

بسا اوقات انسان پر مصیبت پڑتی ہے تو اسے دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی ہے وہ بڑا غم کرتا ہے مگر پردۂ تقدیر میں یہ مصیبت دراصل رحمت ہوتی ہے پھر اسے پتہ چلتا ہے کہ میں جسے مصیبت سمجھا تھا وہ تو رحمت تھی کبھی زوال باعث ترقی ہوتا ہے بعض اوقات کوئی عورت بیوہ ہوجاتی ہے وہ بری طرح روتی پیٹتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اسے ایک اچھا شوہر دینا چاہتے ہیں اور اس کی زندگی کو اور بہتر بنانا چاہتے ہیں تو شوہر کی یہ موت اس کے لئے آفت نہ تھی رحمت تھی۔

اسی طرح بعض اولاد کا مرجانا ہی ہمارے لئے رحمت ہوتا ہے' آوارہ اور بدقماش اولاد اپنے باپ کے مرنے کے بعد نیک اور کارکن بن جاتی ہے اور بعض گھرانے کسی بزرگ کی وفات کے بعد بالکل بدل جاتے ہیں الغرض موت بھی باعث رحمت ہے کہ ہمیں رنج و تکالیف سے چھڑا دیتی ہے۔

انسان کے لئے طرح طرح کے امراض و آلام و مصائب پیدا کئے اگر امراض و آلام نہ ہوتے تو ہم بڑے و متکبر و غافل ہوتے۔ ہر شخص صبر ناآشنا اور فرعون ہوتا۔ موت اور موت کا ڈر ہمیں کبر و نخوت سے روکتا ہے۔

موت نے کردیا ناچار وگرنہ انساں ہے خود وہ بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

اور ہماری روحانی اصلاح کے لئے بہت سی شیریں چیزیں بھی پیدا کیں۔ جن میں سب سے شیریں چیز علم ہے۔ لذت علم کے سامنے دنیا کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔ چونکہ علم غذائے روح ہے لہذا علمی باتیں سن کر اور جان کر روح خوش ہوتی ہے۔ جاہل آدمی بھی علمی بات سن کر ایک گونہ سرور محسوس کرتا ہے۔ قرآن نازل فرمایا جس کی چاشنی سے روح وجد کرنے لگتی ہے ذکر و فکر میں ایسی لذت بھری ہے کہ اہل دل ہی اس کی لذت کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور ہر ذاکر رطب اللسان ہوتا ہے اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جن سے روح کی اصلاح ہوتی ہے۔

وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰاحِمِیْنَ

اَلرَّزَّاقُ جل جلالہ

جب ہمارے گھر مہمان آنے والے ہوتے ہیں تو ہم ان کی آمد سے پہلے ان کے لیے فرش فروش بچھاتے ہیں، کھانے تیار کرتے ہیں، مشروبات بنواتے ہیں، خادموں کو یا گھر والوں کو خدمات سپرد کرتے ہیں اور جب مہمان آ جاتے ہیں تو ان کے لیے دستر خوان بچھا کر کھانے اور مشروبات چنتے، خادموں یا گھر والوں کو ان کی خدمت میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی حضرت انسان کے زمین پر آنے سے پہلے خدا نے ان کے لیے زمین کا فرش بچھایا، پھر اس "خوان یغما" پر طرح طرح کے ماکولات و مشروبات سجائے اور خدمت کے لیے خادم پیدا کیے، قسم قسم کے غلے، پھل اور مشروبات پیدا کیے، درختوں کو حکم دیا کہ وہ بھی ہمارے مہمان کے لیے لباس پیدا کریں اور اسے ماکولات اور مشروبات سے نوازیں، پنکھا جھلیں، سایہ دیں اور آتش و نور بخشیں۔

وہ اپنی مخلوق پر مادر مہربان سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ کیسے کیسے آسائش کے سامان مہیا کیے ہیں اور انواع و اقسام کے رزق پیدا کیئے ہیں کہ مخلوق ایک چیز کھاتے کھاتے اکتا نہ جائے، رزق کا کتنا زبردست اہتمام کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، ابھی بچہ شکم مادر میں آتا بھی نہیں کہ پہلے سے غذا کے لیے خون موجود ہوتا ہے اور جب بڑا ہو گیا تو کھانے پینے کی سمجھ عطا کر دی اور رزق کے لیے لڑنے جھگڑنے اور رونے کی خو عطا کر دی۔

فضا میں فضائی جانوروں کے لیے رزق مہیا کیا اور پانی میں پانی کے جانوروں کے لیے اور جو زمین کے اندر دفن ہیں وہ مٹی چاٹ چاٹ کر خوش ہیں رزق کے سلسلے میں اس نے بڑے عجیب و غریب انتظامات کیے ہیں کہ

عقل حیران رہ جاتی ہے' اونٹ ایک ایسے مقام کا جانور ہے جہاں پانی اور سبزے کی افراط نہیں تو اس کے جسم میں پانی اور چربی کا ذخیرہ کر دیا کہ بوقت ضرورت کام آئے بلکہ ہر جانور کے جسم میں چربی پیدا کر دی تاکہ کسی وقت غذا نہ ملے تو وہ پگھل پگھل کر کام دے اور تن کا گوشت محفوظ رہے۔ بعض نو مولود ایسے ہیں کہ ان کے لیے رزق کا کوئی وسیلہ نہیں تو وہ اپنے ماں باپ کے جسم ہی کو کھاتے ہیں اور بعض جانور اپنا ہی جسم کھا جاتے ہیں۔ بعض اپنے انڈے اور بچے کھا جاتے ہیں۔

اس نے مخلوق کو پیدا کیا تو بھوک کو بھی پیدا کیا تاکہ خوب گھما گھمی رہے' مخلوق ' خالق کو تو کھا نہ سکی لہٰذا مخلوق مخلوق کو کھاتی ہے۔

ہر مولود اپنے ساتھ اپنا رزق لاتا ہے کیونکہ رزق کا ذمہ دار اللہ ہے مگر کوشش فرض ہے۔ کسی جنگل میں ایک صوفی نے لنگڑی لنجی لومڑی پڑی دیکھی سوچنے لگا یہ کہاں سے کھاتی ہے' انتظار کرنے لگا کہ دیکھیئے اللہ اسے کیسے رزق دیتا ہے' ایک شیر آیا اور پس خوردہ چھوڑ گیا وہ گھسٹتی ہوئی شکار تک پہنچی اور کھا کر آسودہ ہو گئی' دل میں کہنے لگا میں بھی اس لومڑی کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر مسند توکل پر بیٹھ جاؤں گا' ندا آئی تو لومڑی کیوں بنتا ہے۔ شیر بن کہ دوسروں کو کھلائے۔ رزق تو بہت ہے مگر جدوجہد شرط ہے۔

؎ رزق ہر چند بے گمان رسد
شرطِ عقل است جستن ازد رہا

رزق مقسوم ہے کم یا زیادہ نہیں ہو سکتا' ہر شخص اسی قدر کھا کر مرے گا جتنا کہ اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ رزق میں کمی زیادتی کیوں ہے؟ سو یہ تقدیری معاملات ہیں اور اسرار الٰہی سے ہیں جن کا افشاء کرنا روا نہیں افشاء بھی کر دیا جائے تو فائدہ کچھ نہیں 'بس اتنا سمجھ لو جو نو مولود دنیا میں آیا ہے یہ اس کی خطا ہے کہ ایسے وقت کیوں آیا جبکہ ایسی تقدیر کے لکھنے جانے کا وقت تھا' روحیں دنیا میں آنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں اور اندھا دھند شمع زندگی پر گرتی ہیں جیسے پروانہ شمع پر گرتا ہے کوئی بالکل جل جاتا ہے تو اس کی

خطا ہے کہ اندھا دھن کیوں گر گیا، کسی کا ایک پر جل جاتا ہے اور کسی کے دونوں تو وہ پھر جرثومہ کی صورت میں شمع کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے اور کوئی احتیاط سے چکر لگاتا رہتا ہے تو بچ نکلتا ہے۔

رزق مقسوم ہے ہماری جدوجہد سے کم یا زیادہ نہیں ہو سکتا مگر جدوجہد فرض ہے

یہ تو اس "رزاق" کے رزق کے وہ طریقے تھے جو پابند اسباب ہیں مگر وہ ایک اور طریقے سے بھی رزق بھی دیتا ہے جو حیران کن ہوتے ہیں اور کسی سبب کے تحت نہیں ہوتے سیکڑوں بزرگوں کے ایسے واقعات ہیں کہ انہیں لق و دق صحرا میں آسمان سے دو روٹیاں دستر خوان پر اتریں اور ایک پیالے میں پانی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے آسمان سے دستر خوان اترا اور ہمارے حضورؐ سے رزق و آب کے بارے میں بہت سے معجزات صادر ہوئے یہاں عقل ہتھیار ڈال دیتی ہے کہ وہ روٹیاں جو آسمان سے اتریں اس کا غلہ کہاں پیدا ہوا؟ کس نے پیسا؟ کس نے پکایا؟ اور جس سونے کے پیالے میں پانی آیا وہ سونا کہاں سے آیا پیالہ کس نے بنایا اور پانی کہاں سے اترا؟ شیخ باہو کو بھنی ہوئی مچھلی صحرا میں کہاں سے آئی؟ کس نے اسے ہرن کے سینگ میں پرویا اور وہ ہرن کہاں سے آیا اور ان تک کیسے پہنچا؟ یہ سب باتیں عقل میں نہیں آتیں مگر ایسا ہوا تو ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

ے بہ بیں طرفہ تماشا شیخ باہو
برات عاشقاں بر شاخ آہو

اسی طرح بعض لوگوں کے لیے سونے کی اشرفیاں برسیں وہ سونا کہاں سے آیا اور کس نے اسے سکہ رائج الوقت میں ڈھالا؟

لوگ ایسی باتیں سنتے ہیں تو بس انکار کر دیتے ہیں حالانکہ یہ بہت معمولی سی بات ہے، دیکھو اللہ "مسبب الاسباب" ہے جس نے اسباب و علل کو پیدا کیا وہ خود اسباب کا کیسے پابند ہو سکتا ہے؟ لہٰذا وہ بغیر کسی سبب کے بھی پیدا کر دیتا ہے مگر اس نے نظام عالم کا دارو مدار اسباب پر قائم کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں

کہ وہ اسباب کا محتاج ہے۔ عالم اسباب کی ہر چیز سبب کی پابند ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی عجیب اور دو بھر ہو جاتی کہ بغیر بادلوں کے بارش ہو جایا کرتی اگر ہم بارش سے بچنا چاہتے تو نہ بچ سکتے اور اگر فائدہ اٹھانا چاہتے تو پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکتے۔ اگر یونہی اچانک بچے پیدا ہو جایا کرتے اور کھیتیاں لہلہانے لگا کرتیں تو "توالد و تناسل" و "جدوجہد" کا مزا نہ رہتا' بلا سبب موت آ جایا کرتی تو ہر وقت کھٹکا لگا رہا کرتا اور علاج معالجے کی ضرورت نہ پڑتی تو نہ حکیم ہوتے نہ عطار' نہ ڈاکٹر نہ دواخانے۔ اس لیے اس نے سارے عالم کو اسباب کے تحت کر دیا ہے کہ نظام عالم برقرار ہے اور انسان اپنی سوجھ بوجھ سے بھی کچھ کر سکے۔

یہ جو خوارق عادات ہیں کبھی کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور ان سے نظام عالم کی استواری میں خلل نہیں پڑتا مگر یہ ہوتے ضرور ہیں اور احاطۂ عقل و خرد سے باہر ہوتے ہیں' عالم اسباب سے اس کا تعلق نہ تھا

اس کا تعلق "مسبب الاسباب" سے ہے' جو سبب کا پابند نہیں۔

بہر حال یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ عقل میں آ ہی نہ سکیں کیونکہ عقل اس بات کو جائز قرار دیتی ہے کہ "مسبب الاسباب" سبب کا پابند نہیں ہو سکتا' اس طرح معجزات' کرامات اور خوارق عادات' خلاف عقل نہیں ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پہلی بار اس نے جس چیز کو بھی پیدا کیا' کسی نطفے' تخم یا کسی پانی سے پیدا نہیں کیا تو جو اختراع کر سکتا ہے وہ پھر بھی اختراع کر سکتا ہے۔

بات لمبی ہو گئی' مختصر یہ کہ وہ "رزاق" سب کو رزق دیتا ہے جیسا بھی جس کے نصیب کا ہو اور بغیر اسباب کے بھی رزق دیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۔

*

اَلرَّشِیْدُ جل جلالہ

بارھویں پارے کے ساتویں آٹھویں رکوع میں یہ لفظ آیا ہے مگر اسم الٰہی کے طور پر نہیں آیا ارشاد رشد اور رشد بھی آئے ہیں۔

وہ "ہادی" ہے اس حیثیت سے کہ اس نے پیغمبر اور مقدس کتابیں نازل کیں اور "الرشید" ہے اس حیثیت سے کہ اس نے ہمارے اندر رشد و شعور پیدا کیا۔ کہ اچھائی برائی کو پہچان سکیں۔ یعنی ہدایت باہر سے اندر آتی ہے اور' رشد ہمارے اندر سے باہر ظہور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا"

اگر تم ان یتیموں میں رشد و شعور دیکھو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو یعنی جب وہ سن رشد کو پہنچ جائیں اور مال کی قدر و قیمت سے باشعور ہو جائیں تو. ان کے اموال ان کے سپرد کر دو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی زبانی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ**

کیا تم میں کوئی باشعور انسان نہیں ہے۔ جب ملائکہ حضرت لوط کے گھر آئے تو ان کی قوم کے اوباشوں نے ان پر ہلہ بولنا چاہا تو انہوں نے قوم سے فرمایا بیٹیاں حاضر ہیں یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں کیا تم لوگ کچھ شعور نہیں رکھتے فرمایا میرے مہمانوں میں مجھے ذلیل نہ کرو مگر وہ کب باز آنے والے تھے لہٰذا تختہ زمین الٹ دیا گیا۔ **جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا**

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ** "فرعون کا حکم درست نہ تھا" اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح انسان رشید ہوتا ہے حکم و احکام وغیرہ بھی رشید ہوتے ہیں۔ صرف انسان ہی نہیں اس نے رشد و شعور جانوروں کو بھی عطا

کیا ہے بلکہ درختوں اور نباتات کو بھی بلکہ نجوم و افلاک و جمادات کو بھی۔

جانوروں کے نومولود بچے بھی اپنے دوست اور دشمن کو پہچانتے ہیں وہ بھی اپنے مرکز غذائی کو جانتے ہیں اپنی حفاظت اور بچاؤ کے طریقوں کا شعور رکھتے ہیں۔ خوب پہچانتے ہیں کہ ماں باپ وغیرہ ہمارے محافظ اور تربیت کنندہ ہیں۔ ہمارے دکھ اور آرام کا خیال رکھتے ہیں۔ گہوارے میں بچہ بول نہیں سکتا مگر رو کر اپنے مربیوں کو بلانا جانتا ہے پھر جس قدر اس کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں وہ "الرشید" اس کی ضروریات کے مطابق اسے رشد و شعور عطا کرتا رہتا ہے۔ بچے کو مبدائے ولادت میں اس بات کا شعور ہوتا ہے کہ میں ہوں بلکہ شکم مادر میں روح پڑ جانے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے وجود کا شعور ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ پیپل پلکھن وغیرہ کسی مکان کی بالائی دیوار پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں پانی نہیں ہوتا پختہ دیوار میں نمو کر جاتے ہیں میرے مکان کی تیسری منزل پر گلی کی طرف پختہ دیوار میں پیپل کا درخت پیدا ہو گیا وہ خوب پھلا پھولا مجھے خدشہ ہوا کہ دیوار کو نہ پھاڑ دے تو میں اس کے پتے جھاڑ دیا کرتا۔ تاکہ بڑھنے نہ پائے کیونکہ درخت کے پتے وظیفئہ انہضام ادا کرتے ہیں وہ کچھ دنوں کے بعد پھر ہرا بھرا ہوجاتا۔ کئی بار میں نے اس کی شاخیں تک کاٹ دیں۔ مگر پھر نمو کر جاتا۔ مجھے تعجب تھا کہ اس پختہ دیوار میں اسے پانی یا نمی کہاں سے ملتی ہے۔ سوچتا کہ ہوا سے خوراک حاصل کرتا ہے ایک دفعہ بیت الخلا کی نالی کھدوانے کی ضرورت پیش آگئی تو کیا دیکھتا ہوں اس کی رگیں اس نالی کے نیچے ہیں میں نے وہ ساری رگیں نکال دیں مگر پھر بھی وہ نہ مرا۔ کچھ عرصہ کے بعد بیت الخلاء کی کھڈی تڑوائی تو مجھے پتہ لگا کہ دراصل اس کی غذا کا مرکز یہ ہے دیکھیئے خدا نے اسے کیا شعور عطا فرمایا کہ پانی پر پہنچا دیا۔

اس نے جمادات کو بھی شعور عطا فرمایا سنگ مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہربا اور بعض جواہرات اثر پذیر ہوتے ہیں پتھر ضرب سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے دھاتیں آگ سے پگھل جاتی ہیں سنگ لرزاں لرزتا رہتا ہے اور بعض بعض سے فرار کرتے ہیں۔

اس نے نجوم و افلاک کو شعور عطا کیا ہے کہ وہ اپنی راہ چلتے ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں اور موانع سے بچ کر نکل جاتے ہیں تھوڑا بہت "رشد و شعور" اس نے ہر چیز کو دیا ہے۔

ساری مخلوق اسکے عطا کردہ "رشد و شعور" سے استفادہ کرتی ہے مگر حضرت انسان بسا اوقات بڑا ہی بے شعور ہو جاتا ہے وہ اپنے رشد و شعور کو کام میں نہیں لاتا بلکہ انہیں غارت کر دیتا ہے بے شک انسان بڑے خسارے میں ہے **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ**

ایک صاحب فرمانے لگے تم میں ایک بھی ولی اللہ نہیں ہوا اور ہم میں سینکڑوں اولیاء، اقطاب و ابدال ہوئے۔ میں نے کہا آپ واقف نہیں ہیں تو ہم کیا کریں؟ حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسا کوئی ایک تو لاؤ قطب الاقطاب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ جیسے بہت سے بزرگ ہم میں گزرے ہیں۔

دیو بند سے ایک رسالہ "الرشید" حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کی یاد میں نکلتا تھا۔ پتہ نہیں اب نکلتا ہے یا نہیں اور ایک "القاسم" نکلتا تھا۔ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی یاد میں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی شخصیت عجیب و غریب تھی جب حکیم عبدالوہاب المعروف بہ حکیم نابینا دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے تو حضرت رشید احمد رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کی۔ میں نابینا ہوں کیا کروں گا؟ تو انہوں نے "حب روح الذہب" کا نسخہ عطا فرمایا یہ عجوبۂ روزگار وہ دوا ہے جس کی تعریف میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بھی اک رباعی کہی ہے۔ جسکو سلاطین اور راجے استعمال کیا کرتے تھے۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی میرا
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو میرا ذوق طلب
ایک جو صبح ازل بخشی میرے اللہ نے
دوسری جو آپ کی بخشی ہوئی "روح الذہب"

چنے برابر گولی چالیس دن چلتی تھی کہتے ہیں ایک جرمن دوا ساز کمپنی نے لاکھوں دینا چاہا مگر نابینا مرحوم نے انکار کر دیا۔

حضرت گنگوہیؒ نے انہیں اور بھی عجیب و غریب دوائیں جو تیربہدف تھیں بتائیں اور دعا کی۔ تو یہ ایسے زبردست نباض ہوئے کہ حیرت ہوتی تھی اور نظام ابن سعود اور مختلف راجگان کے طبیب خاص اور وظیفہ یاب تھے۔

ان کی (نباضی) کے کرشمے میں نے خود دیکھے ہیں۔ کہیں دور سے کوئی عورت نبض دکھانے آئی پھر بولی یہ میری لڑکی ہے اس کی بھی نبض دیکھ لیجئے۔ فرمایا یہ تیری لڑکی نہیں ہے اس نے اقرار کیا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے اپنے بیٹے کی نبض دکھائی فرمایا یہ آپ کے پہلوان کا بیٹا ہے انہوں نے تسلیم کیا ایک دفعہ ایک عورت نے نبض دکھائی فرمایا کئی سال پہلے بھی میں نے یہ نبض دیکھی تھی اس نے کہاہاں کئی سال ہوئے میں حاضر خدمت ہوئی تھی۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ کی کرامات کا ذکر میں اپنے کسی مضمون میں کر چکا ہوں وہ شیخ العرب دا لعجم تھے اور مکہ و مدینہ میں ان جیسا کوئی بھی نہ تھا۔

علامہ رشید رضا مصریؒ اپنے دور کے ممالک عربیہ کے بڑے بھاری عالم تھے۔ ہندوستان آئے تو دارالعلوم دیوبند بھی تشریف لائے اس زمانے میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ صدر المدرسین تھے۔ علامہ رشید رضاؒ نے ان کی تقریر کو سن کر کہا اگر میں دیو بند نہ آتا تو ہندوستان سے مایوس لوٹتا۔ میں نے ان جیسا کوئی عالم کسی بھی ملک میں نہیں دیکھا۔

علامہ کشمیریؒ نے بڑے بڑے جید علماء پیدا کئے مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ۔ مولانا سید بدر عالمؒ۔ مولانا میرک شاہ کشمیریؒ۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ ۔ مولانا ادریس سکھروڑویؒ اور مولانا ادریس کاندھلویؒ۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔ قاری محمد طیب صاحبؒ وغیرہ۔

؎ ایں سلسلہ ازطلائے ناب است ایں خانہ ہمہ آفتاب است

اَلرَّقِیبُ جل جلالہٗ

اللہ تعالیٰ ہر وقت ہمارا نگران و نگہبان ہے۔ قرآن مجید میں ہے ترجمہ:
"انسان ذرا سی بات بھی کہتا ہے تو لکھنے والے فوراً لکھ لیتے ہیں۔"
یہ حال ہمارے الفاظ کا ہے تو اعمال کا کیا ہو گا۔ قرآن مجید میں ہے۔
(ترجمہ)-----

"مکرم لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔"

ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری نگرانی بلاواسطہ تو کرتا ہی ہے بالواسطہ بھی کرتا ہے۔ سب کچھ لکھ لیا جاتا ہے اور یہ اس کا کرم ہے کہ نیکی لکھنے والا فرشتہ بدی لکھنے والے کو روکتا رہتا ہے کہ نہ لکھ! مٹا دے! اب کے کرے گا تو لکھنا۔

(ترجمہ)-----

"ایک داہنے اور ایک بائیں بیٹھا ہے۔"

دائیں طرف والا نیکیاں لکھتا رہتا ہے اور بائیں طرف والا برائیاں۔

حشر میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت کریں گے کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لینا؟ تو عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے۔ (ترجمہ)

"میرے اٹھائے جانے کے بعد آپ ہی ان کے نگران تھے۔

اگر میں نے ایسا کہا ہو گا تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے۔ میرے چلے جانے کے بعد آپ ہی ان کے نگران تھے۔ مجھے کیا پتہ کہ پھر کیا ہوا۔

پیغمبر کے بارے میں بھی قرآن میں رقیب کا لفظ آیا ہے۔ ترجمہ: تم بھی

انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔
وہ جس کی نگرانی کرتا ہے جانی دشمن کے ہاں بھی اس کی پرورش کرا دیتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا (ترجمہ)
میں نے تجھ پر اپنی محبت ڈال دی ہے تاکہ تو میری آنکھوں کے سامنے پروان چڑھے ۔

سارے قرآن میں صرف ایک جگہ محبت کا ذکر آیا ہے اس آیت میں "تصنع" کا لفظ بڑا ہی لطف دے رہا ہے جسے ادب عربی ذوق رکھنے والے ہی پاسکتے ہیں پھر "علیٰ عینی" نے اور مزید لطف پیدا کر دیا ہے۔ اللہ جس کا رقیب و نگہبان ہو اسے کون گزند پہنچا سکتا ہے۔ فرعون ان کا دشمن تھا۔ اللہ نے اپنی نگرانی میں اسی کے محل میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرا دی۔ قرآن میں تصنع ان معنوں میں کسی اور جگہ استعمال نہیں ہوا۔ رسول اللہ کے بارے میں فرمایا ہے۔

ترجمہ: اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا۔ اس کی "رقابت و حفاظت" ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ زندہ سلامت رہے ورنہ بعض انبیاء کو سولی پر لٹکا دیا گیا تو بعض کے سر پر آرا چلا دیا گیا۔

آں یکے را ارّہ بر سرمی کشد ۔۔۔ دیگرے را تاج بر سرمی نہد

آپ محفوظ رہے اور "تاج دار دو جہاں" بنے۔ اسی کی "رقابت و حفاظت" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں محفوظ رہے۔ جب وہ حفاظت کرتا ہے۔ تو پوری پوری حفاظت کرتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو اپنی حفاظت میں لیا تو کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ تاج شاہی سر پر رکھ دیا۔ طالوت معمولی چرواہے تھے اللہ نے جالوت سے انہیں محفوظ رکھا اور پھر تاج شاہی سر پر رکھ دیا۔ یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں پناہ دی۔ "رقابت و حفاظت" خداوندی کی عجیب و غریب اور ایک بہترین مثال قرآن شریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔

ترجمہ: ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

ترجمہ: ہمارے ذمہ اسکا یاد کرانا اور پڑھانا ہے۔ اپنی زبان کو وحی کے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی حرکت نہ دیجئے ہمارے ذمہ ہے اس کا یاد کرانا اور پڑھانا۔ دنیا کی کوئی کتاب یہ دعوی نہیں کر سکتی کہ میں بالکل محفوظ ہوں یہ بات صرف قرآن تک محدود ہے کیوں کہ اللہ نے اس کے یاد کرانے پڑھانے اور محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا ہے عربی زبان ایک ایسی زبان ہے جس کا سارا دارو مدار حرکات پر ہے قرآنی آیات و الفاظ تو کیا اس کے نقطے اور حرکتیں تک محفوظ ہیں۔ قرآن میں کتنے نقطے کتنے زیر کتنے پیش کتنے زبر کتنی تنوینیں ہیں سب محفوظ ہیں۔ سینوں میں بھی اور سفینوں میں بھی۔

حفاظتِ قرآن کا اتنا زبردست کام ہوا ہے کہ عقل حیران ہے ہمارے ایک امامِ وقت نے اتنا زبردست کام کیا ہے کہ کتاب **نَثْرُ الْمُرْجَانْ فِیْ رَسْمِ نَظْمِ الْقُرْاٰنِ** لکھ کر ایک ایک نقطے اور حرکات کو محفوظ کر دیا ہے یہ کتاب تقریباً بائیس جلدوں میں دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں ہر لفظ کے نقاط اور حرکات کو عبارت میں بیان کر دیا ہے جیسے یعلمون کا لفظ ہے تو انہوں نے لکھ دیا کہ یا۔ مفتوح منقوط بدو نقاط زیریں عین مہملہ مسکون اس کے بعد لام مفتوح بعد ازاں میم مضموم پھر واوء مجزوم اور پھر نون جمع مفتوح ہے۔ بتائیے دنیا کی کس کتاب کی اس طرح حفاظت کی گئی ہے۔ کہ زیر و زبر تک محفوظ و مذکور ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون غیور و خود دار ہو سکتا ہے۔ میں نے اولیاء اللہ اور علمائے کرام کو بھی بڑا ہی غیور اور خود دار پایا۔ جن بزرگوں یا پیغمبروں نے اس کی ذات و حفاظت کو چھوڑ کر غیر کی حفاظت طلب کی انہیں سزا دی گئی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے جب قوم ان کے پیچھے بھاگی تو انہوں نے جنگل کا رخ کیا گھبرائے ہوئے تو تھے ہی رقابت خداوندی کو چھوڑ کر ایک درخت سے طالب "رقابت و حفاظت" ہو گئے اس نے پنی جڑ میں انہیں چھپا لیا قوم ڈھونڈتی پھری تو ایک درخت کی جڑ سے ان کا دامن چمکتا نظر آگیا قوم نے درخت پر آرا چلوا دیا تو خدا سے مدد کے طالب ہوئے حکم ہوا خاموش بیٹھے رہو تم نے

غیر سے کیوں مدد طلب کی!

حضرت یونس علیہ السلام توحید کی تبلیغ کیا کرتے تھے قوم ان کی باتوں سے تنگ آگئی تو قتل کرنے کے لئے دوڑے وہ بھاگے بھاگے سمندر تک پہنچ گئے اور مچھلی سے کہا مجھے نگل لے چونکہ غیر کی حفاظت کے طالب ہوئے تھے لہٰذا برسہا برس اس کے پیٹ میں رہے پھر توبہ کر لی معافی مل گئی اور مچھلی نے انہیں کنارے پر اگل دیا۔

اس بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا۔ روایت ہے کہ جب انہیں آگ میں ڈالا جانے لگا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام تین بار ان کے پاس تشریف لائے اور اپنی مدد پیش کی مگر انہوں نے بارہا انکار کر دیا اور جب انہیں آگ کی طرف گوپھن میں بٹھا کر پھینک دیا گیا تو فضاء میں بھی جبرائیل نے عرض کی کہ میں آپ کی مدد کروں فرمایا نہیں جو دوست کی مرضی۔

انہوں نے اللہ پر توکل کیا اور اس کی رقابت حفاظت پر نظر رکھی تو اللہ نے انہیں نجات دلادی اور زکریا و یونس علیہما السلام اس کی حفاظت سے سرفراز نہ ہو سکے۔

؎ "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی"

اس شعر میں علامہ اقبالؒ نے "تلمیح ابراہیمی" کو لیا ہے۔ دوسرا مصرعہ تو بڑا ہی زور دار ہے کہ ہر لفظ نے نئی جان ڈال دی ہے "بام" اور پھر "لبِ بام" اور پھر "تماشائے لبِ بام" اور اس پر مستزاد "محو" پھر "ابھی" کے لفظ نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔

سبحان اللہ ان من البیان لسحرا۔

وہ "الرقیب" صرف ہمارے جسم ہی کی حفاظت نہیں کرتا ہماری روح کی بھی پوری پوری حفاظت کرتا ہے کہ موت کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ پاتے ورنہ مرنے کے بعد تو ہم کہیں کے بھی نہ رہتے۔ روح امر ربی جو ٹھہری امر ربی کو کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اگر جسم کو بھی امر ربی قرار دے دیتے تو یہ بھی محفوظ رہتا اور

انبیاءؑ۔ شہداءؒ۔ اولیاءؒ اللہ کے تو اجسام بھی محفوظ رہتے ہیں "حفاظت و صیانت" خداوندی پر میں کئی بار لکھ چکا ہوں باتیں مکرر ہو جائیں گی لہذا اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

بعض لوگ کہتے ہیں صارم کیا دقیانوسی باتیں کرنے لگا ہے

؎ رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

*

اَلرَّءُوْفُ جلّ جلالہٗ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں دس گیارہ مرتبہ آیا ہے، اور اس کا مصدر رافت دو جگہ۔ چنانچہ اٹھارویں پارے کے ساتویں رکوع میں ہے "زانی و زانیہ ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور حکمِ الٰہی میں ان دونوں کے ساتھ "رافت" و رحم کا برتاؤ نہ کرو اگر اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو"۔

ستائیسویں پارے کے بیسویں رکوع میں ہے "ہم نے ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور انہیں انجیل دی اور ان کے متبعین کے دلوں میں "رافت" و رحم پیدا کر دیا" یہاں "رافت" کے ساتھ رحمت بھی لائے ہیں جیسا کہ عموماً" رؤف کے بعد رحیم آیا ہے۔

"رافت" شفقت و مہربانی کے معنی میں ہے لہٰذا رؤف اس ذات کو کہیں گے جو شفیق و مہربان ہو اور حد درجے رحم کرنے والی ہو۔ جو شفیق و مہربان ہو گا وہی رحم کر سکتا ہے غیر شفیق اور غیر مہربان کیسے رحم کرے گا؟

دوسرے پارے کے پہلے رکوع میں ہے "اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ رؤف و رحیم ہے"۔

اسی پارے کے نویں رکوع میں ہے "بعض لوگوں نے اپنی جانوں کو رضائے الٰہی کے لئے بیچ دیا ہے اللہ بندوں پر مہربان ہے"۔

تیسرے پارے کے گیارھویں رکوع میں ہے "جس دن پائے گا ہر نفس اپنی کی ہوئی بھلائی اور برائی اور تمنا کرے گا کہ ان کے اور اس کے درمیان بڑا بھاری فاصلہ ہوتا اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں کے ساتھ بہت شفقت والا ہے" سبحان اللہ! ڈرایا اور فوراً" دلاسا بھی دیدیا کیا شانِ "رافت" و کرم ہے۔

گیارھویں پارے کے تیسرے رکوع میں ہے "اللہ تعالیٰ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جنھوں نے ایسی تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تذبذب ہو چلا تھا پھر اللہ نے ان (گروہ) کے حال پر توجہ فرمائی بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے"۔

سترھویں پارے کے سولھویں رکوع میں ہے "اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک دیا ہے ہاں مگر اسی کا حکم ہو جائے تو خیر۔ بے شک اللہ لوگوں کے حال پر بڑی شفقت اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اس آیت میں اپنی رحمت و شفقت کے ایک مظہر کا ذکر کیا ہے کہ دیکھو تم پر آسمان نہیں ٹوٹ پڑتا یہ اس کا کتنا بڑا کرم ہے اگر ایسا ہو جاتا تو ہم کہاں جاتے' آسمان اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہم زیر آسمان آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تباہی ہی تباہی ہوتی۔

اٹھارویں پارے کے آٹھویں رکوع میں ہے وہی اپنے بندے پر آیات بینات نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف لائے اور بے شک اللہ تمہارے ساتھ مہربانی و رحم کا برتاؤ کرنے والا ہے۔ اس آیت میں اپنی شفقت و رحمت کے ایک اور مظہر کا ذکر کیا ہے یعنی جس طرح تمہاری حیات جسمانی کے لئے اس نے آسمان کو روکے رکھا ہے تمہاری حیات روحانی کے سامان بھی مہیا کئے ہیں کہ اپنے رسول پر آیات بینات نازل کیں تاکہ تم ظلمتوں سے نور کی طرف نکلو۔

یہ اس کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ وہ ہمارے جسم و روح کی حفاظت کرتا ہے ورنہ ہم گم راہ ہی رہتے جس طرح اس نے ہمارے جسم کی آسائش کا خیال رکھا ہے روحانی آسائش کا بھی اسی درجہ خیال رکھا ہے بے شک وہ "الرؤف" شفیق و مہربان ہے۔

جس طرح اس نے اپنا نام رؤف و رحیم رکھا اپنے نبی کو بھی یہ دونوں نام عطا کئے ہیں گیارھویں پارے کے آخری رکوع میں ہے۔

تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمہارے نقصان کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہارے منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

یہ ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کتنا بڑا اعزاز ہے کہ انہیں اپنا نام دیدیا۔

ان کے رؤف و رحیم ہونے میں کیسے شک ہو سکتا ہے آپ کے منکرین و معاندین نے بھی آپ کی اس صفت کی تعریف کی ہے اور آپ کو "رحمت عالم" اور سراپا "رافت" و شفقت مانا ہے کمال ہے قابو پانے پر' سارے دشمنوں کو معاف کر دیا کیا دنیا اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟

جو غالب آکر بھی صلح کر لے جو تیغ زن سے لڑے نہتا

فَانْظُرْ اِلٰى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ اپنے رب کے آثار رحمت کی طرف دیکھو جب باران رحمت برستا ہے تو نہ صرف انسانوں پر اس کی مہربانی چھا جاتی ہے بلکہ ساری مخلوق پر اس کی شان "رافت" چھا جاتی ہے پیاسی زمین سیراب ہوتی ہے۔ پتھروں اور چٹانوں کی پیاس بجھ جاتی ہے درخت لہلہانے لگتے ہیں۔ پھول وضو کرنے لگتے ہیں نباتات زمین سے سر نکالتی ہیں درختوں کے پتے گردوغبار سے پاک ہو جاتے ہیں فطرت درختوں کو غسل دیتی ہے مینڈک خوشی سے ٹرانے لگتے ہیں۔ جھینگر گانے لگتے ہیں پرند اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور غسل کرتے ہیں تالاب اپنے پیالوں کو بھر لیتے ہیں ندی نالے بہہ پڑتے ہیں اور دور و نزدیک کے حشرات الارض' چرند پرند اور درختوں کو سیراب کرتے ہیں جو حشرات الارض زمین کی نمی کو چوسنے کے محتاج ہوتے ہیں وہ سیر ہو جاتے ہیں پھولوں اور پھلوں اور پتیوں پر جوبن آجاتا ہے جن کے رس سے ان گنت مکھیاں شہد چوستی ہیں بھنورے خوشی سے گنگناتے ہیں اور چڑیاں برکھا کے گیت گاتی ہیں۔ پتوں کی ایک ایک رگ سیراب ہوتی ہے اور درختوں کی ایک ایک نس تر ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے کیڑے مکوڑے لباس ہستی سے آراستہ ہو کر رونق عالم کو دوبالا کرتے ہیں۔ وہ پرند جو پانی نہیں پی سکتے یا انہیں میسر نہیں آسکتا اپنی چونچیں آسمان کی طرف کھول کر دل کی ٹھنڈک حاصل کرتے ہیں دلوں میں ایک ولولہ و جوش پیدا ہوتا

ہے اور مخلوق گانے لگتی ہے پہاڑوں کے پتھر اور چٹانیں دھل دھلا کر بارونق ہو جاتے ہیں اور ان کے چہروں سے گردوغبار دھل جاتی ہے کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں تو جانوروں کو چارے کی افراط ہو جاتی ہے کسانوں کی محنت بار آور ہوتی ہے تو ان کے گھروں میں خوشی کے شادیانے بجنے لگتے ہیں کپاس کے ڈوڈوں پر ابن آدم کے لئے سفید لباس آسمان سے نازل ہوتا ہے رزق بصورت دانہ گندم نازل ہوتا ہے ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے جسے خوشی خوشی جانور کھا کر ہمارے لئے دودھ اور گوشت پیدا کرتے ہیں مکھن دہی گھی اور بالائی اس طرح آسمان سے مخلوق کے لئے نازل کی جاتی ہے یہی مطلب ہے اس آیت کا **وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ** آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

ہم نے آسمان سے لوہا اتارا جس میں تمہاری حفاظت ہے لباس جنگ اور لباس تن پوشی' زرہ بکتر کرتے پاجامے ٹوپیاں جیسے لباس جو اس نے ہمارے لئے آسمان سے اتارے ہیں یہ تو ہر شخص کو نظر آتے ہیں ان دو لباسوں کے علاوہ اس نے ایک اور لباس بھی ہمارے لئے اتارا ہے جسے ہر شخص نہیں دیکھ سکتا جسے "لباس التقویٰ" فرمایا ہے۔

الغرض اس "الرؤف" کی مہربانیاں زیر زمین دفن ہیں پہاڑوں میں پوشیدہ ہیں اور سمندروں کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ**' "لباس تقوی سب لباسوں سے بہتر ہے" اس نے ہمارے لئے آسمان سے جو اونی سوتی کپڑے تن ڈھانپنے کے لئے اتارے ہیں اور جو لباس جنگ ہمارے لئے آسمان سے اتارا ہے یہ دونوں قسم کے لباس سفید سیاہ یا نیلے پیلے وغیرہ رنگوں کے ہوتے ہیں لہٰذا دکھائی دیتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں لباس مادی ہیں لہٰذا انہیں چھوا بھی جا سکتا ہے مگر لباس تقوی چونکہ بے رنگ و بو ہے اور مذکورہ بالا دونوں لباسوں جیسے تراش خراش و اشکال نہیں رکھتا لہٰذا دکھائی نہیں دیتا اور چونکہ غیر مادی ہے لہٰذا اسے چھوا بھی نہیں جا سکتا۔

یہ لباس تقوی بھی عجیب ہے کہ نہ اسے دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا

ہے نہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اس کے باوجود دکھائی دیتا ہے مگر بصارت سے نہیں بصیرت سے دکھائی دیتا ہے۔

کافر و مشرک کو بھی یہ لباس تقویٰ نظر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کچھ نہ کچھ نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے کافروں کو بھی عطا کیا ہے یہ بھی اس "الرؤف" کی "رافت" و رحمت کا ایک اثر ہے کہ اس نے سب انسانوں کو اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے۔

ایک اور لباس بھی ہے جو اس نے انسان، حیوان، چرند، پرند اور تمام حشرات الارض کو عطا فرمایا ہے جس کے بغیر ایک منٹ بھی کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا غذا پانی اور ہوا کے بغیر کچھ نہ کچھ دیر جان دار زندہ رہ سکتا مگر اس کے بغیر زندگی محال ہے۔ ہر جان دار کو اس "الرؤف" نے ازراہ "رافت" و رحمت ایسا لباس عطا کیا ہے جو اس کی اقلیم فضا اور ماحول کے لئے سازگار ہے اور موسمی تغیرات سے بچاتا ہے میری مراد کھال سے ہے کہ وہ ہمیں موذیات سے بچاتی ہے اور ہماری زینت بھی ہے۔

*

السّتّار جل جلالہٗ

مولیٰ تعالیٰ بڑے ہی ستار ہیں۔ ہم رات دن گناہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ان پر پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر مولیٰ تعالیٰ ستار نہ ہوتے تو گنہگاروں کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔ اگر گناہ کرتے ہی اس کا مخلوق پر اظہار ہو جایا کرتا تو مصیبت آجاتی اور لطف گناہ جاتا رہتا۔

کوئی بشر گناہ سے خالی نہیں اور کوئی گنہگار اس کی ستاری سے محروم نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جب ستاری کے علاوہ دوسری صفت بروئے کار آجاتی ہے تو اظہار ہو جاتا ہے۔ انسان گناہوں کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔

؎ القاہ فی الیم مکتوفا وقال لہ ایاک ایاک ان تبتل بالماء

؎ درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اس نے ہم میں گناہ کا خمیر شامل کیا ہے تو استار و حجابات بھی ڈال دیئے ہیں۔

لوگ چھپ چھپ کر گنہ کرتے رہتے ہیں اور وہ دیکھتا رہتا ہے اور پردے ڈالتا رہتا ہے یہ صفت ستاری صرف ہمارے گناہوں تک ہی محدود نہیں ہے دنیا کی ہر چیز کے ساتھ وابستہ ہے خصوصاً" موت و حیات کے کام بڑی رازداری سے ہوتے ہیں کہ ماں باپ کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ ملاپ کا کیا انجام ہوا ہے کار آمد رہایا بیکار گیا تین تاریکیوں کے اندر چپکے چپکے کام ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ جس کے شکم میں وہ بچہ ہوتا ہے اسے بھی پتہ نہیں چلتا پھر حکمت خداوندی اس کے اظہار کو ضروری سمجھتی ہے تو ماہ دو ماہ یا چار ماہ کے بعد ماں کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ایک نئی ہستی کو جنم دینے والی ہے مگر اسے معلوم نہیں ہوتا کہ مذکر ہے یا مؤنث یا مخنث ہے یا عجیب الخلقت۔ وہ شکم مادر میں پلتا رہتا ہے مگر اسے معلوم نہیں ہوتا

کہ وہ کس حال میں ہے کیا رنگ و روپ ہے؟ اس کا کیا وزن ہے؟ تندرست ہے یا بیمار؟ پھر وہ وقت مقرر آجاتا ہے کہ اس کا بچہ اس کے گھر میں قدم رکھے تب بھی اس کو پتہ نہیں چلتا کہ نووارد کب اور کس وقت آئے گا؟ تخلیق کے سارے کام دریاؤں، سمندروں اور زمینوں میں بڑی رازداری سے ہوتے ہیں۔

اسی طرح ربوبیت، تربیت اور نشوونما کے کام بھی بڑی راز داری سے ہوتے ہیں۔ حد ہے کہ کھانے والا نہیں کہہ سکتا جو لقمہ اس کے حلق سے اترا ہے اب اس کا کیا حال ہے؟ حالانکہ لقمہ اس سے جدا نہیں ہوا اس کے پیٹ میں ہے۔ کسانوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس بیج پر کیا گزری جو اس نے زمین کو ودیعت کیا؟

اسی طرح موت کے کام بھی بڑی رازداری کے ساتھ ہوتے ہیں۔ نہ مرنے والے کو پتہ ہوتا ہے نہ اس کے گھر والوں کو۔ موت ہی کے نہیں شباب و شیخوخت کے کام بھی رازداری کے ساتھ انجام پاتے رہتے ہیں جب تک بکرے کے گلے پر چھری نہیں پھر جاتی اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ماں باپ نہیں جانتے کہ ہمارا یہ بچہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں اگر رہے گا تو کب تک۔ مرنے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب مرے گا اور کہاں مرے گا؟ اگر معلوم ہو جایا کرتا تو زندگی وبال جان بن جایا کرتی اور سارے شغل اشغال ٹھپ ہو کر رہ جایا کرتے۔

ستاری کی یہ عادت الٰہی جملہ حقائق و اشیاء پر حاوی ہے برسوں ایک فلسفی کسی راز کے دریافت کرنے کے درپے پڑا رہتا ہے تب اسے کہیں کچھ تھوڑی سی روشنی ملتی ہے کسی نے سچ کہا ہے فطرت بڑی بخیل ہے۔ اپنے راز ظاہر نہیں ہونے دیتی۔

اسرار فطرت اس قدر پوشیدہ ہیں کہ کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ! برسوں اور صدیوں ایک نظریہ کو دنیا تسلیم کرتی چلی آتی ہے مگر پھر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو خیال ہی تھا۔ صدیوں تک یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے مگر صدیوں کے بعد معلوم ہوا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

جب انسان چاند کی دنیا میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ آئن سٹائن کے بعض

نظریات غلط تھے جن پر سائنس دان فخر کرتے تھے اور جس شخص کو اس کے ایک نظریہ کی بنا پر نوبل پرائز دیا گیا تھا وہ نظریہ سراپا غلط تھا۔ حقائق اشیاء کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہم جسے حقیقت سمجھ رہے ہیں آیا وہ حقیقتِ بھی ہے یا نہیں اور جسے حقیقت کلی سمجھ بیٹھے ہیں آیا وہ حقیقت کلیہ ہے یا نہیں۔ صرف اس کے ایک دو اجزا ہی کا پتہ چلا ہے حقائق اشیاء کے بارے میں میرا تو یہ نظریہ ہے کہ انسان کبھی بھی کسی بھی حقیقت تک پوری رسائی نہیں پا سکتا۔ دیکھئے اب چاند میں انسان کے قدم رکھنے کے بعد کیا کیا حقائق مجاز نظر آئیں گے اور کیسے کیسے مجاز حقیقت بن کر سامنے آئیں گے۔ مہ وانجم کے بارے میں دنیا کیا خیال کرتی تھی اور اب تو وہ اس شعر کا مصداق ہیں جو ہم نے پچاس سال پہلے کہا تھا یا لسان الغیب نے ہم سے کہلوایا تھا۔

مہ وانجم نہ کہو، ہے یہ چمن پتھر کا
دل بھی رکھتا ہے تو یہ چرخ کہن پتھر کا

ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں مجھے تو اس حقیقت ثابتہ کے بارے میں بھی شک ہے کہ چار ہوتے ہیں یا پانچ کیونکہ پانچویں ان کی اجتماعی حیثیت ہے **مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ** وہ پانچواں یا چھٹا تو سب کی نظروں سے چھپا ہوا ہے کسی نے اس پانچویں یا چھٹے کو نہیں دیکھا کیونکہ وہ بڑا بھاری ستار ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ موت ایسی رازداری کے ساتھ دبے پاوں آتی ہے جیسے بلی اپنے شکار کو چپکے سے دبوچ لیتی ہے۔ بس معمولی سی تکلیف ہوتی ہے۔ اسے بخار یا کوئی خفیف سی بیماری سمجھ لیجئے پھر وہ اس کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ تھک کر چور ہو جاتا ہے مگر بالکل سالم رہتا ہے اسے موت کی دوسری گرفت یا شدت مرض سمجھ لیجئے پھر وہ اس کا ایک بازو کاٹ دیتی ہے پھر دوسرا یہ موت کی تیسری گرفت ہے۔ پھر ہڑپ کر جاتی ہے یہ بلی یا موت کی فتح ہے اگر کوئی چھڑانے والا نہیں آیا یا شکار کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔

ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ کون سے جراثیم یا زہریلے اثرات ہمارے جسم

میں گھس گئے ہیں اور وہ ہمارے جسم میں کیا کر رہے ہیں پوشیدہ طور پر اندر ہی اندر کام ہوتا رہتا ہے پھر فساد ظاہر ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ آج مرض کی ابتدا ہوئی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا موت تو بہت دن پہلے حملہ کر چکی ہے اور اب ہمارے ساتھ کھیل رہی ہے۔

ہمارے جسم میں موت چوروں کی طرح گھس کر سب کچھ لے جاتی ہے۔ ہمیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ہم لٹ چکے ہیں چور کیسے پردہ در پردہ چھپ کر ہمیں لوٹ کر لے جاتا ہے۔ اسی طرح موت بھی راز داری کے ساتھ ہمارے متاع زندگی کو لوٹ کر لے جاتی ہے۔ اکثر جرائم استار و حجابات میں ہوتے ہیں وہاں بھی اس کی ستاری کام کرتی ہوتی ہے نہ صرف چوری بلکہ دنیا کے سارے کام حجاب اندر حجاب ہوتے ہیں شعلے اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں ہمیں جب پتہ لگتا ہے جب آگ بڑھکنے لگتی ہے ملکوں اور سلطنتوں میں جنگ چھڑتی ہے پہلے آہستہ آگ سلگتی رہتی ہے۔ اس طرح جنگی کارنامے خفیہ خفیہ انجام پاتے رہتے ہیں اور جب دو ملکوں یا سلطنتوں میں محبت بڑھتی ہے تو پہلے سے آتش شوق بھڑکتی رہتی ہے پہلی جنگ عظیم کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی پھر دوسری جنگ عظیم کی آگ بھی اندر ہی اندر سلگتی رہی اور اب تیسری جنگ کی آگ خوب اچھی طرح سلگ چکی ہے۔ دنیا خوب بارود ایٹم ہائیڈروجن اور کیا کیا چپکے چپکے ایک دوسرے سے چھپا کر جمع کر رہی ہے ایک دن کسی کی غلطی سے یا بدگمانی سے یا دشمنی سے یہ آگ بھڑک کر ساری دنیا کو ختم کردے گی لوگ سمجھیں گے اب بھڑکی ہے حالانکہ قدرت خفیہ خفیہ اپنے کام انجام دے رہی تھی جو اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں ہوئے کسی کے اندرون پردہ ارادہ سے ہوئے ہیں۔

"کب سلیقہ یہ فلک کو ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

یہ ستارے جنہیں تم رات دن دیکھ رہے ہو ان کی روشنیاں چپکے چپکے ہمارے عالم میں کیا کیا کارہائے نمایاں نیک و بدانجام دے رہی ہیں کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔

وبائیں، بلائیں، آفتیں، زلزلے، طوفان سب عالم بالا سے نازل ہوتے ہیں فضا پر ان کی روشنیوں کا دباؤ ہمارے عالم کو کچھ کا کچھ کرکے رکھ دیتا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۔

ہم نے ان کے آگے اور پیچھے رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں اور ان پر پردے ڈال دیئے ہیں لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکتے **وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ** ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں لہٰذا وہ اسے سمجھ نہیں سکتے موجودہ دنیا کے لیڈروں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ اور دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں لہٰذا وہ اندھے گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں کہ سمجھ نہیں سکتے کس طرح تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ مگر جب وہ ستار ہی پردے ڈالنے والا ہو تو پھر ان پردوں کو کون اٹھا سکتا ہے۔

اس طرح بے ساختہ پردے اٹھا سکتا ہے کون

اس نے بے محابا پردے ڈالے ہیں تو وہی ایک دن انہیں بے ساختہ اٹھا بھی دے گا **ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ** پھر تم اپنے پروردگار کے سامنے جھگڑو گے **فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** تو وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے کہ چپکے چپکے اور پردہ در پردہ اپنی تباہی کے سامان جمع کیا کرتے تھے اور آپس میں ناحق لڑتے جھگڑتے تھے۔

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!   ”یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟“

السلام جل جلالہٗ

میرا وہ مکان جس کی چھت کے نیچے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹتا رہتا ہوں تقریباً سو سال پہلے کا بنا ہوا ہے جس کی کڑیوں والی پرانی چھت میں نہ معلوم میری جان کے کتنے دشمن آباد ہیں۔ سانپ بچھو اور کنکھجورے تو ہر سال نظر آجاتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے جان لیوا جراثیم بھی آباد ہوں اور جس چھت پر میری چارپائی بچھی ہوتی ہے اس چارپائی کے نیچے بھی نہ جانے ہمارے کتنے دشمن براجمان ہیں ہم اپنی سلامتی کے لئے ہر قسم کے سامان کرتے ہیں مگر جب محافظ دشمنوں کی طرف سے آنکھیں بند کئے غافل سو رہا ہو تو اس کی طرف سلامتی کو کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ معلوم ہوا امن و سلامتی صرف اسی "السلام" کی طرف سے ہے ورنہ ہم کیا اور ہمارے حفاظتی سامان کیا؟ پھر جب وہ اپنی سلامتی کو اٹھالیتا ہے تو ہمارے سارے انتظامات دھرے رہ جاتے ہیں۔

ہمیشہ سے انسان اپنی سلامتی اور موت سے بچنے کی بڑی بڑی تدبیریں کرتا ہے یاد نہیں رہا کسی انگریز نے اس بارےمیں بڑی اچھی نظم لکھی ہے کہ ایک شہر میں وبا پھوٹ پڑی تو وہاں کے بادشاہ نے سارے عمائدین سلطنت کو شہر کے باہر ایک صاف ستھرے قلعہ میں منتقل کر دیا۔ دروازے بند کرا دیئے اور پہرے بٹھا دیئے مگر موت رقص کرتی ہوئی آئی اور سب کو ہلاک کر گئی سب کچھ دھرا رہ گیا۔ اسی طرح ایک بادشاہ نے موت سے بچنے کے لئے شیشے کا گھر بنوایا مگر موت سے نہ بچ سکا۔

ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو زمین و آسمان میں نہ جانے کتنے ہماری سلامتی کے دشمن چھپے ہوتے ہیں مگر ہم سلامتی کے ساتھ گزر جاتے ہیں گلی کوچوں اور عام شاہراہوں پر جگہ جگہ ہماری موت کے اسباب ہوتے ہیں مگر ہم سب سے بچ

کر نگل جاتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے کھانے کی میز پر بھی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو ہمارا گلا دبا سکتی ہیں مگر ہم سب کو مزے لے لے کر نگل جاتے ہیں کتنے ہی ایسے ہوئے کہ وہ کھانے بیٹھے تو کھانا ہی انہیں کھا گیا اور لقمہ، طعمہ اجل بن گیا۔

پانی پینے بیٹھے تو پانی ہی انہیں پی گیا کیونکہ "السلام" کی سلامتی ان سے اٹھ چکی تھی۔

ہم چھوٹی بڑی اور سر بفلک عمارتوں کے نیچے سے گزرتے ہیں تو اوپر سے ایک اینٹ گر کر ہمارا کام تمام کر سکتی ہے اور جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں ان کے گھروں اور کھیتوں میں موت کے فرشتے تاک لگائے بیٹھے رہتے ہیں مگر اس "السلام" کے حکم کے منتظر ہوتے ہیں درندے تو درندے خود ہم ہی جیسے انسان کتنے ہی ہمارے خون کے پیاسے ہوتے ہیں مگر اس "السلام" کی سلامتی ہمیں ان سے بچا کر صاف نکال لے جاتی ہے کہ موت دانت پیستی رہ جاتی ہے اور اس دور میں تو بجلی جگہ جگہ موت کی ایجنٹ بنی بیٹھی رہتی ہے اب تو قسم قسم کے گیس جو ہمارے ہر وقت کے خادم ہیں یہ دام اجل بھی ہیں مگر ہم سلامت رہتے ہیں امن و سلامتی اسی "السلام" سے ہے۔

حق تعالیٰ کی طرف سے جسے امداد نہ ہو تو وہ گھر تابہ قیامت کبھی آباد نہ ہو ہنستے بستے گھر منٹوں میں برباد ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی سلامتی اس گھر سے اٹھ جاتی ہے آگ ہماری خادم ہے اگر یہ خادم سرکشی پر اتر آئے تو سب کچھ جلا کر راکھ کر دے۔

یہ ڈھور ڈنگر گھوڑے اور ہاتھی جو دل و جان سے ہماری خدمت کرتے ہیں ذرا سی دیر میں ہمیں مار بھی سکتے ہیں حکایتوں میں جمشید بادشاہ شاہ ایران کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ بڑا ہی حسین گھوڑا کہیں سے آکر اس کے قلعے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا خدا نے اسے میری سواری کے لئے بھیجا ہے لگام لگاؤ اور زین کسو کہ میں اس پر سواری کا لطف لوں ہر چند لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی بھی اسے لگام نہ لگا سکا تو بادشاہ نے کہا یقیناً یہ صرف میرے ہی لئے اللہ نے بھیجا ہے یہ مجھ ہی سے لگام لگوائے گا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس پر

زین کسی لگام لگایا تو وہ خاموش کھڑا رہا جب اسکی دم میں زین کی ڈوری لگانے لگا تو اس نے ایڑی لات ماری کہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ جو ہماری سواری کے جانور ہیں اور ساری دنیا میں ہمیں لئے لئے پھرتے ہیں ایک لات میں ہمارا کام تمام کر سکتے ہیں مگر اس کی سلامتی ہمیں ان کی سرکشی سے بچاتی ہے۔

ٹیبل فین نے کتنوں ہی کی جان لے لی جو ہر وقت ٹھنڈک و سلامتی پہنچاتا تھا وہی جان لیوا ثابت ہوا بجلی کے بٹن بجلی کے تار وغیرہ کتنوں ہی کو مار چکے ہیں مگر اکثریت اس ''السلام'' کی سلامتی کی بدولت سالم رہتی ہے۔ ہیٹر اور ائیرکنڈیشنر دشمن جان ثابت ہوئے اکثر تیز رفتار سواریوں نے اپنے مالکوں کی جان لے لی ہوا جو ہماری حیات کا باعث ہے بعض اوقات وہ بھی ہماری جان لے لیتی ہے اور وہ پانی جسے ہم رات دن پیتے ہیں ہمیں اپنی آغوش میں لے کر ابدی نیند سلا دیتا ہے۔

جب میں نوجوان تھا مرنے سے بہت ڈرتا تھا کیونکہ ہمارے گھر میں سانپ رہتے تھے لہٰذا اندھیرے اجالے کوٹھری میں جاتے ڈرتا ایک دفعہ ایک انگریز کی لکھی ہوئی کتاب پڑھ رہا تھا اس نے لکھا تھا کہ موت سے بالکل نہیں ڈرنا چاہیئے کیونکہ یہ خود اپنا شکار ڈھونڈ لیتی ہے اس مقولے کے پڑھنے کے بعد میں نے موت سے ڈرنا چھوڑ دیا اور بے کھٹکے اندھیرے اجالے ہر جگہ چلا جایا کرتا تھا۔ صحیح زندگی کا لطف تب ہی ملا ورنہ ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ سچ ہے بزدل ہر وقت مرتا رہتا ہے اور بہادر صرف ایک ہی بار مرتا ہے پاکستان اور بھارت کی جنگ میں ہمارے بعض عزیز ہر وقت مرتے رہتے تھے اور ہم مزے سے بچوں کو لئے سیر کرتے پھرا کرتے تھے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ سلامتی اسی ''السلام'' سے ہے۔

مغربی مصنّفین حقیر سے حقیر عنوان پر بھی کوئی کتاب یا مضمون لکھتے ہیں تو رق ریزی اور دلچسپی سے کام کرتے ہیں ایک انگریز نے ایک کتاب میں دنیا بھر کی اقوام و مذاہب کے سلام جمع کر دیئے ہیں کوئی رام رام کہتا ہے تو کوئی واہ گرو کوئی صبح بخیر کوئی آداب عرض ہے تو کوئی گڈ مارننگ کوئی سعیدا تو کوئی صباح الخیر کسی قوم کا صبح کا سلام اور ہے شام کا اور دوپہر کا اور رات کا اور مگر اسلام کا

سلام ایک ہی ہے اور وہ ہے السلام علیکم وہ لکھتا ہے اسلام کا سلام سب سے بہتر ہے کتنے پیارے الفاظ ہیں تم پر سلامتی ہو۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ کسی نے حضورؐ کو سلام کیا تو حضور نے تیمم کرنے کے بعد جواب دیا فرمایا السلام اللہ کا نام ہے مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ بغیر تیمم کے اس کا نام لوں۔

عربی نحو کے قاعدے کے مطابق آپ یا تو السلام علیکم کہہ سکتے ہیں یا بغیر الف لام لگائے سلام علیکم کہہ سکتے ہیں مگر السلامٌ علیکم نہیں کہہ سکتے کیونکہ جہاں الف لام آجاتا ہے وہاں تنوین نہیں آتی ایک صاحب نے شاید مولانا محمد قاسمؒ بانی دارالعلوم دیوبند کو السلامُ علیکم کہہ کر سلام کیا انہوں نے فوراً جواب میں فرمایا وعلیکم السلام **یَا جَامِعَ التَّنْوِیْنِ وَالْلّامِ**۔ یعنی تجھ پر سلام اے تنوین و لام کے جمع کرنے والے۔ مولانا بڑے ہی ذہین آدمی تھے برجستہ جواب دیتے تھے دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج ان کی حاضر جوابی کی وجہ سے ان سے بہت گھبراتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ماس "ماس" سب برابر کیا سوری اور کیا گائے" مولانا مرحوم نے برجستہ فرمایا ناری ناری سب برابر کیا جورو اور کیا مائے لاجواب ہو کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ایک دفعہ اس نے اسلام کے طریقہ دفن میت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اپنے مردے زمین میں دفن کرتے ہیں اس سے زمین خراب ہوتی ہے مولانا نے جھٹ سے فرمایا اور ہندو آگ میں مردے کو جلاتے ہیں جس سے ہوا خراب ہوتی ہے مگر دفن کرنے سے زمین طاقتور ہوتی ہے۔ یہودی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تو بجائے السلام علیکم کے السام علیکم کہتے سام کے معنی موت کے ہیں یعنی تم پر موت پڑے۔ اسی طرح منافقین رسول اللہ کو خطاب کرتے ہوئے راعنا کی بجائے راعینا کہا کرتے تھے اسی لئے سورہ بقرہ میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم راعنا نہ کہا کرو وانظرنا کہا کرو جس کے وہی معنی ہیں جو راعنا کے ہیں یعنی ذرا ہمارا خیال کیجئے ذرا ٹھہریئے ذرا مہلت دیجئے تاکہ یہ لوگ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بجائے راعنا کے راعینا نہ کہیں جس کے معنی ہیں ہمارے چرواہے بڑے

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سکولوں اور کالجوں کے طالب علم بلکہ ماسٹر حضرات بھی السلام علیکم صحیح طور پر نہیں لکھتے السلام و علیکم لکھتے ہیں یہ غلط ہے السلام علیکم لکھنا چاہیئے۔ جب تک اس کی سلامتی کا ہم سے تعلق رہتا ہے دوا اور علاج درست بیٹھتا ہے مگر جب بجائے سلامتی کے اس کی صفت اماتت ہمارے ساتھ لگ جاتی ہے تو چون قضا آید طبیب ابلہ شود والا معاملہ ہو جاتا ہے اور ساری تدبیریں الٹی پڑ جاتی ہیں۔ بقول شاعر:

الٹی پڑ گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام دیا
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

دنیا میں ایسے کتنے ہی واقعات ہوئے کہ دشمنوں نے جان بچائی سانپ نے حفاظت کی اور درندوں نے انسانی بچوں کو پالا۔ بھیڑیا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے انسان کے بچے کو اٹھا کر لے گیا مگر اسے کھا نہ سکا۔ سلامتی خداوندی نے اس کے دل میں مادر مہربان کا دل ڈال دیا اور وہ اس کی سلامتی کا محافظ بن گیا۔ فرعون جو بنو اسرائیل کے بچوں کا دشمن تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مربی بن گیا۔ اس موسیٰ علیہ السلام کا جو اس کی تباہی کا باعث ہوا اور جب اس نے دیکھ لیا کہ موسیٰ علیہ السلام میرا دشمن ہے تو انہیں مار ڈالنا چاہا۔ مگر ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ وہ "السلام" ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ ایک بے زر بے پر انسان کو باوجود سب کچھ طاقت رکھنے کے گزند نہ پہنچا سکا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ فاتح مصر کو قتل کرنے کے لئے ایک خارجی تلوار لے کر ان کے دروازے پر صبح صبح کھڑا ہو گیا کہ نماز فجر کے لئے نکلیں گے تو قتل کردوں گا مگر اللہ کو انہیں سالم رکھنا تھا اس رات آپ کو اسہال لگ گئے نماز فجر کے لئے برآمد نہ ہو سکے ان کا محافظ خارجہ نماز کے لئے نکلا تو خارجی یہ خیال کر کے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں اسے قتل کر دیا خارجی کو گرفتاری کے بعد پتہ چلا کہ اس نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو نہیں خارجہ کو قتل کیا ہے تو کہنے لگا۔ اَرَدْتُّ عَمْرًا وَاللّٰہُ اَرَادَ خَارِجَۃَ۔ میں نے تو عمرو کو قتل کرنا چاہا تھا مگر

اللہ نے خارجہ کو مارنا چاہا۔

دیکھو دشمن بھی مارنا چاہتا ہے تو نہیں مار سکتا اور جس سے اس کی حفاظت اٹھ جاتی ہے وہ بلا ارادہ قاتل مارا جاتا ہے معلوم ہوا سلامتی اسی "السلام" سے ہے اور اسباب و وسائل طفل تسلیاں ہیں اور بس۔

*

السمیع جل جلالہ

ظلماتِ بحروبر میں اگر ایک سوئی بھی گرے تو مولیٰ تعالیٰ کو اس کا علم ہو جاتا ہے مگر وہ کیسے سنتا ہے اس کا کسی کو علم نہیں جیسے اس کی ذات سراپا ابہام ہے اس کی صفات بھی بڑی حد تک مبہم ہیں کیونکہ انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے بس صرف اتنا کہ وہ اپنی ضروریات کو پورا کر سکے اور نظام ارضی کو باقی رکھ سکے اس زندگی کے بعد کیا ہو گا؟ اسے کچھ پتہ نہیں۔ اسے سننے کے لئے کان دیئے گئے ہیں لہٰذا وہ سن سکتا ہے مگر یہ قوت سماعت اس کی خود پیدا کردہ نہیں ہے کسی سمیع نے اسے یہ قوت عطا کی ہے صانع اپنی صنعت کو وہی کچھ دے سکتا ہے جس سے وہ خود متصف ہوتا ہے اگر وہ سمیع نہ ہوتا تو ہمیں سماعت کیسے بخشتا اس نے اپنی مخلوق کو قوتِ سماعت عطا فرمائی انسان سنتا ہے حیوان سنتے ہیں حشرات الارض سنتے ہیں۔ درخت سنتے ہیں کھیتی باڑی سنتی ہے جڑی بوٹیاں سنتی ہیں بلکہ ساری مخلوق سنتی ہے گو ہم محسوس نہیں کر سکتے۔

اس نے سننے کے لئے کانوں کو مرکز سماعت بنایا ہے کان کے پردے سے ہوا ٹکراتی ہے اس میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے تو دماغ احساس کر لیتا ہے مگر حیوانوں کے علاوہ دوسری مخلوق کیسے سنتی ہے ہمیں معلوم نہیں تو ان کے خالق کے سمیع ہونے کا ہمیں کیسے علم ہو سکتا ہے خود ہمارے کانوں میں جو باریکیاں رکھی گئی ہیں ہم انہیں بھی نہیں سمجھ سکتے کانوں کا ایک ماہر ڈاکٹر خدا کا قائل نہ تھا بارہ سال اس نے کانوں کے مطالعہ پر صرف کئے مگر یہ باریکیاں ختم نہ ہوئیں تو پکار اٹھا ضرور ان کا کوئی صانع ہے! یہ ٹیلیفون وغیرہ کانوں کی باریکیوں کی آگاہی کے بعد ہی انسان نے ایجاد کئے۔

میں کہا کرتا ہوں اگر مجھے کہیں مولیٰ تعالیٰ مل جائیں تو پوچھوں آپ کو اس قدر

جدت طرازی کا شوق کیوں ہے! کہ دوسرے اعضا کی طرح کانوں کی بھی بے شمار قسمیں بنا دی ہیں انسانوں کے کان اور طرح کے' حشرات الارض کے اور طرح کے' اور نباتات کے اور طرح کے' معلوم نہیں کہ فرشتوں اور جنوں کے کان کیسے ہوتے ہیں اور وہ کیسے سنتے ہوں گے؟ پھر ان کے رنگ بھی مختلف' انسانوں میں بھی نر اور مادہ کے کانوں میں اختلاف ہے مرد کے کان اور طرح کے ہوتے ہیں عورتوں کے اور طرح کے بعض جانور اپنا کان ہلا سکتے ہیں بعض نہیں۔ انسان اپنا کان نہیں ہلا سکتا جب کہ گدھے گھوڑے ہلا سکتے ہیں۔ بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں انسان بھی اپنے کان ہلا سکتا تھا مگر چونکہ اس نے مکھی وغیرہ کے اڑانے کے لئے بجائے کان ہلانے کے ہاتھ سے کام لیا لہٰذا اب نہیں ہلا سکتا جب کہ جانور کان سے مکھی وغیرہ کے دور کرنے کے لئے کان کے ہلانے ہی سے کام نکال سکتے ہیں۔ یہ تو ویسی ہی بات ہو گئی کہ ڈارون نے کہا تھا کہ انسان کے بھی دم تھی مگر اس نے دم سے کام لینا چھوڑ دیا لہٰذا وہ رفتہ رفتہ غائب ہو گئی میں نے ایک صاحب کو دیکھا تھا کہ وہ جانوروں کی طرح اچھی طرح اپنا کان ہلا سکتے تھے۔ بعض جانور تو ہر سمت میں اپنا کان ہلا سکتے ہیں جیسے گھوڑا کہ وہ اپنے کان کے ایریل کو ہر طرف درست کر سکتا ہے مگر بعض جانور صرف ہلا سکتے ہیں۔ گدھے کے کان خوب لمبے ہوتے ہیں یہی حال خرگوش کا ہے اور ہاتھی کے چھاج جیسے بعض انسانوں کے کان بہت بڑے ہوتے ہیں اور سر چھوٹا یہ گدھے ہوتے ہیں یعنی بے وقوف ہوتے ہیں بعض حشرات الارض بلکہ اکثر کے کان نہیں ہوتے۔ کسی کے کان میں راڈار لگا ہوا ہے لہٰذا وہ یہ بھی محسوس کر لیتا ہے کہ چیز کتنی دور ہے چمگاڈر راڈار والا جانور ہے آپ کسی بند کمرے میں چمگادڑ پر لاٹھی کے کتنے ہی وار کئے جائیں وہ اس طرح پرواز کرے گی کہ لاٹھی کی زد سے بچ بچ جائے گی کیونکہ اس کا راڈار بتا دیتا ہے کہ لاٹھی اس کے جسم سے کتنی دوری پر گھوم رہی ہے۔

یہ تو مختصر سا حال تھا ان کانوں کا جو جسمانی ہیں کانوں کی ایک قسم اور بھی ہے جنہیں روحانی کان کہنا چاہیئے ان کی بظاہر کوئی ساخت نظر نہیں آتی مگر نفوس قدسیہ کانوں سے کافی دور کی آوازیں سن لیتے ہیں منافق لوگ اپنے گھروں میں جو

سرگوشیاں کرتے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سن لیتے تھے اسی لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کان کہتے تھے چنانچہ قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے کہ یہ لوگ آپ کو کان کہتے ہیں آپ کہہ دیجئے بے شک میں کان تو ہوں مگر خیر کا کان ہوں شر کا نہیں۔ معلوم نہیں آپ گھر بیٹھے کیسے ان کی سرگوشیاں سن لیتے تھے مگر یہ سننا جسمانی کانوں سے نہ تھا نہ ہو سکتا تھا یہ روحانی کان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے روح کو جسم سے زیادہ طاقت ور بنایا ہے۔ یہ زمان و مکان یا قریب و بعید سے بے نیاز ہے اس لئے اس کی قوت سماع جسمانی کانوں سے تیز تر ہے اولیاءاللہ کے ان گنت ایسے واقعات ہیں کہ انہوں نے دور بیٹھے باتیں سن لیں سمندر حائل ہو سکے نہ پہاڑ نہ میل و فرسنگ نہ دنیا بھر کا شورو غوغا جب کہ ہم شور و غوغا میں قریب کی آواز بھی نہیں سن سکتے۔

میں نے ایک زمانے میں شدید ترین مراقبات و مجاہدات کئے تھے تو بعض اوقات لاہور میں بیٹھے ہوئے اپنے وطن بجنور۔یو۔ پی کے عزیزوں کی بات سن لیتا تھا اور دیکھ بھی لیتا تھا کہاں لاہور اور کہاں بجنور؟ سیکڑوں دریا اور پہاڑ راہ میں حائل سیکڑوں میلوں کی دوری اور ہزاروں ریلوں انجنوں ملوں اور فیکٹریوں کی گھڑگھڑاہٹ انسانوں جانوروں اور پرندوں کا شور اور ایک گھر کے بند کمرے کی آواز مجھ تک پہنچ گئی۔ ان ظاہری کانوں سے نہیں روحانی کانوں سے مگر یہ بات اختیاری نہ تھی جیسے خود بخود الہام کا دروازہ کھل جاتا ہے اور خودبخود ہی بند ہو جاتا ہے ایک بزرگ جو صاحب الہام و کرامات تھے۔ اٹھے ٹھوکر کھائی اور حوض میں جاگرے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے کہا

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کبھی ہم دور کی بات بھی سن لیتے ہیں اور کبھی قریب کی بھی نہیں سن سکتے ہیں آخر انسان جو ٹھہرے۔ الغرض ایک کان وہ بھی ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے يَقُولُونَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ میں نے بارہا مردوں کی آوازیں سنی ہیں مگر ان کانوں سے نہیں کیونکہ یہ اس وقت بالکل بند تھے پتہ نہیں جنات اور فرشتے کیسے کان والے ہیں اور وہ کس طرح سنتے ہیں کیا ان کے کان ہمارے جیسے ہیں یا

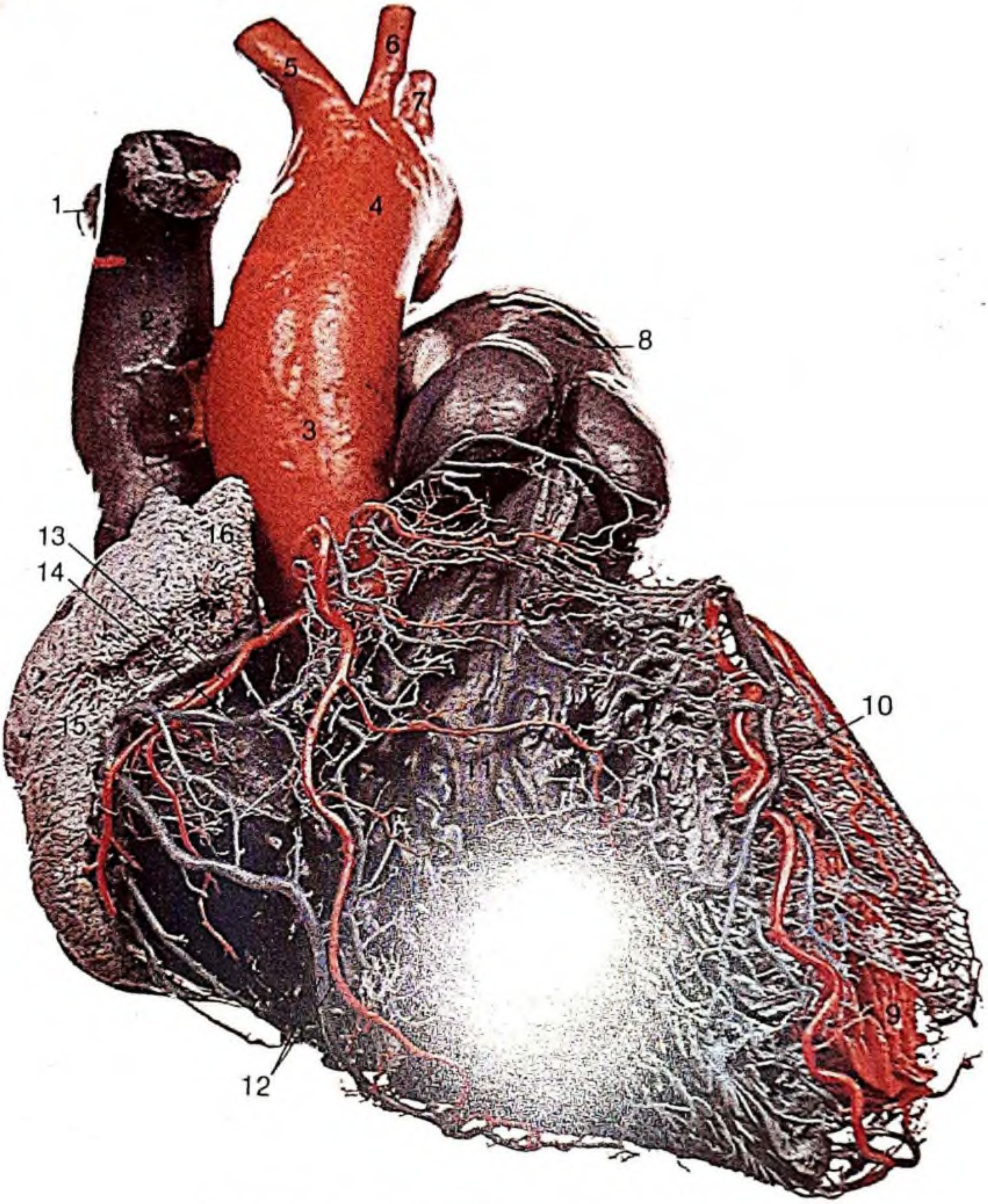
کسی اور طرح کے اور پھر مولیٰ تعالیٰ کیسے سنتے ہیں ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ سنتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کیسے سنتے ہیں "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ" ہر چیز اس کی حمد بیان کرتی ہے۔

جب اولیاءؒ انبیاءؑ سماعت کے سلسلے میں قیدِ زمان و مکان و قریب و بعید سے بے نیاز ہیں (یہ بطور کرامت اور خرق عادت کے ہے جو اللہ کی مشیت پر موقوف ہوتی ہے) تو خدا جو خود صمد بے نیاز ہے جس نے ان گنت بے نیاز پیدا کر دیئے اور جس نے خود زمان و مکان قرب و بعد کو پیدا کیا وہ کیسے قیود سے بے نیاز نہ ہو گا لہٰذا اس میں شک نہ کرنا چاہیئے کہ وہ ہر بات کو سنتا اور جانتا ہے وہ ہماری دعاؤں کو سنتا ہے اور دلوں کے حال جانتا ہے تب ہی تو ہر چھوٹی بڑی بات کا حساب لے سکے گا۔ اور حساب کتاب برحق ہے۔

وہ جسے چاہے قوت سماعت بخش سکتا ہے وہ تو وہ اب تو انسان بھی نپٹ بہرے کو سننے والا بنا سکتا ہے اور اندھوں کو سوانکھا اس دور کی بیشتر ایجادات گواہی دے رہی ہیں کہ خالق کائنات پتھروں کو بھی سامع بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاءؑ اولیاءؒ سے پتھروں درختوں نے باتیں کی ہیں اور ان کا حکم سنا اور مانا ہے۔ دیکھو کمپیوٹر بھی سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے حکم دے رہا ہے اور حکم مان رہا ہے۔

فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

*



1 Azygos vein
2 Superior vena cava
3 Ascending aorta
4 Arch of aorta
5 Brachiocephalic trunk
6 Left common carotid artery
7 Left subclavian artery
8 Pulmonary trunk
9 Left ventricle
10 Anterior interventricular branch of left coronary artery and great cardiac vein
11 Right ventricle
12 Marginal branch of right coronary artery and small cardiac vein
13 Right coronary artery
14 Anterior cardiac vein
15 Right atrium
16 Auricle of right atrium

دل ۔ نظام جسم کو منضبط رکھنے والا مرکز

الشافی جل جلالہ

مخلوقات کا نظام جسمانی پیچیدہ اور لطیف ہے ایسے پیچیدہ نظام میں کبھی نہ کبھی خرابی کا پیدا ہوجانا ایک ضروری امر ہے خصوصاً" جبکہ مخلوق اپنی بے احتیاطی اور لاعلمی سے خرابی پیدا کر دے عام طور پر بیماریاں ہم خود پیدا کرتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے۔ خواہشات نفسانی کے پورا کرنے اور بے قاعدگی سے ہمیں بیماریاں لگ جاتی ہیں کچھ بیماریاں ہماری لاعلمی سے لگتی ہیں خالق کائنات کو معلوم تھا کہ مخلوق ضرور بے احتیاطی کرے گی یا قوانین فطرت کے خلاف جان بوجھ کر یا لاعلمی سے چلے گی اور اس طرح اس پیچیدہ نظام میں خرابیاں رونما ہو جائیں گی۔

قانون قدرت کی خلاف ورزی کرنے سے ہمیں اس عالم میں سزا ملتی ہے خواہ لاعلمی سے کریں یہ ہماری اپنی کوتاہی ہے کہ ہم نے علم کیوں حاصل نہیں کیا مگر قانون عالم اور جاہل ہر ایک کی بلا کسی تفریق کے گرفت کر لیتا ہے اگر کوئی جان بوجھ کر زہر کھاتا ہے تو مرجاتا ہے اور اگر لاعلمی سے کھالے تب بھی مرجاتا ہے کیونکہ قانون فطرت اٹل ہے اور سزا ضروری ہے خواہ کافر ہو یا مومن کوئی تفریق نہیں بچہ ہو یا بڑا اگر بڑا آدمی کھائے گا تو اسے بقدر اس کے جرم کی سزا ملے گی اور بچہ بھوک سے زیادہ کھالے گا تو اسے بھی سزا ملے گی۔ قوانین فطرت کی سزائیں اسی عالم میں ہی مل جاتی ہیں البتہ قوانین روحانی کی سزا موخر ہو سکتی ہے۔

ہم جتنا بڑا جرم کرتے ہیں اتنی ہی بڑی سزا ہمیں ملتی ہے گو بعض وقت ہمیں احساس نہ ہو یا ہم برداشت کر جائیں۔ مگر جسم میں ہر چھوٹے بڑے قانون فطرت کی خلاف ورزی کی سزا کا ریکارڈ محفوظ رہتا ہے جو جوانی میں نہیں تو

بڑھاپے میں سراٹھاتا ہے ہر چھوٹی سے چھوٹی غلطی کا دھبہ ہمارے جسم پر ضرور پڑ جاتا ہے اور ہر بے قاعدگی کا پورا پورا ریکارڈ ہمارے جسم میں محفوظ رہتا ہے تب ہی تو موقع پاکر مختلف بیماریاں سراٹھاتی ہیں اور جہاں انہوں نے جسم میں کمزوری محسوس کی اور انہوں نے حملہ شروع کیا اور ذرا دیکھا کہ قوت مدافعت کمزور ہو گئی ہے اور ہر دھبہ رنگ دکھانے لگا۔

"شافی مطلق" نے ہماری بیماریوں کے رفع کرنے کے لئے طرح طرح کی جڑی بوٹیاں بنائی ہیں جتنی بیماریاں اتنی ہی دوائیں میرے ایک دوست کہنے لگے اللہ میاں نے دوائیں کیوں کڑوی کسیلی بنائی ہیں۔ میں نے کہا بات ظاہر ہے اگر دوائیں کڑوی کسیلی نہ ہوتیں تو لوگ کھا جایا کرتے اور بیمار محروم رہ جایا کرتے پھر اس کی قدرت کاتماشا دیکھئے کہ جڑی بوٹیاں بلند پہاڑوں پر محفوظ جگہ پر پیدا کی ہیں کہ انسان و حیوان وہاں تک نہ پہنچ سکے اور ہر ایک انہیں پامال نہ کر سکے۔ پھر ہر جڑی بوٹی اور ہر پھل میں ایسے اشارے رکھ دیئے ہیں جو اہل دانش و بینش کو برملا بتاتے ہیں کہ ہم فلاں مرض کی دوا ہیں۔

قدرتِ خداوندی کے قربان جایئے۔ اس نے انسان و حیوان وغیرہ کے آرام و آسائش کا کس قدر خیال رکھا ہے اور کیسی کیسی عجیب و غریب دوائیں پیدا کی ہیں یہ اس کی کتنی بڑی مہربانی ہے ورنہ تڑپ تڑپ کر مخلوق مر جایا کرتی پھر انسان کو اتنی عقل عطا فرمائی کہ وہ نباتات و حیوانات کے امراض کا بھی پتا چلا سکتا ہے اور ان کے لئے بھی پیام شفا لا سکتا ہے خلیفہ ارضی جو ٹھہرا۔ مگر یہ سب اسباب شفا ہیں۔ دراصل "شافی مطلق" تو وہی ہے اس کی مشیت نہیں ہوتی تو بڑے بڑے علاج دھرے رہ جاتے ہیں اور اس کی مشیت ہو تو خاک کی چٹکی بھی خاک شفا بن جاتی ہے چون قضا آید طبیب ابلہ شود اور روغن بادام ہم خشکی کند والا معاملہ ہو جاتا ہے کسی بڑے فلسفی کے بارے میں سنا تھا شاید بقراط یا افلاطون وغیرہ کا قصہ ہے کہ مرتے دم دست بند نہ ہوئے تو شاگردوں سے کہا پانی لاؤ اس نے ایک چٹکی پانی میں ڈالی تو وہ جم گیا کہنے لگا دیکھو ہمارا وقت آگیا ہے تو یہ دوا بے اثر ہو گئی ہے۔

"شافی مطلق" کی شفا کے بھی عجیب و غریب طریقے ہیں کبھی ایک کو دوسرے مرض سے دبا دیتے ہیں اور کبھی کسی مقام پر اتفاقاً" چوٹ لگ جانے سے آرام ہو جاتا ہے کبھی اتفاقاً" مریض کوئی ایسی چیز کھا پی لیتا ہے جس سے مرض کا اثر زائل ہو جاتا ہے بعض تکالیف کو انسان مصیبت سمجھتا ہے مگر دراصل وہ جسم سے کسی فاسد مادے کے اخراج کے لئے ہوتی ہیں اور مزیل مرض ہوتی ہیں وہ تکالیف باعث راحت ہوتی ہیں مگر کوتاہ بیں انسان رونے لگتا ہے ہمارے قصبے میں سب سے بڑا مال دار ایک بنیا تھا اس کے گردوں میں درد ہوتا تھا بڑے بڑے علاج ہوئے کسی صورت آرام نہ ہوا اسی طرح عرصہ گذر گیا ایک دفعہ اس کے گھر میں کچھ تعمیری کام ہو رہا تھا ٹین کی چادریں زمین پر پڑی تھیں ایک چادر سے اس کی پنڈلی زخمی ہوگئی بہت خون نکلا مگر اس کے بعد اسے کلی شفا ہو گئی بظاہر تو اس کے لئے یہ حادثہ باعث تکلیف تھا مگر اللہ نے اس کی تکلیف کا ازالہ کرنا چاہا تو ذرا سی دیر میں کام ہو گیا ابھی چند دنوں کا قصہ ہے کہ ایک عورت کا خاوند کسی بیماری سے اپنی بصارت کھوچکا تھا بیوی نے جو ایک دن غصہ میں اس کے سر پر بالٹی ماری تو بصارت لوٹ آئی۔ دنیا میں ایسے بے شمار واقعات ہوئے ہیں کہ ناگہانی آفت باعث شفا بن گئی ایک پاگل کا باپ مرگ گیا تو وہ اچھا خاصا ہو گیا۔

جس طرح اس نے ہمارے جسمانی امراض کے لئے دوائیں بنائی ہیں اسی طرح اس "شافی مطلق" نے ہماری روحانی بیماریوں کے لئے بھی تریاق پیدا کئے ہیں، اسے معلوم تھا کہ انسان میں شر کا خمیر ہے لہٰذا اس کی روح کا بیمار ہونا ضروری ہے اس لئے اس نے روحانی بیماریوں کے لئے بھی دوائیں بنائیں۔ جس طرح جسمانی امراض کی دوائیں تلخ ہیں روحانی امراض کی دوائیں بھی تلخ ہیں بلکہ بہت ہی بدمزہ اور تکلیف دہ ہیں، آئے دن کی بیماریاں ہماری روحانی بیماریوں کے ازالے کے لئے ہوتی ہیں، بیماریاں ہمارے دل کو نرم کرتی رہتی ہیں، سب سے بڑا فائدہ تو ان کا یہی ہے۔ ویسے گناہوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ کتنے ہی ایسے سنگ دل گذرے ہیں کہ جب وہ مبتلائے امراض ہوگئے تو ان کے قلوب موم کی طرح نرم پڑگئے وہ رات دن مخلوق کے ستانے میں مشغول رہتے تھے اور کوئی بھی وعظ

وپندار ان پر اثر نہ کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے روحانی امراض کا علاج جسمانی امراض کے ذریعہ کرتے رہتے ہیں اور گاہے مصائب و آفات سے کرتے ہیں ایک سست ناکارہ انسان آفت پڑنے کے بعد کار آمد بن ہوجاتا ہے اور ایک کمزور قوم ناگہانی مصیبت پڑنے سے ایک توانا قوم بن جاتی ہے ۔ میں نے کتنے ہی ایسے ظالم دیکھے ہیں جو مخلوق خدا کو بڑا ہی تنگ کرتے تھے مگر اچانک ان کا جوان بیٹا مرگیا تو ہاتھ میں تسبیح آگئی اللہ اللہ کرنے لگے کتنے ہی میں نے بے ہودہ اور آوارہ نوجوان دیکھے کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تو وہ ایک ذمہ دار ہستی بن گئے جبکہ پورا خاندان ان کے لاابالی پن کی وجہ سے مایوس ہوچکا تھا۔

بچہ ہویا بڑا' عورت ہو یا مرد' بوڑھا ہویا نوجوان جب کسی گھر کا کوئی فرد مرتا ہے تو گھر کے افراد کے اخلاق پر ضرور اس کی موت کا اثر پڑتا ہے' گو موت بڑی ہی تلخ دوا ہے۔ مگر بڑی ہی زوداثر اور کارگر ہے۔

موت نے کردیا لاچار وگرنہ انساں
تھا وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

اسی طرح قوموں پر جو آسمانی مصیبتیں پڑتی ہیں جیسے طوفان' زلزلہ ' جنگ اور وباء وغیرہ ' یہ قوم کی بہتری کے لئے ہوتی ہیں' زحمت بھی ہوتی ہیں اور رحمت بھی' وباؤں کے زمانے میں تو میں نے کئی دفعہ بڑے بڑے بدمعاشوں اور ظالموں کو سیدھا سادا انسان بنتے دیکھا ہے' قومی و ملکی مصیبتیں بہت سے فاسد مادوں کو قوم سے نکال پھینکتی ہیں جیسے فصد' مسہل اور حقنہ وغیرہ جسم کے فاسد مادوں کو باہر نکال دیتے ہیں۔

مصائب و امراض و آلام سے انسان میں صبر کی خو پیدا ہوتی ہے جو حسن اخلاق میں بڑا درجہ رکھتا ہے ہنسنے کی قدر بھی رونے ہی میں ہے اور صحت کی بیماری سے۔ از پس ہر گریہ آخر خندہ ایست' مگر انسان بڑا ہی گھبرالو ہے فوراً" گھبرا جاتا ہے اور ہمیشہ ہر چیز کا تاریک پہلو دیکھتا ہے' اشیاء کے روشن پہلو دیکھنے والے بہت ہی کم ہیں' ناشکرے زیادہ ہیں اور صابر کم۔

اس نے امراض روحانی کی شفا کے لئے آسمانی کتابیں نازل فرمائیں اور ہر دور میں مناسب حال **نسخۂ شفا** اترتے رہے اور روحانی طبیب مبعوث کئے گئے جن سے مختلف اقالیم میں اصلاح ہوئی اور سینوں کی بیماریاں دور ہوئیں' اسی لئے قرآن شریف کو شفاء لما فی الصدورؔ سے تعبیر کیا ہے' جس طرح اس نے جسمانی طبیب اپنی مخلوق کے امراض کے دفع کرنے کے لئے پیدا کئے' روحانی طبیب بھی نازل فرمائے جنہوں نے قوم کے بڑے بڑے امراض کو دور کرکے ایک صحت مند قوم بنادیا' گو قوم ان کے علاج سے بلبلائی پریشان ہوئی مگر انہوں نے آپریشن کرکے چھوڑا اور فاسد مادوں کو باہر پھینکا۔

؎ اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اک **نسخۂ** کیمیا ساتھ لایا

اس نے امراض جسمانی کے لئے جہاں ادویات پیدا کیں اور بھی ایسی تدابیر پیدا کی ہیں جن سے امراض کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ گو انسان کی اکثریت ان طریقہ ہائے علاج سے ابھی تک ناواقف ہے اور بعض طریقہ ہائے علاج ایسے بھی ہیں جن سے ابھی تک انسانیت بالکل ناواقف ہے شائد آئندہ واقف ہوجائے جسمانی بیماریوں کے رفع کرنے کا ایک طریقہ ایحائے نفسی بھی ہے جس سے بہت ہی کم انسان کام لیتے ہیں یعنی اپنے دل میں یہ خیال جمانا کہ تندرست ہوں مگر اس کے لئے انسان کا صاحب عزم ہونا ضروری ہے ویسے یہ بڑا ہی کارگر طریقہ علاج ہے' امراض کا جتنا زیادہ احساس کرو یہ اتنا ہی سر اٹھاتے ہیں اور اگر پروا نہ کرو تو یہ زیر ہو جاتے ہیں مثلاً" اگر آپ کے سر میں درد ہو اور آپ اس کا مطلق احساس نہ کریں تو یہ ختم ہوسکتا ہے اور اگر زیادہ احساس کریں تو بڑھتا ہی جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جو کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ روپیٹ کر اپنے مرض کو اور زیادہ بڑھالیتے ہیں اور مضبوط طبیعت والے اسے دبالیتے ہیں جس قدر بے صبری کرو مرض بڑھتا ہے اور جس قدر ضبط کرو گھٹ جاتا ہے اعصابی تکالیف کے لئے خصوصیت سے ایحائے نفسی عجیب چیز ہے۔

ایک انگریز ڈاکٹر لکھتا ہے جس شخص نے یہ کہا کہ میرا حافظہ خراب ہوگیا

ہے، اس نے اپنے حافظے پر ایک اور ہتھوڑا مار دیا۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں میرا دماغ کمزور ہوگیا ہے یہ اپنے دماغ کو اور کمزور کردیتے ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے میں بوڑھا ہوگیا ہوں وہ اور مزید بوڑھا ہوگیا، میں نے کئی ایسے بوڑھے دیکھے جو بڑھاپے میں بھی جوان تھے کیونکہ ان کا عزم جوان تھا۔

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا وُ خلق

باشد بقدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

متمدن اقوام میں کہیں امراض کا علاج صرف پانی سے کیا جاتا ہے، کہیں لطائف وظرائف و مضحکات سے تو کہیں غذاؤں سے الغرض اس "شافی مطلق" نے اپنی مخلوق کے دکھ درد دور کرنے کے لئے بہت سے طریقہ ہائے علاج جاری کردیئے ہیں۔

*

الشکور جل جلالہ

ہمیں اگر کوئی شخص پان، سگریٹ یا چائے جیسی معمولی چیزیں پیش کرتا ہے تو ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں ذرا سی کوئی چیز اٹھا کر دے دیتا ہے تو شکریہ ادا کرتے ہیں کوئی ذرا سی رہنمائی کر دیتا ہے تو اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ ہم اپنے محسن کا شکریہ ادا کریں تو وہ خوش ہو جاتا ہے اگر شکریہ نہ ادا کریں یا ناشکری کریں تو اس کا دل میلا ہو جاتا ہے اور وہ پھر احسان نہیں کرتا۔

نئی تہذیب نے تو تھینک یو(thank you) اور شکریہ کو بہت ہی رواج دیدیا ہے پہلے ایسا نہ تھا اب تو بات بات پر لوگ ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے ہیں اگرچہ دل میں نفرت ہی کیوں نہ بھری ہو بہرحال تہذیب جدید کی یہ ایک خوبی ہے جدید تہذیب کو سراسر غلط کہنا بھی غلطی ہے کیونکہ اس میں بھی بہت سی اچھی باتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ایک نام "الشکور" بھی ہے یعنی شکر کو قبول کرنے والا اور یہ بھی اس کا فرمان ہے کہ شکر کرو گے تو ہم زیادہ دیں گے انسان بھی اپنے شکر گزار بھائی کو اور زیادہ ممنون کرنا چاہا کرتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ بھی شکر گزار بندوں کو زیادہ دیتے ہیں انسان شکریہ کو قبول کرتا ہے تو خدا کیوں نہ کرے گا۔

کئی بار مختلف اوقات میں ایسا اتفاق ہوا کہ بعض انگریزی دان دوستوں نے اعتراض کیا کہ اسلام تو ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ ہم الحمد اللہ ، بسم اللہ اور یرحمک اللہ وغیرہ کہتے رہیں کھاؤ تو بسم اللہ کہو ، بیٹھو تو بسم اللہ کہو، اٹھو تو بسم اللہ کہو ، پانی پیو تو الحمد اللہ کہو الغرض ایک مصیبت ہے میں نے کہا آپ غلط سمجھے اسلام نے ضروری قرار نہیں دیا آپ کا جی نہ چاہا کرے تو نہ کہو، بار خاطر نہ بناؤ، ایک بہتر بات بتادی ہے جیسے نئی تہذیب میں ذرا ذرا سی بات پر آپ لوگ تھینک

یو (Thank You) کہتے کہتے نہیں تھکتے اسی طرح خدا کے نیک بندے الحمد اللہ کہتے کہتے نہیں تھکتے نئی تہذیب نے جو بات بات پر تھینک یو (Thank You) کہنا سکھایا تو ہماری اپنی منفعت کے لئے سکھایا ہے اور محسن دوست احباب کے دل کو خوش کرنے کے لئے سکھایا ہے اس طرح اسلام نے بھی بات بات پر الحمداللہ اور بسم اللہ کہنا اس لئے سکھایا ہے کہ ایسا کہنے سے ہمیں فائدہ پہنچے گا ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ٹھنڈا پانی پی کر الحمد اللہ نہیں کہتا تو اس نے خدا کی ملکیت میں کوئی کمی نہیں کردی اور اگر الحمد اللہ کہہ دیا تو اللہ کی ملکیت میں کوئی اضافہ نہیں کیا البتہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچایا یا اپنے ضمیر کو مطمئن کردیا کہ کچھ نہیں تو محسن کا شکریہ ہی ادا ہوگیا۔

اللہ جو **اَصْدَقُ الْقَائِلِینَ** ہے فرماتا ہے کہ شکر کرنے پر زیادہ دیں گے یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا ہے البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ بظاہر اضافہ نہ ہوا ہو یا شکر کرنے پر بھی نقصان ہی نقصان اٹھانا پڑا ہو مگر اضافہ تو ضرور ملے گا وعدہ خداوندی جو ٹھہرا یہاں نہیں تو وہاں شکر کا بدلہ ضرور دیا جائے گا شکر ضائع نہیں جائے گااور نا شکرے کو وہاں کچھ بھی نہیں ملے گا ہو سکتا ہے کہ ایک ناشکرا، شکر گزار انسان کی نسبت اس دنیا میں زیادہ سرسبز وشاداب ہو مگر وہ شکر گزار ہوتا تو شاید اسے اور زیادہ ملتا کہ لوگ اس پر رشک کرتے۔

شکر تین طرح سے کیا جاسکتا ہے (۱) زبان سے (۲) دل سے (۳) اعضاء سے ۔ زبانی شکریہ تو عام طور پر ہم رات دن کرتے ہیں لیکن اگر دل کو بھی ادائے شکر میں شریک کرلیا جائے تو یہ دوسرا شکریہ ہوجاتا ہے یعنی دل سے بھی شکر ادا کیا جائے نئی تہذیب میں صرف زبانی شکریہ مروج ہے دل میں کچھ نہیں ہوتا بلکہ عداوت بھری ہوتی ہے اور زبان پر کلمۂ شکر ہوتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے محسن کے شکریہ کے لئے زبان نہیں ہلاتے مگر دل سے اس کے شکر گزار ہوتے ہیں یہ دل کا شکریہ ہے جس میں شکریۂ زبانی شریک نہیں ہے بعض اوقات محسن کا شکریہ نہ زبان سے ادا کرتے ہیں نہ دل سے بلکہ ہاتھ وغیرہ سے شکریہ ادا کرتے ہیں جیسے بطور شکریہ سینے پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں یا اس کے سامنے

جھک جاتے تھے یا سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

ہم اپنے مالک و خالق کا شکریہ زبان ' دل اور اعضاء سے ادا کرتے رہتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ' کو جب فتح کی خوشخبری سنائی جاتی تو آپ سجدہ ریز ہو جاتے[ه] اور فرماتے اگر مجھے اس سے بہتر طریقہ شکر کا علم ہوتا تو میں اسی طرح کرتا۔ آنکھ کا شکریہ یہ ہے کہ اس سے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو نہ دیکھے اور نہ ہی پڑھے۔ جو دیکھنے اور پڑھنے کو کہا وہ دیکھے اور پڑھے۔ کان کا حقیقی شکریہ ہے کہ اس سے جھوٹ ' چغلی ' غیبت ' فحش باتیں نہ سنے۔ کلام اللہ اور کلام رسول اللہ اور فکر دین و آخرت پیدا کرنے والے بیانات و تقاریر سنے۔ زبان کا شکریہ ہے کہ اس سے دل آزار و دل خراش گفتگو نہ کرے۔ جھوٹ نہ بولے ' غیبت ' چغلی نہ کرے ' بہتان نہ باندھے ' فحش بے ہودہ کلام نہ کرے یہ زبان کا حقیقی شکر ہے۔

ہاتھ کا حقیقی شکریہ یہ ہے کہ اس سے یتیم کے آنسو پونچھے ' ضعیف و ناتواں کی مدد کرے محتاج خدمت لوگوں کا بوجھ اٹھائے ' بے سہارا کو سہارا دے ' نابینا کا ہاتھ پکڑے ' ظالم کو ظلم سے روکے۔ پورا تولے پورا ناپے۔ دستکار ہے تو اپنے فن میں دیانت و امانت کو ملحوظ رکھے۔ لکھاری ہے تو اپنے قلم کو فحش نگاری سے آلودہ نہ کرے۔ امراء و حکام کی قصیدہ خوانی سے گندہ نہ کرے وگرنہ اس سے وہ گھسیارہ بہتر ہے جو گھاس کھود کر رزق حلال کماتا ہے بلکہ وہ خاکروب بہتر ہے جو اپنی جھاڑو سے گندگی و غلاظت کو سمیٹتا ہے اور یہ اپنے خبثِ باطن کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہے **علی ھذا باقی اعضاء**

وہ "خالق و رازق" جو یہ کہتا ہے کہ میں تمہارے شکریہ کو قبول کرتا ہوں ایسے کرم فرما کا شکریہ ادا کرنے میں کیا خسارہ ہے اور کیا مصیبت یا دشواری ہے؟ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں ایک عابد و زاہد انسان اگر ٹھنڈے پانی سے پرہیز کرتا ہے اور ہمیشہ نفس کشی کے لئے گرم پانی پی کر شکریہ ادا کرتا ہے ایسے شخص سے اس شخص کا شکریہ بڑھا ہوا ہے جو ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر خدا کا شکریہ ادا کرتا ہے کیونکہ اس کا شکریہ دل کی ایسی گہرائیوں سے نکلا ہے کہ گرم پانی پینے والے زاہد کے دل سے ایسا شکر نہیں نکل سکتا۔

ه اسد ۔۔۔ [illegible]

اس بات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ دراصل شکریہ تو وہ ہے جو تہ دل سے نکلے، تہذیب جدید جس طرح اندر سے بالکل کھوکھلی ہے اسی طرح اس کا تھینک یو بھی بے بنیاد ہے جو ایک رسم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جس کے ساتھ احسان کرتے ہیں وہ ایک لفظ بھی شکریہ کا اپنی زبان سے ادا نہیں کرتا نہ کسی عضو سے اس کا اظہار کرتا ہے اور دل کی بات سے ہم ناآشنا ہیں مگر اس کی نگاہوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ہمارا بے حد ممنون ہے یعنی کبھی شکریہ کا اظہار آنکھوں سے بھی ہوتا ہے ایک شخص جو مررہا ہے نہ زبان سے بول سکتا ہے نہ ہاتھوں سے شکریے کے طور پر آپ کو سلام کرسکتا ہے مگر اس کی نگاہیں بتا دیتی ہیں کہ وہ بے حد شکر گزار ہے ایک کتا جو پیاس سے جاں بہ لب ہو آپ اسے پانی پلا دیتے ہیں وہ گونگا ہے زبان سے شکریہ ادا نہیں کرسکتا دم ہلانے کی سکت رہی نہیں مگر اس کی آنکھیں ولی شکریے سے ہمیں خبردار کردیتی ہیں۔ کبھی ہمارا احسان اتنا عظیم ہوتا ہے کہ ہمارے دوست یا عزیز کی زبان شکر ادا کرنے سے گنگ ہوجاتی ہے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا، ایسی صورت میں دوستوں کو ناشکرا نہ سمجھو۔

حَجّاج بن یوسف کے سامنے خارجیوں کا ایک گروہ پیش کیا گیا وہ فردا" فردا" ہر ایک کا مقدمہ سنتا رہا ایک خارجی ابھی باقی تھا کہ موذن نے اذان دیدی حجاج نے کوتوالِ شہر عتبہ سے کہا اب تو عشاء کی اذان ہوگئی کل صبح کی نماز کے بعد اسے لانا تو میں اس کا مقدمہ سنوں گا جاؤ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ اور کل حاضر کرو، وہ اسے اپنے گھر کی طرف لے چلا تو راہ میں خارجی نے کہا کیا کوئی احسان کرسکتے ہو؟ عُتبہ نے کہا کیا؟ بولا مجھے آج رات گھر جانے دو صبح آجاؤں گا۔ اس نے دل میں سوچا یہ تو بڑا ہی بیوقوف ہے جو مجھ سے ایسا چاہتا ہے یہ کیوں واپس آنے لگا؟ اور یہ نہ آیا تو حسب عادت حجاج اس کے بدلے تجھے قتل کرادے گا۔ بہرحال اس نے خدا کا واسطہ دیا اور اسے ضامن ٹھہرایا تو اس نے چھوڑ دیا مگر بہت پچھتایا کیونکہ رہائی پر اس نے شکریہ تک ادا نہ کیا دل میں

کہنے لگا پاگل معلوم ہوتا ہے ورنہ کچھ تو شکریے کے طور پر کہتا، صبح ہوئی تو وہ حسب وعدہ موت کے مونہہ میں جانے کیلئے لوٹ آیا عتبہ کو بڑا تعجب ہوا، گفتگو سے پتہ چلا کہ بالکل بے گناہ ہے اس نے نہ کسی کو قتل کیا نہ لوٹ مار کی۔ کہنے لگا ارے تونے چلتے وقت میرا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ بولا اس لئے کہ میں نے خدا کے شکریے میں تیرے شکریے کو شریک نہ کرنا چاہا تھا۔ عتبہ بہت خوش ہوا اور حجاج سے اسے معاف کرا دیا۔ ظاہر ہے یہ شخص اس کا شکرگزار تو یقیناً" تھا مگر زبان سے اظہار گوارا نہ کیا۔

ایک بڑے شرابی کبابی عیاش متمول شخص سے کسی نے پوچھا آپ کو سب سے زیادہ خوشی کس دن نصیب ہوئی کہنے لگا ایک روز مجھے پتہ چلا کہ فلاں بیوہ کے ہاں کئی دن سے فاقہ ہے میں اس شریف زادی کے گھر گیا اس کی لڑکیاں کئی دن کے فاقے سے زارونزار بیٹھی تھیں میں نے انہیں اچھے اچھے کھانے کھلائے تو ان بچیوں نے جن شرمیلی نگاہوں سے میرا شکریہ ادا کیا وہ دن میرے لئے سب سے زیادہ خوش کن تھا۔

بعض اوقات شکر بصورت ناشکری ظہور پذیر ہوتا ہے "مرزا شاہ رُخ" کا ایک وزیر لوگوں کو خوب قرض دیا کرتا تھا اور میعاد ادائیگی "شاہ رخ" کی موت ٹھہرایا کرتا تھا کہ جو کچھ دیا ہے "شاہ رخ" کی وفات کے بعد لوں گا۔ شدہ شدہ یہ بات "شاہ رخ" کے کانوں تک پہنچ گئی "شاہ رخ" کو بڑا غصہ آیا کہنے لگا ارے! تو میرے طفیل عظیم مراتب پر فائز ہوا اور لوگوں کو میری موت کی میعاد پر قرض دیتا ہے؟ اس نے عرض کیا حضور! ایسا ہی ہے جیسا کہ بدخواہوں نے آپ تک یہ بات پہنچائی ہے مگر میں اس لئے ایسا کرتا ہوں کہ مقروض ومدیون لوگ آپ کی درازی عمر کی دعائیں مانگتے رہیں، "شاہ رخ" کو یہ بات بہت پسند آئی اور اسے اور زیادہ قرب عطا کیا اور بدخواہوں کو نظروں سے گرا دیا۔

مخلوق خدا اپنے محسن کا شکریہ ادا کرتی ہے تو محسن خوش ہوتا ہے اور اسے مزید قرب عطا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو "الشکور" ہے کیونکر وہ ہمارے شکر سے خوش نہ ہو گا اور کیوں نہ مزید عطیات وقرب سے نوازے گا۔

بعض اوقات ہم اپنے محسن کا شکریہ ادا تو کردیتے ہیں مگر وہ شکریہ قبول نہیں ہوتا، یا اس کی قدر نہیں کی جاتی مگر "الشکور" کی بارگاہ ایسی ہے کہ وہاں پر شکریہ دوچند قبول پاتا ہے اس کی پوری پوری قدر کی جاتی ہے اور اس کے عوض مزید دیا جاتا ہے لہٰذا ایسی ذات کا شکریہ تو منفعت ہی منفعت ہے یہاں شکریئے کے رائیگاں جانے کا کوئی خدشہ نہیں اور نہ ہی اس کے بے قدر ہونے کا کوئی اندیشہ۔

نعمت پر شکر تو بہت ہی آسان ہے مگر مصیبت پر شکر کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے اہل اللہ مصیبت پر بھی اس کا شکر ادا کیا کرتے تھے بیماری پر بھی اور تکالیف پر بھی کہ دوست نے یاد تو کیا درد سے آہ آہ کرتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے کہ یار نے یاد تو کیا۔

ے لطف سجن دم بدم قہر سجن گاہ گاہ
این بھی سجن واہ واہ اوں بھی سجن واہ واہ

حضرت ایوب علیہ السلام کے بارہ چودہ بیٹے مکان کی چھت کے نیچے دب کر مرگئے تھے کاروبار برباد ہوا، مال مویشی ختم ہوئے، زمیندارہ گیا مال ودولت کی جگہ فقروفاقے نے لے لی رئیس اعظم سے فقیراعظم ہوگئے مگر ہمیشہ اس کا شکر ہی ادا کرتے رہے ایک جان بچ رہی تھی وہ بھی گل سڑگئی تب بھی وہ بندہ خدا شکر ہی کرتے رہے ان کے اس شکریے کا یہ نتیجہ نکلا کہ پھر پہلے سے زیادہ بیٹے ' مال مویشی دولت ' عزت اور زمیندارہ مل گیا اگر شکر نہ کرتے تو نہ یہاں کچھ ملتا نہ وہاں۔ شکر کی بدولت دنیا میں نبوت ودولت ملی اور آخرت میں تو نہ جانے کیا کچھ ملا ہوگا۔

ایک اللہ والے کو چیتے نے حملہ کرکے زخمی کردیا تھا۔ نہر کے کنارے پڑے ہوئے تھے جسم سے خون نکل رہا تھا مگر زبان سے حمد و ثناء کے ترانے ابل رہے تھے۔ کسی شخص نے کہا حضرت کیا یہ مقام شکر ہے؟ کہ یوں بے یار و مدد گار پڑے ہو زخموں سے خون ٹپک رہا ہے۔ فرمایا شکر کیوں نہ کروں کہ مبتلائے مصیبت ہوں گرفتارِ معصیت نہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ

ــ۵من آں مورم کہ در پا یم بما لند
نہ زنبورم کہ از نیشم بنا لند
چگو نہ شکرِ ایں نعمت گذارم
کہ زورِ مردم آزاری ندارم

میں وہ چیونٹی ہوں کہ جس کو لوگ پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ میں وہ بھڑ نہیں ہوں کہ جس کے ڈنک سے لوگ بلبلا اٹھتے ہیں۔ اس نعمت کا شکر کس طرح ادا کروں کہ لوگوں کو اذیت پہنچانے کی مجھ میں طاقت ہی نہیں ہے۔

*

الشَّهِیدُ جل جلالہ

قرآن شریف میں ۳۴ جگہ شہید کا لفظ آیا ہے۔ کہیں اس کے معنی گواہ کے ہیں، کہیں واقف حال کے، اور کہیں موجود و حاضر کے ہیں۔

سورۃ العادیات میں **وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیْدٌ** ''وہ اس بات سے خوب واقف ہے''۔

سورہ البروج میں ہے۔ **وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ** اللہ ہر چیز کے حال سے واقف ہے۔

پارہ ۲ کے پہلے رکوع میں ہے **وَیَکُوْنُ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا۔** ''اور رسول تم پر گواہ ہونگے''۔

پارہ ۳ کے رکوع ۷ میں ہے **وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَہِیْدٌ** ''کاتب و گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے''۔

چوتھے پارے کے پہلے رکوع میں ہے۔
وَاللّٰہُ شَہِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ۔ ''جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا شاہد حال ہے''۔

پانچویں پارے کے تیسرے رکوع میں ہے **فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰۤؤُلَآءِ شَہِیْدًا**۔ ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ لائیں گے اور آپ کو ان پر گواہ لائیں گے''۔

ساتویں پارے کے رکوع میں ہے۔ **وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ** ''تو ہر چیز کی خبر رکھتا ہے''۔ اور آٹھویں رکوع میں ہے۔ **قُلِ اللّٰہُ شَہِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ۔** ''آپ کہہ دیجئے اللہ میرے تمہارے درمیان گواہ ہے''۔

گیارھویں پارے کے دسویں رکوع میں ہے **ثُمَّ اللّٰہُ شَہِیْدٌ عَلٰی مَا**

يَفْعَلُوْنَ۔ "اللہ گواہ ہے جو تم کرتے ہو"۔
وہ "الشہید" ہر چیز کے حال سے واقف ہے جب اس کے بندے بہت سی چیزوں کے حال سے واقف ہیں۔ تو وہ کیوں نہ ہر چیز کے حال سے واقف ہو گا؟ ہمیں واقف کار اسی نے تو بنایا ہے۔ وہ واقف نہ ہوتا تو ہم کیسے واقف ہوتے ؟

آن کس کہ خود گم است کرا رہبری کند

وہ "الشہید" ہر جگہ حاضر ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو کنٹرول کیسے کر سکتا؟

کسی نے کہا ہمہ اوست' کسی نے کہا در ہمہ اوست' کسی نے کہا ہمہ ازوست' یہ آخری بات تو سیدھی سادی ہے کہ سب اسی سے ہیں۔ باقی اقوال پیچیدہ اور فلسفیانہ ہیں جنہیں ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔!

شروع زمانہ اسلام میں عرب کے جاہل ان پڑھ بدو' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ سب کو اسی ایک نے پیدا کیا۔ وہ تو "ہمہ اوست" سے واقف تھے نہ "در ہمہ اوست" سے نہ "از ہمہ اوست" سے۔ مگر وہ بعد میں آنے والے مسلمانوں ' اور ہم سے زیادہ پختہ ایمان والے اور صحیح العقیدہ تھے۔

اس پر پانچ چھ صدی تک مسلمانوں کا پختہ عقیدہ رہا اور ان کے کان مذکورہ بالا باتوں سے نا آشنا رہے کہ شیخ ابن عربیؒ نے "وحدۃ الوجود" کا نعرہ بلند کیا۔ یہ نظریہ وحدت الوجود دراصل کیا تھا۔؟ آیا ایرانی تھا یا یونانی یا ہندوستانی' ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ یہ بڑی لمبی چوڑی بحث ہے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ابن عربیؒ سے پہلے کے مسلمان اس بات سے بالکل ناواقف تھے اور وہ بڑے بلند پایہ پختہ ایمان والے مسلمان تھے' صوفیہ نے امام ابن عربی کی اس بات کو اپنالیا اور اب تک صوفیہ کی ایک بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے' حتیٰ کے معاملہ منصور کے "انا الحق" کہنے اور بایزید بسطامی کے سبحانی اعظم شانی اور مافی الجبتہ الا اللہ تک پہنچ گیا۔

صدیاں بیت گئیں اور صوفیہ واہل طریقت اس کی تبلیغ کرتے رہے پھر پانچ چھ صدی بعد سرہند صوبہ پنجاب میں شیخ احمد سرہندیؒ پیدا ہوئے۔ انہوں نے

"وحدۃ الشہود" کا نعرہ بلند کیا اور اس امام و مجدد وقت نے فرمایا کہ "ہمہ اوست" غلط ہے، "درہمہ اوست" صحیح ہے کہ سب میں اسی کا جلوہ ہے۔

وہ ہمہ اوست ہو یا مجدد صاحبؒ کا "درہمہ اوست" ہو، اسلام، ابن عربیؒ اور مجدد صاحب کے پیدا ہونے سے بہت پہلے مکمل ہوچکا تھا اور مسلمان وحدۃ الشہود کی اصطلاح سے واقف نہ تھے۔ صحابہ کرامؓ ان دونوں بزرگوں سے بہت بلند اور پختہ ایمان والے تھے اور ایسی فلسفیانہ باتوں سے واقف نہ تھے۔

جس طرح "وجودۃ الوجود" کے نظریہ کو بہت سے علماء وصوفیہ نے قبول کیا تھا، "وحدۃ الشہود" کو بھی سب نے قبول کر لیا کہ یہ حق ہے اور اس کے قبول کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بہر صورت یہ بھی ایجاد بندہ ہے۔

یہ مسئلہ "وحدۃ الوجود" بھی عجیب مسئلہ ہے۔ قرآن شریف کی بہت سی آیتوں سے اور بہت سی احادیث صحیحہ سے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ وید تو سارے کے سارے اور بھگوت گیتا وغیرہ "وحدت الوجود" سے پر ہیں، بابا نانک کے گرنتھ بھی "وحدۃ الوجود" کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور بہت سی آیات واحادیث سے "وحدۃ الشہود" حق ثابت ہوتا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کون سچا ہے۔ چلو ہم مان لیتے ہیں کہ "وحدۃ الوجود" حق ہے اور "وحدت الشہود" بھی حق ہے۔ کیونکہ ایسا ہوجاتا ہے کہ شاہدو مشہودوعاشق و معشوق ایک ہوجاتے ہیں۔ لوہا آگ میں پڑ کر انا النار کہہ سکتا ہے اور انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی اور مافی الجبتہ الا اللہ سب حق۔ مگر گوشاہدو مشہود ایک ہوجائیں، شہود تو اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ایک بزرگ منصور حلاج وغیرہ اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ سے بھی بہت آگے نکل گئے کہ فرماتے ہیں "اصل شہودوشاہد و مشہود ایک ہے"

لیجئے انھوں نے تو جڑ ہی کاٹ دی۔ چلو ہم مان لیتے ہیں کہ فاعل و مفعول ایک ہیں مگر مصدر کیسے ایک ہو سکتا ہے؟ مصدر نہ تو فاعل بن سکتا ہے نہ مفعول اور اگر کسی وقت بنے گا تو مصدر نہیں رہے گا مشتق ہو جائے گا۔ وشاھد و مشہود۔

میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ لوگ پوچھنے لگے۔ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ میں مسلمان! کہنے لگے آپ کے داڑھی ہے۔ آپ مسجد میں نماز پڑھنے

آئے ہیں، مسلمان تو ہیں ہی۔ ہم تو یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی؟ میں نے کہا۔ بس مسلمان ہوں ۔ نہ دیوبندی نہ بریلوی ۔ یہ تو بارہ صدی پہلے نہ تھے۔

وہ ""الشہید"" ہر شے پر گواہ ہے۔ اگر وہ ہر چیز پر گواہ نہ ہوتا تو ہم کیسے نفع وضرروالی چیزوں کو جان سکتے؟ وہ گواہی دیتا ہے کہ درندہ' درندہ ہے۔ موذی جانور موذی ہے' یہ بوٹی نفع رساں ہے اور وہ ضرررساں' فلاں پھل فلاں مرض کی دوا ہے اور فلاں فلاں تکلیف کی۔

روایت ہے کہ حضرت لقمان کو خود جڑی بوٹیوں نے بتایا کہ ہم میں یہ خاصیت ہے' لقمان پیغمبر نہیں تھے۔ وہ ایک خدا رسیدہ فلسفی وطبیب تھے جیسے خضر نبی نہیں تھے ایک مرد صالح تھے۔ مگر قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح لقمان کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان دونوں کے ناموں کے ساتھ علیہ السلام لکھنے کا رواج ہوگیا ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی علیہ السلام لکھ دیا۔ علیہ السلام صرف پیغمبروں اور فرشتوں کے ناموں کے ساتھ لکھنا چاہیئے اور کسی کے نام کے ساتھ نہیں۔

مذکورہ بالا روایت ہمارے نزدیک معتبر نہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ زبان حال سے جڑی بوٹیوں نے انہیں اپنے خواص بتائے ہوں گے اور اب بھی جڑی بوٹیاں اور پھل زبان حال سے بتاتے ہیں کہ ہم فلاں مرض کی دوا ہیں اور ہمارے یہ خواص ہیں بشرطیکہ کوئی شخص حکیم ہو۔

اخروٹ کی ساخت بالکل دماغ کی صورت ہے اور اس کا مغز بالکل بھیجے کے مشابہ ہے۔ اس طرح اس پر خدا کی گواہی ثبت ہے کہ یہ دماغ کیلئے خصوصیت سے فائدہ مند ہے۔ پستے کی ساخت بتاتی ہے کہ وہ دل کی شکل پر ہے اور اس کا مغز بتاتا ہے کہ میں دل کے لئے مفید ہوں ۔ انار گواہی دیتا ہے کہ میں سراپا خون ہوں اور دل وجگر کے لئے مفید ہوں فالسہ اور جامن کا رنگ بتارہا ہے کہ ہم جگر کے لئے نفع رساں ہیں۔ سیب کھلے منہ گواہی دے رہا ہے کہ میں دل کو طاقت دیتا ہوں اور میرے اندر فولاد ہے لہٰذا خون پیدا کرتا ہوں اور معدہ وجگر

کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔

اس طرح کسی کا رنگ کسی کی خوشبو، کسی کا مزا، کسی کی صورت وشکل، کسی کا لمس، کسی کا مخصوص موسم میں پیدا ہونا، کسی کا خاص خطئہ زمین میں پیدا ہونا کسی کا پانی اور کسی کا شیرہ صاحب عقل وحکمت کے لئے خدا کی گواہی ہے۔

انسان کو ساری جڑی بوٹیوں کا علم، وحی والہام یا لقمان حکیم جیسے لوگوں ہی کی وساطت سے نہیں ہوا۔ کچھ تجربات وحادثات سے بھی چیزوں کے خواص کا علم ہوا جیسے بعض سائنسدانوں کو بعض تجربات کرتے ہوئے اتفاقی طور پر ایک نئ چیز کے بارے میں علم ہوگیا یا جیسے کسی نے کچھ کھا لیا اور اس کا اچھا یا برا اثر معلوم ہوگیا۔

جب حضرت انسان کو کھانا پکانا نہ آتا تھا تو وحشی درندوں کی طرح شکار کا گرم گرم کچا گوشت کھا جاتے تھے سردی سے بچنے کے لئے وہ آگ کی پناہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ سب بیٹھے شکار کا کچا گوشت کھا رہے تھے، کچھ بچ گیا تو کسی نے اسے آگ میں ڈال دیا۔ گوشت کے بھننے سے جو خوشبو پھیلی تو حضرت انسان کو بڑی بھلی لگی۔ تب سے وہ گوشت کو بھون کر کھانے لگے اس طرح اتفاقی طور پر کباب کی ایجاد ہوگئی۔ اسی طرح اتفاقی یا حادثاتی طور پر انسان کو اشیاء کے خواص معلوم ہوگئے۔ اور پھر اس نے اپنی خداداد قابلیت سے انہیں کچھ کا کچھ بنادیا۔!

بعض جانوروں کے کاٹ لینے سے اسے معلوم ہوا کہ ان کا زہر جسم انسانی پر کیا اثر کرتا ہے اور پھر ویسے ہی کسی جڑی بوٹی کے لگا دینے سے اسے معلوم ہوگیا کہ اس میں قوت تسکین کس درجہ ہے۔ سنا ہے کہ مٹی کے تیل کا علم بھی اتفاقی طور پر ہوا کہ کہیں آگ لگی تو لوگوں نے تالاب میں سے اس پر پانی ڈالا تو وہ اور بھڑکی۔ اسی طرح کونین کی تاثیر کے بارے میں سنا ہے کہ ایک بخارزدہ نے ایسے دریا کا کڑوا پانی پیا جو کونین کے پودوں سے ٹکرا کر آتا تھا تو وہ اچھا ہوگیا اور جنھوں نے نہ پیا تھا وہ مبتلائے بخار ہی رہے۔

انسان تو اپنے علم پر نازاں ہے، شاید کوئی ہماری یہ بات نہ مانے کہ ہر چیز پہ خدا کی گواہی ثبت ہے مگر ان جانوروں کی طرف تو دیکھو انہیں کیسے پتہ چلا کہ

فلاں چیز ہماری غذا ہے اور فلاں نقصان دہ ہے؟ وہ خدا کی گواہی کو ان نباتات پر پڑھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارا رزق ہے حیوانات تو حیوانات' نباتات تک اس کی گواہی کو سنتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں' آپ کو تعجب نہ ہو جمادات بھی!

قرآن شریف میں کئی جگہ آیا کہ اے مسلمانو! تم قیامت کے دن امتوں پر گواہ بنو گے کہ ہم نے انہیں تبلیغ رسالت واسلام کی تھی اور رسول تم پر گواہ بنیں گے کہ ہاں میں ان میں مبعوث ہوا تھا اور انہوں نے مجھے رسول تسلیم کیا تھا۔ اس بات کا ذکر کئی جگہ مختلف مواقع پر بلاوجہ نہیں کیا گیا۔

شہید وہ شخص ہے جو سچی گواہی دے۔ جھوٹی گواہی دینے والا شہید نہیں ہو سکتا۔ البتہ مفتری ہو سکتا ہے۔ شہادت کا چھپانا ازروئے اسلام گناہ ہے۔ مگر اس پر سختی سے عمل کافر اقوام متمدنہ کا ہے کہ جو شخص جو کچھ بھی دیکھتا ہے خود حاضر عدالت ہو کر گواہی دیتا ہے وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ"۔ "گواہی کو مت چھپاؤ جو ایسا کرتا ہے گناہ گار ہے"۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

*

الصمد جل جلالہ

قرآن شریف میں یہ لفظ صرف ایک جگہ سورہ اخلاص میں آیا ہے جس کے معنی بے نیاز کے ہیں اس کی ذات ہر چیز سے بے نیاز اور مستغنی ہے لہذا اسے اپنی نسل چلانے کے لئے کسی بیوی کی ضرورت نہیں پڑتی نہ کسی بیٹے کی چنانچہ فرماتا ہے:۔

مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا "اس کے نہ کوئی بیٹا نہ بیوی"

چونکہ وہ سراپا بے نیاز ہے لہذا اسے کسی نے نہیں جنا اور نہ اس نے کسی کو جنا وہ **لَمْ یَلِدْ** اور **وَلَمْ یُوْلَدْ** ہے نہ اس کا کوئی ہمسر شریک کہ اس کی مدد کا محتاج ہو۔

سورہ اخلاص تین چار آیتوں والی سورت ثلث قرآن کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہر قسم کے شرک سے خلاصی دلاتی ہے اور اخلاص فی التوحید پیدا کرتی ہے اس چھوٹی سی سورت میں سب کچھ آگیا وہ اکیلا ہے بے نیاز ہے لم یلد ولم یولد ہے اور اس کا کوئی نظیر و مثیل نہیں پھر "صمد" اتنا جامع لفظ ہے کہ اس میں ہر چیز سے بے نیازی آگئی ہے۔

وہ بیوی بچوں سے بے نیاز ہے۔ وہ کھانے پینے سے بے نیاز ہے نہ پینے کی کسی چیز کا محتاج نہ کھانے کی نہ نیند اور آرام کی اسے ضرورت
لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ۔
نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند

نہ کسی شریک و ساتھی کی مدد کی اسے ضرورت ہے کیونکہ وہ "صمد" ہے نہ اسے سردی گرمی سے بچاؤ کے لئے روئی، اون یا آگ کی حاجت، نہ مال و دولت کا محتاج، نہ نور و ظلمت کی احتیاج۔ الغرض وہ ہر شے سے بے نیاز ہے۔

چونکہ وہ قید زمان و مکان سے بے نیاز ہے لہٰذا ہر چیز سے بے نیاز ہے جو چیز بھی قید زمان و مکان میں آجاتی ہے سیکڑوں چیزوں کی محتاج ہو جاتی ہے۔ ادھر روح قید مکان میں آئی اور ادھر سیکڑوں چیزوں کی محتاج ہوئی شکم مادر میں پہنچتے ہی خون اور رطوبت وغیرہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ شکم مادر سے باہر آنے پر کپڑے اور ہوا اور دوا وغیرہ سیکڑوں اشیاء کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کچھ ایسا ہی حال جانوروں اور بچوں کا ہے جو انڈوں سے نکلتے ہیں پھر جب روح قید زمان و مکان سے آزاد ہو جاتی ہے تو سب مال و دولت و اثاثہ چھوڑ کر باہر بھاگ جاتی ہے کیونکہ وہ ان سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے **تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ** (اخلاق الٰہی پیدا کرو) صمدیت و بے نیازی پیدا کرنے سے انسان بہت سی برائیوں، ذلتوں، تکلیفوں اور آلام سے نجات پا جاتا ہے اور محلات میں محترم ٹھہرتا ہے چونکہ اہل اللہ بے نیاز ہوتے ہیں لہٰذا سلاطین دہر بھی ان کی آستان بوسی کرتے ہیں بے نیازی پیدا کرنے کا آسان نسخہ ترک ہے، واللہ جو مزا ترک میں ہے ارتکاب میں نہیں جس قدر خواہشات و ضروریات ترک کرتے چلے جاؤ گے خود بخود شان بے نیازی پیدا ہوتی چلی جائے گی اور زمرۂ **لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ** میں داخل ہو جاؤ گے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ اولیاء اللہ کو نہ خوف نہ حزن۔

کیونکہ سب کچھ چھوڑکر بیٹھ رہے تو پھر کیسا ڈر اور کیسا غم نہ آنے کی طمع نہ جانے کا غم آرزو طمع اور امیدیں انسان کو خوف زدہ کرتی ہیں اور نہ ملنے پر غم زدہ۔ جس نے آرزوؤں سے ہاتھ دھولیا وہ کیسے کسی سے ڈر سکتا ہے یا وہ کیسے کسی چیز کے فوت ہو جانے پر غم کر سکتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

؎ ہیچ با کے من ندارم کہ دارم ایں کلاہ چار ترک
ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولیٰ، ترک ترک

مجھے کیسے کوئی غم لگ سکتا ہے کہ کلاہ چار ترک میرے سر پر ہے۔ ایک

ترک دنیا دوسرے ترک عقبیٰ تیسرے ترک دوست چوتھے ترک ترک۔

صوفیا اسی لئے چوگوشی ٹوپی اوڑھا کرتے تھے کہ وہ دنیا کو چھوڑ چکے ہیں اور جنت و دوزخ سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور عزیزو اقارب سے دستبردار ہو چکے ہیں یہ تینوں کام تو ہزاروں صوفیا نے کئے ہیں مگر ترک ترک بڑا ہی مشکل کام ہے اس مقام سے گزرنا مشکل ہے کیونکہ نفی کی نفی اثبات ہوتی ہے مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔

ترک دنیا بہت ہی آسان ہے اگر کوئی شخص کسی پہاڑ کی چوٹی پر سب کچھ چھوڑ کر جا بیٹھا یا جنگل میں جا بیٹھا یا اپنی خانقاہ میں قید ہو کر بیٹھ گیا تو یہ بات کچھ زیادہ مشکل نہیں بس ذرا سے عزم و ہمت کی ضرورت ہے مگر دنیا میں رہ کر ترک دنیا کر دینا جو اسلامی طریقہ ہے ذرا دشوار ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

؎ چیست دنیا؟ از خدا غافل بودن — نے قماش و نقرہ و فرزند وزن

"دنیا داری کیا ہے؟ خدا سے غافل ہو جانا ہے! ترک سامان و ترک نقرہ ترک فرزند وزن کی ضرورت نہیں" یہ سب کچھ ہو مگر خدا سے غافل نہ ہو تو وہ تارک الدنیا ہے اور اگر کسی کے پاس سونا چاندی نہ ہو مگر وہ خدا سے غافل ہو تو وہ پکا دنیا دار ہے لاکھ مال و اولاد ہوا کرے جو غافل نہیں ہے وہ دنیا دار نہیں ہے۔

ترک عقبیٰ اس سے بھی زیادہ سہل ہے بس آپ خیال کر لیں کہ ہمیں حور و قصور نہیں چاہیئے تو یہ ترک عقبیٰ ہو گیا۔ رہا ترک مولیٰ یعنی دوست احباب کو چھوڑ دینا اور سب سے تعلقات کو توڑ لینا یہ ذرا مشکل ہے دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کے مترادف ہے۔ اب رہا ترک ترک یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

اوپر ذکر کی گئی باتوں سے معلوم ہوا کہ انسان ترک سے درجہ صمدیت تک پہنچتا ہے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے "الصمد" ٹھہرا۔ آیا وہ بھی "الصمد" ترک کی وجہ سے ہوا؟

ہم خدا کو منفی صفات والا نہیں مانتے جیسا کہ بعض اسلامی فرقوں کا خیال

تھا۔ وہ مرتکب ہے تارک نہیں، نہ اس کی صمدیت ترک یا کسی اور صفت کی محتاج، اس کی ذات ترک وار تکاب ہر شے سے بلند ہے۔ وہ "الصمد" ہے تو یہ اس کی ایک ذاتی صفت ہے کسی دوسری صفت کی مرہون منت نہیں۔

آج تک بڑی بڑی مہذب قوموں میں بچوں کے نام مہمل رکھے جاتے ہیں یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ ہم لوگ اولاد کے اچھے اچھے نام رکھتے ہیں کیونکہ حضورؐ کا فرمان ہے کہ اپنی اولاد کے نام اچھے اچھے رکھا کرو۔

آپ نے ایسا اس لئے فرمایا کہ نام کا شخصیت پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے اپنے نام کی وجہ سے میں دیکھتا ہوں کہ مجھ میں شان صمدیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے نہ مجھے کبھی کسی چیز کے کھانے کا شوق ہوا اور نہ پہننے کا نہ عزو جاہ کا بہت سی چیزوں کی عادت صحت کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے ڈالی۔ اور برسوں ان پر کار بند رہا۔ پھر جب جی چاہا یک لخت چھوڑ بیٹھا اور ذرہ برابر پروانہ ہوئی کبھی کسی مالی نقصان کا صدمہ نہ ہوا نہ کسی عزیز کے فوت ہونے کا زیادہ ملال ہوا جس دوست کو چاہا چھوڑ دیا پھر کبھی اس کا خیال تک نہیں آیا۔

دارالعلوم دیو بند میں ہزاروں طالب علموں میں سات لڑکے عربی کے ادیب اور کتاب کے کیڑے مشہور تھے ان میں سے ایک یہ خاکسار بھی تھا نہ ہمارا کوئی دوست تھا نہ دشمن اپنی دوستی کتاب سے تھی مگر کسی دوست کا ہونا بھی ضروری ہے لہٰذا ایک دوست سے دوستی کرلی بلکہ انہوں نے ہم سے دوستی کرلی عرصے تک دوستی رہی بڑی مخلصانہ دوستی۔ پھر وہ بہت آنے جانے لگے۔ ہم انہیں آتا دیکھتے تو دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتے عرصہ تک وہ اسے اتفاق سمجھتے رہے پھر کسی نے بتا دیا تو انہوں نے فرمایا۔

"لقد صدق الذی سماک صارما"

جس نے تیرا نام صارم رکھا بالکل سچ ہے۔

آخر میں اب ذرا عبدالصمد نام کا لطیفہ بھی سنتے جائیے میرے خسر صاحب حکیم مولوی محمد صدیق مرحوم کا انتقال ہوا تو میں باغ اور مربعے کا انتقال ان کے ورثاء کے نام لکھانے چونیاں گیا پٹواری نے پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ میں

نے کہا عبدالصمد" وہ ہنس کر کہنے لگا عبدالصمد تو کسی کا نام نہیں ہوتا تیرا نام عبدالحمید ہو گا۔ میں نے کہا نہیں۔ میرا نام عبدالصمد ہے۔ عبدالحمید نہیں وہ بولا نہیں تیرا نام عبدالحمید ہو گا۔ میں نے کہا **قل ھواللہ احد اللہ الصمد** کبھی سورۃ اخلاص سنی ہے "صمد" اللہ کا نام ہے اور میں عبدالصمد یعنی "صمد" کا بندہ ہوں! کہنے لگا اچھا تو کہتا ہے تو میں عبدالصمد لکھے دیتا ہوں۔ ہمارے قصبے میں لوگ کسی کو بہت بے وقوف کہنا چاہتے تو کہا کرتے تھے میاں آدمی ہو یا پٹواری؟ اس روز مجھے پتہ چلا کہ لوگ ایسا کیوں کہا کرتے تھے۔

ہماری ایک شاگرد بڑی ہی جھگڑالو تھی سوز تخلص کرتی تھی اور واقعی سراپا آگ ہی تھی اور اس شعر کا صحیح مصداق تھی۔

اک نہ اک عیب حسینوں میں ہوا کرتا ہے
جسے صورت ملی اچھی اسے سیرت نہ ملی

اس کی شادی ہوئی تو نہ شوہر سے بنی نہ اس کے گھر والوں سے طلاق ہو گئی اس کے بھائی اس کی تیز مزاجی سے بڑے ہی تنگ تھے ایک بزرگ کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا تم سوز تخلص چھوڑ دو شیریں تخلص اختیار کرلو۔ کچھ عرصے کے بعد اس نام کا اثر ظاہر ہونے لگا اور واقعی وہ سوز سے شیریں بن گئی۔

نام کا شخصیت پر لاشعوری طور پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے اچھے نام و لقب سے اپنے دوستوں عزیزوں کو یاد کرو۔ برے القاب رکھنا اور برے ناموں سے پکارنا بری بات ہے ان سے رنجش بھی پیدا ہوتی ہے اور اللہ بھی ناراض ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ "آپس میں برے القاب نہ ڈالو"

"الصمد" کا ورد کرتے رہنے سے شان بے نیازی پیدا ہوتی ہے۔

اَلصَّبُوْرُ جل جلالہٗ

قرآن شریف میں یہ لفظ کسی جگہ نہیں آیا۔ البتہ شکور کا لفظ کئی جگہ آیا ہے۔ شکور کے معنی بہت شکر کرنے والے کے ہیں۔ مگر اسمائے الٰہی میں اس کے معنی شکر قبول کرنے والے کے ہیں۔ اسی طرح صبور کے معنی بہت صبر کرنے والے کے ہیں۔ مگر اسمائے الٰہی میں اس کے معنی تحمل و ضبط کرنے والے کے ہیں۔ یعنی اعدائے الٰہی کے بارے میں انہیں مبتلائے عذاب کرنے میں ضبط و تحمل و درگزر کرنے والا۔ بلاشک وہ صبور ہے۔ ورنہ ہم اس قابل کہاں کہ ہمارا ناپاک وجود سطح زمین کو ناپاک کرتا رہے۔

سطح زمین پر ہر آن اور ہر گھڑی اتنے بڑے بڑے مظالم ہوتے رہتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس صاحب جلال کو باوجود یکہ قادر و جبار و قہار ہے کیوں غضب نہیں آتا کہ وہ زمین کے تختے کو ایک دم میں الٹ کر رکھ دے۔ ظالم لوگ ایسے ایسے نت نئے مظالم ڈھاتے رہتے ہیں جن کے تصور سے بھی روح کانپ اٹھتی ہے پھر بھی وہ مگن خوش باش و خوش عیش صحیح و تندرست رہتے ہیں۔ معصوم بچوں، یتیموں، بیواوں اور بے کس معذوروں پر اہل ثروت و حکومت مظالم توڑتے رہتے ہیں اور اچھے بھلے خوش خوش زندگی گزارتے رہتے ہیں۔

؎ طوفانِ نوح نے تو ڈبوئی زمیں فقط
میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا وہ دن میرے لئے بڑا خوش کن ہو گا جب میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا میں خود اپنے بارے میں کبھی سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ہر

سانس پر کوئی نہ کوئی گناہ کرتا ہوں۔ میں ننگ وجود گردن زدنی ہوں۔ بس وہ "الصبور" ہم سے اور آپ سے انتقام لینے میں ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے۔ اس طرح باوجود جرائم سے بھرپور رہنے کے دنیا صحت و سلامتی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

وہ "الصبور" اپنی مخلوق سے بھی ایسے ہی ضبط و صبر کا تقاضا کرتا ہے چنانچہ جگہ جگہ قرآن شریف میں صبر جمیل کا ذکر کیا گیا ہے۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ میں صبر جمیل کرتا ہوں اور اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں اس کے بارے میں جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔

فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ اے نوح! بیٹے کے ڈوب جانے پر صبر کر۔ کیونکہ آخرت کی بھلائیاں پرہیز گاروں کے لئے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوالْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ نبی! آپ صبر کیجئے جیسے آپ سے پہلے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَاِنَّ ذَالِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ جس نے صبر کیا اور معاف کیا۔ یہ بات بلند ہمتی کی ہے۔

وَالصَّابِرِيْنَ فِى الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ۔ جنگ اور تنگی ترشی میں صبر کرنے والے اور مومنوں کو بشارت دے دو۔

وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا اور جنگ میں ثابت قدم رہو اور سرحدوں کی حفاظت کرو۔

اِنَّاوَجَدْ نَاهُ صَابِرًا۔ ہم نے اسے صابر پایا ایوب بڑا اچھا بندہ ہے رجوع کرنے والا ہے۔

وَاصْبِرْعَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ۔ صبر کیجئے ان باتوں پر جو وہ کہتے ہیں اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے جدا ہو جایئے سورہ مزمل میں یہ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس پیرائیہ ملی میں امت سے مطالبہ ہے کہ تمہیں بھی چاہئیے کہ بدگو لوگوں کی باتوں پر صبر کرو۔ اور خوبصورتی کے ساتھ انہیں چھوڑ دو۔

اسی سے وہ مشہور مقولہ ہے۔ **الصبر عندالجزع اکبر منہ فی القتل** یعنی گھبراہٹ کے وقت ثابت قدم رہنا بڑا دشوار ہے بہ نسبت قتل و قتال کے وقت۔ جاہلی شاعری میں صبر انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

صبر نا و کان الصبر منا سجیتہ - ہم ثابت قدم رہے کیونکہ ثابت قدمی ہمارا شیوہ ہے۔ انسان پہ خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ پڑے بالاخر صبر ہر ایک کو جلد یا بدیر آہی جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے غموں کو بھولتا جاتا ہے اور روتے روتے رونے سے اکتا جاتا ہے یہ صبر نہیں ہے صبر وہ ہے جو ابتدائے صدمہ پر ہو۔ حضورؐ نے فرمایا۔ **الصبر عندالصدمۃ الاولی**۔ صبر وہ ہے جو چوٹ لگتے ہی ہو۔ یعنی کامل صبر وہ ہے کہ انسان پر صدمہ پڑے تو اس کے پڑتے ہی صبر و رضا کا اظہار کرے اور جزع فزع نہ کرے اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ناقص صبر ہے۔ پھر ان لوگوں کا صبر تو بہت ہی ناقص درجے کا ہے جو جزع فزع کرتے پھرتے اور روتے روتے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے اعتبار سے صبر کے بہت سے درجات پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں ایک ایسے کوہ صبر و تحمل مدنی شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا ایک اکلوتا جوان بیٹا مرا تو وہ تعزیت کرنے والوں سے بڑے تحمل کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ کیا ہوا جی اس کی امانت تھی اس نے لے لی۔ اس کے چہرے پر غم و کرب کے کوئی ذرا سے بھی آثار نہ تھے۔ بس وہ راضی برضا انسان تھا۔ لہٰذا اتنے بڑے صدمے کو جھیل گیا۔

ہم نے ہزاروں بار صبر کیا ہو گا۔ اور سینکڑوں کو صبر کی تلقین کی ہو گی مضامین لکھے ہوں گے شعراء کے اشعار پڑھے ہوں گے۔ علم الاخلاق میں صبر کا بیان پڑھا ہو گا اور سمجھتے ہوں گے کہ ہم جان گئے ہیں کہ صبر کی کیا تعریف ہے صبر کی کیا حقیقت ہے فلسفہ اخلاق و نفسیات والے کیا کہتے ہیں۔ مگر صبر ہے کیا؟

اور یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کا اندازہ مجھے صحیح طور پر اس دن کے بعد ہی ہوا جب میری بیوی ایک حادثے میں اچانک مر گئی۔ وہ اور ہم کبھی تیس سال

سے ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں یہ احساس تیز ہوتا جاتا ہے کہ صبر بھی اس کی پیدا کردہ نعمتوں میں سے ایک بڑی بھاری نعمت ہے میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ صبر بھی نعمت خداوندی ہے۔ سنا کرتا تھا کہ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ اس کی شیرینی پر یقین کامل اس دن کے بعد ہی پیدا ہوا اس میں کوئی شک نہیں کہ صبر تلخ ہے بلکہ بہت ہی تلخ ہے مگر اس کا ثمر شیریں ہے بلکہ بہت ہی شیریں ہے۔

ہے ازل سے ساتھ نرم و سخت کا اس دہر میں
کس قدر انساں کے دانتوں سے زبان نزدیک ہے

بیوی کو مرے عرصہ ہو گیا مگر اب بھی تہ دل سے اکثر کہتا ہوں۔ اے اللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ صبر بھی تیری ایک نعمت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بھی تیری پیدا کردہ ایک بڑی بھاری نعمت ہے۔ میں کس زبان سے اس نعمت پر تیرا شکر ادا کروں۔

قدرت خداوندی کا تماشا کرو اس نے زہر پیدا کیا تو تریاق بھی اس کے توڑ کے لئے بنایا غم و آلام پیدا کئے تو ان کے ازالہ کے لئے صبر پیدا کیا اور ہر چیز میں ایک لذت رکھی ہے۔ غم میں بھی مزا ہے اور رونے دھونے میں بھی مزا ہے۔ تلخی کے ساتھ کچھ لذت بھی محسوس ہوتی ہے۔ زخموں پر نمک چھڑکنے سے بھی ایک گونہ لطف محسوس ہوتا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر کیا تو وہ ساری نعمتیں جو چھن گئی تھیں دوبارہ انہیں مل گئی تھیں بلکہ ان سے زیادہ بیٹے مال مویشی جائیداد اور مکان وغیرہ اللہ نے دیئے

خواجہ علاؤ الدین صابر کلیریؒ نے بڑے صبر کے ساتھ سخت مجاہدات کئے تو دنیا میں صابر کہلائے۔ ان کے صبر ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مخلوق خدا میں ان کا نام نیک بلند ہے اور ان کا مزار مرجع خواص و عام ہے۔

خواص اسمائے الٰہی میں لکھا ہے اگر کسی کو رنج و صدمہ لاحق ہو تو ایک ہزار بار اس اسم کا ورد کرے اطمینان و سکون قلبی میسر آئے گا۔ اور اگر حاسدوں

اور دشمنوں سے کوئی خطرہ ہو تو اس کے ورد سے ان کے شر سے محفوظ رہے اور سرکار و دربار میں اس کی عزت ہو۔

صبر تلخ است و لیکن بر شیریں دارد
میوہ چین چمن خلد ہر اک صابر ہے

*

الضار جل جلالہٗ

ضار ضارین ضر یضرون بضر ضر وغیرہ یہ الفاظ قرآن شریف میں آئے ہیں۔ پہلے پارے کے بارھویں رکوع میں ہے **وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ** "وہ فرشتے جادو کے ذریعہ کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ کے اذن سے" تو معلوم ہوا کہ وہ "النافع" "الضار" بھی ہے۔

اگر کوئی شخص نفع پہنچا سکے مگر ضرر پہنچانے پر قادر نہ ہو تو وہ کامل واکمل نہیں اگر کوئی شخص کسی نافرمان یا مجرم کو ضرر نہ پہنچا سکے تو وہ کامل واکمل نہیں چونکہ ذات خداوندی کامل و اکمل ہے لہٰذا وہ "النافع" ہونے کے باوجود "الضار" بھی ہے۔ وہ نیک بندوں کو نفع پہنچانے پر قادر ہے تو بروں کو سزا دینے اور ضرر پہنچانے پر بھی قادر ہے کیونکہ وہ صاحب قدرت کاملہ ہے۔

اس "الضار" نے سب سے پہلے ابلیس کو ضرر پہنچایا کہ راندۂ درگاہ کر دیا۔ اس نے ابلیس کو بڑے مراتب عطا کئے تھے۔ وہ گھمنڈ کرنے اور نافرمانی کرنے لگا تو اس "النافع" نے اسے ضرر پہنچا دیا۔ اگر وہ اس پر قادر نہ ہوتا تو مختار مطلق نہ ہوتا۔

اس "الضار" نے دوسرا ضرر آدم کو پہنچایا کہ اس نے بھولے سے نافرمانی کی تو اسے جنت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ نافرمان اور مجرم کو سزا دینا قرین عدل ہے ورنہ وہ عادل نہ ٹھہرتا۔

نفع و ضرر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے وہ خود فرماتا ہے ہم تمہیں جنگ، قحط، خسارہ مال و جان و ثمرات سے آزمائیں گے۔ معلوم ہوا ایمان مصائب دنیوی سے نجات کی گارنٹی نہیں ہے۔ کافر و مشرک و مومن سب برابر ہیں۔ اسے آزمانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے

آیت کا مطلب تو دراصل یہ ہے کہ ہم تمہیں مبتلائے مصائب بھی کریں گے۔ ایسا کیوں کریں گے؟ نظام عالم صحیح کرنے کے لئے؟ یا سزا دینے کے لئے؟ یا ہمارے نفوس کی اصلاح کے لئے؟ یا کسی اور مصلحت سے؟ وہ بہتر جانتا ہے۔

حدیث قرآن کی تفسیر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے مومن کے کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کے گناہ جھڑتے ہیں۔ ایک دن کے بخار سے بھی گناہ جھڑتے ہیں۔ جانی و مالی نقصانات سے بھی گناہ جھڑتے ہیں۔

اگر دنیا میں نفع ہی نفع ہوتا تو کیا ہوتا۔ نظام عالم بے کار ہوتا۔ جدوجہد اور کش مکش نہ ہوتی۔ کسی کاروبار کے کرنے میں مزا نہ آتا۔ خوشی بے کیف ہو جاتی۔ ذرا آپ غور کریں اگر وہ "النافع" "الضار" نہ ہوتا تو کاروبار زندگی ٹھپ ہو کر رہ جاتا اور سب کچھ بے کیف ہو جاتا۔ ارشاد خداوندی ہے

"آپ کہہ دیجئے ہمیں وہی پہنچے گا جو اس نے لکھ دیا ہے" تو جو بھی ضرر ہمیں پہنچتا ہے اسی سے پہنچتا ہے تو وہ "النافع" "الضار" یقیناً ہوا۔ ضرر حیات دنیوی کا لازمہ ہے کبیرداس نے کیا خوب کہا ہے۔

دو پاٹوں کے بیچ سے سالم گیا نہ کوئے

"عموماً مصائب دھر ہماری اصلاح کے لئے ہوتے ہیں ان سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ یہ ہماری دوا اور علاج ہیں۔ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہیں۔ اچھا ہی ہے جو یہاں کی بلائیں یہیں ٹل جائیں۔"

اس "الضار" کے ضرر سے کوئی بھی مخلوق نہیں بچ سکی۔ انسان، حیوان، اشجار، نجوم، کواکب اور زمین و آسمان ہر ایک کو ضرر پہنچتا ہے۔ انسان و حیوان کو بیماریاں ضرر پہنچاتی رہتی ہیں۔ درختوں اور پتوں کو کیڑے ضرر پہنچاتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں اور پہاڑوں کو بارش، پانی، دریا، فضا اور مختلف جراثیم نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ سوکھی لکڑیوں کو دیمک اور کیڑے اس "الضّار" نے ہر چیز کے ضرر پہنچانے کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں تاکہ ہر چیز ایک وقت پر فنا ہو جائے اور کوئی دعوائے خدائی و بقائے ابدی نہ کر سکے۔ موت فنا خرابی اور بربادی ہر چیز کا مقدر ہے۔

چونکہ وہ "الضار" قادر مطلق ہے لہذا کسی کی مجال نہیں کہ اسے ضرر پہنچا سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ترجمہ:

"وہ اللہ کو ہرگز ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے" اس قادر مطلق کو کون ضرر پہنچا سکتا ہے؟ ضرر اسی سے پہنچتا ہے یا صبر کرو یا اس سے خلاصی کے لئے دعا کرو کوئی بندہ اس کے لگائے ہوئے ضرر کو دور نہیں کر سکتا۔ جو کچھ مانگو اسی سے مانگو۔

اس کی ضرر رسانی کسی کے لئے باعث رحمت ہے اور کسی کے لئے باعث زحمت۔ اپنے نیک بندوں کو اس نے کیسے کیسے ضرر پہنچائے۔ زحمت کے لئے نہیں رحمت کے طور پر کہ ان کے مراتب میں اضافہ ہو ان کے گناہ جھڑیں اور وہ کندن ہو کر اس بھٹی سے نکلیں۔

کافروں بدکرداروں کو اس کی ضرررسانی صرف زحمت کے لئے ہوتی ہے ارشاد ربانی ہے۔ "تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے" وہ بعض اوقات ظالموں کو اس طرح پکڑتا ہے کہ وہ ساری عمر روتے رہتے ہیں۔

اس کی ضرر رسانی کا تماشا دیکھئے ہماری کتابوں' کپڑوں' قالینوں' فرشوں' میزوں اور کرسیوں وغیرہ تک کے لئے اس نے ایسے باریک جراثیم پیدا کر دیئے ہیں جو ان کا بیڑا ہی غرق کر دیتے ہیں۔ **قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ**۔ "ہم نے کہا یہاں سے چلے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے" یہ جذبہ عداوت یا خود غرضی یا بھوک پیاس مخلوق کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے' مارے' دفع کر دے یا کھا جائے۔ الغرض ایک مخلوق دوسری مخلوق کے ضرر پہنچانے پر آمادہ رہتی ہے۔ ایک کی ایک گھات میں لگا ہوا ہے کیسی کیسی مکاریاں چالاکیاں اور چیرہ دستیاں کی جاتی ہیں یہ ایک ایسا ڈرامہ ہے جو رات دن ساری دنیا میں ہر وقت کھیلا جاتا رہتا ہے۔

یہ خلیفۂ ارضی بھی اپنے خالق کی طرح ضار ہے دشمنوں کے ضرر کے درپے رہتا ہے جو جانور اسے تکلیف پہنچاتے ہیں انہیں ضرر پہنچاتا ہے۔ جن درختوں' جھاڑیوں' پتھروں' پہاڑوں' تالابوں اور دریاؤں سے اسے تکلیف پہنچتی

ہے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ ڈالتا ہے دریاؤں کے رخ بدل دیتا ہے۔ مجرموں کو سزا دیتا ہے۔ اور ظالموں سے بدلہ لیتا ہے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ نے ضرر رسانی کی طاقت بخشی ہے اس طاقت کو بے جا استعمال نہ کرنا چاہیئے آپ اپنے دشمن کو ضرر پہنچا سکتے ہیں مگر یہ ضرر رسانی بقدر ظلم ہونی چاہیئے۔ زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔ انسان اور حیوان تو کیا اگر کسی درخت یا جھاڑی جھنکاڑی سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے تو بس اسی قدر اسے کاٹیے جتنے سے آپ کی تکلیف دور ہو جائے۔ اللہ فساد فی الارض کو پسند نہیں کرتا۔

الظاہر جل جلالہٗ و الباطن جل جلالہٗ

سنترے کا ظاہر کچھ اور ہے باطن کچھ اور کیلے کو چھیلو تو اندر سے کچھ اور ہی نکلتا ہے۔ بادام اخروٹ وغیرہ کو توڑو تو اندر سے ایک ایسی چیز نکلتی ہے جو اس کے ظاہر سے بالکل مختلف ہے۔ تمام اشیاء کا ظاہر کچھ اور ہے اور باطن کچھ اور سیب و امرود کو کاٹو تو باطنی حصہ ظاہری حصے سے مختلف پاؤ گے۔ اگر یہ بیرونی حصہ باریک اور متصل ہے تو اس کے چھلکے کو باطن سے تھوڑی سی مناسبت ہو گی۔ اور دبیز اور دور ہے تو مناسبت نہیں ہو گی۔ صرف مادی اشیاء ہی میں ایسا نہیں ہے غیر مادی چیزوں میں بھی ایسا ہی ہے۔ الفاظ جو ٹیڑھے میڑھے نقوش کے سوا کچھ نہیں ہیں اپنے باطن میں معانی کو چھپائے ہوئے ہیں۔ جیسے اخروٹ اپنے اندر مغز کو چھپائے ہوئے ہے۔ جیسے یہاں مغز کو وہ حیثیت حاصل ہے جو چھلکوں کو نہیں۔ اسی طرح معانی کو جو حیثیت حاصل ہے الفاظ کو نہیں یہی وجہ ہے کہ ارباب منطق و فلسفہ الفاظ کو کچھ نہیں سمجھتے معانی سے سروکار رکھتے ہیں کیونکہ الفاظ تو صرف ذریعہ ہیں سمجھنے اور سمجھانے کا اور ارباب فصاحت و بلاغت بھی الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جب تک کہ ان میں اچھے عمدہ معانی نہ ہوں۔ اسی لئے وہ عام لوگوں کی بول چال کو حیوانات کی آوازوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کہتے ہیں جس طرح حیوانات آواز کے زیر و بم سے اپنا مطلب پورا کر لیتے ہیں یہ بھی کر لیتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ الفاظ کے معانی اولیٰ کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے جب تک کہ معانی اولیٰ معانی ثوانی پر دلالت نہ کریں۔ یعنی اگر یوں کہہ دیا جائے کہ زید بہادر ہے تو یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ البتہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ زید شیر ہے تو یہ کلام ہے کہ "زید شیر" ہے کے الفاظ نے زید کے شیر ہونے کو بتایا اور پھر ان معانی نے معانی ثانی پر دلالت کی کہ زید بہادر ہے۔

ارباب منطق و فلسفہ جوالفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے یہ تو بلاشبہ الفاظ کے ساتھ ظلم ہے۔ یہ مانا کہ معانی شرافت میں الفاظ سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر الفاظ اتنے رذیل بھی نہیں کہ انہیں درخوراعتناء ہی نہ سمجھا جائے۔ مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اصحاب رضی اللہ عنہ صفہ کے مقام پر ایک شخص قرآن شریف کو اپنے قدموں پر دھرے پڑھ رہا تھا۔ میں نے کہا ارے ظالم یہ کیا! کہنے لگا یہ تو کاغذ ہے۔ اسکے احترام کی کیا ضرورت؟ اور یہ الفاظ و نقوش ہیں۔ تو پھر ان الفاظ و نقوش کو کس لئے پڑھ رہا ہے؟ مانا کہ یہ کاغذ اور الفاظ و نقوش ہیں اور چلو یہ بھی مانا کہ یہ کاغذ اور نقوش کلام الٰہی نہیں ہیں مگر کیا نامۂ لیلیٰ کو مجنوں قدموں پر رکھ سکتا تھا۔ مذہب عشق و محبت میں ایسا کرنا تقاضائے عشق کے خلاف ہے۔ ادب کے خلاف تو ہے ہی۔ مسجد نبوی کے باہر ایک کتا بیٹھا تھا۔ ایک حاجی نے اس کے ڈنڈا مارا وہ روتا ہوا بھاگا پیر جماعت علی شاہؒ نے دوڑ کر اس کتے کو اپنی گود میں بٹھالیا اور کہا ارے ظالم! تو نے یہ کیا کیا؟ یہ تو لیلیٰ کا کتا ہے۔ عشق و محبت کی باتیں جداگانہ ہیں اور مذہبِ عشق فقہی مذہب سے بہت بالا ہے۔

بہر حال مادیات ہوں یا روحانیات سب کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر ظاہر کا مرجع وہی الظاہر ہے اور ہر باطن کا مرجع وہی "الباطن" ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر ہے کہ " **خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ** " کے ایک تو یہی سیدھے سادے معنی ہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں اور ایک باطنی معنی بھی ہیں اسی طرح **وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْہِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِہِمْ سَدًّا**" کے دو معنی ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا بیان تو سارے کا سارا "ظاہر و باطن" کی جنگ کے بارے ہی میں ہے اور اس لئے لایا گیا ہے کہ حقائق کا ظاہر کچھ اور ہے باطن کچھ اور معصوم بچے کے قتل سے بھی کوئی گناہ بڑا ہو سکتا ہے؟ ایک پیر نے اپنے مرید صادق کو حکم دیا کہ فلاں رنڈی کے پاس جاؤ۔ مرید صادق جو ٹھہرا کیسے نہ مانتا۔ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی گم شدہ بیوی ہے۔

ہماری مرحومہ بیوی صاحبہ بڑی مذہبی خاتون تھیں۔ میرے اوپر اعتراض کرتی رہتی تھیں کہ تم نے ایسا کیوں کہا؟ اور ایسا کیوں کیا؟ میں کہتا جانے دو بیگم صاحبہ! ہمارے اعمال کا ظاہر کچھ ہے باطن کچھ گناہ کبیرہ سے خدا بچائے۔ رہے صغیرہ سو ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ شائد قارئین کو یہ بات معلوم ہو کہ صغائر پر اصرار کرنیولا خوارج کے نزدیک کافر ہوتا ہے۔ اور صوفیاء کے نزدیک ایک پل بھی غافل ہونیوالا کافر مطلق ہے۔ ہمارے ایک دوست مطب میں تشریف لاتے ہیں وہ کھانے کے بڑے شوقین ہیں۔ فلاں دکان کی یہ چیز مشہور ہے فلاں دکان کی وہ۔ ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ جب بھی تشریف لاتے ہیں ہم ملازم سے ان کے ذوق کی کوئی نئی چیز چائے کے ساتھ منگاتے ہیں۔ تو وہ کہا کرتے ہیں۔ حکیم صاحب! آپ کھانے کے بڑے شوقین ہیں۔ خوب چٹخارے لیتے رہتے ہیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ ایک کھاتا ہے اور ہنستا جاتا ہے اور ایک کھاتا ہے اور روتا جاتا ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسی طرح میرے گھر والے سمجھتے ہوں گے کہ میں سونے کا شوقین ہوں۔

بات کہاں سے کہاں جا نکلی وہ "الظاہر" ظاہر بھی ہے اور "الباطن" بھی جنہیں اس نے دونوں قسم کی آنکھیں عطا کی ہیں وہ اس "الظاہر" کو ظاہر دیکھتے ہیں اور اس "الباطن" کو باطن بھی اور جو باطنی نظر سے محروم ہیں وہ اسے ظاہری نظروں ہی سے دیکھتے ہیں۔ وہ "الظاہر" سے واقف ہیں۔ "الباطن" سے نہیں۔ اور جو دونوں سے محروم ہیں وہ اسے نہ ظاہری طور پر دیکھتے ہیں نہ باطنی طور پر۔ گو ظاہری طور پر تو اسے رات دن دیکھتے ہیں مگر پہچانتے نہیں۔ رستم نے اپنے بیٹے سہراب کو دیکھا۔ باتیں کیں۔ اس سے جنگ کی اور اسے قتل بھی کر دیا۔ مگر پہچانا نہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے اور سہراب نے اپنے باپ کو اچھی طرح دیکھا مگر پہچانا نہیں کہ باپ ہے میں کہا کرتا ہوں جس نے جس حد تک دنیا کو دیکھ لیا۔ اس نے اس حد تک خدا کو دیکھ لیا۔ یہ دوسری بات ہے وہ پہچان نہ سکا۔ حدیث قدسی ہے اللہ فرماتا ہے "زمانے کو گالی مت دو کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں۔ ہواؤں کو گالی مت دو" رسول اللہ نے بیان کیا اور خدا نے ان سے فرمایا کہ میں دہر ہوں تو ہم مانتے

ہیں کیونکہ دونوں مخبر سچے ہیں۔ وہ اگر دہر ہے تو ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔
کیونکہ دہر ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

صرف اشیا کی حقائق ہی تک یہ بات محدود نہیں ہے کہ ان کا ظاہر کچھ ہے باطن کچھ ہے۔ باطن کچھ ہمارے رات دن کے اعمال و افعال کا بھی ظاہر کچھ ہوتا ہے۔ اور باطن کچھ اور ہی اس کی صفت ظہور و بطون نے ہر شے پر اثر کیا ہے۔ استاد شاگرد کو مارتا ہے۔ ماں بیٹے کو پیٹتی ہے۔ ڈاکٹر مریض کے نشتر چبھوتا ہے یہ سارے افعال بظاہر ظلم ہیں۔ مگر ان کا باطن سراسر خوبی ہے۔ میں حج کرنے گیا تو اپنے ساتھ کاغذ قلم دوات اور کچھ سفرنامے لے گیا۔ سارے دن جہاز میں بیٹھا ہوا اپنا سفرنامہ لکھتا رہتا تھا کہ ایک صحیح سفرنامہ حج لکھدوں۔ یہ سفرنامہ حج و زیارت امتیاز علی تاج مرحوم نے چھپوایا تھا میرے اس کام سے ساتھیوں کی دل آزاری ہوئی میں بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا کہ چند احباب میرے پاس آئے اور کہنے لگے صارم صاحب! آپ حج کے لئے جا رہے ہیں نہ نوافل پڑھتے ہیں نہ اورادوظائف نہ تلاوت کرتے ہیں سب تہجد پڑھتے ہیں مگر آپ پڑے سوتے رہتے ہیں۔ اور دن بھر کتاب لکھتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا آپ خوبی سے حج ادا کریں گے تو صرف آپ کو فائدہ پہنچے گا۔ اور میں حج کروں گا تو سینکڑوں کو فائدہ پہنچے گا۔ وہ مذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگے اچھا آپ ایسے ہیں میں نے کہا اور میرا سونا آپ کی بیداری سے بہتر ہے۔ اگرچہ میں تہجد پابندی سے پڑھا کرتا تھا مگر انہوں نے دیکھا نہ ہو گا۔ تو میں نے اس کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ کہنے لگے اچھا آپ ایسے ہیں کہ ہماری نمازوں سے آپ کا سونا بہتر ہے؟ میں نے کہا یہ جو میری دوات کی روشنائی ہے خون شہیداں سے افضل ہے پھر کیا تھا انہیں غصہ آگیا۔ کہنے لگے آپ تو دون کی ہانکتے ہیں۔ میں نے کہا آپ میں جو سب سے بڑا عالم ہو اس سے جا کر کہو کہ ایک حاجی ایسی باتیں کر رہا ہے اسے چل کر سمجھا دو چنانچہ امام صاحب جبہ و دستار میں ملبوس میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ مشکل یہ ہے کہ میری وضع قطع ایسی ہے کہ انگریزی دان مجھے انگلش سے نابلد سمجھتے ہیں۔ اور عربی دان عربی سے میں نے ان سے حدیثیں بیان

کیں۔ تو وہ فرمانے لگے یہ سچ کہتے ہیں پھر بولے آپ آج سے نماز پڑھایا کریں۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ سر ہو گئے میں نے کہا میں نماز نہیں پڑھا سکتا۔ فرمانے لگے تو ہر نماز کے بعد کچھ ترجمۂ قرآن' وعظ و نصیحت ہی سہی۔ میں نے کہا منظور۔

اس پورے واقعہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارا ان اعمال کو ترک کرنا دوستوں کی نظروں میں قابل مذمت تھا۔ مگر دراصل محمود تھا۔ دیکھو ایک شخص ریاکاری کے لئے عبادت کرتا ہے۔ بظاہر یہ فعل حسن ہے مگر بہ باطن شرک ہے۔ جو سب سے بڑا گنہ اور ناقابل معافی جرم ہے۔ لوگ کرتے کچھ ہیں دکھاتے کچھ ہیں۔ اس دور کی سیاست تو ساری اندر کچھ باہر کچھ ہے اور سارے تہذیب و تمدن کا یہی حال ہے میں نے اس چکنے چپڑے انسان کو بڑا ہی گندہ پایا یعنی تن اجلا اور من گندہ۔

؎ درجہاں ہر چند زریں راہ است
یاد داری چاہ زیر کاہ است

انسان کو اپنا جائزہ لینا چاہیئے۔ دوسروں کے تجسّس سے کیا فائدہ؟ معلوم نہیں کون کس نیت سے کرتا ہے۔ اعمال کا سارا دارومدار تو نیت پر ہے۔

کار پاکاں راقیاس ازخود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شِیر

ہر حاجی کے بکس پر لکھا تھا حاجی فلاں الحاج فلاں میں نے کہا اس سے حج کا ثواب جاتا رہتا ہے۔ کسی نے بھی مٹانا گوارا نہ کیا۔ مختلف مواقع پر مختلف دوستوں نے کہا کہ آپ اپنی تصانیف پر الحاج لکھوایا کریں۔ میں نے کہا مجھے تو کوئی حاجی بھی کہہ کر پکارتا ہے تو منع کر دیتا ہوں۔ لوگوں نے عبادت کو بھی ڈگری بنالیا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی دکانوں مکانوں وغیرہ پر حاجی لکھوا رکھا ہے۔ انہیں حج کا ذرا سا بھی ثواب نہیں ملے گا۔ بات اس **"الظاہر"** و **"الباطن"** کی ہو رہی تھی۔ کہیں اس نے پھولوں میں ظہور کیا ہے کہیں نباتات حیوانات میں۔ کہیں جمالی ظہور ہے' کہیں جلالی' کہیں آسمانوں میں چھپا ہوا ہے' تو کہیں زمینوں

میں، سانپ کتنا خوبصورت ہے مگر زہر چھپائے پھرتا ہے۔ شیر بڑا خوب صورت جانور ہے لوگ کہتے ہیں بڑا شریف جانور ہے۔ مگر اس نے جس کا خون پیا اس کی نظروں میں تو سب سے زیادہ ذلیل و ظالم ہے۔ بظاہر ظہور جمال لئے پھرتا ہے۔ اور باطن میں جلال الٰہی لئے ہوئے ہے۔

خواجہ فرید فرماتے ہیں۔

میڈا جسم بھی توں میڈی جان بھی توں
میڈی روح بھی توں میڈا مان بھی توں

جو جسم ہو سکتا ہے وہ جان کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر ہے۔ حدیث قدسی ہے "جب بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب چاہتا ہے تو میں اسکا ہاتھ بن جاتا ہوں' کان بن جاتا ہوں اور آنکھ بن جاتا ہوں" جو ظاہر ہے وہ باطن کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر یہاں تو ایسا ہی ہے۔ عقل حیران ہے کہ یہ مجمع اضداد کون ہے اور کیسے ہوا؟

كُنْتُ كَنْزاً مَّخفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ اس حدیث کو صوفیا حدیث قدسی بتاتے ہیں۔ یہ حدیث نہیں ہے۔ کسی صوفی کی بنائی ہوئی ہے۔ بہر حال اس موضوع حدیث سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ صوفیا کے نزدیک وہ باطن تھا پھر ظاہر ٹھہرا۔ صوفیا سے اس "موضوع حدیث" کو شعراء لے اڑے احادیث میں اس طرح کی کوئی حدیث نہیں ملتی۔

جو چیز بھی ظہور کرتی ہے اس کی کوئی نہ کوئی صورت و شکل ہوتی ہے۔ خواہ مدور ہو۔ مثلث ہو۔ مربع ہو یا بے ڈول ہو۔ کسی نہ کسی حدو شکل کی پابند ہو گی۔ اور اگر وہ مادی نہیں ہے تب بھی اس کی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہو گی۔ پھول کی خوشبو ایک حد تک ہی ہو گی۔ اور معانی کی کوئی حد ضرور ہو گی۔ معلوم ہوا ظہور و بطون کے لئے حد کی پابندی ضروری ہے۔ مگر یہ "ظاہر و باطن" ایسا ہے کہ نہ اس کے ظہور کی کوئی حد ہے نہ بطون کی۔

چیز ظاہر ہو یا باطن اپنے ایک خاص نہج میں "ظاہر و باطن" ہو گی اس سے آگے قدم نہیں مار سکتی۔ اگر ظہور بصورت بو ہے تو اسکی بھی کچھ حدود ہوں گی۔ اشیاء اپنے ظہور و بطون میں رسم و دستور کے تحت ہوتی ہیں۔ خارج از رسم

ودستور نہیں ہوتیں۔ کوئی چیز اپنی ماہیئت کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اور اگر چھوڑے گی تو اپنے سے قریب والی ماہیت اختیار کرے گی۔ پانی بھاپ یا ہوا بن سکتا ہے۔ مگر آگ نہیں بن سکتا۔ مگر یہ "ظاہر و باطن" ایسا ہے کہ حدود و رسوم سے بالاتر ہے۔ اس کے ظہور و بطون کی کوئی حد نہیں۔ کیونکہ حدبندی کرنے والا تو وہ خود ہے لہٰذا کیسے حدود کا پابند ہو سکتا ہے۔ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ۔ "اس نے ہر چیز کی ایک مقدار رکھی ہے" تو "خالق مقادیر" کیسے کسی مقدار کا پابند ہو سکتا ہے؟

جو چیز بھی حدود و مقدار کی پابند ہو گی۔ محدود ہو گی۔ اس کی ذات لامحدود ہے۔ لہٰذا کسی حدو مقدار و رنگ وبو کی پابند کیسے ہو سکتی ہے؟ جو چیز محدود ہو گی فانی ہو گی۔ کیونکہ حدود ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہ سکتیں۔ ان میں تغیر و تبدل شکست و ریخت لازمی امر ہے لہٰذا جو ذات باقی رہنے والی ہے وہ کیسے محدود ہو سکتی ہے؟

ہر "ظاہر و باطن" پابند زمان و مکان ہے۔ مگر یہ "ظاہر و باطن" ایسا ہے کہ پابند زمان و مکان نہیں لہٰذا تغیر و تبدل اور رخنہ وغیرہ سے برتر و بالا ہے۔ "ظاہر و باطن" ہوتے ہوئے بھی ہر "ظاہر و باطن" سے جدا ہے۔ جدا ہوتے ہوئے بھی ہر "ظاہر و باطن سے جدا نہیں ہے۔

جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

"الظاہر جل جلالہ"

لوگ کہتے ہیں ذات خداوندی حجاب اندر حجاب ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے۔ انسان خود حجاب اندر حجاب ہے اس کے دل و دماغ اور آنکھوں پر طرح طرح کے پردے پڑے ہیں۔ کچھ مادی اور کچھ غیر مادی۔ طرح طرح کی خواہشات نے اس کی بصیرت و بصارت پر پردے ڈال رکھے ہیں حقے سگریٹ اور سگار وغیرہ کے دھوئیں سے اس کے پھیپھڑے تو کالے سیاہ ہو ہی جاتے ہیں۔ دل بھی سیاہ ہو جاتا ہے چائے پان اور شراب و کباب کی تمنا اسے اندھا بنائے رکھتی ہے۔ شہوتوں کی آندھیوں سے چراغ عقل ٹمٹماتا رہتا ہے لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ کے ورے پردے ہی پردے نظر آتے ہیں مگر آنکھوں والے اسے

ہر جگہ جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

آنکھوں والا ترے جو بن کا تماشہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر؟ کیا دیکھے؟

انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو نہیں پہچانتا جتنا کہ اس کے دوست احباب اسے جانتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے دوست ہمیں اتنا جانتے ہیں جتنا کہ ہمارے عزیز و اقارب اور خود ہم اپنے آپ کو نہیں جانتے۔ حب نفس ہمیں اپنی پہچان سے باز رکھتی ہے اور عزیز و اقارب کی محبت جو انہیں ہم سے ہوتی ہے وہ ان کی آنکھوں پر پردے ڈالے رہتی ہے کیونکہ محبت اندھی ہوتی ہے دشمن جو کچھ ہمارے بارے میں کہتے ہیں وہ قریب قریب سچ ہوتا ہے کیونکہ عیب جوئی کی آنکھ ہمارے عیبوں کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ ہمارے بارے میں دشمن کی رائے صحیح ہوتی ہے۔ ماں باپ اور دوست احباب کی رائے غلط ہوتی ہے۔ جب خود ہمارا اپنا یہ حال ہے تو ہم کیسے خدا کو دیکھ سکتے ہیں؟ جو شخص اپنے آپ کو نہ دیکھ سکا وہ کسی دوسرے کو کیا دیکھے گا؟

اس نے جگہ جگہ اپنے جلوے بکھیر دیئے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ وہ حجاب اندر حجاب ہے۔ چاند' سورج' ستارے' دھوپ' چھاؤں' چاندنی' دریا ' پہاڑ' سمندر' شجر و حجر جمادات و حیوانات سب میں اس کا جلوہ ہے۔ مگر ضعیف البصر کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔

انسان اپنے پردوں کو چاک کر کے خود اپنے اندر دیکھے تو اس کا نور چمکتا نظر آئے گا۔

ان گنت ہڈیوں خلیوں رگوں اور گوشت پوست والا انسان آخر رہتا کس جگہ ہے۔ وہ کتنی گندگیوں میں لپٹا ہوا ہے کہ خود ہی اس کی اپنی گندگی سے اس کا دماغ پھٹ جاتا ہے اور طبیعت نفرت کرتی ہے۔ خون' بلغم' سودا' صفراء گندے پانی اور گندگی' بدبودار رطوبتوں والا انسان کس جگہ رہتا ہے وہ کیسی کیسی گندگیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ یہ گندگیوں میں لپٹا ہوا انسان خود اپنے اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا تو کیا جائے تعجب ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو نہ دیکھ سکے؟

ے جلوے دیکھو ہمارے نگار کے رے
بکھرے گلشن میں دانے انار کے رے

بس طرح ہم مخفی اور پوشیدہ چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے اسی طرح ہم ان چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے جو بہت ہی زیادہ روشن ہوں اور ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیں۔ چونکہ سورج بہت زیادہ روشن ہے اور اجل بدیہیات سے ہے لہٰذا ہماری مادی اور عقلی بصارت و بصیرت اس کی روشنی سے چکا چوند ہو جاتی ہے اور بعض ضعیف البصر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے اسے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ظاہر ہی نہیں بلکہ اظہر ہے بلکہ اظہر من الشمس ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں اگر تم کہتے ہو کہ خدا ہے تو اس کے وجود کی دلیل دو۔ دلیلیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں مگر اہل منطق کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جو چیز بدیہی ہو اس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے چاند اور سورج وغیرہ کہ ان کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی شخص دلیل طلب کرتا ہے تو وہ یا تو بالکل بیوقوف ہے یا جھگڑالو ہے۔ بالخصوص اجل بدیہیات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں جیسے آگ گرم ہے اور پانی سرد ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ خدا نہ صرف یہ کہ بدیہی ہے بلکہ اجل بدیہیات سے ہے' لہٰذا اس کے وجود کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں تسلیم نہیں کرتا کہ سورج موجود ہے تو بجائے دلیل دینے کے اس سے یہی کہا جائے گا کہ بھائی دیکھ لے۔ سو یہی حال خدا کا ہے۔ جو شخص اس کے وجود کا منکر ہے ہم تو اس سے یہی کہیں گے کہ بھائی دیکھ لے وہ ہر جگہ ہے۔

ہم کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہیں تو اس کے کمال فن کی داد دیتے ہیں حالانکہ ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ مگر اس کے فن سے اسے پہچانا ہے اس "الظاہر" نے جو اپنی نقاشی میں ظہور کیا ہے بڑے اچھے خوبصورت مناظر' پھول' بوٹے' آبشاریں' پہاڑ اور دریا بنائے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بے ساختہ

زبان پر یہ شعر آتا ہے۔

اے مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
کیسی تصویر بنائے مرے بہلانے کو

اپنی صفات کمالیہ کی وجہ سے وہ بالکل ظاہر و باہر ہے کہ شک کی گنجائش نہیں۔

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

کسی مصور میں صرف ایک کمال ہوتا ہے کہ وہ تصویر کشی خوب کر لیتا ہے اور کوئی کمال اس میں نہیں ہوتا مگر یہ مصور تو سراپا کمال ہے۔ جس طرح اس کی بنائی ہوئی تصویریں اس کے کمال فن کا ثبوت دے رہی ہیں اس کی دوسری صفات بھی اس کے کمال ظہور کی گواہی دے رہی ہیں۔ وہ رازق ہے اور اسکی رزاقیت ظاہر ہے۔ وہ خالق ہے اور اس کی خالقیت واضح ہے۔ وہ رحمان و رحیم ہے اور اس کی صفت رحمت باہر ہے وہ قدیر ہے اور اس کی قدرت متشکل ہے۔ وہ مالک ہے اس کی ملکیت پُر ظاہر ہے۔ وہ علیم ہے اور اس کا علم سب کو معلوم ہے وہ لطیف ہے اور اس کی لطافت کو ہر شخص پہچان سکتا ہے۔ وہ جبار و قہار ہے اور اس کا جبروقہر خوب عیاں ہے۔ وہ بدیع ہے اور اس کا اِبداع و نُدرَت آشکارا ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے اور اس کی سماعت و بصارت کے تماشے بہت سے اولیاء اللہ نے دیکھے ہیں۔ وہ فَعَّالٌ لِمَا یُرِیدُ ہے اور اس کی فاعلیت واِرَادت کے نظارے چشم بینا نے دیکھے ہیں۔ وہ محی ہے اور اس کی اِحیاء کے کرشمے ہر آن بے شمار دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ممیت ہے اور اسکی اِمَاتَت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ وہ شمار کنندہ ہے اور اس کی شمار میں کبھی غلطی نہیں ہوتی۔ وہ عظیم ہے اور اس کی عظمت ثابت ہے۔ وہ جلیل ہے اور اس کی جلالت و منزلت کامل واتم ہے۔ وہ کریم ہے اور اسکی کرامت واضح ہے۔ وہ عزیز ہے اور اس کا غلبہ ہرشے پر ہے۔ وہ رب ہے او راس کی ربوبیت کی گواہی ہر شے دے رہی ہے۔ الغرض، کہاں تک شمار کراؤں وہ اپنے صفات سے ظاہر و باہر ہے۔

العدل جل جلالہ

ایک دفعہ لندن ریڈیو نے دور حاضر کے مشہور فلاسفہ کی تقریریں نشر کی تھیں۔ اس دور میں عہد حاضر کے مایہ ناز یکتائے دھر فلسفی برٹرینڈرسل سب سے نوعمر تھے۔ انہوں نے عالم اشباہ و امثال پر بڑی اچھی تقریر کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مسلمان صوفی بول رہا ہے کیونکہ عالم اشباہ و نظائر کے بارے میں جو کچھ ہمارے صوفیہؒ نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے اس کا بیان ان کے بالکل مطابق تھا۔

اس تقریر کو پڑھ کر میں یہ سوچا کرتا تھا کہ یہ شخص ضرور خدا تک پہنچ جائے گا۔ اس دور کے اہل مذاہب کو بھی ان سے یہ توقع تھی مگر عالم مذاہب کو بڑی مایوسی ہوئی جب وہ مرتے دم فرما گئے کہ مجھے خدا کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ملی۔

کسی چیز کا انکار بہت آسان ہے ہر شخص بڑی آسانی سے ہر حقیقت کا انکار کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ میں نہیں مانتا۔ دشواری تو ثبوت کا دعویٰ کرنے والے کو پیش آتی ہے کہ مدعی کی کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں مانی جاتی دلائل دینا اور ثبوت بہم پہنچانا مدعی کے ذمہ ہوتا ہے اور انکار کی نسبت اثبات بڑا ہی مشکل ہے۔

بڑے بڑے فلاسفہ نے بڑی بڑی احمقانہ باتیں لکھ دی ہیں ڈارون کی تھیوری ہی کو لے لو اب اسے کون مانتا ہے؟ برٹرینڈرسل کو نہ خدا کے وجود پر کوئی دلیل ملی نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود پر کوئی دلیل ملی لہٰذا وہ نہ عیسیٰ علیہ السلام کے قائل ہوئے نہ خدا کے۔

زبور۔ انجیل اور قرآن کریم قدیم زمانے کی مستند تاریخیں ہیں اور باوجود

بعد زمانہ کے ان کے بیانات ایک جیسے ہیں اگر انہیں آسمانی کتابیں تسلیم نہ بھی کیا جائے اور صرف الہامی یا انسانوں کی بنائی ہوئی مانی جائیں تب بھی چونکہ انجیل و قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان کے وجود کو تسلیم کرنے میں شک نہ ہونا چاہیئے برٹرینڈرسل صرف اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کےوجود سے انکار کرتے ہیں کہ یونانی قدیم مورخ ہیروڈوٹس نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر تھا ان کا ذکر اپنی تاریخ میں نہیں کیا۔ مگر اس سے یہ کیسا لازم آتا ہے کہ وہ کوئی شخصیت نہ تھے۔ ہیروڈوٹس کے دور میں یونان و فلسطین میں بڑے بڑے فاصلے حائل تھے ہو سکتا ہے اس تک خبر نہ پہنچی ہو یا اس کی نظر میں اس دور میں عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت قابل ذکر نہ ٹھہری ہو۔ عبدالقادر بدایونیؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ہمعصر ہوتے ہوئے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر نہیں کرتا۔ تو کیا حضرت مجدد صاحبؒ کا کوئی وجود نہ تھا یقیناً وہ اس دور میں موجود تھے مگر ہمارے مورخ نے انہیں اس قابل نہ سمجھا کہ اپنی تاریخ میں انہیں جگہ دے۔

برٹرینڈرسل نے خدا کے نہ ہونے پر یہ دلیل دی ہے کہ دنیا میں ظلم عام ہے لہٰذا میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس عالم کا کوئی منتظم ہے۔ ازروئے فلسفہ و منطق یہ دلیل بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے عدم کا ثبوت نہیں ہوتا ظلم کا ثبوت ہوتا ہے اور جب ظلم کا ثبوت ہوتا ہے تو ظالم کا خود بخود ثبوت ہو جاتا ہے نعوذ باللہ زیادہ سے زیادہ اس دلیل سے خدا کے ظالم ہونے کا ثبوت ہوتا ہے خدا کے نہ ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا۔ اب یہ ہمارا ذمہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ وہ ظالم نہیں عادل ہے۔

اگر ہم کسی شخص کو اپنا بادشاہ امیر یا حاکم بنا لیتے ہیں اور وہ شخص ظلم پسند ثابت ہوتا ہے تو ظلم ہی کو رواج دے گا۔ دنیا کا سارا نظام اللہ تعالیٰ نے انسان کے سپرد کر دیا ہے۔ اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے یہ خلیفۂ ارضی بادشاہ ربع مسکون ظلم پسند ہے لہٰذا دنیا میں ظلم کا دور دورہ ہے جن لوگوں کے قلوب دولت ایمان سے مالا مال ہیں ان کے لئے اتنا ہی بیان کافی ہے اور جو دولت ایمان سے محروم ہیں ان کے لئے "چون و چرا" کی

بڑی گنجائش ہے اور "یہ کیوں" کا سوال تو ایسا ہے کہ کہیں بھی کسی بھی معاملہ میں ختم نہیں ہوتا بالآخر ایمان کے سامنے ہی سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور بعض باتیں اسرار الٰہی سے ہیں جن کی ہمیں خبر نہیں اور نہ وہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں۔

رسل صاحب! عدل تو دوسری دنیا میں قائم ہو گا جہاں ترازو کھڑی ہے۔ اس دنیا میں نہیں اور اس دنیا میں بھی اس "العدل" کے بہت سے عجیب وغریب عادلانہ شواہد نظر آجاتے ہیں یہ بھی غلط ہے کہ دنیا ظلم سے بھری ہوئی ہے دنیا میں زیادہ تو عدل ہی کا سکہ چلتا ہے اور ظلم ڈھانے والا خدا نہیں ہے ہم ہیں۔ **وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ۔**

اگر اس دنیا سے ایک سیکنڈ کے لئے عدل اٹھ جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ عدل ہی کی وجہ سے یہ اتنا بڑا زمینی و فضائی نظام چل رہا ہے ظلم خال خال ہے دنیا میں جو مظالم ہیں ہم ان کی تصویر پیش کئے دیتے ہیں پھر عدل کی تصویر پیش کریں گے تو آپ کو صاف صاف معلوم ہو جائے گا کہ ظلم خال خال ہے اور دنیا عدل و انصاف سے بھری ہوئی ہے۔

ایک ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے بے قصور لوگوں کو قتل کر کے ناحق ان کا مال لے جاتا ہے یہ کتنا بڑا ظلم ہے ایک چور، خائن، غبن کرنے والا، ناحق بیواؤں، یتیموں اور معصوموں کا مال کھاجاتا ہے وہ دیکھتے رہ جاتے ہیں جیب کترا کسی مسافر کی جیب کاٹ کر اسے مبتلائے مصائب کر دیتا ہے ایک ظالم حاکم رعایا پر ظلم ڈھاتا ہے شوہر بیوی پہ ظلم کرتا ہے رشوت خور بغیر رشوت لئے کام خراب کر دیتا ہے ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو ستاتا ہے ایک دوست دوسرے دوست پر جھوٹا مقدمہ دائر کرتا ہے اور اسے پریشان کر دیتا ہے کوئی شخص کسی کی آبرو ریزی کرتا ہے بے قصور کسی کو مارتا ہے مزدور کا حق نہیں دیتا قرض خواہ کا قرض واپس نہیں کرتا امانت میں خیانت کرتا ہے دھوکا دے کر سودا فروخت کرتا ہے جعلسازی کرتا ہے کوئی استاد شاگرد پر ظلم کرتا ہے کوئی باپ یا سوتیلی ماں اولاد پر ظلم کرتی ہے کوئی بیٹا یا بیٹی یا بہو اپنے بزرگوں کو دکھ دیتے ہیں لوگ ایک دوسرے کو طعن و

تشنیع کرتے ہیں غریب کو ذلیل کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ گالی گلوچ کرتے ہیں بلاوجہ آپس میں جھگڑتے ہیں ناجائز زمین پر قبضہ کرتے ہیں دھوکا دیتے ہیں فریب کرتے ہیں بدلہ لینے میں زیادتی کرتے ہیں حاکم اپنے محکوم کا حق مارتا ہے اس کو ترقی نہیں دیتا اس سے ناجائز خدمت لیتا ہے اس پر زیادہ بوجھ ڈالتا ہے لوگ نوکروں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا برتاؤ کرتے ہیں زبردست زیردست کو مارتا ہے قاتل قتل کرتا اور کسی طرح صاف بچ جاتا ہے گاؤں کا چودھری غریبوں پر ظلم کرتا ہے ملازم آقا کے مال میں خیانت کرتا ہے اغوا کرنے والا کسی کا بچہ اٹھا کر لے جاتا ہے سارے گھر کو روتا چھوڑ جاتا ہے اور خود عیش اڑاتا ہے بردہ فروش عیش کی زندگی گزارتے ہیں غنڈے دندناتے پھرتے ہیں پولیس والے رشوت لے کر مجرموں کی پشت بانی کرتے ہیں۔ ان مظالم سے دنیا بھری پڑی ہے کہ شک ہوتا ہے کوئی اس عالم کا منتظم نہیں ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا اب دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ ساری دنیا عدل سے بھری ہوئی ہے ایک عورت کے رحم میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی کس قدر حفاظت کرتی ہے ہر وقت خیال رکھتی ہے۔ کہ کہیں اسے ضرب نہ پہنچ جائے نو ماہ اپنا خون پانی پلاتی ہے کیونکہ عدل کا یہی تقاضا ہے کہ اس نے ایک مہمان کو دعوت دی۔ پھر جب بچہ پیدا ہونے کو ہوتا ہے تو گھر والے اس کے لئے کپڑے تیار کرتے ہیں۔ دائی کو بلا کر لاتے ہیں زچہ گری کے لوازمات مہیا کرتے ہیں اس کی آمد پر خوش ہوتے ہیں یہ نظام عدل ہے۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے ماں باپ اور عزیز و اقارب اس کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں یہ اس "العادل" کے نظام عدل کا نتیجہ ہے جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اسے کسی اسکول یا کارخانے میں داخل کر دیتے ہیں ادارے کا پورا عملہ اس کا خیال رکھتا ہے اور اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرتا ہے پھر جب یہ بچہ پڑھ کر جوان ہو جاتا ہے تو کہیں ملازم ہو جاتا ہے وہ ادارہ اس کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاو کرتا ہے۔ گھر سے نکلنے اور گھر واپس آنے تک ساری مخلوق اس کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔ بیمار

ہوتا ہے تو ڈاکٹر یا حکیم اس کا تن دہی سے علاج کرتے ہیں بیوی اسکی خدمت کرتی ہے۔ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو بچے اس کی خدمت کرتے ہیں وہ دنیا بھر میں پھرتا ہے کوئی اسے قتل نہیں کرتا لوٹتا نہیں اندھیرے اجالے شہر' شہر' دریاؤں اور پہاڑوں میں مزے سے پھرتا ہے یہ سب کچھ نظام عدل ہی کی بدولت ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو اسے انتہائی احترام کے ساتھ دشمن اور دوست سب مل کر آخری رسومات کے ساتھ رخصت کر دیتے ہیں بادشاہ اپنے شہر کی حفاظت کرتا ہے حاکم اپنی رعایا کا خیال رکھتا ہے گاؤں کے چوہدری گاؤں کے نظام کالحاظ رکھتے ہیں۔ بازاروں میں انصاف ہی انصاف ہے ہر پیشہ ور ہمارے ساتھ انصاف کرتا ہے سواری سے لیکر پیدل تک انصاف ہی انصاف ہے گھر میں ہم اپنے بچوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں دوستوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں پڑوسیوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں الغرض ساری دنیا انصاف سے بھرپور ہے یہ نہ ہوتا تو نظام عالم کبھی کا برباد ہو جاتا۔

میرے ایک دوست کہنے لگے ساری دنیا بدقماشوں سے بھری پڑی ہے اکثریت برے لوگوں کی ہے یہ بات پروفیسر صابر علی خان مرحوم نے کہی تھی۔ وہ بڑے ہی نیک انسان تھے اور نگینہ بیکری میں یہ گفتگو ہو رہی تھی میں نے کہا بالکل غلط اکثریت نیک ہے بتائیے اتنے سارے آدمی اس چائے خانے میں بیٹھے ہیں کیا ہم چور ڈاکو زانی بدمعاش شرابی ہیں رشوت خور ہیں حرام خور ہیں ہم میں کتنے ایسے ہیں معلوم ہوا اکثریت نیک ہے بدخال خال ہیں میری یہ بات سن کر سب خاموش ہو گئے ورنہ سب ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے میں نے کہا یہ سامنے انار کلی بازار سے مخلوق خدا گزر رہی ہے بتاؤ ان میں اکثریت چوروں اور ڈاکوؤں کی ہے یا شرفاء کی؟ ہم انسان ہیں فرشتے نہیں ہیں گناہ کرتے ہیں مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں ہے کہ بقول برٹرینڈرسل دنیا میں ظلم ہی ظلم ہے۔

اس "العادل" نے بڑا زبردست نظام عدل قائم کیا ہے کچھ کو یہاں سزا مل جاتی ہے کچھ کو وہاں! مجرم کو قید' جرمانے' کوڑے' ہاتھ کاٹنے' سنگسار کرنے یا سولی پر لٹکانے کی سزا دیتے ہیں۔ کس لئے یہ سب کچھ اس العادل کے عدل و

انصاف کے تحت ہی ہوتا ہے۔
کہتے ہیں اللہ میاں کی لاٹھی بے آواز ہے اکثر و بیشتر ظالموں کو وہ ایسی سزائیں دیتا ہے کہ مخلوق اگرچہ ان سزاؤں کا احساس نہیں کرتی مگر وہ تو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمارے کیئے کی سزا مل رہی ہے اور ہم عدل کی گرفت میں آگئے ایک یہ کہ ان کے ضمیر میں ایک ایسی خلش ہر وقت رہتی ہے جو کسی طرح ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ طرح طرح سے دل بہلاتے ہیں مگر دل کسی طرح نہیں بہلتا۔ یہ بھی ایک قسم کا عذاب الٰہی ہے۔
ایک تاجر ساری عمر غلط طور پر تجارت کر کے پیسے جمع کرتا رہتا ہے کسی دن دکان میں آگ لگ جاتی ہے یا چور دکان صاف کر جاتا ہے یہ شخص خوب سمجھتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور اکثر لوگ بھی جان جاتے ہیں کہ یہ اس کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے چور اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایسا کر بیٹھتا ہے پولیس اسے پکڑ کر مارتی پیٹتی ہے اور مال برآمد کر لیتی ہے۔ ایسا نظام عدل ہی کے تحت ہوا۔ پولیس مسروقہ مال میں سے کچھ کھا جاتی ہے یا اس کے بچے اس مال کو کھا کر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسا کس لئے ہوا اس ''العادل'' کے نظام عدل کے تحت ہوا۔ لوگ نہیں سمجھتے تو کیا کیا جائے زلزلے' طوفان' وبائیں' بلائیں بڑے بڑے ظالموں سے انتقام لے لیتی ہیں وہ بستی جہاں ظلم ہو رہا ہو اور لوگ ظالم کو نہ روکیں وہ پوری بستی بھی ظالم ہوتی ہے اکثر کارہائے خداوندی خفیہ ہیں کہ لوگوں کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟
اگر ہم ایک زمین خریدتے ہیں اور اس میں مکان بناتے ہیں تو چونکہ ہم اس زمین کے مالک ہیں ہمیں پورا پورا اختیار ہے کہ ہم اس زمین میں جہاں چاہیں پاخانہ اور جہاں چاہیں اپنی صاف ستھری بیٹھک بنائیں زمین کو کسی طرح یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ یہ تو ظلم ہے۔ کیونکہ ظلم وہ ہے جو غیر کی ملکیت میں ہو مولیٰ تعالیٰ مالک الملک ہے انہوں نے جیسے چاہا کر دیا ان کی طرف ظلم کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔
یہ دنیا جیسی بھی اس نے بنائی ہے اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کوئی فلسفی اس سے بہتر دنیا کا خاکہ پیش کر کے تو دکھائے؟ خیر و شر' نور و ظلمت اور عدل و ظلم ہی سے رونق عالم ہے اگر عدل ہی عدل ہوتا تو یہ دارو گیر' دوڑ بھاگ' پکڑ دھکڑ' گہما گہمی' کیسے ہوتی؟ میرا ایک تارک الدنیا صوفی دوست بڑے تعجب و افسوس کے ساتھ کہنے لگا۔ صارم صاحب! یہ دنیا والے کیوں اس قدر گناہ کرتے ہیں میں نے کہا صوفی صاحب اگر سارے آپ جیسے ہو جائیں! تو رونق عالم ہی ختم ہو جائے۔ نہ وکیل نہ عدالت نہ پولیس نہ جرم و سزا کچھ بھی نہ ہو رونق عالم مقدس لوگوں سے نہین ہے شریروں سے ہے سارے آپ جیسے ہوتے تو یہ سینما گھر ہوتے نہ شراب خانے نہ قحبہ خانے نہ رقص و سرود کی محفلیں نہ جوھریوں کی دکانیں نہ زیب و زینت کے اسباب نہ تالے اور تالوں کے کارخانے اور دکانیں وغیرہ الغرض کچھ بھی تو نہ ہوتا جہاں عقل نہیں ہے وہاں عدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر عالم کے احکام جدا گانہ ہیں بس اس نے جیسے بھی یہ عالم بنا دیا ہے ٹھیک ہی ہے وہ بہتر سمجھتا ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔

کہتے ہیں میدان حشر میں اللہ تعالیٰ حساب و کتاب لینے بیٹھے تو ان کے سامنے مختلف لوگ پیش کئے گئے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا تم دنیا میں کیا کیا کرتے تھے؟ کسی نے کہا میں آرٹسٹ تھا۔ اچھی اچھی تصویریں بنایا کرتا تھا کسی نے جواب دیا میں گلوکار تھا تیری مخلوق کو اچھے اچھے گانے سنایا کرتا تھا شدہ شدہ سردار جی کی باری بھی آہی گئی۔ اللہ میاں نے ان سے بھی دریافت کیا تمہارا کیا مشغلہ رہا؟ بولے پہلے تسی دسو تسی کی کردے او۔ فرمایا ہم بندے بناتے ہیں! سردار جی نے غصے اور تمسخر کی ہنسی ہنستے ہوئے اور اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ایسے بندے بناتا ہے ایسے بندے بناتا ہے بندے بناتا ہوں ہم بندے بناتے ہیں یہ بندے بناتا ہے بندے ایسے ہوتے ہیں؟

سردار جی نے نہ تو فن کاروں کی طرف دیکھا نہ گلوکاروں کی نہ فلم سازوں کی نہ قلم کاروں کی طرف۔ دیکھا تو صرف اپنی طرف دیکھا یہ نہ دیکھا کہ باقی بندے تو بڑے اچھے ذوق و شوق سے بنائے ہیں۔ سردار جی نے اپنے برابر

کھڑے باکمال لوگوں اور حسینوں کو تو نہ دیکھا صرف اپنی طرف دیکھا اور تصویر کے ایک ہی رخ کو دیکھا اسی طرح رسل صاحب نے تاریک پہلو کو دیکھا روشن پہلو کو نہ دیکھا رونق عالم ظالموں شریروں اور بدمعاشوں ہی سے ہے عادلوں اور متقی پرہیز گاروں سے نہیں ہے ان کا وجود بھی ضروری تھا اور عدل کے ساتھ ظلم کی پیدائش بھی ضروری تھی۔

*

اَلْعَزِیْزُ جل جلالہ

روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی انگشتری پر یہ عبارت کندہ تھی۔ **یا غالبی حسبک من غالب ارحم علی ابن ابی طالب** اے مجھ پر غالب تو میرے لئے کافی ہے۔ علی ابن ابی طالب پر رحم فرما۔

حق یہ ہے کہ عزت و غلبہ اسی "العزیز" کے لئے ہے وہ جسے چاہے عزیز کر دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔

(ترجمہ آیات قرآن)

آپ کہہ دیجئے اے اللہ مالک الملک تو جسے چاہتا ہے ملکیت و حکومت دے دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے اور جسے چاہے غلبہ و عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے **بعینہہ** یہی درس بائبل مقدس میں ہے۔ مبدائے وحی جو ایک ٹھہرا۔ اس کے بارے میں یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ گرجا میں گیا وہاں پادری مذکورہ بالا درس پڑھ رہے تھے اسے غصہ آگیا اور کہا اچھا گرجوں میں ایسے باغیانہ درس پڑھے جاتے ہیں یہ کہنا تھا کہ اسے وہیں نیند آگئی خواب میں دیکھا کہ اس کے تخت پر ایک بندر بٹھا دیا گیا ہے جو ہر وقت چڑچڑ کرتا رہتا ہے آنکھ کھلی تو اس نے توبہ کی اور کہا سچ ہے غلبہ و عزت اللہ ہی کے ہاتھوں میں ہے وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام جنہوں نے اللہ سے یہ دعا مانگی تھی کہ مجھے ایسی سلطنت دے جو کبھی کسی کو میسر نہ ہو ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور انہیں جن وانس و حوش و طیور اور ابرو ہوا پر حکومت عطا کی گئی پھر عتاب الٰہی نازل ہوا اور سلطنت چھین لی گئی اور ان کے تخت پر انکی صورت کا ایک فرشتہ بٹھا دیا گیا۔ وہ لوگوں سے کہتے پھرتے کہ میں سلیمان بن داؤد ہوں تو لوگ ان کا مذاق اڑاتے پھر

انہوں نے توبہ کی اور پھر اللہ نے انہیں غلبہ و عزت عطا کی۔
سلیمان علیہ السلام یکتائے دہر بادشاہ کا یہ حال ہو تو یہ محدود سلطنت و اختیار رکھنے والے بادشاہ اور حاکم کس زمرے میں ہیں؟ منٹوں میں وہ غالب کو مغلوب اور مغلوب کو غالب کر دیتا ہے۔ بڑے بڑے تاج دار جو کوس "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ" بجاتے تھے دربدر مارے مارے پھرے خود حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے شہر بیت المقدس میں پکارتے پھرتے تھے کہ میں سلیمان بن داود ہوں اور لوگ ان پر ہنستے تھے۔
تفسیر عثمانی میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس قصہ کو اس بے سروپا اسرائیلی قصوں میں شمار کیا ہے جن کو مفسرین اپنی تفاسیر میں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ گو تفسیر قرطبی ص ۱۳۰ ج ۱۵ اور تفسیر ابن کثیر ص ۳۶ ج ۴ عربی' میں یہ قصہ موجود ہے۔ مگر یہ تفسیر درست نہیں ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)
علامہ آلوسیؒ بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں اس قصے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ان ھذہ المقالتہ من اوضاع الیھود و زنادقتہ السو فسطائیتہ ولا ینبغی لعاقل ان یعتقد ضحتہ ما فیھا" ص ۲۹۳ ج ۱۲
غالب نے ایک شعر نواب تجمل حسین خاں کے بارے میں کہا ہے۔

؎ دیا ہے اوروں کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش، تجمل حسین خاں کے لئے

ذرا اس شعر کی گہرائی و گیرائی پر غور کیجئے مرزا غالب جیسا عیش پرست انسان کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیش کی تخلیق صرف نواب تجمل حسین خان کے لئے کی ہے اور دوسروں کو تو اس لئے عیش سے کچھ حصہ دے دیا ہے تاکہ تجمل حسین خاں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔
نواب تجمل حسین خاں کی ریاست انگریزوں نے بغاوت کے الزام میں ضبط کر لی تھی تو وہ جان بچا کر کربلائے معلیٰ پہنچ گئے کہتے ہیں کہ وہاں ایک دن

خیرات تقسیم ہو رہی تھی تو خیرات لینے والوں میں ایک ہاتھ تجمل حسین خان کا بھی تھا۔

غلبہ و عزت تو اسی "العزیز" کے لئے ہے جسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ انسان کو چاہیئے کہ غضب الہٰی سے ڈرتا رہے وہ منٹوں میں غلبہ و عزت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو جا پڑا — یکسروہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا کہ دیکھ کر چل او راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

اللہ تعالیٰ نے اگر تمہیں اپنے گاؤں، بستی، محلے یا شہر میں غلبہ و عزت عطا کیا ہے تو مغرور نہ ہو جاؤ۔ اس غلبہ و عزت کو مخلوق خدا کے کام میں لاؤ۔

دارا جمشید۔ سکندر۔ چنگیز۔ بابر۔ تیمور۔ ہٹلر اور نپولین کہاں گئے؟ اور ان کا کیا انجام ہوا خدا نے تمہیں غلبہ و عزت مخلوق کے ستانے کے لئے نہیں دی۔

ہم نے دیکھے ہیں زمانے میں بہت سے انقلاب
اہل دولت سے کہو اتنا نہ اترایا کریں

مغرور انسان سے اللہ تعالیٰ غلبہ و عزت چھین لیتا ہے۔

نازِ نیرنگ پر — اے ابلقِ ایام نہ کر
نہ رہے گی یہ سپیدی یہ سیاہی تیری

نیرنگی ایام و غضب العزیز سے غافل نہ رہو

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

غزوہ بدر و احد و خندق و حنین و تبوک وغیرہ میں اس "العزیز" ہی نے مسلمانوں کو غلبہ و عزت سے سرفراز کیا تھا۔ ایران و عراق۔ شام و مصر۔ فلسطین وا سپین میں بھی اسی "العزیز" نے مسلمانوں کو غالب کیا تھا۔ ورنہ مسلمانوں کے پاس کیا دھرا تھا قریب کی مثال ہی دیکھ لیجئے۔ قائداعظم کے خلاف ہندو سکھ اور انگریز تین طاقتیں سرگرم عمل تھیں مگر اس "العزیز" نے مٹھی بھر مسلمانوں کو سب پر غالب کر دیا۔ اور پاکستان وجود میں آگیا۔

وہ تو وہ اس کے نیک بندوں میں یہ طاقت ہے کہ وہ ممولے کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں سکینۃ الاولیاء میں شاہزادہ داراشکوہ میاں میر کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ایک باز نے ایک فاختہ پر حملہ کیا آپ نے توجہ ڈالی تو اس فاختہ نے باز کو شکار کر لیا۔

اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کون وہ فرماتا ہے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ "تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو" اب جو مسلمان جہاں کہیں بھی مغلوب ہیں وہ اس آیت پر غور کر کے اپنے گریبان میں نظر ڈالیں کہ ایسا کیوں ہے؟

اس دور میں عالم اسلام کی چھوٹی بڑی سلطنتیں روس یا امریکہ کی محکوم ہیں تو ایسا کیوں ہے معلوم ہوا ہم لوگ مومن نہیں ہیں البتہ مسلمان ہیں۔ ترجمہ آیات قرآن :۔ "بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرما دیجئے تم یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے البتہ یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم داخل اسلام ہو گئے کیونکہ ایمان تو ابھی تک تمہارے قلوب میں داخل ہی نہیں ہوا۔

سو ایسا ہی حال اس دور کے مسلمانوں کا ہے کہ وہ بلاشبہ مسلمان تو ہیں مگر مومن نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ذلیل و خوار ہیں کبھی امریکہ کی کاسہ لیسی کرتے ہیں کبھی روس کی کبھی چین سے دوستی کرتے ہیں اور کبھی ہندوستان سے کہیں جاپان کے مقروض ہیں تو کہیں فرانس کے۔ دنیا بھر میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں اور کافروں کے آگے پیچھے پھرتے ہیں کیونکہ وہ اس "العزیز" کو بھولے ہوئے ہیں جو غلبہ و قوت کا سرچشمہ ہے۔

؎ عزیز یکہ ہر کز درش سرتافت
بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

"وہ ہر چیز پہ ایسا غالب ہے کہ جس نے اس کے دروازے سے سر پھیرا' وہ جس دروازے پر بھی پہنچا عزت سے محروم ہی رہا"

العظیم جل جلالہٗ

ہم ایک ایسا بادشاہ فرض کیے لیتے ہیں جو ساری دنیا کا مالک ہو اور صاحب عظمت و سطوت ہو لیکن اگر اس کی سلطنت زائل ہو جائے تو اس کی عظمت ختم ہو جائے گی معلوم ہوا وہ بذات خود عظیم نہ تھا اس کی عظمت کسی دوسری چیز کی مرہون منت تھی اس کی عظمت سلطنت کی وجہ سے تھی۔ لہٰذا جب سلطنت زائل ہو گئی تو اس کی عظمت بھی زائل ہو گئی۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملیں گے کہ شاہان وقت کی سلطنت کسی دشمن نے چھین لی تو وہ ذلیل و برباد ہو گئے۔ قید خانوں میں گل سڑ کر مر گئے اور کسی نے بھی ان کی تعظیم نہ کی۔ بہادر شاہ ظفر رنگون میں اسیری کی زندگی گزار کر مر گئے۔ کیونکہ انگریز نے ان کی سلطنت چھین لی تھی۔

جب بادشاہوں کا یہ حال ہے تو ہماشما کی عظمت کا کیا حال ہو گا؟ دراصل حقیقی عظمت کا مالک وہی "العظیم" ہے اس کے سوا کوئی بھی "العظیم" نہیں سب کی عظمتیں اضافی اور غیر حقیقی ہیں حقیقی عظمت کا مالک وہی حقیقی "العظیم" ہے یہ دنیا رہے یا نہ رہے اس کی عظمت میں فرق نہیں پڑتا وہ اس کائنات سے پہلے بھی "العظیم" تھا اور اس کائنات کے بعد بھی "العظیم" ہی رہے گا۔

اس کی عظمت کسی وصف وصفت کی مرہون منت نہیں ہے وہ خالق کائنات ہونے کی وجہ سے عظیم نہیں ہے اگر خالق کائنات نہ ہوتا تب بھی وہ عظیم ہوتا عظمت اس کا جوہر ذاتی ہے صفاتی نہیں۔ اسی طرح وہ کوئی رازق ہونے کی وجہ سے عظیم نہیں ہے۔ اگر رازق نہ ہوتا تب بھی وہ عظیم ہی ہوتا۔ یہی حال بقیہ اوصاف الٰہی کا ہے کہ اگرچہ یہ اوصاف اس کے اندر ہیں اگر نہ بھی ہوتے تب بھی وہ بلاشبہ عظیم ہی ہوتا۔

حقیقی عظمت صرف اسی کی ذات کے لئے ہے مگر جس طرح اس نے اپنے اوصاف سے مخلوق کو نوازا ہے اس صفت سے بھی مخلوق کو سرفراز کیا ہے اور طرح طرح کی عظمتیں پیدا کر دی ہیں۔ ایک تخت و تاج کی عظمت ہے ایک جاہ و منزلت کی عظمت ہے مگر جب یہ تخت و کرسی صاحب جاہ کے نیچے سے نکال لی جاتی ہے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ جب تک ایک انسان وزیر' افسر اور کمشنر وغیرہ رہتا ہے۔ سب اسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں اور جب کرسی اس کے نیچے سے سرک جاتی ہے تو کوئی بھی نہیں پوچھتا کیونکہ اس کی عظمت کرسی سے تھی وہ ختم تو یہ بھی ختم۔ ذاتی عظمت نہ تھی لہٰذا ختم ہو گئی۔

کسی کو اس نے مالی عظمت سے نوازا ہے اس کے ملازم اس کے دوست احباب اس کے مال کی وجہ سے اس کی تعظیم کرتے ہیں اس کی جاہ و منزلت کی وجہ سے نہیں کیونکہ وہ کہیں کا کوئی افسر نہیں صرف چار پیسے کا مالک ہو گیا ہے تو لوگ اس کی عزت کرنے لگے ہیں۔ مگر جب دولت اس سے چھین لی جاتی ہے تو سب اس کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں دوست احباب آنکھیں چرانے لگتے ہیں عزیز و اقارب مذاق اڑاتے ہیں اور وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔

کسی کو شہرت کی عظمت سے نوازا ہے دور دور اس کی شہرت ہوتی ہے۔ اور گھر گھر اس کا ذکر ہوتا ہے لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔ اسے ایک اچھا انسان سمجھتے ہیں۔ اس کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں۔ عزیز و اقارب اس کی شہرت پر فخر کرتے ہیں وہ اپنی بستی یا اپنے ملک کے لئے باعث فخر ہوتا ہے مگر کبھی اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے جو اس کی شہرت کو ملیا میٹ کر دیتی ہے تو وہی لوگ جو اس کی عزت کرتے تھے اسے ذلیل کرنے لگتے ہیں اس پر ہنستے ہیں اور **پھبتیاں** کستے ہیں کیونکہ اس کی عظمت ذاتی نہ تھی بالغیر تھی شہرت کے طفیل تھی وہ زائل تو یہ بھی زائل۔

بعض کو اس نے اولاد کی عظمت سے نوازا ہے کہ لوگ اس پر رشک کرتے ہیں وہ کثیر الاولاد ہوتا ہے اس کی اولاد تندرست نیک اور قابل ہوتی ہے اس کا گھر اولاد کی عظمت سے جگمگاتا ہے مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایسے شخص کی

ساری ہی اولاد مر گئی تو لوگ اسے اوت کہنے لگے حضرت ایوب علیہ السلام کے شاید بائیس بیٹے تھے سب کے سب چھت کے نیچے دب کر مر گئے مال و منال ختم ہو گیا تو بستی والے ان سے نفرت کرنے لگے کیونکہ باعث عظمت چیز چھن چکی تھی حقیقی عظمت تو اس "العظیم" ہی کے لئے ہے۔

کسی کو طاقت و قوت جسمانی کی عظمت سے نوازا ہے لوگ اپنے پہلوانوں کی عزت کرتے ہیں اور جب وہ ہر جگہ مار کھانے لگتے ہیں تو لوگ ان پر ہنسنے لگتے ہیں جو ذات سرچشمہ طاقت ہے حقیقی عظمت اسی کے لئے ہے۔

کسی کو عظمت علم عطا کی ہے وہ بے زر بے کرسی اور بے اولاد ہی کیوں نہ ہو لوگ بہر حال اس کی عزت کرتے ہیں اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کے علم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں مگر کتنے ہی اہل علم ہم نے ایسے دیکھے ہیں کہ وہ بوڑھے ہو کر حواس باختہ پاگل ہو گئے تو بچے ان پر اینٹیں برسانے لگے کیونکہ وہ "**ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا**" کا مصداق بن چکے تھے پنجاب یونیورسٹی کے ایک کالج کے مشہور پرنسپل ملک کے مایہ ناز فرزند کو جس کے لاکھوں شاگرد تھے میں نے ایسی حالت میں دیکھا کہ وہ سڑک کے کنارے ایک دکان کے پھٹے پر بیٹھا تھا بچے اسے چھیڑ رہے تھے اور کنکریاں مار رہے تھے ایسا کیوں ہوا اس لئے کہ اس کی عظمت علم کی مرہون منت تھی جب علم زائل ہو گیا تو وہ صرف حیوان ناطق رہ گیا اور بچوں کی عادت ہے کہ وہ حیوانوں پر پتھر برساتے ہیں حقیقی عظمت تو اسی **عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ** کے لئے ہے جس کا علم زوال پذیر نہیں اور جس کے علم سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں جس نے انسانوں کو اقراء کا سبق دیا اور جس نے بیان و گویائی بخشی ہے۔

کسی کو عظمت حسب و نسب عطا کی ہے کوئی اپنے لباس کی وجہ سے محترم ہے کوئی کوٹھی اور کار کی وجہ سے تو کوئی اپنے زیورات اور حسن و جمال کی وجہ سے کسی کی عظمت دکان سے وابستہ ہے کسی کی فیکٹری سے کسی کی فن میں طاق ہونے کی وجہ سے کسی کی حسن زبان و بیان سے کسی کی ذہانت و فطانت سے مگر یہ ساری عظمتیں فانی اور زوال پذیر ہیں اور ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتیں کیونکہ ان

میں مدوجزر ہوتا رہتا ہے حقیقی عظمت تو اسی کے لئے ہے جو "لم یزل ولایزال" ہے۔ خواہ وہ عظمت شاہی ہو' جاہی ہو' مالی ہو' اولادی ہو' فنی ہو' علمی ہو' ہر عظمت صاحب عظمت کے لئے ایک جیسی نہیں رہتی۔ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے فانی اور بالغیر تو ہے ہی استوار بھی نہیں ہے مدوجزر کا شکار رہتی ہے۔ بگڑتی اور بنتی رہتی ہے ہم اس پر ساری عمر لیپ چڑھاتے رہتے ہیں جیسے کچی دیوار پر ہر موسم بادو باراں کے بعد مٹی تھوپنی پڑتی ہے مدوجزر سے پاک اس "العظیم" کی عظمت ہے کیونکہ وہ ذاتی و حقیقی عظمت والا ہے مدوجزر غیر کی وجہ سے ہوتا ہے اور کسی غیر کا وہاں کوئی دخل نہیں۔

اس "العظیم" نے بہت سی عظیم چیزیں پیدا کر دی ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے چاند' سورج' ستارے' افلاک' زمین' پہاڑ' سمندر' دریا اور دیوہیکل جانور اس کی صفت عظمت کے مظاہر ہیں۔ عظیم ملائکہ و جنات پیدا کئے اور ان سب سے بڑھکر عظیم انسان کو بنایا۔ عظمت انسان کے سامنے ہر عظمت ہیچ ہے اور اس کی عظمت کے سامنے ساری مخلوق سربہ سجود ہے خواہ وہ بظاہر اس سے کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو ارض و سما' پہاڑ اور دریا' گینڈے اور ہاتھی سب اس کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ عظیم انسانوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

اگر کوئی انسان اپنی عظمت انسانی کا خیال رکھتا ہے تو وہ ایک عظیم انسان بن جاتا ہے ورنہ معمولی انسان رہتا ہے۔

؎ ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا وُ خلق — باشد بقدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

پھر جو شخص جس قدر اپنی عظمت کو نگاہ میں رکھتا ہے اسی قدر وہ عظیم ہوتا ہے مگر عظمت و تکبر میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ ہلاکت ہے۔ پاس عظمت اچھی خصلت ہے اور تکبر بدترین عادت ہے ان دونوں میں بال سے باریک فرق ہے۔

؎ تکبر مکن زینہار اے پسر
کہ روزے زدستش در آئی بسر

اے بیٹے تکبر ہرگز نہ کرو کیونکہ اس کی وجہ سے ایک دن تم سر کے بل گرو گے۔

عظمت انسانی کو ملحوظ رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان دوسروں کو ذلیل سمجھنے لگے بلکہ اپنے آپ کو کتے سے بھی زیادہ ذلیل سمجھے۔ عظمت انسانی یہ ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے عظمت انسانی کو ٹھیس لگے۔ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے دوسروں کی نگاہ میں ذلیل ٹھہرے بلکہ ایسی بھی کوئی بات نہ کرے جس سے خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے اور اس کا ضمیر کہے کہ تم ایک گھٹیا انسان ہو۔

بہت سے ایسے عظیم انسان جو بڑے عظیم تھے جب انہوں نے اپنی عظمت کا پاس لحاظ چھوڑ دیا تو وہ ذلیل ہو گئے اور بہت سے غیر عظیم انسان پاس عظمت کرنے سے عظیم بن گئے حضرت فضیل بن عیاضؒ جب تک ڈاکوؤں کے سردار رہے ذلیل و خوار رہے مگر جب انہوں نے عظمت انسانی کو پہچانا تو صاحب سلسلہ بزرگ بن گئے۔ ایسے بزرگ کہ سرداران جہاں ان سے ملنے کی تمنا کرتے تھے اور ان کے سامنے دوزانو بیٹھتے تھے حضرت جنید بغدادیؒ نے عظمت انسانی کو قائم رکھا تو سلاطین وقت ان کے در دولت پر حاضر ہوتے۔

بنو اسرائیل میں ایک عابد و زاہد شخص ساری عمر عبادت کرتا رہا بستی والے اس کا بڑا احترام کرتے تھے جب عظمت انسانی کو بھول بیٹھا اور تکبر کا جامہ پہنا تو قوم نے اسے تختہ دار پر چڑھا دیا۔

اس دور کے انسان نے عظمت انسانی کا پاس لحاظ چھوڑ دیا خصوصاً متمدن اقوام نے کہ شب و روز عظمت انسانی کو پس پشت ڈال کر عظمت مال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لہٰذا اخلاق سیئہ میں مبتلا ہیں۔ یہ حال ہو گیا ہے کہ جب بھی کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو محکمہ متعلقہ میں درخواست لے کر پہنچ جاتی ہے کہ میں بے آسرا ہوں صاحب اولاد ہوں مجھے پیشہ کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ بچوں کا پیٹ پال سکوں۔ ہر شخص پیسے کی خاطر ذلیل کام کر گزرتا ہے اسی لئے چوری، ڈکیتی اور چھینا جھپٹی کا رواج ہو گیا ہے جہاں بھی کسی کو موقع مل جاتا ہے

ہاتھ مارنے سے نہیں چوکتا۔ تعلیم اور تہذیب و تمدن ترقی ہے مگر عظمت انسانی روز بروز تنزل پر ہے۔

انفرادی و شخصی اعتبار سے تو یہ حال ہے قومی و ملکی سطح پر تو بالکل ہی دیوالیہ نکل گیا ہے کہ ہر قوم صرف اپنی حد تک عظمت انسانی کا خیال رکھتی ہے مگر دوسری اقوام کو انسان ہی نہیں سمجھتی ہر قوم دوسری قوم کا خون چوسنا چاہتی ہے کیونکہ انہیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ یہ بھی ہم جیسے ہی انسان ہیں۔ ایک دوسرے کی زمین، دریاؤں، معادن اور پہاڑوں کو ہڑپ کر جانا چاہتی ہے اور دھوکا دہی، جھوٹ، فریب یا جنگ سے ان کی دولت کو سمیٹ لینا چاہتی ہے جس طرح انفرادی زندگی میں ایسی حرکتیں باعث بدامنی ہیں قومی و ملکی سطح پر بھی یہی بری عادت بے چینی اور بدامنی پھیلا رہی ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ انسان اپنی عظمت کو اس لئے بھول چکا ہے کہ وہ اس "العظیم" کو بھول چکا ہے جس نے اسے عظمت سے نوازا تھا جب بڑا ہی نہ رہا تو بچے لڑیں گے ہی۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

*

العفو جل جلالہ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں متعدد جگہ آیا ہے کہیں عفو اور کہیں عفوا سترھویں پارے کے پندرھویں رکوع میں عفو آیا ہے "بے شک اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔" بعینہ اسی طرح اٹھائیسویں پارے کے پہلے رکوع میں بھی آیا ہے پانچویں پارے کے چوتھے رکوع میں عفو آیا ہے بے شک اللہ عفو غفور ہے۔ بعینہ یہ آیت گیارھویں پارے کے پانچویں رکوع میں بھی آئی ہے۔ چھٹے پارے کے پہلے رکوع میں ہے۔ "بے شک اللہ معاف کر دینے والا قدرت والا ہے"۔

اس کے افعال بکثرت قرآن میں آئے ہیں۔ پہلے پارے کے چھٹے رکوع میں ہے "پھر ہم نے اس کے بعد تمہیں معاف کردیا تاکہ تم شکر کرو۔" پانچویں پارے کے پہلے رکوع میں ہے۔ **فَعَفَوْنَا عَنْ ذَالِکَ** "ہم نے اس سے درگزر کی" بعینہ یہی الفاظ چھٹے پارے کے دوسرے رکوع میں ہیں۔ "انھوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ حالانکہ ان کے پاس اس سے پہلے آیات بینات آچکی تھیں تو ہم نے اس سے درگزر کی۔"

عفیٰ چھ جگہ آیا ہے "اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے انھیں کیوں اجازت دی۔" "جس نے معاف کیا اور اصلاح کی" عفو دو جگہ آیا ہے اور عفوا بھی دو جگہ آیا ہے عفیٰ ایک جگہ اور **وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی** تین جگہ اور اگر معاف کرو تو یہ قرین تقوی ہے۔

دراصل عفو کے معنی مٹ جانے کے ہیں چنانچہ عربی جاہلی شاعر کہتا ہے۔
عفت الدیار محلھا فمقامھا مٹ گئے محبوبہ کے جائے نزول و قیام کے نشانات۔

عفو کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ **اعفو اللحی واخفو الشوارب** داڑھیوں کو چھوڑ دو اور مونچھوں کو پست کرو۔

اصطلاحِ اخلاق میں کسی کی غلطی سے درگزر کرنے کو عفو کہتے ہیں۔ گویا معاف کر دینے والا اس کی غلطی کو مٹا ڈالتا ہے یا اسے چھوڑ دیتا ہے گرفت نہیں کرتا درگزر کرتا ہے۔

عربی میں عفو اور صفح یہ دو لفظ درگزر کرنے کے لئے آتے ہیں مگر ان دونوں میں فرق ہے عفو معاف کر دینے کے لئے ہے اور صفح بھی معاف کر دینے کے لئے ہے مگر یہ عفو سے بھی زیادہ بلیغ ہے یعنی اس طرح معاف کر دینا کہ بالکل بھول ہی جانا کہ کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہوئی۔ چنانچہ جاہلی شاعر کہتا ہے۔

صفحنا عن بنی ذهل وقلنا القوم اخوان

ہم نے بنو ذہل سے درگزر کی اور کہا یہ تو ہمارے بھائی ہیں۔ اسی لئے قرآن شریف میں آیا ہے **فَاعْفُوْ وَاصْفَحُوْا** یعنی فاعفو کے بعد واصفحو آیا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ نہ صرف معاف کر دو بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھاؤ کہ بالکل بھول ہی جاؤ کہ جرم ہوا ہے ایک دوسری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں **فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْل** خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو۔

چونکہ اس کی ذات "العفو" ہے لہٰذا وہ دوسروں سے بھی معافی کا مطالبہ کرتا ہے کہ مجرم کو معاف کرو کہ یہ قرین تقوی ہے کیونکہ بدلہ لینے میں زیادتی کا احتمال ہے اور بدلہ نہ لینے میں زیادتی کا کوئی امکان نہیں اس لئے معافی انتقام سے بہتر ہے اگرچہ اس کی اجازت دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ظلم کرے تو اس پر اسی قدر ظلم ڈھا سکتے ہو چنانچہ فرمایا **جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا** برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے اور فرمایا **وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِه** اور اگر سزا دو تو ایسی ہی سزا دو جیسی تمہیں دی گئی۔

اسلام نے انتقام لینے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ وہ "العفو" المنتقم بھی ہے مگر معاف کر دینے کو افضل قرار دیا ہے کیونکہ وہ المنتقم رحمان ورحیم و روف و "العفو" بھی ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے لہٰذا اس نے معافی کو افضل قرار دیا ہے۔

اسی جیسا ایک لفظ قران شریف میں ایک جگہ آیا ہے مگر حرکات و سکنات میں اس سے مختلف ہے "دریافت کرتے ہیں آپ سے اے رسولؐ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے۔ عفو۔

عربی میں عفو اس مال کو کہتے ہیں جو اپنی ضرورت سے زیادہ ہو صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ ہم راہ خدا میں کیا دیں؟ تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ جو کچھ تمہاری ضروت سے زیادہ ہو وہ راہ خدا میں دے دو۔ اسی لئے صوفیہ" اس آیت کی بناء پر ضرورت سے زیادہ کسی چیز کو اپنے پاس نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک ضرورت سے زیادہ چیز رکھنا اور جمع کرنا حرام ہے مثلاً" اگر چار روٹیاں ہیں اور دو کھا سکے تو اگلے دن کے لئے دو کو بچا کر رکھنا حرام ہے۔ انہیں راہ خدا میں کسی کو دے دینا چاہیے۔

ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اگلے دن کے لئے روٹی بچا کر رکھ دی تو آپ نے فرمایا۔

اَنْفِقْ یَا بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالاً۔ اے بلال خرچ کر دے خدا سے قلت کا خوف نہ کر۔

اس طرح حدیث سے قرآن کے مذکورہ بالا معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔

"العفو" کے مفسرین نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ کہہ دو فقیر سائل سے کہ معاف کرو۔ یعنی اگر کچھ نہیں دے سکتے تو کم از کم یہ کہدیا کرو کہ معاف کرو اسی معنی کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ اگر سائل کو کچھ نہیں دے سکتے تو کہہ دیتے ہیں بابا معاف کر۔ بہر حال یہ بھی اچھے معنی ہیں اور یہ بھی قرآنی حکم ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ سخاوت تو نہیں شرافت وغیرہ یا حسن خلق کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔ اس میں صرف ٹکے کی زبان ہلانی پڑتی ہے تو ایسا ضرور کرنا چاہئے۔

تخلقوا باخلاق اللہ خلق الٰہی اختیار کرو۔ جو اخلاق الٰہی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور اسی کے لئے زیبا ہیں ان کے علاوہ اخلاق الٰہی کو اپنانا کمال آدمیت ہے۔ جن اخلاق الٰہی کے اتباع کا اس نے ہمیں حکم دیا ہے ہمیں

چاہیئے کہ انہیں اپنانے کی کوشش کریں اور جن سے اس نے روک دیا ہے ان سے باز رہیں جیسے "التکبر" وغیرہ۔

معاف کر دینا اس "العفو" کو پسند ہے لہٰذا نیک بندوں نے اپنا شعار بنایا اور بڑے سے بڑے دشمنوں کو معاف کیا اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ "کفار کے ساتھ حسن خلق کے ساتھ مجادلہ کرو" فَاِذَاالَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ "اسکا یہ نتیجہ ہو گا کہ آپ کا دشمن مخلص دوست بن جائے گا"۔

حضرت امام زین العابدینؒ کے بارے میں روایت ہے کہ گرم گرم سالن کا طباق غلام سے ان کے اوپر گر گیا اس نے کہا وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ "اللہ غصہ ضبط کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" آپ نے یہ سنا تو اسے کچھ نہ کہا۔ پھر اس نے پڑھا وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ "اور لوگوں کو معاف کر دینے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے" یہ سنا تو فرمایا جا میں نے تجھے معاف کیا۔ اس نے پڑھا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ "اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔ یہ سنا تو فرمایا جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ اللہ! اللہ! آل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کتنا بلند کردار تھا۔

حضور نے اس شخص کو معاف کر دیا تھا جو قتل کرنا چاہتا تھا اور سارے اہل مکہ کو مژدۂ عفو سنا دیا تھا وہ کفار مکہ جنھوں نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور وطن سے باہر بھی تعاقب کرتے رہے لڑائیاں لڑتے رہے اور آپ کے چچا حمزہؓ، عزیز و اقارب و اصحابؓ کو شہید کرتے رہے۔

اہل عرب میں حضرت امیر معاویہؓ اور اَحْنَف بِنْ قَیْس ؓ معاف کرنے اور درگزر کرنے میں بڑے مشہور تھے احنفؓ کے سامنے اس کے بیٹے کے قاتل کو لوگ پکڑ کر لائے تو کہا اسے چھوڑ دو۔ اسے تکلیف ہو رہی ہو گی۔ بادشاہوں کے حوصلے بڑے بلند ہوتے ہیں تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ بادشاہوں نے بڑے بڑے سرکش باغیوں کو جو برسوں برسرپیکار رہے قابو پانے پر معاف کر دیا۔

اگر کوئی مجرم معافی مانگتا ہے تو ارباب مروت کے نزدیک اور علم اخلاق کے اعتبار سے اسے معاف کر دینا تقریباً فرض ہو جاتا ہے۔

العلیم جل جلالہ

ہمارا علم بڑا ہی محدود و ناقص اور مشکوک ہے۔ علم کی روشنی میں جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں دھندلا ہوتا ہے جس پر شکوک و شبہات کے غبار کی تہیں چڑھی ہوتی ہیں ہم کسی بھی چیز کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات یقینی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت ہی تھوڑا علم عطا کیا ہے اپنے علم میں سے ساری مخلوق کو تھوڑا تھوڑا علم دے دیا ہے جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ انسان کو سب سے زیادہ حصہ ملا ہے۔ حیوانات کو ان سے کم اور نباتات کو ان سے کم مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی زمین پر ٹھونگ مارتا ہے۔ بقائے نفس کے لئے اسے اس کی ضرورت بھی تھی لہذا پیدا ہوتے ہی اسے اتنا علم دے دیا گیا کہ زمین پر ٹھونگ مار! اور پیٹ بھر۔ بلی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو کانپتا لرزتا بالکل اندھا وہ نہیں جانتا کہ میں کیسے پیدا ہوا ہوں اب مجھ کیا کرنا چاہیئے اللہ اسے بتاتا ہے کہ ٹٹول! تیرے لئے ہم نے دودھ کی نہریں جاری کر دی ہیں اور وہ نپٹ اندھا ماں کے دودھ کو چمٹ جاتا ہے اس کے تھن کو چباتا نہیں کیونکہ اللہ نے اسے بتادیا ہے کہ یہ چبانے کی چیز نہیں ہے چوسنے کی ہے۔ حیوانات کو دوست اور دشمن کے پہچاننے کی سمجھ عطا کر دی اور نباتات کو بقائے زندگی کا علم دے دیا۔ ان حیوانات و نباتات کو کسی نے پڑھایا نہیں نہ انہوں نے کسی کتاب کی صورت دیکھی معلوم ہوا کہ ان کا علم کتابی نہیں یعنی جسے اہل منطق علم حصولی یا کتابی سے تعبیر کرتے ہیں انکا علم ایسا نہیں ہے۔

اہل منطق نے علم کی دو قسمیں کی ہیں ایک حصولی اور دوسرا حضوری۔ علم حصولی وہ ہے کہ جو کسب و اکتساب سے حاصل ہوتا ہے۔ غور و فکر اور کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسرا علم حضوری ہے جو بغیر غور و فکر اور کسب

و اکتساب کے حاصل ہو جاتا ہے جیسے حیوانات و نباتات کو ہے۔ یہ غور و فکر کر کے کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے بس اللہ نے انہیں جتنا دے دیا ہے وہی ان کا سرمایۂ زندگی ہے مگر حضرت انسان کو اس نے علم حضوری بھی عطا فرمایا اور حصولی بھی جس قدر لکھے پڑھے گا علم حصولی حاصل ہوتا چلا جائے گا۔ اور جس قدر روحانی ترقیاں کرتا چلا جائے گا علم حصولی حاصل ہوتا جائے گا۔ علم حصولی و کتابی محدود ناقص اور مشکوک ہے علم حضوری اس سے زیادہ پختہ' صحیح اور قرین صواب ہے اگر اس کا تعلق کسی پیغمبر سے ہو اور بصورت حکم و کتاب ہو تو ہم اسے وحی کہتے ہیں اگر اس کا تعلق اولیا اللہ اور نیک بندوں سے ہوتا ہے اسے الہام سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر کسی جوگی یا سادھو وغیرہ سے متعلق ہو تو اسے استدراج کہتے ہیں۔ جس طرح رزق کے بارے میں مومن و کافر کا کوئی فرق نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ علم کے بارے میں بھی مومن و کافر میں کوئی فرق نہیں کرتے علم کا ایک سمندر ہے جو ہر وقت بہتا رہتا ہے خواہ اس سے کافر سیراب ہو لے یا مومن۔ "برین خوان یغماچہ دشمن چہ دوست" والا معاملہ ہے اس قسم کے فیوضات ربانیہ ہر دم ساری مخلوق کے لئے کھلے رہتے ہیں خواہ کوئی کافر ہو یا مومن بلکہ خواہ وہ سخت ترین دشمن خدا ہی کیوں نہ ہو۔

اس نے اپنے مختلف علوم کو مخلوقات میں منتشر کر دیا ہے۔ سارے علوم کسی ایک مخلوق میں جمع نہیں کئے پھر ان کے ذرائع بھی مختلف رکھے ہوئے ہیں کوئی دماغ سے علم حاصل کرتا ہے۔ تو کوئی دل سے کوئی آنکھوں سے تو کوئی ہاتھوں سے کوئی آسمانوں سے تو کوئی کسی اور ذریعہ سے اور ہر ایک کے علوم کا ایک خاص دائرہ ہے۔ پرندوں کو پہلے سے زلزلے کا علم ہو جاتا ہے۔ باقی مخلوق کو نہیں بعض جانوروں کو پہلے سے طوفان آنے کا علم ہو جاتا ہے۔ باقی مخلوق کو نہیں کسی کو علم ہوا کا ماہر بنایا ہے تو کسی کو طبقات الارض کا کوئی آسمانوں سے علم حاصل کرتا ہے تو کوئی زمینوں سے الغرض یہ دنیا ایک مدرسہ ہے اور مخلوق طالب علم اور استاد باری تعالیٰ بعض کو وہ ڈائریکٹ تعلیم دیتے ہیں جسے وحی یا الہام یا استدراج کہنا چاہیئے اور بعض کو ان ڈائریکٹ۔

بعض لوگ وحی اور الہام کا انکار کرتے ہیں یہ بڑی بھاری غلطی ہے آج کل کے ماہرین نفسیات اسے ضمیر، روشن ضمیری یا چھٹی حس سے تعبیر کرتے ہیں یہ پہلے اس کے بھی قائل نہ تھے مگر اب رفتہ رفتہ قریب آگئے ہیں پہلے انکار کرتے تھے اور اب اقرار۔ مگر الفاظ و تعبیر اور ہے۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے صوفیہ علم حضوری کو علم لدنی سے تعبیر کرتے ہیں تو الفاظ کے بدل جانے سے بات تو وہی رہی لہٰذا خواہ الہام کہہ دیا۔ استدراج یا علم حضوری یا علم لدنی یا روشن ضمیری یا ضمیر یا چھٹی حس بات ایک ہی ہے۔ انگور تو انگور ہی ہے خواہ عنب کہہ لو خواہ رز خواہ گریپ الفاظ کے الٹ پھیر سے حقائق نہیں بدلتے۔

اولیا کے تذکرے اٹھا کر دیکھ لو بہت سے صوفی ایسے گزرے ہیں جو بالکل ان پڑھ تھے مگر بڑے بڑے علماء ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے اور بعض بہت معمولی پڑھے ہوئے تھے مگر ان کی بات سند مانی جاتی تھی میں کسی ایک ایسے ان پڑھ یا کم پڑھے ہوئے "صوفی" سے ملا ہوں جو بڑی عالمانہ اور محققانہ باتیں کرتے تھے ان کا علم ظاہر ہے حصولی یا کتابی نہ تھا حضوری یا لدنی تھا بلکہ میں ایسے صوفیہ سے بھی ملا ہوں جن کے سامنے حقائق و معارف حتیٰ کہ لوگوں کے دلوں میں جو خیالات گزرتے ہیں بالکل آئینہ تھے بات یہ ہے کہ اگر دل صاف ہو جائے تو جیسے ہر چیز آئینہ میں عکس انداز ہو جاتی ہے دل میں بھی عکس انداز ہوتی ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ دل کا عکس آئینے کے عکس کی طرح نہیں ہے کہ سامنے ہو تب ہی نظر آئے۔ یہاں ایسی کوئی شرط نہیں ہے نہ قید زمان و مکان ہے نہ فاصلہ کوئی چیز ہے نہ ماضی و حال و استقبال کچھ ہے جو کچھ ہے حال ہی حال ہے۔

اس کی مخلوق کا یہ حال ہے۔ تو خود اس سے کیسے کوئی بات پوشیدہ ہو گی۔ حضرت عیسیٰ نے دعوی کیا تھا کہ جو کچھ تم اپنے گھروں میں چھپ کر کھاتے ہو یا جو کچھ وہاں ذخیرہ کرتے ہو میں بتا سکتا ہوں کہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کہاں لوگوں کی ہانڈیاں۔ مٹکے گھڑے اور صندوق اور یہ علم اس کتابی علم سے کتنا پختہ اور یقینی ہے کہ بے خوف و خطر دعوے سے فرماتے ہیں۔ ہمارے حضورؐ نے اگلی پچھلی اور موجودہ زمانے کی سینکڑوں باتیں بتائیں۔ ان کی تو کیا ہی بات ہے؟ اولیا

اللہ تک کے قصے عجیب و غریب ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے چونکہ ہماری عقل محدود ہے لہٰذا ہمارا علم بھی محدود ہے۔ عقل بھی زمان و مکان کی پابند تو علم بھی زمان و مکان کا پابند۔

ہم بس اتنا جان سکتے ہیں کہ اللہ جانتا ہے وہ عالم الغیب ہے مگر کیسے جانتا ہے یہ بات ہم نہیں جانتے اس کے متعلق تو کیا جانتے اس کے بندوں کے متعلق نہیں جانتے کہ وہ کیسے جانتے ہیں ہزاروں میلوں کی باتیں کیسے صحیح صحیح بتا دیتے ہیں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک درویش سے ملنے گیا کہنے لگا تو اس لئے آیا ہے کہ تیری بیوی کے پیٹ میں درد رہتا ہے اس کا ایسا رنگ ہے اور ایسا قد ہے اور وہ اس وقت کپاسی رنگ کے کپڑے پہنے کھڑی ہے۔ ایک دفعہ ایک فقیر سے ملنے گیا یہ میری شادی سے پہلے کی بات ہے میں نے اس سے پوچھا کیا میں اس سے شادی کر لوں۔ بولا ضرور کر لے تیرا جوڑا اسی سے لکھا ہے بڑی اچھی ہے نیک ہے تندرست ہے پھر بولا اس کے فلاں فلاں مقام پر تل ہیں۔ میں حیران رہ گیا یا اللہ اسے تلوں تک کا علم کیسے ہو گیا؟ ہم نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں اور آج تک دنیا کے مشہور ترین واقعات کے بارے میں بھی صحیح نہیں بتا سکتے کہ یہ واقعہ کب ہوا۔ بڑے بڑے سلاطین کے بارے میں صحیح علم نہیں کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کب مرے کوئی مؤرخ کچھ لکھتا ہے کوئی کچھ۔ وہ بزرگ جن کے مزاروں پر لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انہی کے مزار ہیں کتابی علم کو دیکھو کہ شکوک و شبہات سے بھرپور ہے میں تو اس سے بڑا ہی اکتا گیا ہوں

؎ صد کتاب و صد ورق درنار کن سینہ را از عشق او گلزار کن

العلی جل جلالہٗ

علو کی کئی قسمیں ہیں علوئے ذاتی۔ علوئے وصفی علوئے عارضی۔ علوئے رتبی۔ علوئے آنی و وقتی۔ علوئے زمانی اور علوئے مکانی وغیرہ۔

ہمارا مکان پانچ منزلہ ہے جب ہم سطح ارضی پر ہوتے ہیں اور اس کے نیچے کی منزل کی چھت کی طرف دیکھتے ہیں جو اٹھارہ فٹ بلند ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے ہمارے فرش سے ہماری چھت بہت بلند ہے مگر جب پہلی منزل کی اس چھت پر چلے جاتے ہیں تو یہی چھت جو پہلے عالی تھی اب سافل ہو جاتی ہے اور اس سے اوپر والی منزل کی چھت اس کے مقابلے پر عالی ثابت ہوتی ہے مگر جب ہم دوسری منزل پر چلے جاتے ہیں تو پہلی منزل کی یہ چھت جو پہلے عالی تھی اب سافل ہو جاتی ہے یہی حال باقی منزلوں کا ہے معلوم ہوا علوئے مکانی ایک اضافی چیز ہے پہاڑ زمین سے بلند ہیں اور ان کی چوٹی ان سے بلند ہے حقیقتہً بلند وہی ذات ہو سکتی ہے جو قید مکان سے برتر ہو وہی "العلی" سب سے بلند ہے باقی چیزوں کی بلندی اضافی اور غیر حقیقی ہے۔

ایک تھانیدار اپنے ماتحت کانسٹیبلوں کے سامنے بہت بلند معلوم ہوتا ہے مگر جب وہ ڈی آئی جی پولیس کے سامنے جاتا ہے تو حقیر ہو جاتا ہے اور جب ڈی آئی جی پولیس آئی جی پولیس کے سامنے جاتا ہے تو وہ بڑا ہونے کے باوجود چھوٹا ہو جاتا ہے، اور جب آئی جی پولیس کسی وزیر کے سامنے جاتا ہے تو حقیر لگتا ہے اور وزیر وزیراعظم کے سامنے ہر افسر افسر بالا کے سامنے ذلیل و حقیر معلوم ہوتا ہے معلوم ہوا کہ علوئے رتبی بھی بے حقیقت ہے بس علی وہی "العلی" ہے جو رتبوں سے بالاو برتر ہے۔

جب تک کوئی افسر اپنی کرسی پر قائم رہتا ہے ہزاروں اسے جھک جھک کر

سلام کرتے ہیں اور جب اسکی سروس کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ ریٹائرڈ ہو جاتا ہے اور کوئی بھی اسے عید بقرعید پر بھی سلام کرنے اور نذرانے دینے نہیں آتا معلوم ہوا علوئے زمانی بھی غیر حقیقی ہے اور علی صرف وہی "العلی" ہے جو پابند زمانہ نہیں ہے۔

ہم اپنی اولاد پر علوئے زمانی رکھتے ہیں لہٰذا وہ ہمارا احترام کرتے ہیں مگر ہمارے آباؤ اجداد ہم پر علوئے زمانی رکھتے ہیں لہٰذا ہم ان کے سامنے سرجھکاتے ہیں جس طرح کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی نظروں میں چھوٹے تھے ہم بھی اپنے باپ کی نظروں میں چھوٹے ہیں معلوم ہوا علوئے زمانی ایک اضافی چیز ہے حقیقتاً وہی ذات "علی واعلیٰ" ہے جو زمانے کی قیود سے آزاد ہے۔

ہم کسی شخص کو اس کے کسی وصف کی وجہ سے بڑا سمجھتے ہیں لیکن اگر وہ وصف کسی حادثے کی وجہ سے اس میں نہیں رہتا تو پھر دنیا اس سے منہ موڑ کر چلنے لگتی ہے معلوم ہوا علوئے وصفی بھی فانی ہے حقیقتہً "علی واعلیٰ" صرف اس کی ذات ہے جو علوئے ذاتی رکھتا ہے۔

ہم کسی کو صدر جلسہ یا معزز مہمان بنا دیتے ہیں تو وہ سارے حاضرین سے بلند معلوم ہوتا ہے مگر جب محفل برخاست ہو جاتی ہے تو وہ ہمیں جیسا بن جاتا ہے معلوم ہوا علوئے آنی وقتی بے حقیقت ہے علی و اعلیٰ صرف اس کی ذات ہے جسے کسی نے کسی خاص مدت کے لئے اعلیٰ تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ ذاتی طور پر "علی واعلیٰ" ہے یہی حال علوئے نسبی و مالی و جاہی وغیرہ کا ہے کہ اگر ہم کسی ایسے ملک میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا تو کوئی بھی ہمارا احترام نہیں کرتا معلوم ہوا یہ سب قسم کے علو آنی و فانی ہیں "علی واعلیٰ" صرف اس کی ذات ہے جو حسب و نسب، جاہ و مال عزت و اولاد و مکان و جائیداد سے بلند ہے۔ اس کا علو چونکہ ذاتی ہے لہٰذا کسی وصف کی وجہ سے نہیں ہے اگر وہ خالق و رازق نہ ہوتا تب بھی "علی و اعلیٰ" ہوتا کیونکہ علو اس کا ذاتی لازمہ ہے عارضی، وصفی، زمانی، مکانی یا وقتی و آنی نہیں۔ نہ وہ آن، اولاد، مال و جاہ و کرسی کی وجہ سے بلند ہے وہ خود بذات خود "علی واعلیٰ" ہے۔

ہم پنج وقتی نمازوں میں بحالت سجدہ کئی بار **سبحان ربی الاعلیٰ** کہتے ہیں مگر ہمارے قلوب ہماری زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے ہم الاعلیٰ کہتے ہیں مگر "علی واعلیٰ" ہمارے نزدیک مال ہے اسی لئے شب و روز اس "علی واعلیٰ" کی تلاش میں پھرتے ہیں جان جوکھوں میں ڈالتے رہتے ہیں اور جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتے۔

حدیثوں میں ممانعت ہے کہ "ملک الملوک" یا "سلطان السلاطین" جیسے نام نہ رکھو کیونکہ "ملک الملوک" یا" سلطان السلاطین" صرف اسی کی ذات ہے اسی طرح "شاہ یا شہنشاہ" جیسے نام رکھنے منع ہیں۔ ایک صاحب نے نبوت کا دعوی کیا تو وہ پیروں فقیروں سے کیسے پیچھے رہتے انہوں نے اپنی بیوی کو آیت الٰہی بنا دیا اپنے قبرستان کو جنت البقیع اور اپنے دوستوں کو صحابہ غلطی ہائے مضامین مت پوچھ۔ ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے حاضرین سے دریافت کرنے لگے بتاؤ وہ کونسا بیٹا ہے جو اپنے باپ کا باپ ہے؟ پھر خود ہی فرمانے لگے وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آدمؑ کے باپ ہیں لوگ کیسے کیسے نکتے پیدا کر کے جاہل سامعین سے داد لیتے رہتے ہیں قران تو صاف کہتا ہے کہ **مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ** محمد کسی کے باپ نہیں ہیں" باپ تو وہ ہوتا ہے جس کے نطفے سے کوئی پیدا ہوتا ہے آپ سب سے پہلے نور ہیں اور "**نورٌ علٰی نورٌ**" ہیں اور آپ ہی کے نور سے مخلوق پیدا ہوئی مگر آج تک ہم تو ابوالبشر آدم ہی کو سنتے اور پڑھتے چلے آئے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے۔

؎ خدا کے کام تو آلات پر نہیں موقوف
ابوالبشر ہوئے بے آدم و پدر پیدا

ایک فارسی شاعر نے آپ کے بارے میں
فرمایا

؎ نہ از رحم مادر نہ پشت پدر

معلوم ہوا باپ ہونے کے لئے رحم مادر پشت پدر کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت حوا علیہ السلام ہماری ماں تھیں حضرت آمنہ ہماری ماں نہ تھیں آپ کے

نور سے ساری مخلوق کا پیدا ہونا بڑا بھاری شرف ہے حضرت آدمؑ کو ان کا بیٹا بنانے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔

ہم تو ہر سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں فرعون کسے سجدہ کرتاوہ تو خود خدا بنا ہوا تھا کہتا تھا انا ربکم الاعلیٰ کہتے ہیں ایک دفعہ مصرمیں سخت قحط پڑ گیا بارش نہ ہوئی تو مصری دربار میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔ آپ خدائی کے دعویدار اور ہمارے رب اعلیٰ ہیں ہم بڑی مصیبت میں ہیں ذرا بارش ہی کرادیجئے فرعون نے شیطان سے کہا ارے میری خدائی ڈگمگا رہی ہے۔ ذرا بارش کر دے کہ لوگ میری خدائی سے منکر نہ ہو جائیں شیطان نے موسلادھار بارش برسادی کہ لوگ واویلا کرنے لگے شیطان یہاں بھی اپنی شیطانیت سے باز نہ آیا فرعون کو منہ کی کھانی پڑی مصنوعی رب اعلیٰ جو ٹھہرا ایسے ہی واقعات سے مصنوعی پیغمبروں کو بھی واسطہ پڑا۔

الحدیث بالحدیث یذکر "بات سے بات یاد آتی ہے" ہارون الرشید کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا تو قاضی یحییٰ سے اس کے بارے میں فتویٰ طلب کیا گیا انہوں نے فتویٰ دیا کہ اس کا سرقلم کر دیا جائے۔ جعلی نبی کو دربار میں پیش کیا گیا تو ہارون نے کہا "ہر پیغمبر ایک نہ ایک معجزہ لاتا ہے تیرا کیا معجزہ ہے" اس نے قاضی یحییٰ کی طرف اشارہ کر کے کہا "امیر المومنین! آپ قاضی یحییٰ کا سرقلم کرا دیجئے میں ابھی اسے زندہ کر کے دکھائے دیتا ہوں یہی میرا معجزہ ہے۔ قاضی یحییٰ نے کہا "نا بھیا میں سب سے پہلے تجھ پر ایمان لایا۔

جس طرح نبوت کے دعویٰ کرنے والے سیکڑوں گزرے ہیں کچھ لوگ ان سے بھی زیادہ بلند خیال تھے انہوں نے دعوائے نبوت کو درخورا عتنا نہیں سمجھا بلکہ **اَنَارَبُّکُمُ الْاَ عْلٰی** کا نعرہ بلند کیا یہ سیکڑوں ربکم الاعلیٰ کہنے والے زمین کا گز بن گئے اور وہ "العلی والاعلیٰ" ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

وہ "العلیؑ الاعلیٰ" اعلیٰ ہونے کی وجہ سے کسی بلند مقام پر نہیں بیٹھا ہے کیونکہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ وہ علوئے مکانی سے بالاتر ہے لہٰذا اسے کسی بلند مقام پر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے اور

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ پکار رہا ہے ایک صحابیؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ اگر ہمارا پروردگار دور ہے تو زور سے پکاروں اور قریب ہے تو آہستہ یاد کروں؟ قرآن میں ہے سَوَاۤءٌ مِّنْکُمْ مَنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِہٖ آہستہ اور زور سے پکارنے والا برابر ہیں نیز فرمایا اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً اسے خشوع و خضوع سے پوشیدہ طور پر پکارو۔ ظاہر ہے کہ جو ورید سے قریب تر ہے اسے کسی بلند مقام پر جا کر تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے ویسے تو ہر عالی و اعلیٰ بلند ہی ہوتا ہے مگر یہ "العلی الاعلیٰ" ایسا بلند ہے کہ بلند ہوتے ہوئے بھی انتہائی قریب ہے رہا یہ سوال کہ وہ عرش پر ہے اور عرش پر کرسی ہے اور وہ کرسی پر ہے تو بلند مقام پر ہی ہوا بات یہ ہے کہ ایسا نہیں جیسا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں یہ تو بات سمجھانے کے لئے ایک قسم کی تعبیریں ہیں ورنہ اگر ایسا ہی ہو کہ وہ عرش و کرسی پر بیٹھا ہے تو وہ محدود ہوا اور محتاج مکان ہوا اور محدود و محتاج مکان خدا نہیں ہو سکتا وہ محدود تو ہے ہی نہیں لامحدود بھی نہیں ہے اس کی ذات "محدودیت" و"لا محدودیت" سے بالاتر ہے کیونکہ جس پر لامحدود ہونے کا حکم لگ گیا وہ بھی محدود ہو گیا لامحدود "العلی الاعلیٰ" عرش اور کرسی یہ سب باتیں سمجھانے کے لئے ہیں وہ ان سب سے برتر ہے۔

اس "العلی الاعلیٰ" تک پہنچنے کا طریقہ سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ واللیل وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اپنے رب اعلیٰ کے نام کی پاکیزگی بیان کرو وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ٥ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ٥ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی ٥ اِلَّا ابْتِغَاۤءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ٥ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ٥ "بچے گا اس آگ سے جو متقی ترین ہے کہ مال زکواۃ دیتا ہے تاکہ تزکیہ نفس حاصل کرے اور وہ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا اور اس پر کسی کا احسان نہیں ہے۔

*

اَلْغَفَّارُ جل جلالہٗ

ہر شخص روزانہ سیکڑوں گناہ کرتا ہے عوام کے گناہ اور طرح کے ہیں علماء کے اور قسم کے فقیروں کے اور رنگ کے پیروں کے اور طرح کے اولیاء اللہ کے اور نہج کے۔ گناہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے اولیا اللہ کی پل بھر کی غفلت پر بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے عمدہ نسل کے خوبصورت گھوڑے سیکڑوں کی تعداد میں پیش کئے گئے گھوڑوں کے اس محبوب تماشے میں نماز عصر کا وقت جانے لگا تو انہیں فوراً احساس ہوا کہ اس دلچسپی میں خدا کو بھول گیا تھا اپنی اس لغزش پر افسوس ہوا تو حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو واپس لاؤ جنہوں نے مجھے ذکر خدا سے غافل کر دیا تھا تلوار اٹھائی اور سب کو قربان کر دیا۔

حضرت آدم و ابراہیم علیہما السلام کے بارے میں قرآن شریف میں ایسے الفاظ آئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سے قصور سرزد ہوا ہمارے علماء حیران و پریشان ہو کر ایسی آیتوں کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تمام انبیا معصوم تھے مگر سہویا نسیان ذکر پر ان کی گرفت ہو جاتی ہے اور یہ از روئے شرع شریف صغیرہ گناہ ہے نہ کبیرہ۔ اسے ان کی لغزش سے تعبیر کر دیا جائے تو شاید کچھ مضائقہ نہ ہو گا۔ اور بوجہ علومرتبت کے ذرا سی غفلت بھی ان کے لئے باعث گرفت ہے اور انہیں استغفار کا حکم دیا جاتا ہے یہی حال اولیاء اللہ کا ہے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت بایاں قدم پہلے رکھ دینا کوئی گناہ نہیں مگر حضرت سفیان ثوریؒ کو مسجد میں پہلے بایاں قدم رکھنے پر سرزنش کی گئی اور انہیں ثور (بیل) کہا گیا۔ یہ ان کے اس جرم کی سزا تھی کہ ایسے لفظ سے یاد کیا گیا۔

کہتے ہیں جب حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کی قوم قتل کرنے کے لئے ان کے پیچھے پیچھے بھاگی تو انہوں نے ایک درخت سے فرمایا مجھے پناہ دے دے۔ درخت جھکا اور وہ اس کی جڑ میں سما گئے۔ قمیض کا دامن باہر رہ گیا تو قوم نے دیکھ لیا کہ یہاں چھپے ہیں انہوں نے درخت پر آرا چلا دیا۔ حضرت زکریا نے اللہ سے فریاد کی جواب ملاتم نے ہمارے غیر سے پناہ طلب کی اب خاموش رہو۔

تمام انبیاء گناہوں سے معصوم و محفوظ ومامون ہیں۔ ہم نے جو اوپر یہ لکھ دیا ہے کہ انبیاء سے بھی گناہ سرزد ہوتے ہیں صرف سمجھانے کے لئے یہ بات لکھ دی ہے ان کی ذرا سی لغزش یا سہوان کے حق میں گناہ ہے گناہ کا لفظ ہم جن معنوں میں استعمال کرتے ہیں وہ ایسے کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ذرا سی لغزش پر انتہائی سخت سزا دی گئی اولوالعزم پیغمبر یکتائے روزگار بادشاہ کو کیسا ذلیل ہونا پڑا۔ دیکھو مقربین بارگاہ سلطانی کو ذرا سی لغزش پر سولی پر لٹکادیا گیا۔

عوام کے گناہ قتل' چوری' زنا' شراب خوری' غبن' قماربازی' دھوکا دہی' جھوٹ اور غیبت وغیرہ ہیں ان میں تو ہم سب کسی نہ کسی گناہ کے عادی ہیں مگر خواص بھی گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ بڑے بڑے متقی پرہیز گار انسان غیبت و ریا میں مبتلا ہیں۔ اگر ایک متقی پرہیز گار انسان کسی بدقماش کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا دل سے اسے برا کہتا ہے یہ غیبت ہوئی۔ لسانی غیبت نہیں قلبی غیبت۔

اگر ایک نمازی آدمی ایک بے نمازی بھائی کو دل ہی دل میں برا کہتا ہے تو اس نے اس کی غیبت کی اگر کوئی عالم یا عابد زاہد انسان لوگوں سے تعظیم کی آرزو رکھتا ہے یا ان کی تعظیم سے خوش ہوتا ہے تو وہ بلاشبہ ریا کار ہے اور ریا گناہ عظیم ہے۔ اس شرک خفی میں بڑے بڑے علماء پیر فقیر اور متقی پرہیز گار انسان مبتلا ہیں اور ہما شماء تورات دن ریا کاری کرتے ہی رہتے ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت سعدیؒ اپنے باپ کے ساتھ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے اور سب گھر والے سو رہے تھے۔ سعدیؒ باپ سے کہنے لگے دیکھو یہ کیسے

غافل سو رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا کاش تم بھی اسی طرح سوتے رہتے۔ ایسا انہوں نے کیوں کہا؟ اس لئے کہ سعدیؒ نے ان کی غیبت کی اور انہیں اپنے سے کم تر سمجھا۔

ہمارا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، پہننا اور نیکی کے کام کرنا عموما سب کی بنیاد ریا پر ہوتی ہے خصوصا شادی بیاہ وغیرہ تقریبات میں تو ریا ہی ریا ہوتی ہے اس گناہ عظیم سے شاید ہی کسی کا دامن پاک ہو۔

روایت ہے کہ ایک ولی اللہ کہیں چلے جا رہے تھے چھوٹی سی گلی سے گزر ہوا بیچ گلی میں کتا پڑا تھا کیچڑ سے بچنے کے لئے فرمایا "او کتے! راستے سے ہٹ جا" کتے نے کہا "تو کتے سے بھی بدتر ہے کہ مجھے ذلیل اور اپنے آپ کو شریف سمجھتا ہے۔"

کسی کو بنظر حقارت دیکھنا بھی گناہ ہے اولیاء اللہ کے ایسے بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں کہ انہوں نے کسی شرابی یا بدمعاش کو بری حالت میں دیکھا تو اسے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا رات کو خواب میں انہیں تنبیہہ کی گئی کہ وہ گناہ گار بھی ہمارا بندہ ہے تم نے اسے حقارت سے کیوں دیکھا؟

حدیث شریف میں مذکور ہے کہ پچھلی امتوں میں ایک بڑا عابد زاہد انسان تھا۔ اس کا بھائی بڑا بدمعاش تھا ایک دن وہ زاہد انسان بھائی کی حرکت پر چراغ پا ہو کر کہنے لگا "خدا کی قسم! تو جہنم میں جائے گا" فورًا عتاب خداوندی ہوا کہ تو کون ہے جو ہماری قسم کھا کر ایسا کہتا ہے جاہم نے اسے بخشا۔ اور تجھ مغرور عبادت کو جہنم رسید کیا۔

جھوٹ، غیبت، ریا کاری، دھوکا دہی یہ ایسے گناہ ہیں کہ ان میں ہم سب کم و بیش مبتلا ہیں۔ کم تولنا، چیزوں میں ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ میں ہمارے سارے تاجر مبتلا ہیں۔ عوام رات دن جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں لوگوں کو ستاتے ہیں جانوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ پڑوسیوں کے حقوق مارتے ہیں۔ پڑوسی کے گھر میں جھانکنا بھی خیانت ہے۔ اگر کوئی ملازم ڈیوٹی کے وقت پر نہیں پہنچتا تو وہ خائن

ہے اگر کوئی شخص کسی گھر، کسی کمپنی، کسی دکان یا کسی سرکاری شعبہ میں ملازم ہے وہ مقررہ وقت سے دیر میں پہنچتا ہے۔ تو وہ خائن ہے خواہ وہ فرد یا حکومت مومن ہو یا کافر اگر وہ دس منٹ دیر سے پہنچا یا دس منٹ پہلے چلا آیا تو اس نے دس منٹ کی چوری کی اور اس کے بقدر اس نے حرام تنخواہ وصول کی۔ اس طرح ہم سب جرم خیانت کے مرتکب ہیں۔

کوئی بھی حکومت خواہ مومن ہو یا کافر اس کے کسی ایسے قانون کی خلاف ورزی کرنا جو اسلامی احکام سے نہ ٹکراتا ہو گناہ ہے۔ مثلاً" کسی بھی ملک کے ٹریفک کے قانون کے خلاف چلنا گناہ ہے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے گناہوں میں پورا معاشرہ مبتلا ہے۔

ہماری مجالس کی رونق غیبت سے ہے اور غیبت گناہ عظیم ہے جسے قرآن شریف نے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور حدیث شریف میں اسے زنا سے زیادہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بھی تقریبا سارے انسان مبتلا ہیں۔ بقول مولانا حالیؒ۔

ے مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے
کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے
نہ ملا نہ صوفی کو اس سے حذر ہے

بعض لوگ غیبت سے پرہیز کرتے ہیں مگر نادانستہ طور پر غیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو بلکہ پڑھے لکھے عالموں کو کہتے سنا گیا ہے کہ ہم غیبت نہیں کر رہے ہیں حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سامنے کسی عالم نے کسی عالم کی غیبت کی تو فرمایا "میرے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو" وہ کہنے لگے "حضرت! میں نے تو کوئی غیبت نہیں کی نہ مبالغہ کیا۔ واقعتہ ان میں یہ بات ہے" فرمایا "اگر واقعتہ" ان میں یہ بات نہ ہوتی تو یہ تہمت ہوتی۔" غیبت تو یہی ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔ میں نے جو غیبت قلبی کے بارے میں اوپر بیان کیا اس سے تو شاذو نادر ہی کوئی بری ہو گا۔

غیبت زبان سے بھی ہوتی ہے دل سے بھی اور ہاتھوں سے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کسی عورت کے پستہ قد ہونے کے بارے میں ہاتھ سے بتایا تو آپ نے فرمایا "یہ غیبت ہے۔"

ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے برے برے نام رکھتے ہیں۔ دیہات میں تو یہ بات عام ہے۔ کسی کو برے نام سے یاد کرنا گناہ ہے لوگوں کو ان کے اچھے ناموں سے پکارو۔

کسی دوست عزیز یا ساتھی کا نام رکھنا جو اسے ناپسند ہو یا نوکر کو برے نام سے یا ذلت کے ساتھ پکارنا گناہ ہے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ناراض ہو کر کہا "او حبشن کے بیٹے!" حضورؐ نے فرمایا ایسا نہ کہو ابوذر نے ان سے معافی مانگی۔ کسی کے عیب دار باپ دادے کے بیٹے کو اس قسم کے الفاظ سے خطاب کرنا گناہ ہے کسی کو طعنہ دینا' زبان سے سخت کلمہ نکالنا گالی دینا گناہ ہے کسی کانے یا اندھے یا لنگڑے کو اس کے عیب کے ساتھ پکارنا گناہ ہے۔

جو معالج بغیر سمجھے بوجھے علاج کرتا ہے گنہگار ہے اور وکیلوں کے بارے میں تو کیا لکھوں۔ حضرت اکبر الہ آبادیؒ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔

اگر کوئی شخص ضرورت سے زیادہ کھاتا ہے تو اس نے غریب کا حق کھایا جو یقیناً گناہ ہے۔ اگر خود پیٹ بھر کے سویا اور پڑوسی بھوکا رہا تو وہ گناہ گار ہوا حدیث شریف میں ایسے شخص کی مذمت کی گئی ہے۔ کھانے پینے کے چھوٹے چھوٹے گناہ ہم سب رات دن کرتے رہے ہیں۔

معاشرے میں ایسے بھی افراد کی کمی نہیں جو یتیموں بیواؤں اور بیکسوں کا مال کھاتے ہیں اور ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو ظالموں اور بدمعاشوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ایسے تو بے شمار ہیں جو ظالم کو ظلم کرتے دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ مظلوم کی مدد نہیں کرتے اور ظالم کو نصیحت نہیں کرتے۔ یہ سب گناہگار ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے "اپنے ظالم اور مظلوم بھائی کی مدد

کرو۔"
صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی "یا رسول اللہ! ظالم بھائی کی مدد کا کیا مطلب؟ فرمایا "یہ کہ اسے ظلم سے روک دو۔" اس حدیث کے اعتبار سے ہم سب خلاف سنت کر رہے ہیں۔

وہ علماء اور عوام جو فروعی اختلافات پر بحث مباحثہ' تکرار و تحریر و تقریر کرتے ہیں گنہگار ہیں۔ احادیث میں ایسے لوگوں پر لعنت کی گئی ہے اور اقوال علی کرم اللہ وجہہ میں تو ایسے لوگوں کے لئے بڑے سخت الفاظ آئے ہیں۔ بالخصوص مسلمانوں کو آپس میں لڑانے والے تو یقیناً گنہگار ہیں۔ اور "اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ کے مصداق ہیں"۔

وہ پیر و فقیر جو اپنی حیثیت سے زیادہ کا اظہار کرتے ہیں گناہ کرتے ہیں۔ اور جو مرید اپنے پیروں کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں کذب کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کسی کی زیادہ مدح کرنا بھی گناہ ہے۔ اس طرح کسی کی زیادہ مذمت بھی گناہ ہے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں تو گناہ سے بچنا بڑا ہی مشکل ہے۔ حکومتوں کے کچھ قوانین ایسے ہیں کہ بغیر جھوٹ بولے کام ہی نہیں نکلتا بس وہ دور آگیا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف ایسے شخص کا ایمان سالم رہے گا جو ایک بکری لے جا کر پہاڑ پر رہنے لگے کہ اس کے دودھ پر گزارا کرے اور دنیا سے دور رہے۔

اس پوری تحریر سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہو گا کہ بندگان خدا ہر آن کیسے کیسے گناہ کرتے ہیں۔ مگر وہ "الغفار" سب کے گناہوں کو بخشتا رہتا ہے۔ ورنہ قیامت سے پہلے قیامت برپا ہو جائے اس "الغفار" کی مغفرت کتنی عظیم ہے کہ اس کا دریائے مغفرت مخلوق کے گناہوں کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔ ظالم ظلم کر رہا ہے اور وہ چھوٹ دیئے جاتے ہیں۔ گنہگار گناہ کر رہا ہے اور وہ بخشے چلے جاتے ہیں۔ پردہ پوشی کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص ہمیں نیک انسان معلوم دیتا ہے۔ اگر ہمارے ساتھ بھی پچھلی امتوں کا سا برتاو ہوتا تو کبھی کا تختہ زمین الٹ چکا ہوتا۔ اہل مذاہب خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ترقی یافتہ ممالک کے

لوگوں سے پھر بھی غنیمت ہیں اگرچہ ان کی زندگی تو سراپا گناہ ہے۔ اگر وہ غفار نہ ہوتا تو وہ اس شان و شوکت سے دنیا میں چل پھر نہ سکتے اور ایک آن بھی ان کے ملک سالم نہ رہتے۔ ان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے قلبی سکون چھین لیا گیا ہے۔ قلبی سکون تو بس مذہبی دنیا ہی میں ہے خواہ وہ کتنے ہی گنہگار ہوں۔

؎ سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی ہے روش میری، خطا پوشی کام اس کا

(مولانا ظفر علی خانؒ)

✻

اَلْغَفُوْرُ جل جلالہٗ

وہ غفور و غفار رحیم و کریم ہر گھڑی ہمارے گناہ بخشتا ہے اور ہم میں سے ہر فرد ہر لمحہ کوئی نہ کوئی گناہ کرتا رہتا ہے اس نے ہمیں ان گنت خادم نیکی کرنے کے لئے عطا کئے ہیں۔ مگر ہم ان سے ہر وقت برے کام کرتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں آنکھیں نہ ہوں تو دنیا اندھیر ہے یہ آنکھیں اس نے ہمیں راہ ہدایت دیکھنے کے لئے عطا کی تھیں مگر ہم اکثر اپنی قوت بصارت کو گناہ میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہم کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھتے ہیں اور اس سے چشم پوشی کر کے اسے ظلم کرنے پر جری بنا دیتے ہیں اس طرح ہم بھی شریک ظلم ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ہے اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ظالم کی مدد کیا مطلب! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے ظالم کی مدد ہم کیسے کریں۔ فرمایا ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دو۔ معلوم ہوا جب بھی ہم کسی ظالم سے چشم پوشی کرتے ہیں تو گناہ کرتے ہیں۔

ہم ان آنکھوں کو بجائے اس کے کہ اپنے عیوب دیکھیں دوسروں کے عیوب کے دیکھنے میں استعمال کرتے رہتے ہیں چھپ چھپ کر ٹوہ لگاتے ہیں فلاں شخص کیا کر رہا ہے تجسّس کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص چھپ کر گناہ کر رہا ہے تو تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تجسّس کرو اور پھر اس کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرو یہ گناہ درگناہ ہے وہ تو گناہ کر ہی رہا ہے تم تجسّس کر کے ایک اور حرام کام کر رہے ہو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** اللہ پسند نہیں کرتا کہ برائی کا اظہار کیا جائے مگر یہ کہ وہ مظلوم ہو گناہ کرنا انسان کی فطرت ہے اور کوئی کسی پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ پڑوسی کے گھر میں جھانکنا گناہ ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس نے اپنی آنکھوں سے گناہ کیا ہر شخص آزاد ہے اور آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ اپنے گھر یا کمرے میں کوئی کچھ کر رہا ہے تو اسے کرنے دو۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں مگر ان آنکھوں سے غلط اشارے اور کنائے کرتے ہیں۔ بعض اوقات بڑے سے بڑے فصیح و بلیغ جملے وہ کام نہیں کرتے جو ہماری آنکھ کا ایک اشارہ کر جاتا ہے اور معاملات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتا ہے ہم اپنے عزیزوں دوستوں کو آنکھ مار کر دھوکہ دیتے ہیں جن سے بات کو چھپانا نہیں چاہتے ہیں ان سے تو چھپا لیتے ہیں اور دوسرے شخص سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اس طرح ہم عزیزوں دوستوں کو ان آنکھوں کے ذریعہ دھوکہ دیتے ہیں۔ فریب کرتے ہیں۔ چغل خوری کرتے ہیں اور بعض اوقات خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ہم ان آنکھوں سے ان چیزوں کو نہیں دیکھتے جنہیں ہمیں دیکھنا چاہیئے تھا اور اس طرح دیکھ کر گنہگار ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنی آنکھوں سے ہر دم کوئی نہ کوئی گناہ کرتے رہتے ہیں اور وہ بصیرت و بصارت عطا کرنے والا "الغفور" ہماری حرکتوں کو دیکھتا رہتا ہے اور بخشش نچھاور کرتا رہتا ہے۔

ہمیں اس "الغفور" نے کان عطاء کئے تاکہ ہم ان سے حق کی بات سنیں مگر ہم حق سے کان بند کر لیتے ہیں اور ناحق کے لئے خوب خوب کان لگاتے ہیں کانوں سے بھی ہم ہر وقت گناہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم غیبت چغلی جھوٹ فحش اور بے ہودہ باتوں کو بڑے مزے لے لے کر سنتے ہیں اور واعظ کی نصیحت سے کان بند کر لیتے ہیں اور كَاَنَّ فِىٓ اُذُنَيۡهِ وَقۡرًا کے مصداق بن جاتے ہیں ہم مظلوم کی آہ و زاری نہیں سنتے اپنے بوڑھے ماں باپ کی کراہیں نہیں سنتے اپنے پڑوسی کی آہوں سے کانوں میں قفل لگا لیتے ہیں اور گم راہ دوست احباب کی باتوں کے لئے کان کھول لیتے ہیں۔ دین کی باتیں نہیں سنتے دنیا کی باتیں بڑے ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ ہمارے کانوں کے گناہوں کو وہ "الغفور" السمیع دیکھتا اور سنتا رہتا ہے اور انہیں بخشتا رہتا ہے۔

ہمیں اس "الغفور" نے زبان عطا کی تاکہ حق کی بات کہیں مگر ہم حق کی بات سے جان چراتے ہیں اور ناحق کی باتیں بڑی تیزی و طراری سے کرتے رہتے ہیں۔ ہم ظالم کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے۔ مگر کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس سے اظہار نفرت ہی کر دیں۔ اس طرح اگر ایک ظالم کے مظالم پر ساری بستی خاموش رہتی ہے۔ تو وہ پوری کی پوری بستی بھی ظالم ہے۔ جو شخص ظالم کو تف بھی نہیں کر سکتا اسے نصیحت بھی نہیں کر سکتا۔ دو کلمے بھی زبان سے نہیں نکال سکتا وہ بھی ظالم ہے۔ زبان اس "الغفور" کی دی ہوئی بڑی بھاری نعمت ہے۔ مگر ہم اس نعمت کا حق ادا نہیں کرتے خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے زبان چلاتے رہتے ہیں بلا وجہ گالیاں بکتے ہیں۔ بے سبب لوگوں سے جھگڑتے ہیں۔ حرام لقموں کی لذتیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ سگریٹ پان اور چائے سے زبان ودہن کی تواضع کرتے رہتے ہیں اور ذکر الٰہی سے زبان کو تر نہیں رکھتے۔

عبدالرحمان بن ملجم خارجی قاتلِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے ملعون نے کیا خوب کہا تھا جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے تو وہ بالکل نہ گھبرایا مگر جب زبان کاٹنے کا حکم دیا تو بہت گھبرایا لوگوں نے اس سے دریافت کیا اے دشمنِ خدا تو ہاتھ پاؤں اطمینان سے کٹواتا رہا مگر زبان جو ذرا سی چیز ہے اس کے کٹوانے پر گھبراتا ہے تو وہ کہنے لگا میں زبان کے کٹنے پر اس لئے گھبرایا کہ میں چاہتا تھا مرتے دم تک میری زبان ذکر الٰہی سے تر رہے۔

زبان کے مفاسد اور گناہ بے شمار ہیں گھروں کنبوں بستیوں اور عزیزوں دوستوں میں سارے کے سارے جھگڑے تقریباً اسی سے ہوتے ہیں۔ یہ ذرا سی زبان ملکوں کو پھونک کر رکھ دیتی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا **جرمہ صغیر و جرمہ کبیر** زبان کی جسامت تو چھوٹی ہے مگر اسکا گناہ تو بہت ہی بڑا ہے۔ حضور علیہ السلام نے کیا اچھا فرمایا ہے **الانسان باصغریہ** یہ انسان دراصل صرف اپنے دو سب سے چھوٹے اعضاء سے معیاری یا غیر معیاری بنتا ہے جن میں ایک زبان ہے۔

نیز فرمایا "بھلا لوگوں کو ناکوں کے بل دوزخ میں کونسی باتیں ڈالیں گی؟ یہی

ان کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں۔ جن میں کفر و شرک جھوٹ بہتان اور غیبت ہوگی۔ مفاسد زبان کے شمار کے لئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے زیادہ گناہ زبان کی لذت زبان ہی سے ہوتے ہیں۔ اور وہ "الغفور" ہمیں بخشتا ہی رہتا ہے۔

اس "الغفور" نے ہمیں دو کان عطا کئے مگر زبان ایک ہی دی تاکہ دو سنیں تو ایک کہیں۔ "پہلے تول پیچھے بول" ہر وقت زبان چلانے سے دل مردہ ہو جاتا ہے بقول عطار رحمتہ علیہ

دل زپر گفتن . بمیرد دربدن گرچہ گفتارش بود درعدن

دل فضول باتوں سے جسم میں مرجایا کرتا ہے اگرچہ اس کی باتیں عدن کے موتی ہی کیوں نہ ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر کم بولتے تھے کہ صحابہ تمنا کرتے تھے کہ آپ بولیں اور ایسے بولتے کہ آپ کے الفاظ شمار کئے جا سکیں۔ کم بولنے سے حکمت پیدا ہوتی ہے۔ اس "الغفور" نے ہمیں بڑا سا سر عطا کیا۔ اس سر میں کروڑوں' غدود و عروق' جراثیم' اعصاب' خانے اور پیچیدگیاں ہماری خدمت کے لئے متعین کیں تاکہ ہم صحیح سوچ بچار سے قدم اٹھائیں مگر ہم زیادہ تر دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے سوچتے ہیں۔ مفاسد کو جنم دیتے ہیں۔ برے برے خیالات دماغ پر مسلط کئے رہتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں سے بدگمانیاں کرتے ہیں۔ بدگمانی بھی گناہ ہے **ان بعض الظن اثم۔**

دماغ کے گناہ ظاہر ہیں۔ مگر بعض گناہ اتنے باریک اور پوشیدہ ہیں کہ لوگ ان سے غافل ہیں۔ کسی گناہگار کو مبتلائے گناہ دیکھ کر اسے حقارت کی نظر سے دیکھنا گناہ ہے اگر کوئی نمازی بے نماز کو ذلیل اور برا سمجھتا ہے تو وہ خود ہی برا ہے اگر کوئی نیک آدمی کسی بدمعاش پر دماغ میں نفرت کو جگہ دیتا ہے وہ برا کرتا ہے۔ معلوم نہیں اللہ کو اس کا کون سا عمل پسند آجائے اور تمہارا ہر عمل وہاں مردود ٹھہرے۔ کسی بھی برے آدمی کے بارے میں اگر اپنے دماغ میں یہ خیال جمایا کہ یہ برا ہے تو اس نے دماغی طور پر اس کی غیبت کی اور اگر وہ عیب اس میں

نہیں تو اس نے دماغی طور پر غیبت سے بڑا گناہ کیا کہ اس پر جھوٹی تہمت لگائی اپنے بھائی سے بدگمانی کی اور اسے اپنی نظروں سے گرایا۔

پچھلی امتوں میں دو بھائی تھے ایک عابد و زاہد اور دوسرا بیکار ایک دن وہ عبادت گزار اپنے بھائی سے کہنے لگا۔ خدا کی قسم تو دوزخ میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ بات بری لگی فرمایا یہ کون ہوتا ہے جو ہماری قسم کھا کر کہے کہ تو دوزخ میں جائے گا۔ جا میں نے تجھے معاف کیا اور اس عبادت پر نازاں انسان کو جہنم رسید کیا۔

دماغی گناہوں سے بچنے کا یہ طریقہ ہے کہ انسان مصروف رہے بیکاری میں ہمیشہ بری باتیں سوجھتی ہیں۔ بیکار انسان کا دماغ شیطان کا **گھونسلہ** ہوتا ہے۔ حضورؐ نے ہوا جس و خواطر (وسوسے شیطانی خطرے جو دل میں گزریں) خواطر (خیالات جو دل میں گزریں) سے پناہ مانگی ہے۔ اچھے برے خیالات تو ہر شخص کے دماغ میں خود بخود آتے ہی رہتے ہیں۔ ان پر کوئی گرفت نہیں ہے ان سے نہیں گھبرانا چاہیئے۔ یہ تو فطرت انسانی کا تقاضا ہے خیال جمانے پر گرفت ہے اس "الغفور" نے ہوا "جس و خواطر" کو بخش دیا ہے۔

اس غفور و مقتدر نے ہمیں دو ہاتھ عطا کئے ہیں تاکہ ہم ایک ہاتھ سے اپنی مدد اور دوسرے سے دوسروں کی مدد کریں مگر ہم لوگ دونوں ہاتھوں سے دوسروں کو زک پہنچاتے رہتے ہیں برائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں خواہ مخواہ عزیزوں دوستوں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں بے کسوں پر ظلم ڈھاتے ہیں توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ خیانت کرتے ہیں رشوت لیتے ہیں۔ لینا پسند کرتے ہیں دینا پسند نہیں کرتے۔ حق دار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ جانوروں کو ستاتے ہیں انہیں بلاوجہ مارتے پیٹتے ہیں۔ اپنے جسم اور کپڑوں کو صاف نہیں رکھتے۔ گھروں میں صفائی نہیں رکھتے۔ اپنی سڑکوں گلیوں اور محلوں کو غلیظ کرتے ہیں۔ پیرس کے ایک کافر بچے کی بات مسلمانوں کے لئے قابل عبرت ہے۔ جب وہ بس سے اترا تو کسی نے اس سے کہا کہ یہ ٹکٹ پھینک دو وہ بولا "میں اس سے شہر کی سڑک کو گندہ نہیں کروں گا اسے تو ڈسٹ بن (Dust Bun) میں ڈالوں گا"۔

یہ ہاتھ ہمارے جسم کے خادم ہیں ہم ان ہاتھوں سے اپنے اعضاء کے حقوق ادا نہیں کرتے بلکہ ان سے اپنے اعضاء کی بربادی کے کام کراتے رہتے ہیں۔ ان کی انگلیوں میں سگرٹ دبائے پھرتے ہیں۔ اور منہ اور روح کو گندہ کرتے رہتے ہیں۔ پھیپھڑوں پر کالک ملتے رہتے ہیں اور دل و دماغ کو ایذا پہنچاتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے کام بھی گناہ ہیں۔ مگر یہ ایسے گناہ ہیں کہ ان پر آخرت میں کوئی گرفت نہیں ہے۔ دنیا ہی میں سزا مل جاتی ہے۔ کھانسی' نزلہ' بلغم' ناک' تھوک وغیرہ یہ سب عذاب الہٰی ہیں۔ جو دنیا ہی میں سگرٹ نوشوں پر پڑتے رہتے ہیں۔

اس "الغفور" نے ہمیں دوپاؤں دیئے ہیں کہ ثابت قدمی سے صراط مستقیم پر چلیں مگر عموماً" ہم ایک پاؤں سے صراط مستقیم پر چلتے ہیں اور دوسرے کو غلط راہ پر ڈالتے ہیں ایسے لوگ کم ہی ہیں جو دونوں پاؤں سے صراط مستقیم پر چلتے ہوں۔ اور وہ تو بہت ہی بدنصیب ہیں جو صراط مستقیم کے لئے زندگی بھر ایک بھی پاؤں استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ دونوں سے غلط راہ پر ساری زندگی گامزن رہتے ہیں۔ انسان راہ چلتے چلتے بھی ثواب کما سکتا ہے راہ میں سے کوئی بھی ایسی چیز جو چلنے والوں کو تکلیف دے سکے۔ اسے راہ سے دور کر دینا کار ثواب ہے جیسے کیلے' خربوزہ' آم وغیرہ کے چھلکے یا کانٹے' اینٹ' پتھر وغیرہ ذرا چلتے چلتے ہم ایسی چیزوں پر ٹھوکر ماریں تو لوگ گرنے پڑنے اور ایذا سے بچ جائیں حدیث شریف میں ہے۔ ایمان کا سب سے ادنیٰ درجہ راہ سے تکلیف دہ چیز کا دور کر دینا ہے۔ میرے مطب میں کئی ایسی برقع پوش عورتیں آئیں جن کی کمر کا درد کسی بھی علاج سے درست نہ ہوا۔ کیونکہ وہ برقع پوش عورت بیچ سڑک پر پڑا ہوا کیلے کا چھلکا نہ دیکھ سکی۔ ایک کا تو حمل ہی ساقط ہو گیا اور زندگی بھر کے لئے اسے آزار لگ گیا۔ ذرا سے گناہ نے ایک گھر کا سکون برباد کر دیا۔

ہم رات دن ان قدموں پر چل کر کسی کو ستانے کے لئے جاتے ہیں کسی سے جھگڑا کرنے کے لئے کسی کو دھوکا دینے کے لئے کسی کی عزت لوٹنے کے لئے وہ "الغفور" یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے اور معاف کرتا رہتا ہے۔

آہستہ خرام بل مخرام   زیرِ قدمت ہزار ہا جان است

آہستہ چل بلکہ مت چل کہ تیرے قدموں تلے ہزاروں جانیں ہیں۔

اس "الغفور" نے ہمیں جسم کا ایک بادشاہ عطا کیا ہے تاکہ ہم برے ارادوں سے بچیں۔ یہ بادشاہ رات دن ہماری خدمت میں لگا رہتا ہے۔ ان تھک کام کرتا ہے اور ہر وقت ہمیں ہر برائی پر ٹوکتا رہتا ہے۔ گناہوں سے یہ تاریک ہو جاتا ہے اور پھر ملامت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور نیکیوں سے آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض لوگ بڑے روشن ضمیر ہو جاتے ہیں اور یہ قلب مطہر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔

ہمارا دل ہر وقت کوئی نہ کوئی گناہ کرتا رہتا ہے۔ بدگمانی اس کی سب سے بڑی بیماری ہے اور ہزاروں مفاسد کی جڑ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اپنے مومن بھائی کے ساتھ اچھا گمان رکھو۔

ہم بعض لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ گناہ قلبی ہے خواہ مخواہ کسی سے نفرت کرنا تو یقیناً گناہ ہے ہی۔ کسی وجہ سے بھی کسی سے نفرت و بغض و کینہ رکھنا بھی گناہ ہے اگرچہ پہلے کی نسبت سے خفیف ہے۔ ہم بری بری آرزوؤں سے دل کو گنہگار بناتے رہتے ہیں۔

ہر شخص کے دل میں کسی نہ کسی سے بغض، کینہ، حسد، عداوت بھری رہتی ہے اور ہمارا دل ہر وقت ان میں سے کسی نہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ یہ قلب جو عرش الٰہی ہے ہم ہر وقت اسے گناہوں کی نجاستوں سے گندہ کرتے رہتے ہیں۔ قلب المومن عرش الرحمان وہ "الغفور" ہر وقت دیکھتا رہتا ہے کہ یہ انسان میرے عرش کو گندہ کر رہا ہے۔ مگر وہ بخشتا رہتا ہے۔ وہ کتنا بڑا غفار ہے۔ اپنے گھر کو کون گندگی سے بھروانا پسند کر سکتا ہے؟ مگر اس کی شان کریمی سب کچھ گوارا کر لیتی ہے۔

سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے کام اس کا

اَلْغَنِیُّ جل جلالہٗ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں سترہ جگہ آیا ہے اور غنیا" تین جگہ مغنون دو جگہ اور اس کے افعال اغنی اور یغنی کئی جگہ

"غنی" کے معنی عربی زبان میں امیر کے ہیں پھر یہ لفظ اپنا یہ مفہوم لے کر ایران پہنچا اور پھر ہندوستان آیا لہٰذا فارسی اور اردو میں بھی اس کے معنی مال دار کے ہو گئے مگر عربی زبان میں بھی اس کے یہ اصلی معنی نہیں ہیں۔ دراصل "غنی" کے معنی بے نیاز و بے پروا کے ہیں مگر تونگر کے لئے یہ لفظ اس لئے استعمال ہونے لگا کہ امیر آدمی بوجہ اپنی دولت کے بہت سی چیزوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ اسی لئے حسین عورت کو غانیہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے آرائش سے بے نیاز ہوتی ہے یا اس لئے کہ وہ اپنے شوہر کو دوسری عورتوں سے بے پروا کر دیتی ہے یا اس لئے کہ وہ اپنی ضروریات سے بے پروا رہتی ہے کہ شوہر اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ **مَا اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ** "ابولہب کو اس کا مال بے نیاز نہ کر سکا" **لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ** "نہ تنومند کرتا ہے نہ بھوک سے بے پروا کر سکتا ہے"۔

تو دراصل عربی زبان میں "غنی" کے معنی مالدار کے نہیں ہیں۔ بے نیاز و بے پروا کے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ اسم جہاں بھی آتا ہے مال دار کے معنی نہیں ہوتے بے پروا کے ہوتے ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ "غنی" اس لئے ہے کہ اس کے پاس طرح طرح کے ذخائر اموال ہیں یا اس لئے کہ اس کے معین و مددگار و آل و عیال اور خدمت گار بہت سے ہیں۔ یا اس لئے کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟ اموال و اولاد حشم و خدم خواہ کسی انسان کے پاس کتنے ہی ہوں۔ اسے بے

نیاز نہیں کر سکتے بلکہ احتیاج روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے "آنانکہ "غنی" ترند محتاج ترند" جو "غنی" ہیں وہ زیادہ محتاج ہیں۔ استغناء کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا استغناء تو صرف ترک ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں کو مستغنی نہیں پاؤ گے البتہ فقیر اللہ والے کو مستغنی پاؤ گے تو غنا ارتکاب سے نہیں ترک سے حاصل ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اللہ تعالی ارتکاب سے "غنی" بنا کہ اس نے نوع بنوع کی تخلیقات کیں یا ترک سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استغناء کسی چیز کا مرہون منت نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ایسا ہوا تو وہ اس چیز کا تو یقیناً محتاج ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کا استغناء ارتکاب و ترک دونوں سے بالاتر ہے بس اس کی ذات "غنی" ہے۔ نہ وہ اپنی کسی صفت کی وجہ سے "غنی" بنا جیسا کہ ہم ارتکاب یا ترک سے "غنی" بن سکتے ہیں ہمارا غنا کسی نہ کسی چیز کا مرہون منت ضرور ہو گا۔ چونکہ وہ "غنی مطلق" ہے۔ لہٰذا اس کا غناء کسی چیز کا مرہون منت نہیں۔

دراصل ہمارا استغناء بھی اموال و اولاد و حشم و خدم سے نہیں بلکہ دل کے مستغنی ہونے سے انسان مستغنی ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

؎ یہ اور بات ہے نہ بنے یا بنی رہے   پر آدمی کو چاہئے دل کا "غنی" رہے

مطلب یہ کہ آدمی مال و دولت سے "غنی" نہیں ہوتا دل سے "غنی" ہوتا ہے ہر اچھے یا برے حال میں دل کو مستغنی رکھنا چاہیئے بعض لوگ نہیں بلکہ اکثر لوگ بظاہر "غنی" معلوم ہوتے ہیں مگر ان کا دل "غنی" نہیں ہوتا بلکہ سینے کے اندر کوئی نہ کوئی خلش رہتی ہے۔ ظاہری غنا طاری کر لینا تو بڑا ہی آسان ہے غنائے باطنی ہر کسی کو میسر نہیں "غنائے باطنی" اسی شخص کو میسر آسکتا ہے جو اس "الغنی" کی صفت غنا اپنے اندر پیدا کر لے۔

کہتے ہیں کوئی بادشاہ شکار کرنے کے لئے نکلا تو ایک بہروپیا اسے دھوکا دینے کے لئے نکلا مگر بادشاہ اس کے دھوکے میں نہ آیا سمجھ گیا کہ بہروپیا ہے۔ پھر سلام کر کے انعام کا طالب ہوا بادشاہ نے کہا تو مجھے دھوکا تو دے ہی نہیں سکا انعام کیسا؟ البتہ اگر مجھے دھوکا دے دے گا تو منہ مانگا انعام دوں گا۔ بہروپیا بادشاہ

کو دھوکا دینے کے لئے فقیر بن کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھا رفتہ رفتہ مخلوق اس کے پاس دعا کے لئے جانے لگی جب اس کی شہرت بادشاہ تک پہنچی تو ایک دن بادشاہ بھی اس کی زیارت کے لئے گیا۔ اس نے سلام عرض کیا اور معافی چاہی اور اور کہا میں وہی بہروپیا ہوں جسے آپ نے حکم دیا تھا کہ مجھے دھوکا دو تو انعام دوں گا۔ بادشاہ نے کہا مانگ کیا مانگتا ہے۔ کہنے لگا اب مجھے آپ کا زر و جواہر نہیں چاہیئے۔ جب مصنوعی طور پر اس کا بندہ بن جانے پر یہ کچھ ملا اگر اصلی طور پر اس کا بن جاؤں گا تو بالکل ہی مستغنی ہو جاؤں گا۔

ظاہر کا باطن پر ضرور اثر پڑتا ہے اگر نیک نہیں ہو تو نیکوں کی سی صورت بنالو۔

*

فَالِقُ الاِصبَاحِ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"فَالِقُ الاِصْبَاحِ" وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا

وہ صبح لانے والا ہے اور اس نے رات کو سکون بنایا۔

سورہ الفلق میں ہے **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ**

آپ کہیئے میں رب فلق کی پناہ مانگتا ہوں۔

عربی زبان میں فلق کے معنی پھاڑنے کے یا کھولنے کے ہیں چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

نفلق هاما من رجال اعزۃ علینا وهم کانو اعق واظلما!

ہم پھاڑ ڈالتے ہیں کھوپڑیاں افلق کے معنی عجیب کام کرنے والے کے ہیں اور جب پھل پھول گھٹلی سے نکلتا ہے تو کہتے ہیں **فلق الشمر** پھول پھل پھوٹ پڑا۔

بہرحال فلق کے معنی پھاڑنے یا کھولنے کے ہیں جب حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی جادو گرنی نے جادو کیا تھا تو رد سحر کے لئے سورہ فلق اور والناس نازل ہوئی تھیں یہ دونوں سورتیں جادو اور نظربد کے دور کرنے کے لئے زود اثر ہیں اور اگر کسی کو ڈراؤنے خواب نظر آتے ہوں اور وہ سوتے وقت الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ لے تو یقیناً برے خواب بند ہو جاتے ہیں شاید کسی حدیث میں دیکھا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر الحمد شریف اور چاروں قل سوتے وقت پڑھ لے تو ہر قسم کے دردوں سے محفوظ رہتا ہے میرے ایک نوے سالہ عزیز کو جوڑوں میں درد ہوا کرتا تھا انہوں نے اس پر عمل کیا تو درد کافور ہو گیا حالانکہ ہر قسم کے ڈاکٹری اور طبی علاج سے خلاصی نہیں ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے حضور کو رب فلق کی پناہ طلب کرنے کو فرمایا اس لئے کہ صبح ہوتے ہی بلائیں دور ہو جاتی ہیں صبح صلاح و فلاح کا وقت ہے اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ صبح صبح رزق کے دروازے کھلتے ہیں۔ سویرے اٹھا کرو سویرے اٹھنے سے صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور بدن میں چستی رہتی ہے جو لوگ دن چڑھے اٹھتے ہیں وہ سست رہتے ہیں اور ایسے لوگ کم نصیب ہوتے ہیں اس دور میں امراض و آفات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم لوگ سورج چڑھے تک سوتے رہتے ہیں جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے اس کی شعاعوں میں وٹامن ڈی بہت ہوتا ہے اس لئے بھی جو لوگ صبح سویرے اٹھتے ہیں وہ اس سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو بستر میں پڑے رہتے ہیں صبح سویرے برکات کا نزول ہوتا ہے اس لئے ہر مذہب میں صبح کی نماز رکھی گئی ہے آفتاب پرستی کا یہی فلسفہ ہے بعض عقلاء نے سورج پرستی کو رواج دیا اسلام میں سورج طلوع ہوتے وقت عبادت کو اسی لئے منع کیا گیا ہے کہ سورج پرستوں سے مسلمانوں کی مشابہت نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے صرف اس لئے فرمایا ہے کہ لوگ اس وقت سورج کی پوجا کرتے ہیں ورنہ طلوع شمس بابرکت ہے۔

صبح دم دولت بیدار بٹا کرتی ہے
جاگتے پاتے ہیں کھو دیتے ہیں سونے والے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں صبح کا کھولنے والا ہوں یعنی اندھیرے کو پھاڑ کر صبح کو نکال لاتا ہوں رات کی تاریکی کو دور کر کے روشنی پھیلا دیتا ہوں۔ رات کے متعلق اس نے اپنے آپ کو فالق الیل نہیں کہا کیونکہ رات دن کو پھاڑ کر نہیں نکلتی بلکہ اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں نے رات کو سکون بنایا یعنی صبح کو باعث نشاط و عمل بنایا ہے رات کو سست اور ٹھنڈا اور باعث سکون بنایا ہے۔ تو چونکہ دن عمل کے لئے ہے اس لئے

اس نے اپنی ایک خصوصیت یہ بیان کی کہ میں صبح لاتا ہوں۔ اگر صبح نہ ہوتی اور رات ہی رہتی تو میرے سوا کون دن کو لا سکتا اور کون روشنی لاتا۔ رات تاریکی لاتی ہے اور صبح نور لاتا ہے اس لئے اپنے آپ کو "**فَالِقُ الْاِصْبَاحِ**" کہا۔ **فَالِقُ اللَّيْلُ** نہیں کہا فرماتے ہیں۔ **اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِضِیَآءٍ** "اگر رات ہی رات مسلط رہتی تو کون تمہارے لئے روشنی لاتا"۔

یہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے رات کو ہٹا کر صبح طلوع کر دی۔ اس نعمت کا پورا پورا احساس ہم لوگ نہیں کر سکتے صرف وہ ممالک کر سکتے ہیں جہاں کئی کئی ماہ رات مسلط رہتی ہے اور وہ دن کی روشنی کو ترستے ہیں۔ جو دھوپ سے محروم ہیں وہی "فالق الاصباح" کی خصوصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ دھوپ کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے ہم میں چستی و چالاکی جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ سینکڑوں امراض دور ہوتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں جو برائیاں' آفات اور جراثیم پیدا ہوتے ہیں "فالق الاصباح" ان کو صبح نکال کر ختم کر ڈالتا ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ اپنے آپ کو "فالق الاصباح" کہہ کر ہمیں ممنون کیا ہے کہ ہم اس "فالق الاصباح" کا شکریہ ادا کریں جس نے نیند کے بعد ہمیں دوسری زندگی عطا کی۔

صبح کے لئے فالق کا لفظ استعمال کیا جس سے حرکت و ہیجان ظاہر ہوتا ہے اور رات کو سکون فرمایا کہ رات مخلوق کے آرام کے لئے ہے۔ چونکہ اس دور کا انسان فطرت کے خلاف چل رہا ہے۔ اس لئے اعصابی تناؤ کا شکار ہے اب رات میں سکون نہیں ہوتا۔ خصوصاً شہروں میں حالانکہ حیوان تو حیوان درخت بھی رات میں آرام کی نیند سو جاتے ہیں۔ اور ہر چیز مائل بہ راحت ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا اشارہ ہے کہ یہ آرام کا وقت ہے آرام کرو' سو جاؤ مگر اس دور کا انسان اب کچھ مجبور سا ہو گیا ہے کہ اگر سونا بھی چاہے تو نہیں سو سکتا رات کی ڈیوٹی' کثرت کار اور رونق بازار سے انسان مجبور ہے۔ جو لوگ رات کی ڈیوٹی دیتے ہیں ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ سردیوں میں نزلہ' زکام' کھانسی اور گرمیوں میں دوسری تکالیف لگی ہی

رہتی ہیں۔ رہی سہی کسر ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے پوری کر دی۔ جب سے ٹیلی ویژن آیا ہے لوگوں سے صبح کی نماز اور تلاوت کلام پاک ختم ہو گئی ہے اور تو اور اچھے اور پکے نمازیوں کو بھی فجر کی نماز قضا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پھر جب دیر سے اٹھتے ہیں تو نماز پڑھ لیتے ہیں مگر تلاوت غائب۔

علامات قیامت میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ ناگہانی اموات بکثرت ہوں گی۔ انسان چلتے پھرتے مرجایا کرے گا چنانچہ کچھ تیز سواریوں کی وجہ سے اور کچھ رات میں صحیح نیند نہ سوسکنے کی وجہ سے قلبی امراض بڑھ گئے ہیں شہری لوگ تو صحیح نیند سوہی نہیں سکتے گو انہیں سوتے میں احساس نہ ہو مگر کاروں' بسوں اور موٹر سائیکلوں کی آوازیں معیاری نیند نہیں سونے دیتیں۔ رات میں سڑکوں اور گلیوں کی روشنی بھی شہری آدمی کو معیاری نیند سے محروم رکھتی ہے ہم آرام سے سویرے سونا چاہتے ہیں مگر پڑوس سے ایسی خوفناک آوازیں آتی ہیں کہ آنکھ اگر کھلتی نہیں تو بد مزگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے یہ آوازیں ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی ہوتی ہیں جن پر بڑے خوفناک یا غم آلود یا لڑائی جھگڑے والے ڈرامے دکھائے جاتے ہیں کوئی کردار زور زور سے چیختا چلاتا ہے کوئی روتا پیٹتا ہے تو کوئی بے ہنگم آوازیں نکالتا ہے ایسی باتوں سے خلل پڑ جاتا ہے اور یہ نئی نسل جو پیدا ہو رہی ہے یہ تو حقیقی اور معیاری نیند سے بالکل محروم ہے تو ان کے اعصاب پرانے زمانے کے لوگوں جیسے کیسے مضبوط ہو سکتے ہیں؟ یہ آئندہ زمانے میں چلتے پھرتے نہ مریں گی تو اور کیا ہو گا؟ فضا کی آلودگی کی طرف تو اب کچھ دنوں سے ہر ملک میں توجہ دی جا رہی ہے مگر آوازوں کی آلودگی اور نیند کی آلودگی کی طرف ابھی تک کسی کا خیال نہیں گیا افسوس ہے کہ ہم اس "فالق الاصباح" کی نعمت عظمیٰ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور خواب خرگوش میں سورج نکلنے تک خراٹے بھرتے رہتے ہیں۔

الفتاح جلّ جلالہ

فتح و ظفر و کشادگیِ کار اسی "الفتاح" کے فیض سے ہے بظاہر اسباب کام کرتے ہیں مگر دراصل پسِ پردہ مُسَبِّبُ الاسباب ہوتا ہے اسی لئے قرآن شریف میں جہاں کہیں فتح و ظفر کا ذکر آیا ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی طرف کی ہے چنانچہ فرمایا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا — ہم نے تمہیں فتح مبین دی

نیز فرمایا

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ — جب نصرو فتح الٰہی آئے

فرماتے ہیں

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ — نصرت و فتح الٰہی قریب ہے

نیز فرمایا

فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ السَّمَاءِ — ہم نے ان پر آسمان کے دروازے کھول دیئے۔

کلام پاک میں ہے

رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا — پروردگار ہمیں کافروں پر فتح دے

حتیٰ کہ فرمایا

مَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی — کنکریاں آپ نے نہیں اللہ نے پھینکیں

پہلی آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں ہے جو بظاہر شکست تھی اور جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں دب کر صلح کرنا ناپسند کیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا رسول ہوں میرا ہر اقدام اللہ کی منشاء و مرضی کے ماتحت ہوتا ہے۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ ظاہری شکست دراصل اسلام کی فتح تھی ایسی

فتح جسے اللہ نے فتح مبین سے تعبیر کیا اور رسول کی بات سچی نکلی معلوم ہوا کبھی فتح الٰہی بصورت شکست بھی ظاہر ہوتی ہے۔ کوتاہ نظر انسان بعض اوقات فتح الٰہی کو اپنی شکست تصور کر کے رنجیدہ ہو جاتا ہے بعض اوقات مصیبت' بیماری اور خسارہ مستقبل کے لئے کشادگی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

میرا ایک عزیز میٹرک پاس تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے میٹنگ سیکشن میں ملازم تھا تنگی ترشی سے گزر ہوتی تھی ایک دن دفتر کا ایک فائل ان سے گم ہو گیا تو یورسٹی نے انہیں برخاست کر دیا۔ اس صدمے سے انہیں دل کے دورے پڑنے لگے اس سروس سے وہ مطمئن تھے اور ساری عمر یہیں پڑے رہتے مگر خدا کو انہیں چڑھانا مقصود تھا پریشان ہو کر کراچی چلے گئے۔ وہاں ان کے ایک عزیز دوبئی سے آئے اور اپنے بینک میں ملازم کرا دیا۔ اب وہ لاکھوں کے آدمی ہیں اور وہاں کے بینک میں ان کا لڑکا بھی ملازم ہو گیا اور پھر وہ بینک کی طرف سے امریکہ پڑھنے چلا گیا۔

دیکھو بظاہر یہ ان کی شکست تھی کہ یونیورسٹی میں اپنا کیس ہار گئے مگر دراصل یہ ہار جیت تھی یہی حال بعض امراض' مصائب اور عزیزوں کی موت کا ہے کہ وہ ہماری مادی نہیں تو روحانی و اخلاقی فتح کا سبب بنتے ہیں۔ انسان گھبرا جاتا ہے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے معلوم نہیں لوگ کیوں خودکشی کرتے ہیں۔ فتح و نصرت الٰہی کا انتظار نہیں کرتے۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔

قرآن شریف میں ہے آسمان و زمین جڑے ہوئے تھے ہم نے انہیں کھول دیا۔ تو یہ عظیم فتح و کشادگی اسی "الفتاح" نے کی کہ دنیا آباد ہو گئی۔

حضورؐ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا آپ نے اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا تو جس شخص کے خلاف فیصلہ فرمایا تھا وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ **حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔** آپ نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو فرمایا اسے واپس بلا لاؤ۔ وہ حاضر خدمت ہوا تو فرمایا تو نے ایک بڑی ذات کا سہارا لیا ہے۔ مگر دیکھ عاجز بیٹھ رہنے والے انسان کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ **علیک بالکیس** (کیس کو لازم پکڑ)

کیس کے معنی عربی زبان میں اپنی منفعت کے حریص ہونے کے ہیں۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ اپنی منفعت کے لئے جدوجہد کرتے رہو۔ عاجز بندہ اللہ کو پسند نہیں بندۂ مومن کو اپنی مفید مطلب چیزوں کا حریص ہونا چاہیئے اور اپنی ضروریات کو مجتمع کرنا چاہیئے۔ قنوطی انسان اللہ کو پسند نہیں اور نکمّے نکھٹو لوگوں سے خدا نفرت کرتا ہے جدوجہد کرتے رہنا اور پھر فتح الٰہی کا منتظر رہنا بندہ مومن کی شان ہے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انور کے بارے میں حریص کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حریص علیکم تو کیس یعنی حرص حصول منافع مومن کی شان ہے کیونکہ اسلام رہبانیت کو جائز نہیں سمجھتا۔ زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن ہے جو مال جمع کرنے والوں پر واجب ہوتی ہے۔ معلوم ہوا مال جمع کرنا کوئی بری بات نہیں کیونکہ مال فتح الٰہی کا سبب ہے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اپنی کتاب التوحید میں لکھتے ہیں اگر اسباب کو کوئی شخص باعث کشادگی سمجھتا ہے تو وہ مشرک ہے اسباب کا ارتکاب کرنا چاہیئے مگر فتح و کشادگی کار کو اللہ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔

محمد بن عبدالوہاب بخدی توحید کے معاملے میں بہت ہی سخت ہیں۔ لکھتے ہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے علم و ہنر سے ایسا ہوا میرے مال سے یہ فائدہ ہوا اگر کتا نہ ہوتا تو چور نہ بھاگتے اگر بطخیں نہ ہوتیں تو چور گھر میں گھس جاتے۔ اس قسم کی باتیں کہنے والا کافر و مشرک ہے۔ اگر اس اعتقاد کے ساتھ یہ باتیں کہتا ہے کہ صرف یہی وسیلہ بنے تو وہ کافر اور اگر یہ اعتقاد نہیں رکھتا مگر اسباب کو موثر مانتا ہے تو مشرک ہے کیونکہ جو کچھ ہے مسب الاسباب ہے وہ ان سے اثر کو سلب کر سکتا ہے۔ اسباب تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص صرف دنیا کی غرض سے کوئی کام کرتا ہے تو وہ بھی مشرک ہے اسی طرح دنیا کے تمام شعراء ان کے عقیدے کے مطابق مشرک و کافر ہیں کہ وہ افلاک و زمانہ وغیرہ کی طرف کاموں کی نسبت کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اولیاء اللہ سے کچھ مانگتے ہیں وہ بھی مشرک ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب بخدی وغیرہ کی کتابوں کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ

سارا عالم کفر و شرک میں مبتلا ہے اور کوئی بھی کفر و شرک سے محفوظ نہیں ہے۔
خدا ہم سب کو کفر و شرک سے محفوظ رکھے اور گمراہی سے بچائے۔

یوں تو "فتوحات ربانی" ہر شخص کو اس کے مرتبہ کے مطابق ہوتی ہی رہتی ہیں مگر "فتوحات" صوفیہ کی ایک خاص اصطلاح ہے انہوں نے اپنی کتابوں کے نام بھی "فتوحات مکیہ" اور "فتوح الغیب" وغیرہ رکھے ہیں۔ اولیاء اللہ کو جو بے حیلہ و کاوش رزق ملتا ہے وہ اسے فتوحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ فتوحات بعض کو کم اور بعض کو زیادہ ہوئیں حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے حجرے میں اشرفیوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ کسی صوفی نے ان سے اعتراضا" کہا یہ کیا؟

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ

آپ کہہ دیجئے کہ متاع دنیا تھوڑی سی ہے۔ تو بتاؤ ہمیں اس قلیل میں سے کتنا دیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اور دنیا بھر کی دولت کے مالک بھی تھے۔ اگر "دل بیار و دست بکار" ہو تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ ورنہ سب کچھ غلط۔
کہتے ہیں کہ کسی بزرگ سے ایک سادھو نے فخریہ کہا کہ میں پانی بن سکتا ہوں انہوں نے فرمایا یہ کیا مشکل بات ہے میں بھی پانی بن سکتا ہوں۔ لوگوں سے کہا جب یہ پانی بن جائے تو ایک کپڑا اس میں تر کرلینا اور میرے پانی سے دوسرا کپڑا بھگولینا۔ سادھو والے کپڑے میں بدبو تھی اور مومن بزرگ کے کپڑے میں خوشبو تھی۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

کہتے ہیں ایک سادھو نے ایک بزرگ سے کہا میں ہوا میں اڑ سکتا ہوں فرمایا دکھاؤ وہ اڑا تو انہوں نے اپنی جوتی ہوا میں اڑا دی جب تک وہ زمین پر نہ اترا برابر اس کے سر پر پڑتی رہی یہ دیکھ کر وہ داخلِ اسلام ہو گیا۔

ہر شخص کو اس کے علم و جہدو ماحول کے مطابق فتوحات ہوتی ہیں۔
شاعروں کو شاعرانہ' فلسفیوں کو فلسفیانہ اور اہل فن کو ان کے فن کے مطابق گاندھی جی بعض سوالات کے بارے میں اکثر کہا کرتے تھے۔ ابھی روشنی نہیں

آئی۔ اہل عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ ہر شاعر کا ایک جن ہوتا ہے جو اسے القاء کرتا ہے جن تو خیر کیا ہوتا ہے دراصل اس "الفتاح" کی طرف سے شرح صدر ہوتا تھا جو فیض ورزق وغیرہ کے پہنچانے میں کافر و مومن کا امتیاز نہیں کرتا کیونکہ برے بھلے سب اسی کے بندے ہیں اور مخلوق اس کی عیال ہے۔

حدیث شریف میں ان تین نوجوانوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو بارش کے خوف سے کسی پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ قضارا اوپر سے ایک چٹان گری اور اس نے غار کا دہانا بند کر دیا تو وہ بڑے پریشان ہوئے کہ کیا کریں خالی ہاتھ-بھاری چٹان نہ چھینی نہ ہتھوڑی، انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے شاید فتح و کشادگی نصیب ہو جائے طے یہ پایا کہ ہر ایک کسی ایسے اعلیٰ عمل کے وسیلے سے دعا مانگے جو اس نے خالصتاً" لوجہ اللہ کیا ہو۔ ان میں سے ایک نوجوان آگے بڑھا اور اس نے کہا پروردگار میرے ماں باپ بوڑھے ہو گئے تھے رات ہوئی تو انہوں نے دودھ طلب کیا۔ میں پیالے میں دودھ لے کر آیا تو وہ دونوں سو چکے تھے میں ساری رات ان کے لئے دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے کھڑا رہا کہ از خود بیدار ہوں تو پیش کروں وہ صبح تک سوتے رہے اور میں وہ دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے ساری رات کھڑا رہا۔ اے خدا اگر میں نے یہ کام صرف تیری خوشنودی کے لئے کیا تھا تو اس چٹان کو کشادہ کر دے چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی۔ پھر دوسرا نوجوان آگے بڑھا اس نے کہا اے خدا میری چچا زاد بہن بڑی ہی حسین و جمیل تھی میں اس پر عاشق تھا وہ میرے قبضے میں نہ آتی تھی۔ ایک دفعہ منت سماجت سے وہ راضی ہو گئی۔ جب میں ہم بستر ہونے لگا تو اس نے کہا خدا سے ڈر۔ اے خدا میں فوراً اس سے جدا ہو گیا۔ پروردگار اگر یہ کام میں نے صرف تیری خوشنودی کے لئے کیا تھا تو اس چٹان کو ہٹا دے چنانچہ چٹان اور تھوڑی سی اوپر ہو گئی اس طرح تینوں نے ایسا ہی کیا اور فتح الٰہی سے چٹان نے انہیں راہ دے دی۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فتح و کشادگی منجانب اللہ ہوتی ہے آلات و اسباب نظام عالم کی ایک کڑی ہیں ان نوجوانوں کے پاس کسی قسم کے اوزار نہ

تھے صرف اس "الفتاح" کے فضل و کرم سے کشادگی نصیب ہوئی وہ جسے چاہے فتح و کشادگی عطا کر دیتا ہے جب چاہے اور جسے چاہے بے وسیلہ کام بھی بنا دیتا ہے۔ لہٰذا فتح و نصرت اسی سے طلب کرنی چاہیئے اور اسباب پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ مسبب الاسباب خود کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے اور بغیر سبب کے بھی فتح دے دیتا ہے۔

؎ خدا کے کام تو آلات پر نہیں موقوف
ابوالبشر ہوئے بے مادر وپدر پیدا

*

القادر جل جلالہ

اگر ہم میں قدرت و طاقت نہ ہو تو ہم ایک سوئی بھی نہیں بنا سکتے۔ طاقت نہ ہو تو قلم تک نہیں تراش سکتے۔ لیکن اگر طاقت ہو تو بقدر قوت و قدرت کام کر سکتے ہیں اپنی قدرت و طاقت سے زیادہ ہم کام نہیں کر سکتے چھوٹی سے لے کر بڑی سے بڑی چیز ہماری قدرت و قوت کا شاہکار ہے اگر ہاتھوں میں طاقت نہ ہو تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر پاؤں میں قدرت نہ ہو تو ہم چل نہیں سکتے۔ ہم نے جو اس دنیا کو سجایا ہے قدرت و طاقت کے بل بوتے پر سجایا ہے۔ اگر ہم میں طاقت نہ ہوتی تو یہ فلک شگاف عمارتیں میلوں لمبی سڑکیں اور پل کیسے بناتے ہم نے اس دنیا کو گلزار بنا دیا ہے۔ صرف اپنی طاقت کے بل بوتے پر افراد اور قومیں اپنی طاقت کے بقدر کام انجام دیتے ہیں۔ جو افراد اور جو قومیں کم زور ہیں ان کی صنعت و حرفت بھی کمزور ہے اور جو طاقت ور ہیں ان کی ہر چیز طاقت کا مظہر ہے۔ افراد کی طاقت کا مظہران کی مصنوعات ہیں اور اللہ کی قدرت و قوت کا مظہر یہ کائنات ہے مخلوق میں جیسی بھی قوت ہے اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ ورنہ ہر مخلوق اپنے آپ کو سب سے زیادہ قوی بناتی اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کرتی ۔ مگر کسی صاحب قدرت نے اپنی قدرت سے اس کی حیثیت کے مطابق قوت سے نواز دیا ہے۔ وہ آگے قدم نہیں بڑھا سکتی۔ ہر شے کی قدرت و طاقت کی ایک حد ہے جس کی وہ پابند ہے مگر اس قادر مطلق کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے کیونکہ اسے کسی نے قدرت عطا نہیں کی کہ وہ محدود ہوتی جیسے وہ خود لامحدود ہے اس کی قدرت بھی لامحدود ہے کسی سے مانگی ہوئی نہیں ہے۔

ذرا پہاڑوں کو دیکھو کیسے بلند کیسے وسیع و عریض اور کتنے محفوظ ہیں ظاہر

ہے یہ اوصاف ان کے اپنے پیدا کردہ نہیں ہیں تو جس ہستی نے ان میں یہ اوصاف پیدا کئے وہ کتنی عظیم قدرت والی ہو گی انہیں زمین کے جگر میں کس نے گاڑا؟ اس نے انہیں کہاں سے اٹھا کر کہاں رکھ دیا کس نے ان میں اتنا ثقل پیدا کیا کس نے انہیں اتنا سخت بنایا کہ تیز و تند ہوائیں سر توڑ کوشش کے باوجود انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں اور سمندروں کی موجیں اپنا ہی سر پھوڑ کر واپس جانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ذرا سمندروں کو دیکھئیے۔ اس کی قدرت کتنی لطیف ہے اور باوجود لطافت کے اتنی زور دار بھی ہے کہ پہاڑوں جیسے جہاز بھی تنکے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں لطافت میں طاقت کا پیوند کس خوبی سے کیا ہے کہ لطیف بھی ہے اور طاقت ور بھی جیسے ہوا بے حد لطیف ہے اور بہت طاقتور بھی وہ ہوا جو اس قدر نازک ہے کہ ہمارے ذرا سے اشارے سے پاش پاش ہو جاتی ہے بڑی بڑی چیزوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتی ہے۔

اس نے پانی جیسی لطیف اور بے بو چیز سے ساری مخلوق کو پیدا کر کے رکھ دیا اور پھر اس قطرۂ ناچیز سے رنگ برنگ کے درخت پھول بوٹے انسان اور حیوان بنا دیئے کہ دیکھا جائے تو ہر شے کا رنگ روپ جدا ناز و انداز نرالے اور چھب ڈھب عجیب ایک قطرۂ آب سے کیا کیا پھول کھلائے ہیں کیسے کیسے موتی مونگے اور جوہرات پیدا کئے ہیں کہ اس کی قدرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس کی قدرت کے کیسے کیسے نمونے ہیں۔ زمین' آسمان' سورج' چاند اور ستارے گواہی دے رہے ہیں کہ ہمیں کسی قادر نے پیدا کیا ہے ورنہ ہم کیا اور ہماری بود کیا پھر یہ سورج اور چاند جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے ایسے ایسے کروڑوں اور بھی ہیں۔ یہ کیسے معلق ہیں کون انہیں روکے ہوئے ہے۔ اور یہ کیسے فضا میں تیرتے ہیں ماننا پڑتا ہے کہ کسی قادر مطلق نے انہیں روشنی بخشی اور ان بے سہاروں کو سہارا دیا۔

آپ نے شادی بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر دیکھا ہو گا لوگ اپنے گھروں پر بجلی کے قمقموں سے کیسے کیسے چاند تارے اور در و دیوار بناتے ہیں۔ وہ خود تو آکر

مکان پر نہیں لگ جاتے انہیں کوئی صاحب قدرت آکر لگاتا ہے۔ اسی طرح آسمان پر چاند تارے خود نہیں آلگے کسی قادر مطلق نے لگائے ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جورات دن قدرت خداوندی کے کرشمے دیکھتے ہیں اور پھر بھی نہیں مانتے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں۔ وہ اندھے ہیں دیکھ نہیں سکتے بہرے ہیں سن نہیں سکتے اور حیوانات سے بھی بدتر ہیں کہ گواہی نہیں دے سکتے۔

یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ اس "قادر مطلق" کی قدرت اسی عالم تک محدود ہے جسے تم رات دن دیکھ رہے ہو۔ زمینوں کے نیچے بھی بہت سے عالم موجود ہیں۔ پہاڑوں کے شکموں میں نہ جانے کتنے عالم آباد ہیں۔ سمندروں کی تہوں میں بے شمار عالم آباد ہیں اور فضائے آسمانی میں ان گنت عالم آباد ہیں۔

؎ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

تلاش کرو گے تو اور بہت سے عالم پاؤ گے۔ جستجو شرط ہے۔ بقدر جستجو انعام ملتا ہے۔

؎ ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔

اس عالم کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے جو ان مادی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا جسے فلاسفہ عالم اشباہ و نظائر کہتے ہیں اور جسے صوفیہ عالم امثال سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ عالم اس عالم سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جہاں نہ وزن کوئی چیز ہے نہ قید زمان و مکان۔ وزن کی بے قدری تو انسان کو چاند پر جانے ہی سے معلوم ہو گئی گو ابھی تک بہت سے حقائق آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ جب یہ مادی آنکھیں بند ہو جائیں گی تو عالم امثال و ارواح والی آنکھیں کھل جائیں گی تو ہم اس عالم کو دیکھ سکیں گے۔

آپ کا یہ وجود جس کی آپ رات دن غور و پرداخت کرتے ہیں جس کے آرام و آسائش کا ہر دم خیال رکھتے ہیں اور جس کی آسودگی کے لئے دن رات جائز و ناجائز محنت کرتے ہیں۔ یہ آپ کا اصلی وجود نہیں ہے۔ یہ تو اس کی نقلی کاپی ہے اصل کاپی عالم بالا میں محفوظ ہے۔ اور جس پر آپ کے اچھے برے اعمال

کے دھبے پڑتے رہتے ہیں اور وہاں ریکارڈ قائم ہوتا رہتا ہے۔

یہ عالم جس پر آپ **ریجھ** رہے ہیں۔ بالکل فانی اور بے بود ہے۔ عارضی اور دھوکا ہے ۔ یہاں اس "قادر مطلق" نے دراصل فنا کے عجائبات دکھائے ہیں۔

؎ نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

فنا بھی نعمت ہے تب ہی تو اسے بھی نعمتوں میں شمار کیا ہے ورنہ **فبای لاء ربکما تکذبان** کا یہاں کیا موقعہ؟۔

؎ مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گزار ہوتا ہے

*

انسان مقدس بن کر فرشتوں سے بھی زیادہ مقدس ہو سکتا ہے اور گرے تو انتہائی گندگی سے بھی زیادہ گندہ ہو سکتا ہے جس طرح اس نے اپنی صفات سے مخلوق کو حصہ دیا اسی طرح صفت تقدس سے بھی مخلوق کو حصہ عطا کیا ہے مگر تقدس حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط مقرر کی ہیں جس طرح ہر چیز کے حصول کے کچھ نہ کچھ اسباب و شرائط ہیں۔

حصول تقدس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ہر قسم کی گندگی سے دور ہے جس قدر گندگی سے بچے گا تقدس پائے گا گندگی کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی ظاہری گندگی وہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں اور باطنی وہ جسے ہم حواس خمسہ سے محسوس نہیں کر سکتے پہلی قسم ہمارے جسم کو گندہ کرتی ہے اور دوسری ہماری روح کو۔ طہارت و پاکیزگی کے اصول نجاست ظاہری سے بچنے کے لئے ہیں اور باطنی سے بچنے کا ذریعہ حسن خلق وغیرہ ہیں نماز روزہ زکوٰۃ اور حج ذکر و فکر و علم و عمل وغیرہ باطنی نجاست کو دور کرتے ہیں اس طہارت باطنی کو اخلاق حسنہ سے ناپا تولا جا سکتا ہے اگر کوئی شخص رات دن مذکورہ بالا اعمال حسنہ کرتا ہے لیکن اخلاق حسنہ سے بے بہرہ ہے تو سمجھ لو اس کے اعمال کسی وجہ سے ضائع جا رہے ہیں جیسے ہم ظاہر کی نجاست سے کسی کی پاکیزگی کو اس کے جسم اور کپڑوں وغیرہ کی پاکیزگی سے محسوس کر سکتے ہیں اسی طرح باطنی نجاست سے پاکیزگی کو اخلاق حسنہ سے جان سکتے ہیں کتنے ہیں مسلمان حاجی اور غازی اور نہ جانے کیا کیا ہیں مگر ان کے اخلاق نہیں بدلے یہ وہ لوگ ہیں جن کی روح پاکیزہ نہیں ہوئی روح کی پاکیزگی کا اخلاق پر اثر ضرور بالضرور پڑتا ہے۔ اگر روح ناپاک ہے تو اس سے اخلاق حسنہ کا ظہور نہیں ہو سکتا جیسے کوئی شخص جسم و جامہ کو پاک صاف کر کے پھر ان پر نجاست مل لے تو اس کی پاکیزگی بے اثر رہے گی یہی حال ان لوگوں کا ہے جو ذکر و فکر و مراقبہ و نماز روزہ کرتے ہیں مگر برے اخلاق سے نہیں بچتے کہ ادھر روح کو پاکیزہ کرتے ہیں اور ادھر اسے برے اخلاق سے ملوث کر دیتے ہیں اس طرح ایسے لوگ ساری زندگی گزار دیتے ہیں اور **خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا**۔

ترجمہ وہ نیک اور بد اعمال کو گڈ مڈ کرتے رہتے ہیں۔ کا مصداق بن جاتے ہیں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو صرف نیک عمل ہی کرتے ہیں برائی کے پاس نہیں پھٹکتے اور ایسے بھی بہت کم ہیں جو صرف اعمال بد کرتے ہیں اور کوئی نیکی کبھی بھی نہیں کرتے مسلمانوں کی اکثریت پہلے گروہ سے ہے۔

؎ ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو' ابھی راہ میں ہیں' سنگ گراں اور

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

؎ قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

؎ تو دھن لے! دھنیئے اپنی دھن
پرائی دھنی کا پاپ نہ پن
تیری دھنی میں چار بنولے
سب سے پہلے ان کو چن

کبیر داس فرماتے ہیں۔ "(من) کا منکا پھیر کے بابا منکا منکا پھیر"

بہر حال کوشش کرنے سے کچھ نہ کچھ تقدس ضرور پیدا ہو جاتا ہے مگر کامل تقدس ہمیں بھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم مادے سے بنے ہیں اور چونکہ صرف اسی کی ذات سراپا نور ہے اور نور ملوث نہیں ہوتا لہٰذا وہ "القدوس" مطلق ہے سڑانڈ' بدبو' بدرنگ ہو جانا' بکھر جانا' کم زیادہ ہو جانا' بدشکل ہو جانا' گل سڑ جانا' مادے کی خاصیت ہے لہٰذا کوئی مادی چیز کامل طور پر مقدس نہیں ہو سکتی قدوسیت کاملہ صرف اسی کے ساتھ خاص ہے۔

القدیر جل جلالہٗ

اس "قدیر" مطلق نے ہر چیز کی کچھ قدریں مقرر کر دی ہیں کہ وہ ان سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ افلاک کا ایک مدار ہے اور ہر ایک کا مدار جداگانہ ہے۔ اور جن کی تقدیر میں عدمِ حرکت لکھ دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں جیسے درخت اپنی جگہ قائم رہتے ہیں ہر ستارے کی اپنی ایک خاص روشنی ہے وہ اپنے رنگ کو نہیں چھوڑ سکتا اور ہر ستارے کا ایک جداگانہ مزاج ہے جسے وہ ترک نہیں کر سکتا ہر ایک کی ایک خاص رفتار ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا اور ہر ایک کی ایک خاص نوعیت کی حرکت ہے خواہ وہ مستدیرہ ہو یا کسی اور طرح کی ان افلاکی فضاؤں کی یگانہ حالت ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے اور ان افلاک و نجوم کی مخلوقات کے خصوصی احوال ہیں جن سے وہ سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ شہابِ ثاقب اپنی تقدیریں نہیں بدل سکتے۔

زمین کے مدار کا ایک مزاج ہے اور زمین کی حرکت کا ایک نظام ہے۔ اور خود اس کے بھی مختلف رنگ مختلف حالتیں اور مختلف خواص ہیں۔ پہاڑوں کے اپنے خاص انداز ہیں اور پتھروں کے خصوصی رنگ و تاثیر ہیں۔ ایک خاص وقت آتا ہے کہ پتھر کوئلہ بن جاتا ہے یا ہیرے کا روپ دھار لیتا ہے یا' یاقوت و زمرد بن جاتا ہے۔

سمندروں اور دریاؤں کی کچھ حدود ہیں کہ شدید طغیانی میں بھی وہ ان حدود سے باہر نہیں جا سکتے اور ان کی مخلوقات کے خصوصی مقادیر ہیں کوئی چھوٹی نسل کی مچھلی ہے تو وہ ہمیشہ چھوٹی ہی رہے گی اور جو بڑی سمندری مخلوقات ہے ان کے لئے خاص اوزان و مقادیر ہیں جن سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔ زمینی مخلوق ہو یا فضائی' پہاڑی ہو یا دریائی ہر ایک کے لئے ایک خاص رزق مقدر ہے کہ اس

کے سوا وہ کچھ نہیں کھا سکتا اگر وہ چاہے بھی تو اس کے اعضاء اسے قبول نہیں کرتے اور باہر نکال دیتے ہیں چونکہ ابتدائے تخلیق پانی سے ہوئی اس لئے عظیم الجثہ حیوانات پانی میں ہیں خشکی میں اتنے بڑے جانور نہیں ہیں اور چونکہ زندگی کی نمود پانی سے ہے لہٰذا پانی میں اس قدر مخلوق ہے کہ خشکی پر اتنی نہیں بے شمار قسم کی مچھلیاں، صدف، گھونگے اور حیوانات ہیں جن کے اقسام کا ابھی تک یہ ترقی یافتہ انسان احاطہ نہیں کر سکا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ ان کی کیا قدریں ہیں۔ سمندری نباتات کے خاص مقادیر ہیں اور سمندروں کے سانس لینے اور سانس باہر پھینکنے کے کچھ اصول ہیں اور ان کی طغیانی کے اوقات متعین ہیں۔

. ہر جان دار ماں کے رحم یا انڈے وغیرہ میں ایک خاص مدت تک رہتا ہے پھر باہر نکلتا ہے تو ایک خاص وقت تک عالم طفولیت میں رہتا ہے پھر عالم شباب میں اور پھر عالم شیخوخت (بڑھاپا) میں اس کے بعد وہ فنا ہو جاتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ عالم طفولیت کے بعد عالم شیخوخت آجائے نہ یہ ممکن ہے کہ بغیر عالم طفولیت میں قدم رکھے عالم شباب میں قدم رکھ دے۔ جیسے دن اور رات اپنے اپنے مقررہ وقت پر آتے ہیں، یہ بھی اپنے مقررہ وقت پر آتے ہیں یا جیسے موسم ایک خاص وقت پر آتے ہیں، اسی طرح شباب و شیخوخت بھی خاص وقت پر آتے ہیں یہ تینوں عالم حیوانات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہیں اشجار و نباتات کا بھی یہی حال ہے جنہیں ہر شخص رات دن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔

مگر یہ تینوں عالم ہر مادی و غیر مادی اشیاء پر بھی طاری ہوتے ہیں جنہیں ہر شخص نہیں دیکھ سکتا۔ قوموں پر بھی یہ تین زمانے گزرتے ہیں۔ ایک وقت ہوتا ہے کہ ایک قوم جنم لیتی ہے پھر وہ رفتہ رفتہ عالم شباب کو پہنچ جاتی ہے اور پھر وہ رو بہ زوال ہو جاتی ہے اور مدت مدید کے بعد فنا ہو جاتی ہے کتنی ہی قومیں، تہذیبیں اور ادیان اس آسمان کے تلے پیدا ہوئے، شباب کو پہنچے، بوڑھے ہوئے اور پھر فنا ہو گئے کہ اب انھیں کوئی جانتا بھی نہیں۔

اشخاص پر نہ صرف جسمانی طور پر یہ عالم طاری ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی ہر چیز پر یہ تین دور گزرتے ہیں ایک زمانہ ہمارے ابتدائے کمال کا ہوتا ہے تو دوسرا

شباب کا اور تیسرا زوال کا ایک وقت آتا ہے کہ انسان بالکل مفلس ہوتا ہے پھر دولت بڑھنی شروع ہوتی ہے اور کمال کو پہنچ جاتی ہے پھر زوال ہونے لگتا ہے نسیان و عجز طاری ہونے لگتا ہے اور ہمارے ساتھ ہمارا علم و کمال و پیشہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

الغرض عالم کی ہر شے میں مدوجزر ہے اور ہر مدوجزر ایک خاص قدر کا پابند ہے حتی کہ ان دیکھی چیزوں میں بھی مدو جزر ہے علوم و حقائق میں بھی مدوجزر ہے، تہذیب و تمدن اور ادیان میں بھی مدوجزر ہے، کمالات و پیشہ جات میں بھی مدوجزر ہے ایک حالت پر باقی رہنے والا تو بس وہ "القدیر" ہی ہے ورنہ ہر چیز تغیر و تبدل کی محکوم ہے۔

ہر چیز کا ایک سائز مقرر ہے بادام کا ایک سائز ہے پستے کا ایک سائز ہے، پھلوں کے خاص خاص سائز ہیں ترکاریوں کے اپنے اپنے مخصوص سائز ہیں درختوں کی ایک مخصوص لمبائی ہے بیلوں کی ایک خاص حد ہے، بوٹیوں کی خاص مقدار ہے، پھلوں کے خاص خاص دائرے ہیں۔ وہ اپنے رنگ یا بو کو ترک نہیں کر سکتے ہاتھی اپنے سائز سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ شیر اپنے ماحول کے مقرر سائز سے نہیں بڑھ سکتا یہی حال باقی جانوروں کا ہے چیونٹی کا ایک مخصوص انداز ہے خاص دائرہ کار ہے اسے نیند نہیں چھو سکتی وہ جانور یا انسان نہیں بن سکتی اور انسان شیر نہیں بن سکتا۔ چیونٹی کی تقدیر میں بلوں میں رہنا لکھا گیا ہے مشقت اس کا مقدر ہے اس کی غذا بہت عام ہے مگر درندے صرف گوشت ہی کھا سکتے ہیں ساگ پات یا پھل نہیں کھا سکتے۔

جن پھلوں کی قسمت میں خوشبو نہیں لکھی گئی وہ خوشبو نہیں دیتے اپنا رنگ اور سائز تبدیل نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خلیفہ الٰہی خداداد حکمت سے ان میں تبدیلی پیدا کر دے تو وہ بھی ایک حد تک ہی کر سکتا ہے۔ شلجم تربوز سے بڑا نہیں ہو سکتا چیونٹی بکرے کے برابر نہیں ہو سکتی اور بکرا ہاتھی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اور ہاتھی گھڑیال نہیں بن سکتا بعض حقائق اپنے آپکو تبدیل نہیں کر سکتے۔ جھوٹ سچ نہیں بن سکتا۔ بخل سخاوت نہیں ہو سکتا۔ اور شجاعت بزدلی نہیں بن سکتی۔

جس طرح مادیات کے کچھ حدود ہیں روحانیت کے بھی ہیں کوئی انسان خواہ کتنی ہی ریاضتیں کرے خدا نہیں بن سکتا ہوا میں اڑ سکتا ہے پانی پر چل سکتا ہے خوارق عادات کر سکتا ہے جنوں یا فرشتوں جیسا بن سکتا ہے مگر حقیقتاً جن یا فرشتہ نہیں بن سکتا۔ فرشتوں سے بڑھ سکتا ہے مگر بشریت کو نہیں چھوڑ سکتا سب کچھ ہو سکتا ہے مگر خدا نہیں بن سکتا۔ اور جو لوگ خدائی کے دعویدار ہوئے وہ دراصل خیالی طور پر ہوئے انہیں اپنی مافوق الفطرت ہستی بن جانے سے دھوکا ہوا اور ساری عمر مغالطہ میں رہے بشریت نے کبھی بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا کیونکہ **كُلُّ شَيْئٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ**۔ مقدور "قدیر" کیسے ہو سکتا ہے۔

*

القوی جل جلالہٗ

ہم رات دن کہتے ہیں ہمارے اندر اتنی قوت ہے یہ بات ہماری قوت و طاقت سے باہر ہے ہم اتنی طاقت رکھتے ہیں اس میں اتنے ہارس پاور ہے اس میں اتنی پاور نہیں ہے۔

مگر آج تک کسی نے قوت و طاقت و پاور کو نہیں دیکھا اس دور میں تو ساری دنیا میں قوت اور پاور ہی کا راج ہے ہر قوم پاور حاصل کرنا چاہتی ہے ساری مشینیں پاور ہی سے چلتی ہیں۔ کوئی گھر اور کوئی خطہ پاور سے خالی نہیں بہر حال پاور ہے تو ضرور مگر دیکھی نہیں جا سکتی۔

جب کوئی بھی قوت و طاقت اور پاور کو نہیں دیکھ سکا تو اس ''القوی'' کو جو تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے حیرت ہوتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہوتا تو کہیں تو دکھائی دیتا؟

بھائی اس کی پیدا کردہ قوتوں کو کوئی نہیں دیکھ سکا تو اسے کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ جیسے پاور کو سمجھا جا سکتا ہے اسے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

صرف قوت و طاقت ہی نہیں دنیا کی بیشتر چیزیں دکھائی نہیں دیتیں۔ زمین و آسمان تک جو کچھ بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے ان دیکھی موجودات ان سے کہیں زیادہ ہیں بلکہ دیکھی اور ان دیکھی کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہے کہ ہم کہہ سکیں چوتھائی یا تہائی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور باقی سب ان دیکھی ہیں۔ کیونکہ دکھائی دینے والی چیزیں بہت ہی تھوڑی ہیں ان دیکھی زیادہ ہیں۔

یہ حال تو ان چیزوں کا ہے جنہیں واقعتہً کسی صورت ہی ہم نہیں دیکھ سکتے۔ مگر وہ چیزیں جو بالکل مادی ہیں اور جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں ان میں سے بھی اکثریت ان دیکھی ہے ہمیں معلوم نہیں زمینوں کے اندر کیا کیا چھپا ہے پہاڑوں

کے شکموں میں کیا کچھ ہے؟ سمندروں کی گہرائیوں میں کیا کیا چیزیں ہیں اور فضاؤں اور آسمانوں میں کیا بھرا ہے؟

ایک صاحب جن کے دل میں عشق الٰہی کی شمع روشن تھی میرے مضامین کو پڑھ کر دھوکا کھا گئے نجانے مجھے کیا سمجھنے لگے بڑی منت سماجت کرنے لگے کہ خدا کو دکھا دیجئے میں نے کہا میں تو بڑا ہی بدقماش انسان ہوں آپ کو دھوکا ہوا مگر یہ تو بتاؤ کیا خدا کوئی مادی وجود رکھتا ہے میں اسے آپ کو پکڑ کر دکھا دوں؟ البتہ اسے ہمارے مضامین سے سمجھنا اور پہچانا جا سکتا ہے آپ کسی پیر فقیر کی طرف رجوع کریں میں تو کوئی پیر فقیر نہیں بلکہ ایک بے عمل عالم ہوں۔ کہنے لگے میں سب کو دیکھ چکا ہوں۔ میں نے کہا تو بس آپ اپنے کام میں لگئیے شریعت کا اتباع بہت کافی وافی ہے۔

تقسیم ملک سے پہلے کا یہ قصہ ہے کہ حضرت میاں اصغر حسین شاہ صاحبؒ مدرس دوم دارالعلوم دیوبند لاہور تشریف لائے تو ایک بزرگ جن کے سینے میں شمع عشق رسول روشن تھی۔ حاضر خدمت ہوئے اور عرض پرداز ہوئے کہ میں ذرا تخلیہ میں ملنا چاہتا ہوں حضرت برابر والے کمرے میں تشریف لے گئے اور وہ صاحب کمرہ بند کر کے سر ہو گئے کہ مجھے رسول اللہ ؐ کی زیارت کرائیے میاں صاحب کو بڑا غصہ آیا فرمانے لگے لوجی یہ کہتے ہیں۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھا دیجئے۔ ہمارے پیٹ میں تو آدھ سیر گو بھرا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے دکھا دیں؟

میں نے سنا ہے کہ ایک پیر صاحب اپنے مریدوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کراتے ہیں مگر اس شعبدے باز سے اور اس کے مریدوں سے کوئی پوچھے کیا حضور آجاتے ہیں؟ ایک ہندو ایک سادھو کے سر ہو گیا کہ ہنومان جی کے درشن کرادو تو وہ سادھو ہنومان بن گیا تو کیا وہ وہی ہنومان جی تھے جنھوں نے رام جی کا ساتھ دیا تھا یا سادھو کا اپنا تصرف تھا جھوٹے پیروں فقیروں نے طرح طرح کے ڈھونگ رچا رکھے ہیں۔

میاں اصغر رحمتہ اللہ علیہ بڑے ہی جلالی انسان تھے کوئی شخص ان کے

چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا اور ہر وقت آہیں بھرتے رہتے تھے اور پریشان پریشان ادھر ادھر دیکھتے رہا کرتے تھے۔ معلوم نہیں انہیں کیا نظر آتا تھا؟ دیو بند کا ایک باشندہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کرنے لگا میاں صاحب! ایک وقت کھانے کی دعوت قبول فرمایئے۔ فرمایا ضرور مگر دیکھو سوائے ارھر کی دال کے اور کوئی سالن نہ ہو۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ان کے بالکل برعکس بڑے ہنس مکھ اور سیر چشم انسان تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ اصول کی حد تک بڑے جلالی اور مجلس میں بڑے جمالی طبیعت کے تھے۔

لاہور کے دو مختلف مکاتب فکر کے پیران عظام کا واقعہ سناتا ہوں میرے مطب میں ایک عورت آئی میں نے پوچھا کیا کرتی ہو کہنے لگی فلاں پیر صاحب کے ہاں ملازم ہوں میں نے دریافت کیا کیا کام کرتی ہو؟ کہنے لگی تعویذ لپیٹ لپیٹ کر بانٹتی ہوں اور بھی تین عورتیں میرے ساتھ یہی کام کرتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب مطب میں آئے میں نے پوچھا کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا فلاں پیر صاحب کے ہاں تعویذ بانٹتا ہوں۔

یہ لوگ قرآنی آیات کی بتیاں بنا کر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں کیا قرآن اسی لئے نازل کیا گیا تھا؟ وہ شخص جو ہمارے پاس طالب دیدار خدا ہو کر آیا تھا سچ ہی کہتا تھا کہ میں سب پیروں کو دیکھ چکا ہوں۔

ان لوگوں نے عوام کو تعویذوں کی ایسی چاٹ لگا دی ہے جیسے انگریزوں نے اہل ہند کو مفت چائے پلا پلا کر چائے کی چاٹ لگا دی۔ میں چھوٹا سا تھا ہمارے چھوٹے سے قصبے میں ہر پینٹھ کے بازار میں لوگوں کو مفت چائے پلائی جاتی تھی اور کمپنی کا آدمی خوب خوب چائے کے فوائد بیان کیا کرتا تھا۔

اس ''القوی'' کی قوت و طاقت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جس نے قسم قسم کی قوتیں پیدا کر دی ہیں کائنات ان گنت مختلف قسم کی قوتوں کی گرفت میں ہے جن میں سے ابھی صرف چند ایک ہی کا انسان کو علم ہوا ہے اور وہ بہت سی طاقتیں جن کی گرفت میں وہ اور یہ کائنات ہے ان سے وہ بالکل بے خبر ہے اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کی نشان دہی کرتا ہے تو وہ کہتا ہے یہ تو وہم و

خیال ہے اگر حقیقت ہے تو ہمیں دکھاؤ مگر کوئی بتائے کہ دکھائیں کیسے کیونکہ وہ تو دیکھی ہی نہیں جا سکتی۔

کچھ مادی قوتیں ہیں اور کچھ روحانی۔ جو روحانی ہیں وہ مادی قوتوں سے زیادہ طاقتور اور نفوذ کر جانے والی ہیں۔ مادی قوت صرف اپنے ماحول پر اثر انداز ہو سکتی ہے اس کا ایک خاص دائرہ کار ہوتا ہے اور محدود عمل ہوتا ہے مگر روحانی طاقتیں بوجہ لطیف ہونے کے پابند زمان و مکان نہیں ہیں ان کے لئے قرب و بعد مکانی و زمانی کوئی اثر نہیں رکھتا۔

انسان جس قدر ترقی کرتا جا رہا ہے لطیف تر قوتوں کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ بھاری سے بھاری مادی طاقتیں ان لطیف قوتوں کے سامنے ہیچ ہیں ایٹم' آکسیجن' ہائیڈروجن اور شعاعیں وغیرہ لوہے' پیتل اور تانبے وغیرہ سے زیادہ طاقت ور اور مؤثر ہیں اس طرح آہستہ آہستہ انسان روحانیات کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بڑے بڑے متمدن ممالک کے بڑے بڑے لوگ سحر و ساحری کے احیا کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

یہاں میری مراد روحانیت سے وہ اشیا ہیں جو بے حد لطیف ہیں جنہیں عام طور پر محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری موجودہ کئی ایک ایجادات ایسی ہیں جو جادوگری معلوم ہوتی ہیں مگر چونکہ ہم ان کے عادی ہو گئے ہیں لہٰذا احساس نہیں کرتے۔ ریڈیو' ٹیلیویژن' ٹیلیفون' کمپیوٹر سسٹم و روبوٹ اور تباہ کن جنگی چیزیں اچھی خاصی جادوگر ہیں پھر بھی اس "القوی" کی بہت سی پیدا کردہ قوتیں ہم سے مخفی ہیں حال ہی میں امریکہ نے سٹار وار کی قوت کا پتہ چلا لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس قسم کی ایجاد کو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ اس طرح اس "القوی" کی پیدا کردہ اور قوتوں کا اگلے سائنس دان پتہ لگالیں گے اور ان کی وہ ایجادات از قسم روحانیات یا روحانیات سے قریب ہوں گی۔

اس "القوی" نے مختلف ادوار و ممالک میں مختلف قسم کے قوی لوگ پیدا کئے کہ دنیا ان کی قوت پر حیران رہ گئی (**لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد**) اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ دنیا بھر کو ایک شخصیت میں جمع کر

دے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے دست مبارک میں اس "القوی" نے ایسی قوت رکھ دی تھی کہ لوہا ان کے ہاتھوں میں موم ہو جاتا تھا اور وہ بڑی آسانی سے زرہیں بنا لیتے تھے جیسے کوئی اون سے سوئیٹر بن لیتا ہے ایسا ہو سکتا ہے کہ جیسے اونٹ اور بکری کے معدہ میں کانٹے پانی ہو جاتے ہیں اور بگلے کی چونچ میں مچھلی کے کانٹے اور سخت ترین ہڈیاں نرم ہو جاتی ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جن وانس و حشرات الارض و طیور و وحوش سب عاجز تھے اسی لئے ساری دنیا پر ان کی حکومت تھی۔ اور سب ان کی قوت کے سامنے ہیچ و پوچ تھے۔

ہم اپنے مضامین میں جہاں کہیں یہ لکھتے ہیں کہ روایت ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی صحت وعدم صحت و قرین درایت ہونے سے بری الذمہ ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ان کے وزیر و امراء جمع تھے ملک الموت آیا اور ان کے ایک وزیر یوز آصف کو بڑی غور سے دیکھتا رہا۔ حضرت سلیمان نے حکم دیا کہ ہمارے تخت کو ہمارے وزراء سمیت کشمیر لے جایا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ذرا سی دیر میں ہوا ملک شام سے ان کے تخت کو اڑا کر کشمیر لے گئی یہاں پہنچتے ہی ملک الموت نے یوز آصف کی جان نکال لی۔ حضرت سلیمان نے ملک الموت سے پوچھا کہ تم ہمارے دربار میں اسے کیوں غور سے دیکھے جا رہے تھے اس نے کہا میں اس لئے حیرانی سے بار بار اسے دیکھ رہا تھا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ اس کی روح کو کشمیر میں قبض کر لیا جائے اور یہ ابھی تک ملک شام ہی میں بیٹھا ہے اور وقت کم ہے کہ آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ ہمارے تخت کو وزیروں سمیت کشمیر پہنچا دے وہ یہاں پہنچ گیا تو میں نے عین وقت پر اس کی روح قبض کر لی۔ اس لئے میں اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

بات جو کچھ بھی ہو سلیمان علیہ السلام کے وزیر کی تو قبر کشمیر میں ہے مگر مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین نے اس پر مضامین اور رسالے

لکھے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قبر یوز آصف کی نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے اور یسوع کا لفظ بگڑ کر یوز بن گیا جو قبر یوز آصف کی مشہور ہے وہ دراصل یسوع مسیح کی ہے کیونکہ مسیح کا انتقال ہوا جیسا کہ ان کے نزدیک قرآن سے متوفیک کے لفظ سے ثابت ہے۔

مگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں اس "القوی" نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھالیا دجال اکبر کے فتنے کی سرکوبی کے لئے قیامت سے پہلے ان کا نزول ہوگا تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ سید انورشاہ کشمیریؒ کی کتاب **التصریح بماتواترا فی نزول المسیح** جس کا اردو ترجمہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے لائق فرزند مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ نے کیا ہے اور قابل دید ہے۔

اس القوی نے سکندر نپولین اسٹالن ہٹلر چنگیز خان ژال وسہراب و رستم جیسے بڑے بڑے قوی لوگ پیدا کئے کہ دنیا ان کی قوت پر حیران رہ گئی میں نے حضرت علی حیدرؓ کا اسم مبارک یہاں نہیں لکھا کہ اس مجلس میں ان کا بٹھانا سوئے ادبی ہے۔ ہمارے اسلاف میں سیکڑوں ایسے قوی لوگ ہو گزرے ہیں جن کی قوت کا دنیا نے لوہا مانا۔ خالد سعد قتیبہ طارق محمد بن قاسم اور محمود غزنوی جیسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے۔

ازمنۂ قدیمہ کی تاریخ پر بڑا غبار ہے جس کا صاف کرنا ناممکن ہے ہندوستان کے مہاراجہ بکرماجیت کے واقعات حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات سے بہت ملتے جلتے ہیں کہتے ہیں ذوالکفل کپل دستو (گوتم بدھ) کا بگڑا ہوا نام ہے رام اور ابراھام ابراہیم کو بھی بعض لوگوں نے ایک ہی شخصیت مانا ہے اور لنکا کو آدم علیہ السلام کا مسکن بتایا ہے اس "القوی" نے کسی کو قوت جسمانی سے نوازا جیسے طالوت وغیرہ کو اور کسی کو قوت روحانی بخشی تو کسی نے مردے زندہ کر دیئے کسی نے چاند کے ٹکڑے کر دیئے کسی نے پہاڑ کو اٹھالیا کسی نے دریاؤں اور سمندروں کو قابو میں کر لیا اور کسی نے آگ کو بے اثر کر دیا کسی کو قوت بصیرت عطا فرمائی اور کسی کو قوت بصارت۔ کہتے ہیں چیل اور گدھ میلوں سے دیکھ لیتے ہیں اور ہدہد زمین کے پاتال تک دیکھ لیتی ہے کسی کو قوت

سماعت ایسی عطا فرمائی کہ وہ لوگوں کے گھروں کی خفیہ باتوں کو اپنے گھر بیٹھے سن لیتا ہے روایت ہے کہ حضرت عزیز علیہ السلام کی ساری قوتیں ان کے سر کے بالوں میں تھیں اس روایت پر تو ہمیں اس دن یقین آگیا جس روز ہم نے ایک ایرانی پہلوان کو سر کے بالوں سے موٹر کھینچتے دیکھا تھا اور ایک صاحب کو مونچھوں سے کئی من کا پتھر اٹھائے دیکھا تھا دنیا عجائبات سے پر ہے اور سب کچھ ہو سکتا ہے سب معجزات برحق ہیں عقل کے خلاف نہیں ہیں خدا جسے چاہے جیسے چاہے قوت عطا کر دے وہ "القوی" مرکز قوت و طاقت ہے کسی کو ایسی قوت حافظہ عطا کی ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ لیتا یا سن لیتا ہے عمر بھر کے لئے اس کی قوت حافظہ میں ثبت ہو جاتا ہے محدثین کے ذکر میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں محدث کو پانچ لاکھ حدیثیں ان کی اسناد کے ساتھ یاد تھیں کسی کو تین لاکھ یاد تھیں کسی کو دو لاکھ کسی کو ایک لاکھ تعجب کیا کرتے تھے کہ وہ کیسے لوگ تھے؟ مگر جب حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیو بند اور علامہ عبدالعزیز میمنؒ کو دیکھ لیا تو یقین آگیا کہ قدرت خداوندی سے کوئی بات بعید نہیں ہے حضرت انور شاہ کشمیریؒ تو کتاب کے صفحے اور سطر تک کا حوالہ دیا کرتے تھے اور عبدالعزیز میمنؒ کو عربی کے لاکھوں شعر یاد تھے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اگرچہ محدث تھے مگر وہ ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ اقتصادیات کے حوالے دیتے تو تاریخ جغرافیہ و اقتصادیات کے بڑے بڑے پروفیسر بھی انگشت بدنداں رہ جاتے تھے کہ یہ محدث کیا جادو جگا رہا ہے پروفیسر محمود خان شیروانی کو شاہنامہ فردوسی تقریبا حفظ تھا خواجہ محمد زکریا موجودہ صدر شعبہ اردو اورنٹیل کالج کو دیوان کے دیوان یاد ہیں یہی حال ڈاکٹر ناظر حسین زیدی کا ہے ناظر حسین اورنٹیل کالج سے ریٹائر ہو کر امریکہ چلے گئے۔ ایک لاکھ کے قریب عربی شعر مجھے بھی یاد ہوں گے مگر میں نے انہیں باقاعدہ حفظ کیا تھا اور ہر جمعہ کو اعادہ کر لیا کرتا تھا میرا حافظہ بہت ہی کمزور ہے۔

بعض کو قوت لامسہ ایسی عطا کی ہے کہ وہ جس مریض کے جسم پر ہاتھ پھیر دیں مرض رفع ہو جائے کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لئے

کہتے تھے کہ وہ مریض کے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے مسح کرتے تھے میں نے ایک دو نابینا ایسے دیکھے کہ وہ ہاتھ پھیر کر گھڑی کا وقت بتا دیتے تھے حالانکہ گھڑی پر شیشہ جڑا ہوتا تھا اور ایک نابینا کپڑے کو چھو کر رنگ بتا دیا کرتا تھا شاید وہ کسی حصہ عمر میں رنگوں کو دیکھ چکا ہوگا ورنہ نابینا کو رنگوں کی کیا پہچان ہو سکتی ہے؟

کسی کو قوت شامہ ایسی عطا کی ہے کہ وہ بہت دور پڑی ہوئی چیز کی خوشبو کو محسوس کر لیتا ہے جیسے چیونٹیاں اور مکوڑے وغیرہ۔ کتے کو ایسی قوت دی ہے کہ وہ مختلف خوشبو کا ریکارڈ اپنے دماغ میں محفوظ رکھ سکتا ہے اور اگر کبھی کسی راہ پر چلا ہو تو برسوں کے بعد بھی سونگھ سونگھ کر اس راہ پر اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

میرا ننھیال شیر کوٹ (ضلع بجنور) ہے۔ میرا وطن سیوہارہ اس سے پانچ کوس پر واقع ہے۔ میری والدہ بیان کرتی تھیں کہ جب میری شادی ہوئی تو میری بوا نے سیوہارہ جاتے وقت کتے کو میرے تانگے کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ میرا گھر دیکھ لے پھر وہ اس کتے کو کھلا پلا کر خط اس کی گردن میں باندھ کر کہتیں جا! سیوہارہ چلا جا تو وہ خط لے آتا پھر ہم اسے کھلا پلا کر خط گلے میں باندھ دیتے اور وہ واپس چلا جایا کرتا۔ قرون اولیٰ میں اسلامی حکومتوں نے تو باقاعدہ کبوتروں سے نامہ رسانی کا کام لیا ہے اور کبوتروں کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ تھا جنگوں میں تو خاص طور سے کبوتروں سے کام لیا جایا کرتا تھا۔ یہ اور دوسرے پرندے اور شہد کی مکھیاں وغیرہ فضائے بسیط میں کیسے امتیاز کر لیتے ہیں اس "القوی" نے معمولی معمولی حشرات الارض کو بڑی بڑی قوتیں عطا کی ہیں کہ بڑے سے بڑے انسان کو بے تاب کر دیتے ہیں اور موت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اس قدر قوت فہم و ادراک عطا کی ہے کہ دنیا میں ان کی عقل و دانش کا ڈنکا بجتا ہے اور بڑے بڑے اہل علم ان کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں وہ مشکل مسائل جو لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں ان کے لئے پیش پاافتادہ مضامین ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کو ایسی روحانی قوتیں عطا کی ہیں کہ بڑی سے بڑی مادی

طاقتیں ویسا کرنے سے عاجز رہتی ہیں وہ بغیر آلات و اسباب کے سب کچھ کر گزرتے ہیں ان میں بشری نہیں الوہی طاقتیں ہوتی ہیں جنہیں اسباب و علل کی احتیاج نہیں ہوتی یہ روحانی قوتیں بعض کو موہبت الٰہی سے پیدائشی طور پر بغیر ریاضت و محنت کے حاصل ہوتی ہیں۔ اور باقی لوگوں کو ریاضیات و مجاہدات سے۔

کرامات اولیاء برحق ہیں اگرچہ ان میں لوگوں نے خرافات کا بڑی فراخ دلی سے اضافہ کر دیا ہے۔

*

القہّار جلّ جلالہٗ

قہر خداوندی سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتی ہیں کہ آسمان پر ابر چھا جاتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہو جاتے کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو بھانپ گئیں کہ آپ کچھ پریشان سے ہیں دریافت کیا کہ آپ کیوں پریشان ہیں؟ فرمایا اے عائشہ! (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) یہ جو بادل چھائے ہوئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ قوم عاد و ثمود والے ہوں کہ وہ بادلوں کو دیکھ کر خوش ہوئے یہ ہم پر برسیں گے مگر ان میں عذاب الٰہی چھپا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتی ہیں جب بارش ہونے لگتی تو آپ پر سکون ہو جاتے۔

مجھے ٹھیک نام یاد نہیں رہا شائد مہتہ نام تھا وہ ہندوستان میں علم نباتات کے واحد عالم تھے آگرہ کالج کے پرنسپل تھے اور سیالکوٹ کے ایک مالی کے بیٹے تھے ماں باپ نے محنت مزدوی کر کے انہیں دسویں تک تعلیم دلائی پھر انہیں سکالر شپ ملتے رہے حتیٰ کہ وہ حکومت کی طرف سے لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے آئے اور ان کی کسی بڑے ہندو گھرانے میں شادی ہو گئی وہ ماں باپ سے ہمیشہ پوشیدہ رہے مگر ماں باپ کو محبت کب چین سے بیٹھنے دیتی تھی آخر انہوں نے کھوج لگا ہی لیا کہ ہمارا بیٹا آگرہ میں پرنسپل ہے دونوں بصد اشتیاق سیالکوٹ سے آگرہ پہنچے تو مہتہ صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے تھے انہوں نے دونوں کو دیکھتے ہی چپراسی سے کہا انہیں اندر نہ آنے دینا بے چارے مجبوراً" وہاں کسی کوٹھڑی میں ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ ایک معزز ہندو خاندان کا ایک نوجوان پروفیسر ان سے کسی بات پر الجھ پڑا تو اس نے آگرے کے چند قصابوں سے کہا کہیں چھپ کر بیٹھ جائیں جب یہ کالج سے واپس کوٹھی میں داخل ہو تو اسے لاٹھیوں سے ماریں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مہتہ بالکل معذور مجبور ہو گیا۔ انگریز گورنمنٹ نے بڑے

بڑے علاج کرائے ٹھیک نہ ہوا۔ وہ آگرے کی سڑکوں پر ہتھیلیوں سے گھسٹتا ہوا بھیک مانگتا پھرا کرتا تھا کیونکہ دماغ کھو چکا تھا۔

ایک بستی میں یہ شاید جھانسی کا قصہ ہے ایک بیوہ عورت کے اکلوتے نوجوان بیٹے کو کسی نے اس کے گھر میں گھس کر سوتے میں قتل کر دیا۔ اور تھانیدار کو رشوت دے کر گلو خلاصی کرالی۔ تھانیدار نے قتل کا مقدمہ اس بیوہ پر قائم کر دیا کہ چونکہ یہ عورت آشنا سے مراسم رکھتی تھی اور بیٹا سنگ راہ تھا لہٰذا اس عورت نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تھانیدار نے پورا پورا ثبوت فراہم کر کے عورت کو پھانسی دلوادی۔ وہ عورت اکثر خواب میں اسے نظر آیا کرتی حتیٰ کہ وہ خوابوں سے پاگل ہو گیا اور جھانسی کی سڑکوں پر چیختا پھرا کرتا تھا آمنہ مجھے معاف کر دے آمنہ مجھے معاف کر دے۔۔۔۔

ایک ناخلف "زن مرید" بیٹے نے اپنے معذور و مجبور باپ کو بیوی کے کہنے سے گھر سے باہر نکال دیا اور اسے چڈھی چڑھا کر بستی سے دور لے جا کر جنگل میں چھوڑ آیا بوڑھے آدمیوں کی گندگی اور معذوری سے اکثر بہویں تنگ آجاتی ہیں۔ قدرت خدا کی جب وہ بوڑھا ہوا تو باپ کی طرح معذور ہو گیا بہو نے اس زن مرید سے کہا اس بڈھے کو یہاں سے نکال دے چنانچہ ایک دن اس کا بیٹا اسے چڈھی چڑھا کر شہر سے باہر جنگل میں چھوڑ آیا وہ بوڑھا پہلے تو رویا اپنے انجام پر اور پھر ہنسا اس بات پر کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں میں اپنے باپ کو اسی طرح چھوڑ کر گیا تھا بیٹے سے کہا تیری اولاد بھی تیرے ساتھ یہی سلوک کریگی۔

قہر خداوندی سے ڈرتے رہنا چاہیئے بعض وقت بڑی سخت گرفت ہو جاتی ہے ہمارے خاندان میں تین تھانیدار ہوئے تینوں کا برا ہی انجام ہوا۔ دو کا تو یہ عالم تھا کہ ان کے گھر جو کتے پلے رہتے تھے وہ دودھ ڈبل روٹیاں کھایا کرتے تھے اور ملازم اور ملازماؤں سے انکے گھر بھرے ہوئے تھے مگر دونوں بے اولاد مرے وہ گھر جو چھوٹا سا قلعہ تھا برباد ہو گیا اور ان کے داماد ان کی ساری کمائی لوٹ کر لے گئے۔

ایک تھانیدار نے آکر ایک بڑا بھاری چکلی خانہ لگایا جہاں ہر قسم کی دل

چسپیاں بھی تھیں۔ اس کے دو لڑکے تھے دونوں آوارہ و ناکارہ ایک کو کپڑے کی دکان کرائی وہ سب بیچ کر کھا گیا۔ اور دوسرا بالکل آوارہ پھرتا۔ وہ عرصے تک بیمار رہے اور گھر بار کی تباہی اچھی طرح دیکھ کر بصد افسوس اس دنیا سے سدھارے۔ بیٹے ماں کو پیٹتے اور زیور لے جا کر بیچ کر "گل چھرے" اڑاتے کبھی ایک بیٹا ماں کو مار کر زیور لے جاتا کبھی دوسرا۔ وہ ساری دولت نہ معلوم کہاں گئی جب سب کچھ اڑا چکے تو ایک بیٹا کمپاؤنڈر بن گیا اور دوسرا سلائی مشین کی کمپنی میں ملازم ہو گیا اور دونوں کا برا ہی انجام ہوا۔

قہر خداوندی مختلف طریقوں سے وارد ہوتا ہے بعض ظالم گل سڑ کر رنجھ رنجھ کر مرتے ہیں بعض کی اولاد بڑی بڑی تکلیف دہ بیماریوں میں مبتلا کر دی جاتی ہے جو ان کے لئے سوہان روح بنی رہتی ہے۔ بعض کے پیچھے طرح طرح کے مقدمے لگ جاتے ہیں کہ وہ شب و روز ان کی پیروی میں پریشان پھرتے ہیں بعض کا مال چوری یا ضائع ہو جاتا ہے یا آگ کی نذر ہو جاتا ہے بعض ظالموں کا جوان بیٹا مر جاتا ہے کہ ساری زندگی اسے روتے ہی رہتے ہیں۔

اس دور کی جنگ ایسی نہیں ہے جیسے پرانے زمانوں میں ہوتی تھی اب تو واقعی آسمان سے آگ برستی ہے۔ بڑی زبردست کڑک' چمک' اور دل ہلانے والی آوازیں آسمان سے آتی ہیں یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے۔ کہ دنیا اپنے پروردگار سے باغی ہو چکی ہے منٹوں میں شہر کے شہر کھنڈر ہو جاتے ہیں سب کچھ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے مظلوم تو جلتا ہی ہے ظالم بھی اپنے شعلوں میں جل مرتا ہے جو فاتح ہے وہ بھی مفتوح سے بدتر ہے۔

ساری مہذب اور غیر مہذب دنیا ایٹم بم ہائیڈروجن بم' جراثیم برسانے والے' زہریلے بموں کی تیاری میں دن رات لگی ہوئی ہے ملک کے ملک بھوکے اور بے روزگار ہیں اور انسان بجائے تعمیر کے تخریب میں لگا ہوا ہے یہ قہر الٰہی نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا سے بغاوت کر کے انسان کس قدر پست ہو گیا ہے یہ قہر الٰہی نہیں تو کیا ہے؟ اور ہماری سیاسی مکاریوں' جھوٹ' فریب' دھوکا دہی کی سزا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا سے بغاوت کر کے انسان کس قدر پست ہو گیا ہے اور

اپنے آپ کو کس قدر مصائب میں مبتلا کرنے کے در پے ہے آگ لگانے مارنے اور ہلاک کرنے ہی کی سوچتا ہے۔ جگہ جگہ بم پھٹ رہے ہیں جہاز اغوا کئے جا رہے ہیں۔ اور بالکل غیر انسانی حرکتیں کی جا رہی ہیں۔ اچھے خاصے چلتے پھرتے آدمی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ پر امن معصوم مسافر جل کر راکھ ہو جاتے ہیں یہ تو بظاہر قہر خداوندی کے نشانہ بن ہی جاتے ہیں لیکن دراصل مارنے والے ان سے بدتر قہر الٰہی میں مبتلا ہوتے ہیں گو انہیں یا دنیا کو اس امر کا احساس نہ ہو بظاہر مجرم بچ کر نکل جاتے ہیں مگر درحقیقت وہ بچ کر نہیں جاتے۔

اس دور میں دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ دولت مند اور طاقتور دو ملک ہیں ایک روس اور دوسرے امریکہ۔ سب کچھ ہوتے ہوئے روسی سخت ترین قہر الٰہی میں گرفتار ہیں روس ایک "چوہے دان" ہے جس کے باسی اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں ان کا اپنا کوئی دل و دماغ نہیں ہے وہ صرف ایک حکمران ٹولے کی سخت ترین گرفت میں ہیں یہ ذرا سی جماعت پورے ملک کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہے حد یہ ہے کہ کوئی شخص ذرا سا ڈرامہ یا افسانہ یا نظم یا مضمون بغیر حکومت کی مرضی کے چھپوا سکتا ہے نہ ایک لفظ زبان سے نکال سکتا ہے محنت مزدوری پر ہر فرد مجبور ہے تاکہ حکومت کا پیٹ بھرے تو کچھ اپنے پیٹ میں بھی ڈال سکے۔

امریکہ و یورپ' فرانس و جرمن و جاپان وغیرہ کی زرق برق زندگی سے آپ دھوکا نہ کھائیں یہ سارے متمدن ممالک سخت ترین قہر الٰہی میں مبتلا ہیں کیونکہ قلبی سکون ان سے چھین لیا گیا ہے اور ہر فرد سکون قلبی کے لئے رات دن لذتوں کے حصول کے لئے تگ و دو کرتا ہے کبھی سگریٹ سے دل بہلاتا ہے' کبھی شراب سے' کبھی ناچ اور گانے سے' مگر سکون قلبی میسر نہیں آتا سارا دن ایک لذت سے دوسری لذت کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ بالاخر تھک کر سو جاتا ہے اور اگلے دن پھر اسی کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہتا ہے جو قلبی سکون غیر مہذب دنیا کو حاصل ہے انہیں بالکل میسر نہیں ہے دوسرے یہ کہ ساری مہذب دنیا گھریلو زندگی سے محروم ہو چکی ہے صرف امراء یا وزراء کی زندگی تو ایسی ہے جیسی ہم لوگوں کی گھریلو زندگی ہے۔ گھر کے افراد کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیاں

کرتے ہیں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں ایک مکان میں سوتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک ہوتے ہیں اور اپنے بیمار کی تیمارداری کرتے ہیں امراء وزرا کے علاوہ ساری مخلوق گھریلو زندگی سے محروم ہو چکی ہے بیوی کہیں ملازم ہے' میاں کہیں' لڑکیاں کہیں' لڑکے کہیں' گھر کے بوڑھے اور معذور افراد حکومت کے بنائے ہوئے کوارٹروں میں' بیمار شفا خانے میں' بچے اسکول یا کالج کے ہوسٹل میں اور اگر ملازم ہوں تو وہ کہیں اور۔ صرف اتوار کے دن یا مہینے میں ایک دن مل لیتے ہیں نہ شوہر کو بیوی کی خبر ہے نہ بیوی کو شوہر کی خبر نہ اولاد پر کوئی کنٹرول ذرا جوان ہوئے تو بالکل خود مختار۔

اگر ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو دنیا ان مہذب ممالک پر قہر الٰہی کا نزول اچھی طرح دیکھ لے گی۔ اللہ سب کو قہر الٰہی سے محفوظ و مامون رکھے آمین۔

*

القیوم جل جلالہٗ

ایک لاٹھی یا چھڑی خود بخود سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم اسے کسی سہارے سے لگا کر کھڑا نہ کریں اگر ہم چھڑی کو کسی دیوار کے ساتھ سہارا دے کر کھڑا کر دیتے ہیں تو چھڑی قائم ہے مگر قائم بذاتہ نہیں بغیرہٖ ہے یعنی ذات و جود کے اعتبار سے قائم نہیں ہے سہارے سے اور غیر کے ذریعے سے قائم ہے اسے اہل منطق قائم بالعرض کہتے ہیں جو چیز قائم بالعرض ہو گی جب وہ عرض ہٹ جائے گا تو وہ گر پڑے گی اگر دیوار گر جائے گی تو چھڑی بھی گر پڑے گی۔

ہم کھڑے ہوتے ہیں تو کسی سہارے کی بدولت نہیں قائم بالذات ہوتے ہیں قائم بالعرض نہیں ہمیں کھڑے ہونے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی لہٰذا قائم بالذات ہیں قائم بالعرض نہیں چھڑی قائم بالعرض ہے اور ہم قائم بالذات ہیں۔

"القیوم" کا لفظ قرآن شریف میں متعدد جگہ آیا ہے جس کا ترجمہ سدا رہنے والا ہے ذات باری تعالیٰ قائم با لذات ہے سدا قائم و دائم ہے ہم بھی قائم بالذات ہیں مگر قیوم نہیں قیوم صرف اسی کی ذات ہے ہمارا قیام و دوام ہماری قوت کی بناء پر ہے اگر قوت نہ ہو تو ہم کھڑے نہیں رہ سکتے معلوم ہوا ہمارا قیام و دوام قوت کا مرہون منت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ "القیوم" بھی قوت کی بنا پر قائم و دوائم ہے؟ اگرچہ "القوی" بھی اس کی صفت ہے مگر اس کا قیوم ہونا قوی ہونے کا مرہون منت نہیں ہے جس طرح کہ ہمارا قیام و دوام قوت کا محتاج ہے وہ صمد و بے نیاز ہے وہ کیوں کسی صفت کا محتاج ہو گا؟ وہ قیوم بذاتہ و بجوہرہ ہے اس کی ہر صفت مستقل بذاتہ ہے اور قیوم ہونا اس کا عین ذات ہے قائم، مقیم، قیم اور مقوم

و قوام تو بہت سے ہیں مگر ''القیوم'' صرف اسی کی ذات ہے جو شخص عبدالقیوم ہے وہ قیوم نہیں ہو سکتا اگر ہم یہ دعوٰی کریں کہ قیوم بخط مستقیم نہیں ہے بلکہ بصورت مثلث ہے اور تین خطوط سے مل کر ایک قیوم بنتا ہے مثلا ماں باپ اور بیٹے سے مل کر ایک قیوم بنا اور تین مل کر بھی ایک ہوئے جیسے تین خطوط سے مل کر ایک مثلث بنتا ہے تو یہ بات غلط ہو گی کیونکہ اہل منطق کا اس بات پر اتفاق ہے اور حقیقت بھی یہی کہ نتیجہ ہمیشہ ارذل (گھٹیا) کے تابع ہوا کرتا ہے یعنی اگر کسی چیز کے ایک یا دو عنصر خالص ہیں مگر تیسرا ناخالص ہے تو وہ چیز خالص نہیں ناخالص ہوگی اگر ہم دودھ میں پانی ملا دیتے ہیں تو وہ خالص دودھ نہیں کہلایا جا سکتا ناخالص کہلائے گا اگر سونے میں تھوڑا سا پیتل شامل کر دیں تو پھر وہ خالص سونا نہیں رہے گا کھوٹا سونا کہلائے گا پھر ملاوٹ جس قدر زیادہ ہو گی کھوٹ بھی اسی درجے زیادہ ہو گا اگر عطر میں پاخانہ ملا دیا جائے گا تو وہ عطر نہیں پاخانہ کہلائے گا اس لئے کہ نتیجہ ہمیشہ ارذل کے تابع ہوتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ عمران کی بیوی کے شکم سے حضرت مریم علیہ السلام پیدا ہوئی تھیں، پیدائش سے پہلے وہ کہیں موجود نہیں تھیں خون' پانی' اور مضغہ گوشت کی صورت پاکر عالم وجود میں آئیں پھر وفات پا گئیں اور ایک وقت تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی وجود نہ تھا تو معلوم ہوا کہ مریم اور عیسیٰ دونوں غیر قیوم تھے یعنی فانی و حادث تھے۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مثلث کا ایک خط خدائے قیوم ہے اور دوسرا عیسیٰ علیہ السلام اور تیسرا مریم علیہا السلام تو دو غیر قیوم یا ایک غیر قیوم سے جو ذات بنے گی وہ قیوم نہیں ہو سکتی غیر قیوم ہی ہو گی۔

اس ''القیوم'' نے زمین و آسمان کو بغیر ستونوں کے قائم کر دیا ہے چنانچہ فرمایا **بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا** ''بغیر ظاہری ستونوں کے'' اتنی بھر کم بھاری اور وسعت والی مخلوق کو قائم کرنا اسی ''القیوم'' کا کام ہے یہ چیزیں خود تو قائم نہیں رہ سکتیں کیونکہ ان میں ایسی قوت و شعور نہیں ہے کہ وہ خود قائم رہ سکیں۔ یہ زمین و آسمان' چاند' سورج' ستارے' سیارے کسی ستون یا کسی رسی سے بندھے ہوئے

نہیں ہیں مگر یہ ان دیکھے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان دیکھے بندھن اگرچہ بڑے ہی لطیف اور نازک ہیں مگر مضبوط ترین ستونوں اور محکم ترین رسیوں سے زیادہ مضبوط ہیں یہ ان دیکھے بندھن دوری و نزدیکی اور فاصلوں کو کچھ نہیں سمجھتے ان کے لئے دورونزدیک سب برابر ہیں قوانین کشش و جذب دوری نزدیکی سے بے نیاز ہیں۔

دیکھو ایک ماں جو سینکڑوں سمندر پار بڑی دور امریکہ میں بیٹھی ہوئی ہے اور اس کا بچہ پاکستان میں ہے اس کا دل اس کی محبت میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ نہ طوفان کا اس پر کوئی اثر ہوتا ہے نہ پہاڑوں اور سمندروں کا نہ موسموں کا نہ فضا کی آلودگیوں کا نہ بادوباراں کا۔ کشش و جذب کا یہ بندھن اتنا مضبوط ہے کہ مضبوط سے مضبوط دھاتیں بھی اتنی مضبوطی سے گرفت نہیں کر سکتیں وہ بھی موسمی اثرات سے بوسیدہ ہو جاتی ہیں اور ان پر بھی آگ اور پانی کا اثر ہوتا ہے۔

اس ''القیوم'' نے دو بندھنوں میں ساری کائنات کو جکڑدیا ہے ایک رغبت اور دوسرے نفرت۔ رغبت کے مظاہر شوق' محبت' عشق اور جذب وغیرہ ہیں اور نفرت کے مظاہر عداوت' فرار اور کراہیت وغیرہ ہیں۔

ایک ستارہ دوسرے ستارے کے اردگرد کشش و شوق کے تحت چکر لگاتا رہتا ہے اور اس طرح وہ اپنے محور پر قائم رہتا ہے اسے دوسرے ستارے سے کوئی رغبت نہیں بلکہ کراہیت یا نفرت ہے لہٰذا وہ اس سے دور رہتا ہے اس طرح وہ ٹکراؤ سے محفوظ رہتے ہیں ہر ایک اپنے فلک سے محبت کرتا ہے جیسے ہم اپنی مادر ارضی سے محبت کرتے ہیں ہر فلک اپنے آپ سے اور اپنی کائنات سے محبت کرتا ہے لہٰذا وہ دوسرے فلک کے اندر نہیں گھستا یا اس پر نہیں گرتا ہر مذہب کی بنیاد بھی انہی دو چیزوں پر قائم ہے یعنی جنت کی طرف رغبت اور دوزخ سے نفرت!

دنیا کے سارے کاروبار بھی انہی دوستونوں پر قائم ہیں صبح سے لے کر شام تک کے اپنے سارے کاموں کا جائزہ لیجئے آپ نے جو کچھ بھی کیا یا رغبت کی بنا پر یا نفرت کی بنا پر اگر یہ دونوں نہ ہوں تو کاروبار عالم ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

جانور بھی انہی دو بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں اور اشجار و نباتات بھی۔ ایک مزدور صبح سے شام تک کسی رغبت کے تحت کام کرتا ہے۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا ہے تو کسی مغرور سے بچنے کی خاطر اور کسی نقصان سے نفرت کی بنا پر۔ یہی حال تاجر، کارخانے دار، صنعت کار اور علمی و مذہبی کام کرنے والوں کا ہے۔ ملکوں کی آپس کی جنگ قطعۂ زمین، سمندر، دریا یا پہاڑ کی رغبت کے تحت ہوتی ہے۔ دوسرا ملک اسے ہڑپ کر جانا چاہتا ہے لہٰذا جنگ چھڑ جاتی ہے۔ سیاسی گٹھ جوڑ، صلح و امن انہی دو وجوہات سے ہوتی ہیں کالجوں اور سکولوں میں پڑھنا پڑھانا رغبت عزت و مال اور نفرت جہالت و ذلت کی بنا پر ہوتا ہے محفلیں، مجلسیں، شادی و غم کے اجتماع سب کے اندر انہی کی کارفرمائی ہے۔

بچوں کا رونا، بڑوں کا ہنسنا۔ مظلوموں کا آہیں بھرنا، کھیل کود اور تماشے، کارخانوں کی گھڑگھڑ، سواریوں کا سڑکوں پر دوڑنا، پھیری والوں کی صدائیں، شاعروں کے گیت، موسیقاروں کے گانے، ناچنے والیوں کے ناچ، جلسے جلوس اور نعرے، کتابیں، اخبار، اور رسالے، واعظوں کے وعظ، اور نماز و روزہ وغیرہ سب انہی دو سے ہیں۔

الغرض اس "القیوم" نے ساری کائنات کو ان دوستونوں پر قائم کر رکھا جو سارے عالم کو قائم کئے ہوئے ہیں اور لطف یہ کہ دکھائی بھی نہیں دیتے۔

*

اَلْکَافِیُ جلّ جلالہٗ

سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں اوپر جا کر طبقۂ زمہریر میں جم جاتے ہیں پھر پانی بن کر برس پڑتے ہیں زمین میں جو تخم پڑے ہوتے ہیں انہیں غذا پہنچاتے ہیں تخم سے پودا بنتا ہے اس پر پھل لگتے ہیں کسان آتا ہے اور انہیں کاٹ کر چھان پھٹک کر بازار میں فروخت کر دیتا ہے۔ پیسنے والا انہیں پیس کر آٹا بنا دیتا ہے اور پکانے والا روٹی تیار کر دیتا ہے۔ اسباب کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے کھانے والے کھاتے ہیں ان کا معدہ و جگر ہضم کر کے خون بنادیتا ہے اس خون پانی سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔

یہ سلسلۂ اسباب مُسَبِّبُ الْاَسْبَاب نے اس لئے رکھا ہے کہ دنیا میں اچانک کسی چیز کا بغیر کسی سبب کے ظہور نہ ہو جائے اور انسان و حیوان حیران نہ رہ جائیں سبب پیدا کریں اور نتیجے کے منتظر رہیں جدوجہد کریں اور کوشش کا ثمرہ حاصل کریں۔ بیٹھے بٹھائے چیزیں بن جایا کرتیں اور بگڑ جایا کرتیں تو دنیا ایک معمہ بن کر رہ جاتی۔

مردوزن کے ملاپ سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور زمین میں تخم ریزی سے پودا پیدا ہوتا ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کفایت دراصل اسی کی ہے اور اسباب کافی نہیں ہوتے کافی اس کی ذات ہوتی ہے۔

پائے شتر کو باندھ دینا چرائے نہ جانے کے لئے کافی ضمانت نہیں ہے جب تک کہ اس کی ذات کافی نہ ہو توکل یہی ہے کہ اسباب کی تکمیل کی جائے اور نتیجے کو اس پر چھوڑدیا جائے نہ تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا کافی ہے اور نہ اسباب کا ارتکاب۔

کسان سارے اسباب مہیا کر لیتا ہے اور محروم رہتا ہے کیونکہ اس کافی

نے اسے اپنی کفایت سے نہیں نوازا اور ناقص اسباب والامراد کو پہنچ جاتا ہے کیونکہ وہ اس کے لئے کافی ہو گیا میرے مطب میں کئی ایسے جوڑے آئے جن کے اولاد نہیں ہوتی تھی ان میاں بیوی نے چوٹی کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کو دکھایا اور انہوں نے بتایا کہ کوئی ادنیٰ سی بھی خرابی نہیں ہے پھر بھی حکیموں اور ڈاکٹروں کے بڑے بڑے علاج کئے اور محروم ہی رہے اسباب تو سب درست تھے مگر وہ کافی نہ ہوا تو کچھ نہ ہوا۔

ایک دفعہ میں نے کیپٹن ضیاء اللہ مرحوم سے کہا آپ میری بیوی کو بڑی قیمتی دوائیں دے رہے ہیں اور ہم بھی انہیں عمدہ غذائیں دے رہے ہیں مگر جان نہیں آتی کہنے لگے "دوا اور غذا تھوڑا ہی کام کرتی ہے جب تک کہ وہ نہ چاہے" میں حیران رہ گیا کہ میڈیکل کالج کا پرنسپل، مشہور فزیشن، بین الاقوامی شہرت کا مالک یورپ کا پڑھا ہوا۔ ہم جیسے ملاؤں کی سی بات کہہ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ میرے اپنے ذاتی تجربے سے بھی یہی ثابت ہوا کہ وہ شافی کافی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہوتا، بڑی بڑی دوائیں بے کار ثابت ہوتی ہیں اور معمولی دوائیں کفایت کر جاتی ہیں اسی لئے بڑی بوڑھیاں جب بھی کسی کو دوائیں پلاتیں تو اللہُ شافی اللہُ کافی ضرور کہتی تھیں اب تو یہ باتیں معدوم ہو گئی ہیں۔

تاریخ کی کتابیں ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہیں کہ دو قومیں آپس میں ٹکرائیں ایک قوم کے اسباب بالکل ناقص و ناکافی تھے اور دوسری قوم کے سارے اسباب مکمل ہی نہیں ضرورت سے زیادہ تھے مگر فتح کمزور کی ہوئی کیونکہ اللہ ان کے لئے کافی ہو گیا تھا۔ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی حالت زار اور کفار کے زرہ، بکتر اور ہتھیار ایک دوسرے سے کوئی بھی نسبت نہ رکھتے تھے وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ اسی طرح غزوہ احد وغیرہ میں بھی اور غزوہ خیبر میں تو یہودیوں کا مقابلہ کوئی آسان کام نہ تھا چھ سات مضبوط قلعے ہر قسم کے سامان سے بھرپور اور ایسے ایسے پہلوان کہ ایک پہلوان ہزار مرد کی طاقت رکھتا تھا مگر اللہ ان کے لئے کافی نہ رہا تو شکست ہی کھانی پڑی۔ جب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو یہ عالم تھا کہ ایرانی فوج سرخ ریشم

کی وردیوں میں ملبوس تھی اور زرہ بکتر سے لیس، صف شکن ہاتھی اور ماہر سورما ہمراہ تھے اور اہل عرب پھٹے پرانے کپڑے پہنے بے زر بے پر نہ وہ پورے ہتھیار والے تھے نہ تعداد ہی پوری تھی مگر اللہ ان کے لئے کافی ہو گیا۔ ایک دفعہ رستم نے ایک چٹان میں تیر مار کر کہا کیا کروں میرے تیر چٹانوں میں اثر کرتے ہیں مگر اس قوم پر نہیں کرتے۔ طارقؒ نے سپین پر حملہ کیا اس کے پاس کیا تھا۔ ان عربوں کی شکستہ حالی کو دیکھ کر شاہ اسپین نے ان کی گرفتاری کے لئے چھکڑے بھر بھر کر رسیاں بھیجی تھیں مگر خود ہی گرفتار ہوئے ایسا ہی واقعہ سلطنت روم میں ہوا شائد جرجیس کا قصہ ہے کہ وہ ہنسا اور کہا تم مٹھی بھر آدمی یہاں کس لئے آئے ہو؟ ہم تمہاری گرفتاری کے لئے رسیاں لائے ہیں۔ مگر خدا مسلمانوں کے لئے کافی ہو گیا اور دنیا حیران رہ گئی اس دور میں مسلمانوں کا ایران پر حملہ کرنا ایسا تھا جیسے چھوٹی سی غریب قوم روس یا امریکہ پر حملہ کر دے ایران دنیا کی بہت بڑی طاقت تھا اور اہل عرب تہی دست۔

حکیم نابینا مرحوم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر انصاری ہندوستان کے مشہور سرجن تھے۔ کسی والی ریاست کے کسی عزیز کا پیٹ کا آپریشن ہونا تھا۔ اس نے ڈاکٹر انصاری کو بلایا انہوں نے آپریشن کیا اور کامیاب رہا جب اوزار دھوئے اور رکھے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک آلہ غائب ہے پتہ چلا کہ مریض کے پیٹ ہی میں رہ گیا انہوں نے کہا دوبارہ آپریشن کرنا پڑے گا آپریشن کیا تو وہ مر گیا۔ دیکھئے اسباب تو سارے جمع تھے مگر وہ کافی نہ ہوا تو اسباب کافی نہ ہوئے۔

بہت سے صوفیاؒ نے اپنے حالات میں ایسے واقعات لکھے ہیں کہ انہوں نے اسباب کو مہیا کیا اور نتیجہ کچھ نہ نکلا ایک بار نہیں بارہا ایسا ہی ہوا تو پھر وہ سمجھے کہ یہ ہماری تعلیم کے لئے ایسے کیا جا رہا ہے کہ ہم اسباب کو کافی سمجھ رہے تھے حالانکہ اس "کافی" کو بھولے ہوئے تھے پھر جب ترک اسباب کر بیٹھے تو جو کچھ اسباب کے تحت ہونا تھا اس سے بہتر ہو گیا۔

سبب کو سبب سمجھا جائے رب نہ سمجھا جائے سبب میں بھی اللہ کی قدرت مخفی طریق سے کام کرتی ہے۔ جب بندہ سبب ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے تو

اللہ اس کے ذہن کے فتور کو دور کرنے کے لئے قدرت سے براہ راست کرتے ہیں اسباب دھرے رہ جاتے ہیں اسباب میں سے تاثیر سلب کرلیتا ہے جیسے آگ سے جلانے کی، پانی سے ڈبونے کی، چھری سے کاٹنے کی قوت و تاثیر کو سلب کرلیتا ہے تو سعادت مند، سلامت فکر بندہ پکار اٹھتا ہے کہ واقعی کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ وہ کام بنانے یا بگاڑنے میں اسباب و وسائل کا محتاج نہیں ——— جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس سے اس کی کفایت و صیانت اٹھالی جاتی ہے یہی حال باقی باتوں کا ہے۔ اس کی کفایت کے مختلف طریقے ہیں کبھی اسباب کے ذریعے کفایت کرتا ہے اور اکثر ایسا ہی کرتا ہے کیونکہ یہی عادت الٰہی ہے اور کبھی بغیر اسباب کے کفایت کرتا ہے۔ یہ کہ وہ اسباب ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لہٰذا ہم اسے خلاف عادت سمجھتے ہیں۔ کبھی دوست کے ذریعہ کفایت کرتا ہے۔ کبھی دشمن کے ذریعے، کبھی زہر کو تریاق بنا دیتا ہے اور سانپ کو محافظ!

اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ کیا اللہ کافی نہیں ہے اپنے بندہ کو؟

*

الکبیر جل جلالہٗ

کہتے ہیں ایک خون کے قطرے میں ہزاروں جراثیم ہوتے ہیں تو چیونٹی یقیناً ان سے بڑی ہے۔ مکوڑا چیونٹی سے بڑا ہے۔ چھپکلی مکوڑے سے بڑی ہے۔ بلی چھپکلی سے بڑی ہے۔ کتا بلی سے بڑا ہے۔ کتے سے لگڑبگڑ بڑا ہے۔ لگڑبگڑ سے شیر بڑا ہے۔ شیر سے ہاتھی بڑا ہے اور ہاتھی سے وہیل مچھلی بڑی ہے۔ وہیل مچھلی سے بڑے اور جانور ہوں گے۔ بعض جانور موجودہ جانوروں سے بے حد بڑے تھے مگر وہ کھیتیاں اور تالاب صاف کر جاتے تھے لہٰذا انسانوں نے ان کی نسل کو ختم کردیا۔ جیسے ناقۂ صالح علیہ السلام کو قوم ثمود نے اس لئے ہلاک کردیا تھا کہ وہ سارا پانی ایک دن میں پی جاتی تھی جب کہ بستی کے سارے جانور سات دن میں بھی اتنا پانی نہ پیتے تھے۔ ان جانوروں سے زیادہ طاقتور اور بڑے پہاڑ ہیں مگر ذرا سا' انسان ضعیف انسان' ان ہاتھیوں' شیروں اور وہیل مچھلیوں کو تگنی کا ناچ نچا دیتا ہے۔ جس پہاڑ کے پتھروں سے منگلا ڈیم بنایا گیا ہے وہ سرگودھا میں تھا۔ میں وہاں کی واپڈا کالونی میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں سارا پہاڑ انسانوں نے کھود کھود کر منگلا پہنچا دیا اور وہاں بالکل صاف چٹی زمین رہ گئی۔ میں یہ خیال کیا کرتا تھا کہ ان پہاڑوں کی بھی زمین کے اندر دور تک بنیاد ہوتی ہوگی۔ اس دن پتہ چلا کہ یہ تو زمین کے اوپر ہی دھرے ہیں۔ ضعیف و ناتواں انسان نے اس پہاڑ کو تہس نہس کردیا جو اس پہاڑ کی بہ نسبت بالکل ذرا سا ہے۔ معلوم ہوا بزرگی کبریائی جسامت سے نہیں ہے۔ "کبیر اور اکبر" اسی "الکبیر" کی ذات ہے جو "ابعاد ثلاثہ" یعنی طول وعرض وعمق سے بالاتر ہے جو جسامت و ضخامت سے پاک ہے۔ کبیر صرف وہی ہوسکتا ہے جو حدوشکل سے بے نیاز ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظر ستارے پر پڑی تو دیکھا کہ خوب بڑا چمک دار اور بلند ہے' فرمایا یہ میرا رب ہے' پھر چاند کو دیکھا تو وہ اس سے زیادہ بڑا ہے فرمایا وہ نہیں یہ میرا رب ہے پھر سورج

کو دیکھا تو اسے اس سے بھی بڑا پایا' فرمایا یہ میرا رب ہے جب وہ غروب ہوگیا تو سمجھ گئے جسمانی اعتبار سے بزرگی و کبریائی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ کبیرو اکبر وہی ذات ہوسکتی ہے جس کی کبریائی و بزرگی جسامت کی مرہون منت نہ ہو۔ اسی طرح ان کی اس "الکبیر" تک رسائی ہوگئی جو حقیقتہً "الکبیر" ہے۔ مادے' حدود' شکل اور طول و عرض و عمق وغیرہ سے بہت بلند ہے۔

قرآن شریف میں اکیس جگہ کبیر کا لفظ آیا ہے۔ کہیں تو اسے جسامت کے اعتبار سے بڑے ہونے کے لئے استعمال کیا ہے' جیسا کہ ابھی ہم نے کبیر کو اسی اعتبار سے لیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں ہے۔ **اِلَّا کَبِیْرًا لَّھُمْ لَعَلَّھُمْ اِلَیْہِ یَرْجِعُوْنَ** "انہوں نے سب بتوں کے ٹکڑے کر دیئے اور سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا کہ وہ اس بارے میں اس کی طرف رجوع کریں اگر وہ بول سکے اور انہیں بتا دے"۔

کہیں کبیر کو "کبیرالسن" کے لئے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ سب سے بڑے بھائی نے کہا اسے قتل نہ کرو کسی اندھے کنویں میں ڈال دو اگر تم لوگ ایسا کرنا ہی چاہتے ہو۔ ظاہر ہے جسمانی اعتبار سے لمبا چوڑا نہیں بلکہ عمر کے اعتبار سے بڑا تھا۔ اسی طرح شعیب علیہ السلام کی لڑکیوں کے ذکر میں ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا **ابونا شیخ کبیر** "ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔" یہاں بھی کبیر کو سن کے اعتبار سے استعمال کیا گیا ہے یوسف علیہ السلام کا ایک بھائی اپنے بھائیوں کے اعتبار سے بڑا تھا مگر اپنے باپ کے اعتبار سے چھوٹا تھا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام اس کے اعتبار سے بڑے تھے مگر اپنے باپ کے اعتبار سے چھوٹے تھے اور وہ اپنے باپ کے اعتبار سے چھوٹے تھے معلوم ہوا سن کے اعتبار سے بڑا ہونا ایک اضافی چیز ہے حقیقتاً تو بڑائی اسی "الکبیر" کے لئے ہے جو ماہ وسال اور زمانے کی قیود سے آزاد ہو۔ کہیں کبیر کا لفظ' علم وفن میں بڑائی کے اعتبار سے استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرعون کے قصے میں ہے کہ جب جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکست کھا کر سجدے میں گر پڑے تو فرعون نے کہا یہ تو تمہارا استاد معلوم ہوتا

ہے جس نے تمہیں ساحری سکھائی ہے معلوم ہوا کہ کبریائی فنی مہارت کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے چنانچہ کہتے ہیں "بزرگی بہ علم است نہ بہ سال" بزرگی علم و عقل سے ہے ماہ و سال سے نہیں ہم اپنے شاگردوں کے اعتبار سے کبیر ہیں مگر اپنے استاد کے اعتبار سے صغیر ہیں اور ہمارے استاد ہمارے لئے کبیر ہیں مگر اپنے اساتذہ کے مقابلے میں صغیر ہیں۔ میں نے بارہا اپنے اساتذۂ دارالعلوم دیوبند کو بڑی حسرت سے کہتے سنا **کبرنا موت الکبراء** ہمیں بڑوں کی موت نے بڑا بنا دیا ہے۔ ہمارے وہ اساتذہؒ جو علوم کے سمندر تھے اور ہماری نظروں میں کبیر و عظیم تھے اپنے استادوں کے مقابلے میں صغیر تھے اور ان کے وہ اساتذہ ان کی نظروں میں کبیر و عظیم تھے اپنے استادوں کے سامنے صغیر و حقیر۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

ایک دفعہ ایم اے عربی کے طالب علم کہنے لگے آپ تو سمندر کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔ ہم جس علم و فن کے بارے میں بھی آپ سے سوال کرتے ہیں تو آپ کہیں رکتے ہی نہیں میں نے کہا اگر آپ لوگ ہمارے استادوں کو دیکھتے تو حیران و ششدر رہ جاتے۔ بھائی میں تو ان سمندروں کی ایک چھوٹی سی نہر ہوں معلوم ہوا علم و فن کے اعتبار سے بڑائی بھی ایک اضافی چیز ہے کبیر تو اس "الکبیر" کی ذات ہے جو "علام الغیوب" ہے۔

کہیں "فضل" کو کبیر کہا گیا ہے۔ کہیں "فوز" کو، کہیں "اجر" وغیرہ کو ظاہر ہے کہ یہ بڑائی نہ جسمانی اعتبار سے ہے نہ زمان و مکان وغیرہ کے اعتبار سے مگر ان میں بھی درجات ہیں تو حقیقتہً "الکبیر" اس کی ذات ہے جو ہر اعتبار سے کبیر ہے۔

ایک افسر اپنے ماتحتوں کے اعتبار سے کبیر ہوتا ہے مگر اپنے افسر کے اعتبار سے صغیر ہے گاؤں کا چوہدری اپنے گاؤں کے اعتبار سے کبیر ہے مگر اپنی تحصیل یا ضلع والوں کے اعتبار سے صغیر ہے ایک بادشاہ اپنی مملکت کے اعتبار سے کبیر ہے مگر اپنی مملکت کے باہر کچھ بھی نہیں یا اگر اس سے اس کا کوئی دشمن سلطنت چھین لیتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ مخلوق کی کبریائی میں مدوجزر رہتا ہے۔ حقیقتہً "الکبیر" وہی "المتعال" ہے۔ جس کی کبریائی

میں مدوجزر نہیں۔

دنیا کا ایک عظیم فلسفی، سردار کبیر اور سلطان عظیم مر جاتا ہے تو لوگ اسے نذرِ آتش کردیتے ہیں یا زمین کے اندر اس کو دفن کردیتے ہیں وہ ہستی جسے لوگ سر اور آنکھوں پر بٹھاتے تھے انہی لوگوں کے ہاتھوں اسے آگ یا خاک کی سپرد کردیا جاتا ہے۔ لوگ ان کے فلسفے، سرداری اور سلطنت پر بڑی بے دردی سے تنقید کرکے ان کی عظمت کو ملیامیٹ کردیتے ہیں تو ایسے لوگ کیسے کبیر ہو سکتے ہیں۔ حقیقتہ "کبیر تو وہی "الکبیر" ہے جسے کوئی آب وخاک و آتش کے سپرد نہیں کرسکتا اور ہزار رنگ سے بدترین تنقیدیں کرے تب بھی اس کی کبریائی میں کوئی فرق نہیں ڈال سکتا۔

ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ ان کی کبریائی ذاتی نہیں ہوتی، کسبی، بالغیر، عارضی، اور فانی ہوتی ہے۔ جب وہ غیر ان سے زائل ہوجاتا ہے تو ان کی کبریائی بھی ختم ہوجاتی ہے یا جب وہ خاص میعاد ختم ہوجاتی ہے تو وہ پھر جیسے تھے ویسے ہی رہ جاتے ہیں یا جب ان کے معتقدین نہیں رہتے یا ان سے بدعقیدہ ہوجاتے ہیں تو وہ اتنے بڑے نہیں رہتے جیسے کہ سابق میں تھے۔ حقیقی کبریائی اس "الکبیر" کے لئے ہے کہ اسے کوئی مانے یا نہ مانے وہ بہرحال "کبیرومتعال" ہی ہے اس کی کبریائی میں سے کوئی بھی ایک ذرہ برابر کم نہیں کرسکتا نہ اضافہ کرسکتا ہے۔ ہم جن لوگوں کی کبریائی میں اضافہ کرسکتے ہیں تو اسے کم بھی کرسکتے ہیں لہٰذا وہ ہمیشہ کبیر نہیں رہتے۔ ان کی کبریائی ایک کھلونا ہوتی ہے۔ جسے معتقدین گیند کی طرح اوپر کو اچھالتے رہتے ہیں اور مخالفین اسے زمین پر پٹختے رہتے ہیں لہٰذا ان کی بڑائی مدوجزر کا شکار رہتی ہے مگر اس "الکبیر" کی کبریائی مخلوق کی دسترس سے باہر ہے اور گھٹاؤ بڑھاؤ سے بلند ہے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "اسی کے لئے آسمان و زمین کی بڑائی ہے۔"

شیر کی کبریائی جنگل تک ہے۔ ذرا بستی میں جاکر دیکھیے۔ وہیل مچھلی کی بڑائی سمندر تک ہے ذرا باہر نکل کر دیکھے کیسے تکا بوٹی ہوتی ہے۔ ہماری بڑائی زمین کے کچھ مخصوص حصوں تک ہے۔ بحروبر میں ہمیں کون بڑا سمجھتا ہے۔

وحشی جانور اور سمندری حیوانات ہمیں کب محترم سمجھتے ہیں۔ خود سطح ارض تک ہم محترم نہیں تو فضاؤں اور آسمانوں میں کون ہماری کبریائی کو تسلیم کرے گا؟ ستاروں کی دنیا میں ہماری کون پذیرائی کرے گا؟ وہاں ہمیں کون جانتا ہے؟ شہاب ثاقب ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ معلوم ہوا یہ مغرور انسان جو بڑا عظیم بنا پھرتا ہے اس کی معمولی جنگلوں اور ذرا ذرا سے دریاؤں میں بھی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے پہاڑوں کے اندر اور زمین کے نیچے بھی یہ بالکل بے وقعت ہے زمین کے اوپر بھی اس کی کیا وقعت ہے اگر اپنے محلے میں بڑا ہے تو بہت سے اس کی بڑائی کا مذاق اڑانے والے ہوتے ہیں اور اگر اپنی بستی میں بڑا ہے تو بستی کے بہت سے اس کی بڑائی کے منکر بھی ہوتے ہیں اور اگر اپنے ضلع میں بڑا ہے تو کثیر تعداد ایسی بھی ہو گی جو اس سے ناواقف ہوگی اور اگر اپنے صوبے میں بڑا ہو تو بہت سے اس کو ذلت سے یاد کرنے والے بھی ہوں گے اور اگر اپنی اقلیم میں بڑا ہوگا تو بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو اس کے ماننے والے نہ ہوں گے اور اگر پوری زمین میں بڑا ہے تو کتنے ہی اسے ٹھکرانے والے بھی ہوں گے پھر یہ کہ اس کی کبریائی صرف چند سالوں تک ہی ہوگی۔ فرعون جیسے لوگ خدا مانتے تھے اس سے بڑا رتبہ کسی انسان کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے؟ آج سے نہیں عرصہ دراز سے لوگ اس پر لعنت کرتے چلے آئے ہیں لوگ نمرود کو بے وقوف اور شداد کو مغرور محض سمجھتے ہیں۔ دنیا کی ان عظیم ہستیوں کی کبریائی کہاں گئی؟ یہ جو خدا بنے بیٹھے تھے آج کا انسان ان کی عقل پر ہنستا ہے ان کو برائی سے یاد کرتا ہے، گمراہ اور غلط کار بتاتا ہے۔ معلوم ہوا حقیقتہً "الکبیر" اسی کی ذات ہے جس کی کبریائی دریاؤں اور سمندروں، جنگلوں، پہاڑوں، آسمانوں، زمینوں کے سینوں اور فضاؤں میں ہے بلکہ مکان ولامکان، زمان و لازمان ہر جگہ اور ہر آن میں ہے۔

ہر ملک وقوم میں بزرگی کے معیار مختلف ہیں اگر ایک ملک میں کوئی بات بڑائی ہے تو وہی بات دوسرے ملک میں چھوٹائی کی ہے۔ ہم ایک کی نظر میں محترم ٹھہرتے ہیں تو دوسرے کی نظر میں ذلیل و کم ظرف۔ اس لئے اگر کوئی انسان چاہے کہ وہ کبیر مطلق بن جائے تو نہیں بن سکتا کبیر علی الاطلاق تو وہی بن سکتا

ہے۔ جو معیاروں، رسموں اور اصولوں سے بلند ہو۔ اور ایسی ذات اسی "الکبیر" کی ہے جس کی تسبیح دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور زمینوں اور آسمانوں میں ہردم اور ہر آن پڑھی جاتی ہے اور جس کی تسبیح وتقدیس سے ایک ذلیل انسان زمین اور آسمان میں محترم ٹھہرتا ہے۔ جسے سب بڑا مانتے ہیں۔ وہی "الکبیر" کسی کو کبریائی عطا کرتا ہے تو کبیر ہو جاتا ہے۔ زمین و آسمان کی کبریائی صرف اسی "الکبیر" کے لئے ہے۔

*

الکریم جل جلالہ

کریم ایک ایسا لفظ ہے جس کا پوری طرح ترجمہ اردو زبان میں نہیں ہوسکتا ہمارے مدرسین و معلمین اس کا ترجمہ سخی کرتے ہیں تو اس لئے کہ سخی انسان شریف آدمی ہوتا ہے۔ دراصل کریم اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو تمام اخلاق کاملہ کا حامل ہو اور ظاہر ہے کہ یہ بات سوائے ذات خداوندی کے کسی میں نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے کسی نہ کسی بدخلقی میں مبتلا ہوتا ہے۔

؎ اک نہ اک عیب حسینوں میں ہوا کرتا ہے
جس کو صورت ملی اچھی اسے سیرت نہ ملی

بے عیب تو صرف اسی کی ذات پاک ہے' چونکہ وہ کریم ہے اس لئے اس کا رسولؐ بھی کریم ہے' اس کا شکر ہے کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں۔

؎ تجھ کو کریم جان کے ہم نے گناہ کئے
تیرے کرم کی آس میں اہل خطا بنے

کریم چونکہ جامع اخلاق حسنہ کو کہتے ہیں' اس لئے اس مختصر مضمون میں اس کے سارے معانی کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ایک دو معانی کی طرف اشارہ کئے دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کریم وہ ہے جو بے مانگے دے اور جواد وہ ہے جو دے کر خوش ہو اور سخی وہ ہے جو مانگے سے دے اور سخاوت کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دے اور دے کر ملول ہو یا مجبوراً" دے یا دکھاوے کے لئے دے یا شہرت وغیرہ کی غرض سے دے۔

وہ "الکریم" بغیر مانگے دیتا ہے' آدم نے اس سے خلافت ارضی کا مطالبہ نہیں کیا تھا' اس نے اتنی بڑی دنیا بنائی اور آدم کو سونپ دی' وہ کتنا بڑا کریم ہے۔

آدم نے پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے بعد اس سے جنت کی طلب نہیں کی تھی، اس نے خود ہی بغیر مانگے عطا کردی تھی مگر اس سے لغزش ہوگئی چونکہ وہ منتقم وجبار وقہار بھی ہے لہٰذا وہاں سے نکال تو دیا مگر جنت ارضی عطا کردی۔ اب اس کی اولاد اس جنت ارضی کی وارث ہے اور طرح طرح کی نعمتوں سے شاد کام ہوتی ہے پھر اولاد آدم بہشتوں کی وارث ہوگی مگر مشروط طور پر۔

ہم نے شکم مادر میں اس سے کچھ نہیں مانگا تھا ہم اسے جانتے ہی نہ تھے، ہمیں مانگنا آتا ہی نہیں تھا مگر اس نے بغیر مانگے ہمارے لئے ہوا، پانی اور خون مہیا کردیا۔ یہ اس کا کتنا بڑا کرم ہے اور بے شک وہ "الکریم" ہے کہ بغیر مانگے دیتا ہے اور خوب دیتا ہے۔

بغیر ہوا کے انسان وحیوان و شجرونباتات ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتے تو ہوا کو اس "الکریم" نے عام کردیا ہے ہر ایک کو بغیر کسب واکتساب کے ہر دم پہنچتی رہتی ہے اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ مفت وبے منت ایک نعمت عظمیٰ ہے جس کا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا۔

شاہ چون روزی دہد منّت نہد   رازقِ مارزق بے مِنّت دہد

ہوا کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہر لمحہ اس کی ضرورت ہے مگر پانی کی یہ صورت نہیں ہے، وہ بھی عام ہے مگر جدوجہد شرط ہے۔ اس "الکریم" نے ہمارے لئے پانی مہیا کیا، اگر پانی نہ ہوتا تو ہم اور ہمارے جانور کیسے زندہ رہتے، کھیتی باڑی کیسے ہوتی، درخت کیسے پھل پھول لاتے کھانا کیسے پکتا اور کیسے ہضم ہوتا۔ دل وجگر میں کیسے ٹھنڈک پڑتی اور آنکھوں میں کسے طراوت آتی۔

آب وہوا سے آگ کم ضروری ہے مگر اس سے ہمارے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ آگ نہ ہوتی تو ہم سردی سے کیسے بچتے اور طرح طرح کی مصنوعات کیسے بناتے۔ اس "الکریم" نے ہمارے لئے سبز درختوں میں آگ بھر دی **مِنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا**"۔

ہوا کی طرح ہمیں مٹی کی بھی سخت ضرورت ہے وہ بھی ہر جگہ عام ہے اور قسم قسم کی مٹی ہماری طرح طرح کی ضروریات کو پوری کرتی ہے۔ اگر مٹی نہ

ہوتی تو زندگی اجیرن ہوجاتی' پھر مٹی میں طرح طرح کے پتھر' کوئلہ اور روغنیات وغیرہ پیدا کیئے تاکہ افراط کے ساتھ اپنی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

آگ ہوا پانی اور مٹی ہمارے لئے بے حد ضروری ہیں سووہ ہر جگہ موجود ہیں مگر انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔**اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ** بعض لوگ کہا کرتے ہیں ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نہیں دیا' ہم نے ان سے کہا شکر کرو تمہیں بھی بہت کچھ دیا ہے' کہنے لگے یہ تو عام چیزیں ہیں۔سب کو دی ہیں کیوں بھائی جو چیز عام ہو وہ نعمت نہیں ہے؟ اور اپنے جسم پر غور کرو لاتعداد خادم دیئے ہیں جو ہر وقت مصروف خدمت رہتے ہیں۔

اس "الکریم" نے اپنی مخلوق کی لذت کے لئے بے شمار مادی چیزیں پیدا کی ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار روحانی لذتیں بھی پیدا کی ہیں۔ تاکہ مخلوق تنگ دل نہ ہوجائے انسان وحیوان کے لئے طرح طرح کی روحانی وخیالی لذتیں اور مسرتیں تو بنائی ہی ہیں۔ شجرونباتات کے لئے بھی بہت سی روحانی وخیالی مسرتیں پیدا کی ہیں۔ یہ اشجار ونباتات صرف پانی' مٹی اور ہوا ہی نہیں کھاتے یہ بھی رنگ برنگی خوشیوں سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ شادی بیاہ رچاتے ہیں' بچے دیتے ہیں۔ چڑیوں کے نغمے سنتے ہیں' گاتے ہیں' ناچتے ہیں جب ہوائیں ان کی شاخوں اور پتوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہیں تو وہ اپنے پتوں کی سرسراہٹ کے نغمے سن کر خوشی سے جھومتے اور ناچتے ہیں۔ جس طرح ہم اپنی اولاد کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی اپنے پھولوں اور پھلوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اس پیدوار پر ناز کرتے ہیں۔ اشجارونباتات نے اس سے کچھ نہیں مانگا بس اس "الکریم" نے انھیں بے مانگے یہ سب کچھ دیدیا ہے۔

ہمارے دل بہلانے کے لئے اس نے طرح طرح کی مسرتیں پیدا کی ہیں' راحت وآرام' مال ودولت کی خوشی' اولاد کی مسرت' بچوں کے شادی بیاہ کا سرور' دوست احباب سے ملاقات کا لطف' اپنے اور اپنے بچوں کے امتحان میں پاس ہونے کی خوشی' بچوں کی بھولی بھالی باتیں اور ان کے کھیل کود کی مسرت' دریاؤں' پہاڑوں' سمندروں اور شہروں شہروں کی سیروتفریح کا مزا۔ ان گنت ہر دم کی

لذتیں ان کے سوا ہیں' دوست احباب کے ساتھ باتیں کرنے کا اور لطف ہے' بیوی کے ساتھ باتیں کرنے کا اور مزا ہے' بزرگوں اور دانشوروں سے ہم کلامی کا اور ہی مزا ہے' تنہا سکون کے مقام پر سونے کا لطف اور ہے' بیوی کے ساتھ سونے کا اور مزا ہے اور بچوں کو ساتھ لے کر سونے میں اور ہی تسکین ہے۔

اگر کوئی شخص ان باتوں سے محظوظ نہیں ہوتا بلکہ کتابوں سے سر مارنا پسند کرتا ہے تو اس کے لئے کتابوں میں وہ لذتیں پنہاں ہیں جن کے سامنے مذکورہ بالا لذتیں بالکل ہیچ ہیں کیونکہ لذت علم ساری لذتوں سے بڑھ کر ہے۔ علمی گتھیاں سلجھانے میں جو مزا آتا ہے اور دماغ سوزی کے بعد جو ایک حقیقت سامنے آتی ہے وہ دل کو ایسا سکون بخشتی ہے جسے اہل علم ہی جان سکتے ہیں۔ پھر اس ''الکریم'' نے ہمارے لئے علوم بھی طرح طرح کے پیدا کئے ہیں کہ ہر علم کی علیحدہ چاشنی ہے۔ بے شمار مسائل اور بیشمار علوم وفنون ہیں کہ اگر کوئی شخص ساری عمر انہی میں مشغول رہنا چاہے تو رہ سکتا ہے یہ اتنے سارے علوم وفنون اس ''الکریم'' نے ہمیں بے مانگے دیئے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ دنیا کی طرف رخ کرتے ہیں نہ علم کی طرف' بس وہ شب وروز روح کی پرورش میں لگے رہتے ہیں اس ''الکریم'' نے ایسے صوفیوں' راہبوں اور جوگیوں کے لئے ایسی ایسی لذتیں پیدا کردی ہیں کہ وہ ملک سلیمان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ایسے ایسے درجات ہیں کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتے ہر مقام دوسرے مقام سے اعلیٰ وارفع ہوتا ہے اور ہر ترقی بعد والی ترقی کے سامنے ہیچ ہوتی ہے۔ واللہ جو مزہ شراب حقیقی میں ہے اس کے مقابلے میں شراب مجازی کچھ بھی نہیں ہے اس کا نشہ سارے نشوں سے تیز تر ہے اور لذت عشق ہر لذت سے بڑھ کر ہے لذت علم بھی اس کے سامنے ہیچ ہے یہ لذتیں اس ''الکریم'' نے اپنے بندوں کے لئے بے مانگے پیدا کیں۔

حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج آسمانوں پر تشریف لے گئے اور واپس چلے آئے۔ بخدا اگر میں ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا''۔ ایسا انہوں نے کیوں کہا؟ اس لئے کہ وہ

جانتے تھے کہ وہ عالم کتنا وسیع، کتنا لطیف اور کتنا پاکیزہ ہے۔ وہاں وہ مسرتیں اور انوار والطاف ہیں جو دنیا میں کہاں؟ ایک سرورِ ابدی ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور بغیر ذکرِ شراب ولبن و عسل وجواہرات وحور وقصور کے ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسی لئے شاعر نے کہا ہے۔

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر ومینا کہے بغیر

ہم مادی لوگ ہیں۔ ہمیں مادیات کے ذریعہ ہی سمجھایا جاسکتا ہے بعض بچے بڑا فلسفیانہ سوال کردیتے ہیں تو انہیں ان کی عقل کے مطابق بات سمجھائی جاتی ہے ورنہ ان کے پلے کچھ بھی نہ پڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "**کلموا الناس علی قدر عقولهم** " "لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو"۔

اس "الکریم" نے عالم آخرت میں ہمارے لئے بڑی بڑی مسرتیں پیدا کردی ہیں جس طرح یہاں اپنی مخلوق کے لئے اہتمام کیا ہے وہاں بھی کیا ہے، کیوں نہ کرتا وہ "الکریم" جو ٹھہرا۔

قرآن شریف میں بالکل واضح الفاظ میں بتادیا گیا ہے کہ اس جنت کی کہاوت ایسی ہے کہ اس میں صاف شفاف پانی کی نہریں ہیں **مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِی وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ**۔ اور حدیث میں واشگاف الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ جنت میں وہ کچھ ہوگا جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا اور کسی بشر کے دل پر بھی اس جیسا خیال تک نہیں گزرا۔ یہ شراب وحور وقصور تو ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی بشر کے دل پر نہ گزری ہوں، معلوم ہوا وہ کچھ اور ہی حقائق ہیں جو اس "الکریم" نے بغیر مانگے ہمارے لئے تیار کر رکھے ہیں۔ بعض لوگ جنت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بھائی اگر وہاں شراب وحور وقصور ہوں گے تو کیا ہرج ہے مزے اڑانا، جو لوگ حور وقصور کے لئے عبادت کرتے ہیں واقعی ان کے لئے حور وقصور ہی ہوں گے کیونکہ عموماً" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو وہی دیتے ہیں جن کی انہیں تمنا ہوتی ہے مزدور کو اس کی خواہش کے مطابق مزدوری ہی ملے گی تاکہ وہ خوش

رہے۔ جو یہ کہتے کہتے مرگیا۔

؎ جنت کی حور دلادو نبی جی جنت کی حور دلا دو!

اسے جنت کی حور ہی ملے گی مگر جو لوگ شراب و حور و قصور کی حدود سے اس عالم میں گزر چکے ہیں ان کے سر یہ بلائیں کیوں تھوپی جائیں گی ان کے لئے وہاں وہ کچھ ہوگا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہو' نہ کسی کان نے سنا ہو اور نہ کسی کے دل پر اس کا خیال تک گزرا ہو بزرگوں نے لکھا ہے۔" اس دنیا کی لذتیں پھل پھول' میوے' شراب وکباب اور حسین عورتیں' جنت کی چیزوں کا ادنیٰ سا نمونہ ہیں۔" اگر یہ چیزیں ہمارے لیے یہاں نعمتیں ہیں تو وہاں بھی اسی قسم کی نعمتیں ہوں گی۔ یہ بات قرین قیاس بھی ہے اور اگر ایسا ہو تو مضائقہ بھی کیا ہے۔ جنت کے سارے مدارج ایک جیسے تو نہیں ہیں۔ جیسے جنتی ویسی لذتیں۔

؎ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ۔

"تمہارے لئے وہاں وہ ہوگا جو تم چاہو گے اور جو کچھ تم طلب کرو گے"۔

؎ اپنا اپنا ہے طریقہ اپنی اپنی ہے پسند
تم کو ہے عشقِ بتاں اور مجھ کو عشقِ حور ہے

*

اَللَّطِیْفُ جل جلالہٗ

ہوا کس قدر لطیف ہے' دکھائی نہیں دیتی ' ہماری ذرا سی حرکت سے پاش پاش ہوجاتی ہے' ہر جگہ موجود ہے پہاڑوں کے پیٹ ' سمندروں کے سینے ' زمین کے طبقات ' درختوں کے جسم اور چٹانوں کے جگر میں گھسی ہوئی ہے۔حاضر تو ضرور ہے پتہ نہیں ناظر بھی ہو۔ باوجود اس قدر لطافت کے اتنی طاقتور بھی ہے کہ بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے ' سمندروں اور دریاؤں کو تہ وبالا کر دیتی ہے' بڑے بڑے محلات کو زمین بوس کردیتی ہے اور شہر کے شہر تباہ کردیتی ہے۔ یہ ہوا ہمیں بتاتی ہے کہ میں لطیف ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کر سکتی ہوں توجس لطیف نے مجھے پیدا کیا ہے وہ کتنا طاقتور ہوگا اور کیوں نہ ہر جگہ حاضروناظر ہوگا

چیز جس قدر لطیف ہوتی ہے طاقتور ہوتی ہے چونکہ خدا سب سے زیادہ لطیف ہے لہٰذا زیادہ طاقتور ہے۔ ہوا لطیف ہے تو دیکھئے سب پر حاوی ہے' بارود ' ایٹم ' ہائیڈروجن جیسی لطیف چیزیں اور شعاعیں بڑی بڑی عمارتوں اور مضبوط قلعوں' بڑے بڑے جہازوں 'ٹینکوں اور توپوں کو ریزہ ریزہ کردیتے ہیں۔ لوہا جو سب سے زیادہ سخت چیز ہے دھواں بن کر اڑجاتا ہے۔

اس کی لطافت کا ایک مظہر پانی بھی ہے۔ کتنا لطیف ہے جس برتن میں چاہو ڈال لو' پی لو' بہادو' بھاپ بنا کر اڑا دو مگر اتنا طاقتور ہے کہ ساری مخلوق کو سیراب کرتا ہے ان کے دل ودماغ کو تازہ رکھتا ہے۔ درختوں اور کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ درختوں ' پھلوں ' میوؤں انسانوں اور حیوانوں کی رگ رگ میں جاری وساری ہے' ہر جگہ گھس جاتا ہے اس قدر لطافت کے باوجود اتنا طاقتور ہے کہ بڑے بڑے تناور درختوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ بستیوں کی بستیاں تباہ کر دیتا

ہے قلعوں اور محلات کو بہا کر لے جاتا ہے بڑے بڑے جہازوں کو غرق کردیتا ہے۔ بڑے بڑے زور آوروں کو بے زور کردیتا ہے۔ہاتھی اور شیر بھی اس سے پناہ مانگتے ہیں تو جس لطیف نے اس کو یہ لطافت وطاقت بخشی وہ کتنا لطیف اور کتنا طاقتور ہو گا۔

آگ کس قدر لطیف ہے مگر ہر چیز کو کھا جاتی ہے جو چیزیں بھاری بھر کم اور ثقیل ہیں یہ انہیں خاطر میں نہیں لاتی۔ ہر جگہ سرایت کرجاتی ہے خواہ لوہے کا جگر ہو یا پتھر کا دل' بڑے بڑے قلعے اور دیوہیکل جہاز اس کے سامنے ہیچ ہیں ہر جاندار کے جسم میں گھسی ہوئی ہے کہیں کھانا پکاتی ہے تو کہیں خون بناتی ہے پھر اسے اپنی طاقت سے سارے جسم میں گھماتی ہے۔اس سے پیدا شدہ حرارت اس سے بھی زیادہ لطیف ہے جو موجود ہے مگر دکھائی نہیں دیتی درختوں اور پتھروں تک میں اس کا نشیمن ہے۔ اس کی پیدا کردہ حرارت بھاپ اور دھواں کتنے لطیف اور کتنے طاقتور ہیں منٹوں میں لوہے پگھلا دیتی ہے اور بڑے بڑے ٹینک اور توپوں کو خاکستر بنادیتی ہے۔ باوجود لطافت ونزاکت کے طاقتور ہے اور بڑی سے بڑی مادی چیز کو کھا جاتی ہے تو وہ ذات جس نے باوجود لطافت کے اسے اتنی قوت بخشی وہ کتنی لطیف اور قوی ہوگی۔

بھاپ کتنی لطیف ہے مگر بڑی بڑی ریل گاڑیوں اور جہازوں کو اڑائے اڑائے پھرتی ہے' لوہے اور پتھر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ بھاری مشینوں کو ذراسی جنبش دے سکیں۔ تیل اور پٹرول اپنی لطافت کی بنا پر طاقتور ہیں اور بجلی ان سے بھی زیادہ تیز ہے۔ یہ بجلی جو دکھائی نہیں دیتی اور ہر جگہ حاضروناظر ہو سکتی ہے۔ خالق کی اس صفت میں شریک ہے کہ پاک وناپاک ہر جگہ سے گزرجاتی ہے اور پھر بھی پاک ہی رہتی ہے۔ جیسے وہ ہر جگہ موجود ہے مگر پھر بھی منزہ ومقدس ہے ریڈیائی اور دوسری قسم کی شعاعیں کتنی لطیف ہیں اور کیسے کیسے طاقت کے کام انجام دیتی ہیں۔ انسان افلاک ونجوم کی سیر کے لئے لطیف ترین اشیاء کا سہارا لے رہا ہے۔

ان تمام مذکورہ بالا اشیاء سے بھی لطیف تر ہماری عقل ہے جس نے زمین

و آسمان کو مسخر کر رکھا ہے اور ساری مخلوق کو تگنی کا ناچ نچاتی رہتی ہے۔ اس کی گرفت سے نہ پہاڑوں کو مفر ہے نہ دریاؤں اور سمندروں کو' نہ افلاک و نجوم کو' یہ عقل جس نے ساری دنیا میں کہرام مچا رکھا ہے دکھائی نہیں دیتی تو وہ ذات جس نے اسے پیدا کیا کتنی لطیف اور کتنی طاقتور ہوگی۔

خود ہماری اپنی قوت اس قدر لطیف ہے کہ دکھائی نہیں دیتی پھر بھی سارے کام انجام دیتی ہے۔ بڑے سے بڑے حیوانوں کو گرفت میں لے آتی ہے۔ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ درختوں کو چیر کر رکھ دیتی ہے اور سمندروں کو زیروزبر کردیتی ہے۔باوجود لطافت کے سب پر حاوی ہے تو جس ذات نے اسے قوت بخشی وہ کتنی طاقتور ہوگی۔

فرشتے اور جنات ہماری طرح مادی نہیں ہیں لہٰذا وہ ہم سے زیادہ طاقت ور ہیں ہم زمان و مکاں کے پابند ہیں اور ثقالت و خفت کے مرہون ہیں مگر وہ ان چاروں سے بالاتر ہیں ہر جگہ اور ہر وقت آجاسکتے ہیں۔ محلات کی مضبوط دیواریں اس لطیف مخلوق کو نہیں روک سکتیں یہ شعاعوں کی طرح ہر جگہ نفوذ کر جاتے ہیں۔ اس لطیف مخلوق کا یہ حال ہے تو اس کے خالق کا کیا حال ہوگا؟

ہم سمجھتے ہیں کہ ٹھوس اور جامد مادے زیادہ طاقتور ہیں ۔ لوہے اور پتھر میں زیادہ قوت ہے' ایسا نہیں ہے قوت تو لطیف چیزوں میں زیادہ ہے۔ ہمارا جسم وہ کام انجام نہیں دے سکتا جو ہماری روح انجام دے سکتی ہے کیونکہ وہ زمان و مکان اور ثقالت و خفت کی پابند نہیں اس کے بل بوتے پر کسی نے چاند کے دو ٹکڑے کردیئے کسی نے پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا' کسی نے مردے زندہ کر دیئے کسی نے بہتے دریاؤں کو روک دیا تو کسی نے زمین کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں۔ کوئی بغیر پروں کے فضا میں اڑگیا۔ کسی نے کوئی دوسرا روپ دھارلیا کوئی پانی پر چلا تو کسی کے لئے آگ گلزار ہو گئی۔ الغرض روحانی طاقت سے بعض لوگوں نے ایسے ایسے عجوبے دکھائے کہ علم و عقل انگشت بدنداں رہ گئے۔

پچھلے زمانوں کے جو عجیب و غریب واقعات ہیں جن کی تاویل سے سائنس عاجز آکر راہِ انکار اختیار کرتی ہے۔ وہ سچ مچ ایک حقیقت تھے مگر اس دور کا انسان

مادیات میں پھنس کر روحانی طاقتوں سے بالکل بے گانہ ہوگیا ہے۔ انکار عجز سے ہوتا ہے اور اثبات طاقت سے' انکار بہت آسان ہے اور عاجزوں کا کام ہے سائنس کو اگر اپنی قوت پر ناز ہے تو ان باتوں کا اثبات کرکے دکھائے؟ بڑی آسانی سے انسان خدا کا انکار کرسکتا ہے صرف ذرا زبان ہلانی پڑتی ہے۔ اسی طرح ہر حقیقت سے آسانی سے انکار کر سکتا ہے اور عام طور سے ہم ایسی چیزوں ہی کا انکار کرتے ہیں جو ہمیں معلوم نہیں ہوتیں یا ہماری دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔

جادواگرچہ باطل ہے مگر ہے حقیقت۔ سحروساحری میں سارا کام ارواح سے لیا جاتا ہے میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس سے کھانے کی جس چیز کی بھی فرمائش کی جاتی تھی فورا" آجاتی تھی خواہ وہ اس بستی میں بھی کہیں نہ پائی جاتی ہو اور سب بڑے مزے لے لے کر انھیں کھاتے تھے۔ ایک صاحب سلسلہ بزرگ کو دیکھا کہ ان کے بٹوے سے ہمیشہ سو کا نوٹ ہی نکلتا تھا۔ حالانکہ بٹوہ بالکل خالی ہوتا تھا مگر وہ ہاتھ ڈالتے تو سو کا نوٹ ہی برآمد ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ساحرہ نے جادو کیا اور آپؐ کے جسم مبارک پر اس کا اثر ہوا جس کے توڑ کے لئے **مُعَوَّذَتَیْن(سورۃ الفلق والناس)** نازل ہوئی تھیں اور یہ دونوں سورتیں اب بھی عمل سحر کو باطل کردیتی ہیں۔

ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی وہ ماضی وحال و مستقبل کے بارے میں صحیح صحیح جواب دیتے تھے۔ بلکہ ایک اور بزرگ سے ملا۔ میں ان کے پاس کئی روز رہا۔ میں نے دیکھا کہ جو کچھ میرے دل پر گزرتا ہے ان کے سامنے بالکل آئینہ ہے مجھے جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہ خود ہی اپنے زنانے مکان میں سے باہر آکر مجھ سے کہتے صارم صاحب آپ کو یہ ضرورت ہوگی ہم نے اس کا انتظام کردیا ہے۔ "پیر روشن ضمیر" کے عنوان سے میرا ایک مضمون سلسبیل لاہور میں چھپ چکا ہے اور مینڈھوشاہ پر میں کئی مضامین لکھ چکا ہوں۔

ایک معتبر مصنف نے حضرت حاجی امداداللہؒ کے سوانح میں لکھا ہے کہ راوی نے بیان کیا۔ حاجی صاحب نے حرم کعبہ میں نماز پڑھی اور مجھے لے کر مدینہ شریف گئے وہاں ہم نے مغرب کی نماز ادا کی یہ طے ارض کیسے ہوا؟ کچھ

سمجھ میں نہیں آتا یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے حاجی صاحب کو گرفتار کرنا چاہا تو وہ تھانہ بھون سے روپوش ہو کر انبالہ ایک مرید کے گھر روپوش ہوگئے۔ انعام کے لالچ میں کسی نے مخبری کردی کمشنر خود آیا اور اس کوٹھی کو کھلوایا تو حاجی صاحب کو نہ پایا۔ جب پولیس چلی گئی تو میزبان نے دریافت کیا کہ آپ کہاں تھے؟ فرمایا قریب تھا کہ تمہارے پیروں میں کچلا جاتا۔

کیمیاؤ سیمیاؤ ریمیا۔ کس ندارند جزبذات اولیاء

ہمارے بزرگوں میں ایک رئیس کو کیمیا بنانے کا شوق تھا۔ ہمیشہ ایک تاؤ کی کسر رہجاتی تھی۔ بستی کی عیدگاہ کے حجرے میں جو فقیر رہتا تھا' ادھر سے گزرا پوچھا کیا کررہے ہو؟ کہنے لگے کیمیا بنارہاہوں ہمیشہ ایک تاؤ کی کسر رہ جاتی ہے وہ بولا ارے ذرا سا پوندے کا رس ڈال دے' انہوں نے ایسا ہی کیا تو سونا بن گیا۔ پھر بنانا چاہا تو نہ بنا' وہ اس بزرگ کے پاس گئے کہاشاہ صاحب بس ایک دفعہ بن کر رہ گیا۔ اب کیوں نہیں بنتا؟ فرمایا بھاگ جا بس ایک دفعہ بن چکا وہ سونا کیسے بنا؟ پہلے کیوں نہ بنا اب کیوں بن گیا؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا اتنا ضرور ہے کہ اگر زبان کو جھوٹ سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو پھر جو کچھ زبان سے نکل جاتا ہے حق ہو کر رہتا ہے۔ خاموشی سے حکمت پیدا ہوتی ہے اور کم کھانے 'کم سونے 'کم بولنے سے روح میں کچھ اجنبی سی طاقتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ قلب اتنا روشن ہوجاتا ہے کہ منزلوں کی باتیں معلوم کرلیتا ہے اور دور ترین چیزوں کو دیکھ لیتا ہے۔ ہماری ایک عزیزہ پاگل ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ زندہ تھے۔ ان کے والدؒ نے میرے والد صاحبؒ کو ان کے پاس بھیجا کہ معلوم کریں آرام ہوگا یا نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا' ایک لڑکی ایسے والان اور ایسے پلنگ پر بیٹھی ہے سامنے دروازے میں طوطے کا پنجرہ ٹنگا ہوا ہے' وہ اچھی نہیں ہوسکتی' کہاں گنج مراد آباد' اللہ اباد کے قریب اور کہاں سیوہارہ ضلع بجنور' بڑا بھاری فاصلہ ہے اور پھر جو کچھ انہوں نے آئندہ کے بارے میں فرمایا وہ بھی صحیح نکلا

"اولیا راہست قدرت ازالٰہ"

ایک بزرگ کو غلطی سے لوگ حجرے میں بند کرکے آگے سے تالا لگا

گئے۔ لوٹ کر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ باہر چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ نہ تالا ٹوٹا نہ دروازہ چیرا نہ دیوار پھوٹی۔ بتائیے یہ طاقت کب کسی مادی شے میں ہے؟ شاہزادہ داراشکوہ نے حضرت میاںمیر رحمتہ اللہ علیہ کی سینکڑوں کرامات لکھی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے معتبر مصنف ہے اور ان کی مجالس میں آنے جانے والا ہے۔ کیسے تکذیب کی جائے۔

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ یُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ

*

المَاجِدُ جل جلالہٗ

یہ لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ مجید کا لفظ چار جگہ آیا ہے۔ پارہ چھبیس رکوع ۱۵ سورہ ق کے ابتداء میں قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ۔ قسم ہے قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مجید سے تعبیر کیا ہے جبکہ پارہ دواز دہم رکوع ہفتم میں اپنے لئے بھی مجید کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ وہ حمید و مجید ہے۔

اور تیسویں پارے میں سورہ بروج میں دو جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ ایک آیت میں اپنے یا عرش کے بارے مجید کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی سورت کی آخری آیت میں قرآن کے لئے مجید کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ذُوالْعَرْشِ الْمَجِیْدِ صاحب عرش مجید

بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ بلکہ وہ قرآن مجید ہے۔

قرآن میں تو یہ لفظ بہت ہی کم استعمال ہوا ہے مگر عربی ادب میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔

ہم لوگ والد کے ساتھ ماجد کا لفظ ضرور بڑھاتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا خالق ثانی ہے۔ اس "الماجد" نے اپنی مخلوق کو بھی مجدوبزرگی سے نوازا ہے۔ چنانچہ پہاڑوں کو عظمت و بزرگی و سربلندی عطا کی۔ سمندروں کو جاہ و جلال بخشا۔ شیروں کو جنگلوں کا بادشاہ بنایا۔ شاہین کو پرندوں پر غلبہ و بزرگی عطا کی اور سب سے زیادہ بنو آدم کو عزت سے نوازا چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ

ہم نے اولاد آدم کو مکرم و معظم بنایا۔ اولاد آدم کو مخلوق کا بادشاہ بنایا۔ پہاڑ سمندر شیر شاہین سب اس کے حکم کو مانتے ہیں۔ پھر انسانوں میں بعض کو

بعض پر فوقیت دی کسی کو بادشاہ بنایا کسی کو وزیر کسی کو حاکم تو کسی کو گاؤں کا چودھری کسی کو دینوی عزت بخشی جیسے امراء و حکام کو تو کسی کو روحانی عزت بخشی جیسے انبیاء و اولیاء بزرگان دین کو اور کسی کومادی اور روحانی دونوں بزرگیاں عطا کیں جیسے داؤد و سلیمان علیہما السلام وغیرہ کو پھر پیغمبروں کے بعد کسی کو علمی بزرگی عطا کی جیسے بقراط و سقراط و ارسطو و افلاطون وغیرہ۔

اس نے رنگ رنگ کے ماجد پیدا کر دیئے مگر درحقیقت ماجد وہ ہے جو عبدالماجد ہو جو صحیح معنوں میں عبدالماجد بن گیا شاہان جہان تو کیا حیوانات واشجار حتیٰ کہ جمادات بھی اس کا حکم مانتے ہیں اور سلاطین عالم اس کے آستانے کو بوسہ دیتے ہیں۔

عبدالماجد پر مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم یاد آگئے۔ یہ کسی زمانے میں فلسفی اور دہریہ تھے۔ ایک زمانے میں مولانا ابوالکلامؒ آزاد بھی اسی قسم کے آدمی رہے تھے۔

اکبرالٰہ آبادیؒ صرف جج یا شاعری ہی نہ تھے۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ بھی تھے۔ عبدالماجد دریا بادی سے ملاقات ہوئی تو دریافت کیا کبھی قرآن پڑھا ہے کہا نہیں فرمایا اس نظر سے پڑھنا کہ یہ ادب عربی کی بہترین کتاب ہے۔ اکبر نے عبدالماجد پر ایک جال پھینکا اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے۔

قرآن کو سیکڑوں مستشرقین' ہزاروں دھریے' اور لاتعداد بے دین ادیب' عربی ادب کی خاطر پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ بغیر اس کے مطالعے کے کوئی شخص عربی زبان کا ادیب نہیں بن سکتا۔ عبدالماجد نے بھی اسے عربی ادب کی ایک کتاب کی حیثیت سے اٹھایا۔ دوسرے رکوع پر پہنچے تھے کہ قرآن نے انہیں شکار کر لیا اور اکبر الٰہ آبادیؒ کا بچھایا ہوا جال بڑا مضبوط ثابت ہوا۔ فلسفی مزاج تو تھے ہی دیکھا کہ اس میں سائیکولوجی بھری ہوئی ہے پڑھتے چلے گئے اور پھنستے چلے گئے۔

اکبر الٰہ آبادیؒ روشنی کے مینار تھے۔ علامہ اقبال نے حالی سے اور ان سے قومی شاعری سیکھی چنانچہ بانگ درا کے آخری صفحات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اکبر الٰہ آبادی سے کس حد تک متاثر ہو چکے تھے پھر فلسفیانہ دماغ رکھنے کی وجہ

ہے ظرافت کو چھوڑ بیٹھے۔

اب عبدالماجد کو وصول الی اللہ نے بے تاب کر دیا تھا۔ ایسے لوگ جو مفکر ہوں پھر مومن ہو گئے ہوں شدت سے حق کی تڑپ ان کے دل میں پیدا ہو جاتی تھی۔ تلاش حق کے لئے ایک عالم مرشد کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر نظر پڑی۔ وہ دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس تھے اور ان کی للہیت میں کسی کو کیا شک ہو سکتا تھا۔ عبدالماجد نے دیو بند کا رخ کیا اور مولانا حسین احمدؒ سے بیعت کی درخواست کی۔ انہوں نے حسب عادت معذرت کی اور فرمایا سیاست میں پڑ جانے کی وجہ سے مجھے تربیت و اصلاح کی فرصت نہیں ہے۔ میں آپ کو خانقاہ امداد یہ تھا نہ بھون حضرت مولانا شرف علی تھانوی کی خدمت میں لئے چلتا ہوں۔ وہ مجھ سے بہتر ثابت ہوں گے۔

حضرت مولانا حسین احمدؒ بہت کم کسی کو مرید کرتے تھے۔ کوئی سر ہی ہو جاتا تو بیعت کر لیتے۔ ورنہ تھانہ بھون ہی کا راستہ دکھاتے۔ جب یہ دونوں حضرات مولانا تھانویؒ کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے فرمایا اس دہریے کے لئے آپ اور میں دونوں کافی ہیں۔ بیعت آپ کریں تربیت میں کروں گا۔

حضرت مولانا تھانوی صاحبؒ کہا کرتے تھے کوئی کیسا ہی منکر خدا دہریہ ہو۔ ہماری خانقاہ میں دو تین ماہ رہ جائے تو وہ خود بخود خدا کا قائل ہو جائے گا۔ ہم اس سے کچھ نہیں کہیں گے نہ نماز وغیرہ کا مطالبہ کریں گے۔ عبدالماجد دو تین ماہ خانقاہ میں رہے پھر اجازت چاہی تو مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے فرمایا کیوں جا رہے ہو؟ انھوں نے کہا اس لئے کہ اتنے دنوں میں آپ کی خدمت میں رہا کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ فرمایا یہ بتاؤ اتنے عرصہ دراز میں کبھی کسی سنت کے خلاف بھی کوئی بات دیکھی؟ کہا نہیں۔ فرمایا یہی ہماری کرامت ہے۔

عبدالماجد نے جو کچھ اپنی سوانح میں اپنے بارے میں یہ واقعہ لکھا ہے بعینہٖ یہ واقعہ ایک پرانے بزرگ کا ہے مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ عبدالماجد نے چار جلدوں میں قرآن شریف کی انگریزی میں بڑی اچھی تفسیر لکھی ہے۔ یہ عقائد اہل دیو بند کے مطابق ہیں۔

پھر علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی خیال آیا کہ وہ بھی حضرت تھانویؒ کے مرید ہو گئے۔ سنا ہے کہ حضرت نے فرمایا۔ آپ معجزات کا انکار کرتے ہیں پہلے اس کی تردید کیجئے۔ پھر بیعت کریں گے۔ ایک دفعہ علامہ شبلی نعمانیؒ بھی خانقاہ امدادیہ گئے تھے تو حضرت تھانوی نے بس اتنا فرمایا سنا ہے آپ اردو اچھی لکھتے ہیں۔ خانقاہ امدادیہ کے قواعد و قوانین بڑے ہی سخت تھے۔ بات بات پر جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا اور ایسے لوگوں کو خانقاہ سے نکال دیا جاتا تھا۔ مگر جب کبھی مولانا حسین احمد مدنی تشریف لے جاتے تو سارے قواعد و قوانین بالائے طاق رکھ دیئے جاتے تھے۔ جس کا جو جی چاہے کرے۔ ورنہ مسجد کا لوٹا بھی ذرا مقام پر نہ رکھا جاتا یا کوئی چراغ بھی اٹھالیتا تو اس پر جرمانہ کر دیا جاتا تھا۔

خانقاہ میں مٹی کے دیئے تل کے تیل سے جلا کرتے تھے۔ مٹی کا تیل نہیں جلایا جاتا تھا طاقوں میں دیئے دھرے رہتے تھے۔ کیا مجال جو کوئی سخت ضرورت میں بھی انہیں طاق سے اٹھائے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ بڑے ہی سخت مزاج تھے۔ مگر ان کی مجلس میں مشاعرے کا سا لطف آتا تھا ہر ایک کے ساتھ دوستانہ بات ہوتی تھی۔ کسی سے ہدیہ قبول نہ کرتے جب تک یہ پتہ نہ چل جاتا کہ اس کی روزی حلال کی ہے۔ اسی لئے فقروفاقہ سے دوچار رہتے تھے جبکہ ان کی تصانیف سے پبلشر حضرات عیش کرتے تھے۔ اکثر جاہل لوگ کہتے حضرت آپ کو تو سب کچھ معلوم ہو گا تو صاف فرما دیتے مجھے کچھ معلوم نہیں۔

ایک دفعہ ایک چور حاضر خدمت ہوا اور بیعت چاہی۔ فرمایا جہاں جہاں چوری کی ہے پہلے ان کا مال واپس کر کے آؤ یا معافی مانگو۔ اس نے ہندوؤں کے گھروں اور دکانوں میں چوری کی تھی۔ ان بنیوں کے پاس گیا تو ہر ایک نے بخوشی معاف کر دیا۔

دنیا بھر کے ریسرچ اسکالر اور محققین نے نفسیات اسلامی کے سمندر میں غوطے لگائے۔ تو بڑی دور کی کوڑی نکال کر لائے کہ نفسیات اسلامی کا آغاز امام غزالیؒ سے ہوا یا علامہ ابن خلدونؒ سے مگر یہ بالکل غلط ہے۔

نفسیات اسلامی کی ابتداء سورہ بقرہ کے دوسرے رکوع سے ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ قرآن شریف کی سیکڑوں آیتوں سے نفسیات اسلامی کی ابتداء ہو چکی ہے۔ قرآن فرماتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

نیز ارشاد ہے۔

ان سے خوبی کے ساتھ جھگڑیے تو آپ دیکھیں گے کہ سخت سے سخت دشمن بھی آپ کے گہرے دوست ہو جائیں گے نیز فرماتا ہے۔

افسوس ہے ہر طعنہ زن بدگو پر۔

بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اور وہ یہ بات جانتا بھی ہے اور اسے مال کی بڑی محبت ہے۔

احسان کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ فلاح پاگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا۔ اور خسارے میں پڑ گیا جس نے اسے خراب کر دیا۔ ترش روئی کی اور پشت پھیر لی کہ اندھا آیا تھا۔ آپ کو کیا معلوم کہ وہ پرہیز گاری اختیار کرے گا مالدار کی طرف جھکتے ہو۔

سخت دل ہیں کافروں پر اور رحم دل ہیں آپس میں۔ انہیں اف بھی نہ کہنا اور نہ جھڑکنا۔

جو لوگ ریا کاری کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اور ذرا ذرا اسی چیزوں سے منع کرتے ہیں۔

لوگوں کے لئے گال نہ چڑھا اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ تم زمین کو نہیں پھاڑ سکتے اور تاکہ تمہارے چھپے ہوئے کینوں کو نکال دے۔ انسان گھبرالو پیدا کیا گیا ہے۔ شر لگے تو گھبرا جاتا ہے۔ اس قسم کی سیکڑوں آیتیں ہیں جن کی بنیاد نفسیات پر ہے۔ پھر سیکڑوں احادیث ہیں جو نفسیات کو سموئے ہوئے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہوئی ہے کہ ایک ایسی ہستی جس نے کہیں بھی تعلیم نہیں پائی۔ نفسیات پر کتنی گہری نظر رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ تھادوا تحابو۔ ہدیے دیا کرو محبت بڑھتی ہے۔

زر غبا" تزدد حبا" ناغہ کر کے ملاقات کیا کرو۔ محبت بڑھے گی

اتق شر من احسنت الیہ اس شخص کے شر سے بچو جس کے ساتھ تم نے احسان کیا ہو ۔یہ کتنی گہری بات ہے اور رات دن کا تجربہ ہے۔ ذرا کسی کے ساتھ احسان کرتے رہو۔ پھر ہاتھ کھینچ لو اور تماشا دیکھو۔ فرماتے ہیں نرمی برتو جہاں کہیں سختی آجاتی ہے بھلائی دور ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

یشب ابن آدم و یشب فیہ خصلتان الحرص وطول الامل

ابن آدم جس قدر بوڑھا ہوتا جاتا ہے دوعادتیں جو ان ہوتی جاتی ہیں ایک حرص دوسرے طول امل کیا بات کہی ہے۔ سبحان اللہ۔ اس طرح کی بہت سی احادیث ہیں کہ لالچی ذلیل ہوتا ہے۔ اور قانع عزت پاتا ہے۔ اخلاقیات کی ساری احادیث غرور تکبر تواضع و انکساری وغیرہ کے بارے میں نفسیات ہی سے تو ہیں۔

سیرت النبی پڑھیئے نفسیات سے بھرپور ہے۔ کیسے کیسے دشمنوں کو آپ نے رام کیا ہے اور کس خوبی اور آسانی سے ذرا سی دیر میں ان کی اصلاح کر دی۔ ان کے دلوں میں جو بیماریاں تھیں۔ انہیں بڑی آسانی سے نکال کر اچھے نفسیات کا حامل بنا دیا ہے۔ وہ لوگ جو جانوروں سے بدتر تھے۔ آپ کے نفسیاتی علاج سے بڑے اچھے انسان بن گئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شمشیر بدست غصہ سے بھرے ہوئے آئے تو آپ نے بڑے پیار سے فرمایا عمر کیسے آنا ہوا۔ بس یہ محبت بھرے نرم و شیریں الفاظ جادو کر گئے اور سنگ دل عمر موم ہو گئے۔

اگر مثنوی مولانا رومؒ کو نفسیاتی نقطہ نظر سے پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ رومی نفسیات کا بہت بڑا ماہر تھا۔

قرآن شریف کی بے شمار تفاسیر لکھی گئی ہیں نحویوں نے نحوی طرز پر تفسیر لکھی۔ ادیبوں نے ادبی لحاظ سے تفسیر مرتب کی فلسفیوں نے فلسفیانہ اندازاختیار کیا اور صوفیوں نے اپنے نقطہ نظر سے تفسیر و تشریح کی۔ ضرورت ہے کہ قرآن کی تفسیر نفسیات کے لحاظ سے لکھی جائے۔ یہ میدان ابھی تک خالی ہے۔ اور اگر نفسیات کا کوئی ماہر ایسی احادیث جمع کر دے جن کا سائیکالوجی ہی سے تعلق ہو تو یہ بڑا اچھا کام ہو گا۔ اگر یہ دونوں کام مکمل ہو جائیں تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی

نفسیات یہ ہے غزالیؒ و ابن خلدونؒ وغیرہ کی تحریروں کو ہم مسلم نفسیات کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی نفسیات نہیں کیونکہ ان کے علم النفس میں یونانی فلسفے کی آمیزش ہے۔

موروثی اور غیر موروثی ہونے کے اعتبار سے مجدوبزرگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نسبی اور دوسرے کسبی وہ مولود جسے اس "الماجد" نے شریف خاندان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی کوشش سے مجدوبزرگی حاصل کی وہ کسبی مجد کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر بعض مجد نسبی والے مجد کسبی سے کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں اور بعض ایسے اعمال کرنے لگتے ہیں کہ وہ اس مجد نسبی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ حسب و نسب کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہوتے مگر اپنی کوشش سے لوگوں کی نظروں میں ماجد و امجد بن جاتے ہیں اور اس مجد کسبی کی تا مرگ حفاظت کرتے ہیں۔ مگر بعض غرور مجد میں ایسے اعمال کر گزرتے ہیں۔ کہ ان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھو بعض اوقات ذرا سی لغزش ساری زندگی کو برباد کر دیتی ہے۔

*

المالک و الملک و الملیک

جب میں دنیا میں آیا تو بالکل خالی ہاتھ تھا نہ میرے قبضے میں کوئی زمین تھی نہ مکان نہ باغ نہ میری مٹھی میں کوئی دمڑی تھی میں ایک پھوٹی کوڑی کا مالک بھی نہ تھا اور جب اس دنیا سے جاؤں گا میرے ساتھ نہ میری دکان جائے گی نہ مکان نہ روپیہ۔

پھر جب میں بڑا ہو گیا تو مکان دوکان اور باغ کا مالک ہو گیا نہ صرف دکان مکان اور باغ کا بلکہ سینکڑوں چیزوں کا مالک بن گیا مگر کیا یہ چیزیں میں ساتھ لایا تھا اور ساتھ لے جاؤں گا؟ تو پھر میں کیا مالک ہوا۔ اگر میں ان چیزوں کا مالک ہوتا تو انہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔ دوسروں کے لئے ہر گز چھوڑ کر نہ جاتا۔ اور اگر میں واقعی مالک ہوتا تو ان چیزوں کو اپنے ساتھ لاتا۔ معلوم ہوا مالک حقیقی کوئی اور ہی ذات ہے نہ میرے باپ دادا اصلی مالک تھے اور نہ میرے بیٹے پوتے اصلی مالک ہیں اصلی مالک وہی تھا وہی ہے اور وہی رہے گا۔ البتہ اس کے کارندے بدلتے رہتے ہیں جیسے زمین کا اصل مالک زمیندار ہوتا ہے مگر مزارع بدلتے رہتے ہیں اور اپنی صواب دید کے مطابق تصرف کرتے رہتے ہیں اور اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

جب شروع شروع ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو اس کے گماشتے رعایا کو ہموار کرنے کے لئے رات کے وقت سڑکوں سڑکوں اور گلیوں گلیوں یہ صدا لگاتے پھرا کرتے تھے ملک اللہ کا زمین اللہ کی حکم کمپنی بہادر کا۔ ہاں ملک اللہ کا زمین اللہ کی تو تھی ہی مگر حکم بھی اسی کا تھا۔ گو بظاہر حکم کمپنی بہادر کا تھا۔ اس کی مشیت کے بغیر کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک قوم کو جو توہمات' منشیات' رسومات' اختلافات اور عیاشی و جہالت میں مبتلا تھی زیر کر کے ایک دوسری قوم کو

ملک پر مسلط کر دیا۔ جس نے سارے ہندوستان پر ایک حکومت قائم کر کے سارے ملک میں ریل گاڑیاں دوڑا دیں بادشاہ تو وہی ہے البتہ وائسرائے بدلتے رہتے ہیں کوئی عادل اور کوئی ظالم دنا اہل۔

جو شخص کوئی چیز بناتا ہے یا ایجاد کرتا ہے تو وہی اس کا مالک ہوتا ہے مگر یہ کہ وہ اپنی ملکیت دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے یا اس ارادے سے کام کرے کہ بنا کر فلاں کو دے دوں گا۔ بہر صورت مالک وہی ہوتا ہے پھر یہ ملکیت دوسرے کو منتقل کر دیتا ہے۔ ایک بڑھئی ایک کرسی بناتا ہے تو وہی اس کا مالک ہوتا ہے اور اگر شروع ہی سے اس نیت سے بنائے کہ یہ فلاں شخص کی ہے یا فلاں شخص کے لئے ہے تب بھی مالک تو دراصل وہی ہے۔ ملکیت منتقل ہو جاتی ہے۔ ہم نے اس زمین یا باغ کو پیدا نہیں کیا تو ہم اس کے کیسے مالک ہو سکتے ہیں۔ مالک وہ ہے جس نے اسے پیدا کیا البتہ عارضی طور پر وہ چیز ہمارے تصرف میں آجاتی ہے اور چونکہ ہر چیز تخلیق کنندہ کی ملکیت ہوتی ہے لہٰذا اس ساری کائنات کا مالک بھی وہی ٹھہرا جب ہم نے اسے پیدا ہی نہیں کیا یا بنایا ہی نہیں تو ہم کیسے مالک ہو سکتے ہیں۔ مالکُ الملک وہی مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے اور حکم بھی اسی کا ہے **اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ**۔

مالک وہ ہے جس سے ملکیت کو سلب نہ کیا جا سکے مرتے ہی ہم سے ملکیت سلب کر لی جاتی ہے تو ہم کیسے اصلی مالک کہلائے جا سکتے ہیں؟ اصلی مالک وہی ہے جس کی ملکیت کو کوئی سلب نہ کر سکے۔ نہ ہمارے باپ دادے مالک تھے نہ ہمارے بیٹے پوتے مالک ہیں مالک بس اسی کی ذات ہے ہم اس کے خلیفہ ہیں۔ اور اس کے حکم کے تحت تصرف کرتے ہیں۔ انسان خلیفۂ ارضی ہے اسے مالک نے حق تصرف دے دیا ہے اس کے کچھ نائب عادل ہیں اور کچھ ظالم کچھ مومن اور کچھ کافر۔

ہمارے خسر صاحب مولوی محمد صدیق مرحوم نے اپنے وطن نگینہ میں بڑا خوبصورت مکان بنایا تھا اس کے دروازے کی پیشانی پر یہ شعر لکھا تھا۔

ے این عمارت چند روزہ نزدِ ماست ‌ ‌ ‌ بعد از ما، مالکِ ایں کبریاست

مجھے یہ شعر بہت پسند آیا سوچا کبھی مکان بناؤں گا تو دروازے کی پیشانی پر یہ شعر تحریر کروں گا مگر اب سوچتا ہوں کہ شاعر نے پہلا مصرعہ تو صحیح کہا ہے کہ یہ عمارت ہمارے پاس چند روزہ ہے مگر دوسرا مصرعہ بالکل غلط ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد اس کا مالک اللہ ہو گا کیونکہ ہماری زندگی میں بھی وہی مالک ہے۔ اگر ہم مکان کے مالک کہلانے کے اس لئے مستحق ہیں کہ ہمیں اپنے باپ سے پہنچا تو ہمارے مرنے کے بعد ہمارا بیٹا مالک کہلائے جانے کا مستحق ہے نہ کہ (نعوذباللہ) خدا معلوم ہوا کہ ہماری زندگی میں بھی وہی مالک ہے اور ہمارے مرنے کے بعد بھی وہی مالک ہے وہ شخص کیسے مالک ہو سکتا ہے جس سے ملک الموت ملکیت سلب کرے؟ مالک تو وہ ہے جس سے کوئی نہ چھین سکے۔

مکانوں اور قبروں کے کتبے بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں اور بعض بہت ہی غلط ہوتے ہیں۔ کوئی بیس سال ہوئے قبروں کے کتبوں پر میں نے چٹان میں ایک طویل مضمون لکھا تھا مگر ابھی چند دن ہوئے میں نے ایک قبر پر عجیب کتبہ دیکھا میں بیگم صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جا رہا تھا کہ ایک دیوار کے کتبے پر نظر پڑ گئی لکھا تھا "اس طرف صوفی شاعر' ساغر صدیقی کی قبر ہے" میں نے سوچا چلو اس پر بھی فاتحہ پڑھتا چلوں اس کا بھی حق ہے کیونکہ یہ بھی شاعر میں بھی شاعر یہ بھی صوفی میں بھی صوفی یہ بھی صدیقی اور میں بھی صدیقی بیگم صاحب کے طفیل ہی سہی۔

میں جو ادھر گیا تو ایک قبر پر سنگ مرمر کا ایک کتبہ لگا دیکھا جس پر لکھا تھا "ھذا من فضل ربی" غموں مارا دل باغ باغ ہو گیا روتا جا رہا تھا ہنسی آ گئی۔ گورستان میں ہنسی کا سامان ہو گیا سوچنے لگا اس کی کوئی تاویل کرنی چاہیئے معا دماغ میں یہ بات آئی کہ اس کا باپ اسے تنگ کرتا ہو گا یا کوئی بڑی دولت چھوڑ گیا ہو گا لہٰذا اس کی موت یقیناً فضل ربی ہے۔

"ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ" پر ایک دوست نے بڑا اچھا لطیفہ سنایا تھا ایک رشوت خور حرام خور نے بڑی خوب صورت کوٹھی بنوائی۔ اس کی پیشانی پر "ھذا من فضل ربی" کا کتبہ لگوایا۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ

جبہ و قبا پہنے اس کوٹھی کو دیکھ دیکھ کر زاروقطار رو رہے ہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا بڑے میاں کیوں روتے ہو آخر اس کوٹھی میں ایسی کیا چیز لگی ہے کہ آپ اسے دیکھ دیکھ کر رو رہے ہیں؟ اس بڈھے نے کہا بات یہ ہے کہ میں شیطان ہوں! اس کو حرام خوری' رشوت خوری اور اسمگلنگ وغیرہ کے سارے گر میں بتایا کرتا تھا۔ اسے میں نے دولت کمانے کے طرح طرح کے ڈھنگ بتائے اور اس نے کتبہ میرے دشمن کے نام کا لگا دیا ہے کہ **هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ**۔

"غلطیہائے مضامین مت پوچھ" لکھوانے والے تو عجیب عجیب غلطیاں کرتے ہی ہیں یہ لکھنے والے ان سے زیادہ انوکھی غلطیاں کرتے ہیں۔ کوئی پندرہ سال ہوئے میں نے "امروز" میں ایک مضمون لکھا تھا۔ "مجھے میرے کاتبوں سے بچاؤ" تو اس میں یہ مشہور واقعہ بھی لکھا تھا کہ ایک صاحب نے کسی کاتب صاحب کو کلام پاک لکھنے کے لئے دیا اور کہا خدا کے لئے اس میں اپنی طرف سے کوئی اصلاح نہ ٹانک دینا جب وہ کلام پاک لکھ کر لایا تو دریافت کیا آپ نے کہیں تصرف تو نہیں کیا۔ فرمایا بس تین جگہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ آپ کے دیئے ہوئے قرآن میں لکھا تھا خر موسیٰ صعقا میں نے موسیٰ کی جگہ عیسیٰ لکھ دیا کیوں کہ "خر" گدھا تو عیسیٰ کا تھا موسیٰ کا نہ تھا اور ایک جگہ لکھا تھا **وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى** میں نے آدم کی جگہ موسیٰ لکھ دیا ہے کیونکہ عصا (ڈنڈا) موسیٰ کا تھا آدم کا نہ تھا اور جہاں کہیں شیطان کا لفظ آیا وہاں آپ کے والد مرحوم کا نام لکھ دیا ہے کیونکہ خدا کی کتاب میں شیطان کا کیا ذکر؟

سو کچھ اسی طرح کی بات اس فرزند ارجمند نے کی ہے جس نے اپنے باپ کی قبر پر ھٰذا من فضل ربی کا کتبہ لگوادیا ہے۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اب ہم اصل مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں مذہبی و علمی مضامین میں ذرا دل چسپ باتیں آجاتی ہیں تو پڑھنے والوں کو خشک باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض ترین نام شہنشاہ ہے لہٰذا اپنے بچوں کے ایسے نام نہ رکھو یہ بات تو صحیح ہے کہ شہنشاہ تو اس کی ذات ہے کسی بچے کا ایسا نام رکھنا اللہ کو پسند نہ ہو گا۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ

اَلْمُلْکِ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور دراصل وہی شہنشاہ ہے باقی شاہان دنیا تو بس برائے نام اور عارضی بادشاہ ہیں وہ کیسے شہنشاہ ہو سکتے ہیں جنہیں ملک الموت مار دے اور بچھو کاٹ لے تو تڑپ جائیں اور انہیں جیسا بادشاہ انہیں شکست دے کر ان کی شہنشاہی کو ختم کر دے اور پھر انتہائی ذلیل حالت میں جان چھپاتے پھریں۔

ایک صاحب سلسلہ پیر صاحب نے اپنے بیٹے کا نام شہنشاہ دین رکھا ہے۔ میں نے سنا تو کہا یہ کیسے شہنشاہ دین ہو گئے اگر شہنشاہ دین یہ ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ رضی اللہ عنھم، تابعینؒ، علمائے کرامؒ اور اولیاء عظامؒ کیا ہوئے؟ بغیر پڑھے لکھے پیر و مرشد بن بیٹھے ہیں اور جاہل مریدوں کو اردگرد جمع دیکھ کر خوش رہتے ہیں مگر کوئی شخص ہزار سال بھی خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور جاہل ہو تو نہ وہ خدا تک پہنچ سکتا ہے نہ مرشد بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس دور کے مرشدوں کی یہ حالت ہے کہ ایک پیر صاحب ہمارے پاس تشریف لاتے ہیں تو بات بات پر کہتے ہیں "علماء کو کیا پتہ؟ علم سے کیا ہوتا ہے؟ کتابوں میں کیا دھرا ہے؟" دیکھو تو سہی جس علم کی تعریف خدا اور رسول کرتے ہیں یہ لوگ اسے بے وقعت چیز بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کتابیں لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ دو چار کتابیں جمع کیں اس سے لیا کچھ اس سے اور ایک کتاب بنادی۔

اور میں سوچتا رہتا ہوں کہ یہ اتنا بڑا پیر ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں کتنا بڑا عالم ہوں تو اس کی زبان بے تکی ہانکنے سے تتلا جائے جیسے ان اہل علم کی زبانیں ہمارے سامنے بولنے سے لڑکھڑانے لگتی ہیں جو ہمارے مرتبۂ علمی سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ جاہل لوگ تو بڑی دلیری سے ہمارے ساتھ کج بحثی کرتے رہتے ہیں لیکن اگر انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ جس شخص سے باتیں کر رہے ہیں اس کا دماغ نہ معلوم کتنے کتب خانے پی چکا ہے تو وہ بالکل گونگے ہو جائیں عالم و مالک تو صرف اس کی ذات ہے نہ کوئی مالک ہے نہ شہنشاہ البتہ اندھوں میں کانا راجہ والا معاملہ ہے۔

ملکیت و سلطنت کے سارے دعویدار بصد حسرت و یاس سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے اور اصلی مالک جسے چاہے گا دے دے گا۔ یہ دنیا یہیں پڑی رہ

جائے گی۔ ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے شاگردوں کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے ایک درخت کے نیچے سونے کے سکے پڑے تھے اور تین آدمی مرے پڑے تھے فرمایا دیکھو دنیا اپنی جگہ پڑی ہے۔ اور اس کے عاشق مرے پڑے ہیں۔ بات یہ تھی کہ تین دوست کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ راہ میں ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لگے وہاں ایک دفینہ نکلا تینوں نے کہا آپس میں تقسیم کئے لیتے ہیں۔ بھوکے تھے ایک ساتھی کو بستی کی طرف روانہ کیا کہ کھانا لے آئے اس کی نیت خراب ہو گئی اس نے کھانے میں زہر ملا دیا کہ دونوں ساتھی کھا کر مر جائیں گے یوں میں پورے دفینے کا مالک ہو جاؤں گا۔ دونوں ساتھیوں نے طے کیا کہ جب وہ بازار سے کھانا لے کر آئے تو اسے مار ڈالیں چنانچہ وہ آیا تو اسے مار ڈالا پھر کھانا کھانے بیٹھ گئے اور زہر کے اثر سے دونوں مر گئے۔ وہ شخص جو اس دفینے کا مالک تھا مرتے دم تک اسی مغالطہ میں رہا کہ میں مالک ہوں اور پھر یہ تین اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے مگر مالک حقیق اور ہی تھا سو وہی مالک رہا پھر جسے اس نے چاہا ہو گا عارضی مالک بنا دیا ہو گا۔

جب سکندر مرنے لگا تو وصیت کی کہ میرے ہاتھ کفن سے باہر نکال دینا تاکہ لوگ دیکھیں کہ میں خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔

؎ دارا کو مار کر کے سکندر نے کیا لیا   آپ کے روز جیئے کس لئے دارا مارا

کیوں بھئی سکندر کو مرتے دم یہ کیا سوجھی پہلے سے خیال نہ آیا کہ یونان سے ایران اور کہاں کہاں ہوتا ہوا ہمارے ٹیکسلا تک آپہنچا اور جوع الارض کی وجہ سے بے گناہوں کا خون بہتا رہا نہ خود آرام کیا نہ دوسروں کو آرام سے رہنے دیا۔ شہنشاہ کہلانے کی ہوس نے نہ تجھے نچلا بیٹھنے دیا نہ تیرے ساتھیوں پنولین اور ہٹلر کو۔

یہی ملکیت و ملوکیت کی ہوس روس امریکہ اور اسرائیل کو بے گناہوں کا خون بہانے اور معصوموں کو بے گھر کرنے پر نچلا نہیں بیٹھنے دے رہی ہے۔ جب تک یہ تینوں تباہ نہیں ہو جائیں گے دنیا میں امن قائم نہ ہو سکے گا مگر پھر کوئی اور مغرور "ہم چو ما دیگرے نیست" کا راگ الاپنے لگے گا۔ بس "شہنشاہ عالم" ہی

چاہے گا تو امن و امان قائم ہو گا ان ارضی بادشاہوں سے کوئی توقع رکھنا فضول ہے۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ حسب عادت الٰہی ایک ظالم کو دوسرے ظالم پر مسلط کر کے دونوں کو ملیا میٹ کر دے۔ جب تک جوع الارض کی وبا ختم نہ ہوگی انسانیت آرام سے نہ بیٹھ سکے گی۔

بغاوت کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں امن عالم کی کنجیاں ہیں۔ "شہنشاہ عالم" "مالک الملک" کے باغی ہیں خدا کو مانتے ہی نہیں تو خوف خدا کیسے پیدا ہو؟ نفسانفسی کا عالم ہے اور ہر ایک ایک دوسرے کو لوٹنے پر لگا ہوا ہے جھوٹ' دھوکا اور فریب سیاست ہے انہیں کون سمجھائے کہ خدا سے ڈرو؟ اور کیسے سمجھائے؟ کیونکہ یہ تو اسے مانتے ہی نہیں۔ اگر سارے عالم کے لیڈر خدا ترس ہو جائیں تو ذرا سی مدت میں امن عالم قائم ہو سکتا ہے۔ کہیں امریکہ سوالنامہ جاری کرتا ہے۔ کہیں کوئی کہیں کوئی کہ امن عالم کیسے قائم ہو؟ اور بھاری انعامات کا لالچ دیا جاتا ہے ارباب عقول خامہ فرسائی کرتے ہیں اور طرح طرح کی تجاویز پیش کرتے ہیں مگر سوالنامہ پھر بھی تشنہ ہی رہتا ہے۔ اور معاملہ وہیں کا وہیں رہتا ہے اور اسی طرح لاینحل رہے گا جب تک کہ لیڈران قوم "ملیک مقتدر" کی بغاوت سے تائب نہیں ہو جائیں گے انسان اللہ سے باغی ہو کر سخت پریشان ہے اور پریشان ہی رہے گا۔

اس تحریر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ساری دنیا کو اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہوں اسلام کی تبلیغ کرنے والے اور لوگ ہیں میں تو یہ کہتا ہوں کہ خواہ کوئی لیڈر یہودی ہو یا عیسائی آتش پرست ہو یا بدھ مت کا قائل ہو خوف خدا کو پیش نظر رکھ کر دیانت داری سے معاملات کو طے کرے۔ کسی ایک مذہب پر تو سارے عقلاء کا متفق ہونا محال ہے مگر ہر مذہب خوف خدا اور عدل و دیانت کا سبق دیتا ہے تو اپنے مذہب کی پاکیزہ تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی مسائل کو حل کریں اور مذاہب نے جو انفرادی طور پر اخلاقیات کی تعلیم دی ہے اسے اجتماعی زندگی پر بھی لاگو کریں مگر مشکل یہ ہے کہ قومی اعتبار سے کسی بھی قوم اور کسی بھی لیڈر کا اخلاقی کردار کچھ بھی نہیں ہے ہر ایک دوسرے کو دھوکا

دیتا ہے اور جھوٹ فریب سے کام نکالنا چاہتا ہے بس ہر لیڈر اپنی قوم کا بہترین جھوٹا وکیل یا بیرسٹر ہے اور دوسری قوم کا خون چوسنا چاہتا ہے۔ رہے وہ ممالک جو خدا کی شہنشاہیت کے قائل نہیں ہیں انسانیت کو ہاتھ سے نہ دیں تو بہت مشکلات حل ہو جائیں۔ اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْاَرْضُ لِلّٰہِ وَالْحُکْمُ لِلّٰہِ۔

*

مَالِکِ یَومِ الدِّین

دین کا لفظ کلام پاک میں بکثرت آیا ہے اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دین کے معنی حساب کے ہیں "مالک یوم الدین" یعنی حساب کے دن کا مالک یا روز جزا کا مالک دین کے معنی ملک، سلطان اور حکم کے بھی ہیں۔ چنانچہ سورہ یوسف میں ہے **مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ** "یعنی یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو بادشاہ کے قانون یا حکومت میں یونہی گرفتار نہیں کرا سکتے تھے لہٰذا چوری کے الزام میں گرفتار کرادیا۔"

دین کے معنی شان طاعت ذلت اور ہراس چیز کے ہیں جس سے اللہ کی عبادت کی جائے جاہلی شاعر کہتا ہے **فدنا ھم کمادانوا** ہم نے انھیں ایسی جزا دی جیسی انھوں نے ہمیں دی تھی یعنی جیسے کو تیسا۔

کلام پاک میں کہیں **اَلدِّیْنُ۔ دِیْنُ۔ دِیْنَاً۔ دِیْنَکُمْ۔ دِیْنَہٗ۔ دِیْنَھُمْ** اور **دینی** آیا ہے اور دین کا لفظ تو بہت آیا ہے۔ دین • بمعنی مذہب سورہ الکافرون میں ہے **لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ** میرے لئے ہے میرا مذہب اور تمہارے لئے ہے تمہارا مذہب یعنی تمہیں تمہارا مذہب مبارک ہو۔ مجھے میرا مذہب مبارک ہو۔ نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں کرتا ہوں نہ میں اس کی عبادت کر سکتا ہوں جس کی تم کرتے ہو۔ ہماری تمہاری راہیں جدا ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ** "اللہ کے نزدیک صحیح دین تو اسلام ہی ہے۔" اس آیت میں بھی دین • بمعنی مذہب استعمال ہوا ہے **دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا** سیدھا دین ملت ابراہیم ہے جو حنیف ہے۔ اسلام سے پہلے حنیف وہ لوگ کہلاتے تھے جو خدا پرست تھے اور مکہ میں ایسے لوگ بھی تھے چنانچہ ورقہ بن نوفل حنیف تھے مگر یہ گنے چنے تھے۔

چونکہ سورہ فاتحہ فہرس قرآن ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب میں روز حساب و جزا کا ذکر ہو گا حساب و جزا و قیامت کا قرآن میں بکثرت ذکر آیا ہے تو سورہ فاتحہ نے بتادیا کہ آگے چل کر یہ مضامین آئیں گے۔

اس سورت کی ابتداء حمد سے کی گئی ہے کیونکہ مقصود خلائق ثابت کرنا تھا ظاہر ہے قابل عبادت وہی ہستی ہو سکتی جو محامد والی ہو۔ پھر صفت رحمت و کرم کو ثابت کیا گیا تاکہ اپنی طرف خلق کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ذات سراپا رحم و کرم ہے تو اس کی طرف بڑھو اس کے بعد اپنی گرفت کو جتایا گیا کہ ہم روز جزا حساب کے مالک ہیں۔ جب یہ باتیں ذہن نشین کرا دیں تو جو مقصود تھا اس کی طرف بڑھے کہ عبادت و استعانت کے لائق ہم ہی ہیں لہٰذا ہماری ہی عبادت کرو اور ہمیں سے مدد چاہو پھر طلب ہدایت کی طرف متوجہ کیا گیا کہ عبادت تو وہی کر سکتا ہے جو ہدایت یافتہ ہے اور گم راہ نہیں ہے۔

جزا و سزا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں تمام آسمانی مذاہب میں ہے کیونکہ انسان کوئی کام بغیر معاوضہ کے لالچ کے نہیں کر سکتے۔ اور کسی چیز سے بغیر خوف سزا کے نہیں رک سکتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں فرما دیا کہ میں روز حساب و جزاء کا مالک ہوں۔ اگرچہ "رحمان و رحیم" ہوں مگر عدل کی بنیاد پر حساب کتاب لیتا ہوں۔ اور تم لوگوں کو پورا پورا حساب دینا پڑے گا۔

کہتے ہیں مارنے والے کے قریب سے قریب تر ہو جاؤ کیونکہ یہی مار سے بچاؤ کی صورت ہے آپ نے دیکھا ہو گا۔ لاٹھی، شمشیر اور نیزے کے کرتب سکھانے والے بتاتے ہیں کہ مارنے والے کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤ تاکہ وہ وار نہ کر سکے۔ معلوم ہوا قرب وار کو روک لیتا ہے۔ لہٰذا روز جزاء حساب کے مالک کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤ تو مار سے محفوظ رہو گے۔ اور رحم و کرم سے سرفراز رہو گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں حساب کی سختی سے بچائے جس دن ہر شخص اپنے نامہ اعمال کو دیکھ کر تعجب کرے گا کہ یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات چھوڑی نہ بڑی سب کو شمار کر لیا ہے۔

المبدئ جل جلالہٗ والمعید جل جلالہٗ

"مبدی" اسے کہتے ہیں جو پہلی بار کسی چیز کو پیدا کرے یعنی کسی ایسی چیز کو پیدا کرے کہ اس جیسی چیز پہلے نہ ہوئی ہو۔ اور "معید" وہ ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کو پیدا کرے جس کی نظیر و مثیل پہلے تخلیق پا چکی ہو۔

اسمائے الٰہی میں ایک اسم المبدئ ہے اور ایک معید کیونکہ وہ المبدی بھی ہے اور معید بھی۔ معید کا لفظ قرآن میں نہیں آیا البتہ اس کے افعال آئے ہیں جیسے نُعِيْدُهٗ المبدی بھی نہیں آیا البتہ مُبْدِئُهٗ آیا ہے اور اس کے افعال بھی آئے ہیں مبدی ہے مبداء نہیں۔

"مبدی" اور "معید" کے بارے میں ہمارے اسلافؒ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مبدی اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے تخلیق کی اور معید اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا بلاشک ایسا ہی ہے اور ان کا یہ فرمانا بالکل درست ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ اس عالم میں بھی مبدی اور معید ہے۔ اس نے آدم کو پیدا کیا تو وہ مبدی ٹھہرا اور پھر اس کے نمونے پر اس کی اولاد پیدا کی تو معید ٹھہرا۔ وہ فرماتا ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَفِیْ شَاْنٍ "ہر روز وہ نئی شان والا ہے" تو "مبدی" ہے اور جن حالات و مخلوقات کو ہر روز لوٹاتا ہے تو "معید" ہے۔ ہر روز موسم اور فصلوں کا اعادہ کرتا ہے تو ان کے اعتبار سے "معید" ہے

حدیث شریف میں آتا ہے اس آدمؑ سے پہلے کئی آدمؑ گزر چکے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور یہ آدم انہی آدموں جیسا تھا تو وہ اس آدم کے اعتبار سے معید ہوا۔ مبدی نہ ہوا۔ اور اگر یہ آدم ان آدموں سے مختلف تھا تو اس آدم کے اعتبار سے مبدی ہوا اور اس کی اولاد کے اعتبار سے معید ہوا۔

اور اگر پہلے آدموں کا عالم بھی ایسا ہی تھا تو وہ موجودہ مخلوقات کے اعتبار سے معید ہوا۔ اور اگر ان عالموں کا نظام اس عالم جیسا نہ تھا تو وہ اس عالم کے نظام کے اعتبار سے مبدی ہوا۔ اور اگر پہلے آدموں کی دنیا بعض اعتبار سے اس آدم جیسی تھی اور بعض اعتبار سے ایسی نہ تھی تو پھر اس عالم کے اعتبار سے وہ مبدی بھی ہوا اور معید بھی۔

ہم کوئی چیز ایجاد کرتے ہیں تو بڑی ہی دشواری ہوتی ہے مگر جب کسی چیز کو ایجاد کر لیتے ہیں تو پھر اس جیسی چیزیں آسانی سے بنا لیتے ہیں۔ جس شخص نے گھڑی ایجاد کی اسے بڑی مشکل پیش آئی۔ مگر جب وہ ایک گھڑی ایجاد کر چکا تو پھر اس جیسی اور گھڑیاں بنانے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی ہو گی۔ یہی حال ریل کے انجن کا ہے کہ موجد نے اسے بڑی دشواری سے ایجاد کیا ہو گا۔ پھر لوگ آسانی سے انجن بناتے چلے گئے اسی طرح ہوائی جہاز بنانے والے کو بڑی دشواری پیش آئی ہو گی مگر پھر لوگوں نے بڑی آسانی سے سینکڑوں ہوائی جہاز بنا ڈالے۔

جب قرآن نے یہ دعوی کیا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے تو کفار نے بڑا تعجب کیا۔ اور کہا کہ کیا ہم دوبارہ زندہ کر دیئے جائیں گے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کیا جب ہماری ہڈیاں چونا بن جائیں گی تو پھر سے نئی تخلیق ہو جائے گی۔ کیا ہم قبر میں اٹھائے جائیں گے یہ تو بڑے خسارے کا لوٹنا ہے۔ تو اللہ تعالٰی نے ان کے جواب میں فرمایا۔ پہلی تخلیق کو لوٹانا کیا مشکل ہے۔ ابداء مشکل ہو سکتا ہے اعادہ کیسے مشکل ہو سکتا ہے؟ اور اس کی ایک مثال پیش کر دی کہ **عزیر علیہ السلام** جب فلسطین آئے تو تعجب سے کہنے لگے اللہ کیسے اس بستی کو پھر سے زندہ کر دے گا؟ تو اللہ نے وہیں ان کی روح قبض کر لی ان کا گدھا بھی وہیں مر گیا۔ سو سال تک وہ وہیں پڑے رہے۔ سو سال کے بعد زندہ کئے گئے اور کہا دیکھو تمہارا گدھا تو گل سڑ گیا مگر کھانا نہیں سڑا۔ اور تم سو سال کے بعد زندہ کر دیئے گئے۔

چونکہ مرے پیچھے زندہ ہو جانا ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کہ ان سے کہا گیا۔ چار مختلف قسم کے

پرندے لو اور قیمہ کر کے ان کے گوشت کو گڈمڈ کر دو پھر انہیں پہاڑ کی مختلف چوٹیوں پر رکھ دو اور انہیں بلاؤ۔ تو وہ تمہارے پاس آجائیں گے۔

تیسرا واقعہ قریبی زمانے کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیان کیا گیا کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے تو جب ایک انسان ایسا کر سکتا ہے تو خدا کیوں نہیں کر سکتا جو ہر چیز پر قادر ہے؟ اور انسان جو مجبور محض ہے ایسا کرتا تھا اور مخلوق دیکھتی تھی۔ کوڑھی کو اچھا کر دینا اور اندھے کو بینا کر دینا بھی مردے کے زندہ کر دینے کی مانند ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا اور کھجور کے تنے کا رونا بھی اسی قبیل سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھنی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی تھی اور اصحابؓ کہف سو سال تک سوتے رہے پھر بیدار ہو گئے تھے۔ یہ واقعات بھی اس لئے قرآن میں ذکر کئے گئے ہیں کہ خدا اعادہ پر قادر ہے اور وہ المبدی اور المعید بھی ہے۔

نئی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کی ماہیت یا روح فنا نہیں ہوتی یا یہ کہ عالم مثال میں ہمارا حقیقی جسم موجود ہے اور یہ گوشت پوست کا جسم ماہیت یا روح یا اس مثالی جسم کا لبادہ یا لباس ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر جسم کا فنا ہونا اور دوبارہ ہمارا زندہ اٹھنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

یہ جسم کوئی چیز نہیں۔ دراصل ماہیت یا روح ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہؒ کے سینکڑوں واقعات ایسے ہوئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ گوشت پوست کا جسم کچھ بھی نہیں ہے۔ اولیاء اللہؒ کا غائب ہو جانا اور ذرا سی دیر میں کسی دور مقام پر چلے جانا یا اور کوئی جسم اختیار کر لینا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مادی جسم کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

یہ قریبی زمانے کا تاریخی واقعہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں تھانہ بھون کے قاضی بن گئے تھے اور انگریزی حکومت سے باغی ہو گئے تھے جب ۵۷ء میں اہل ہند انگریز سے شکست کھا گئے اور انگریزی حکومت قائم ہو گئی تو چونکہ حاجی

صاحبؒ باغی تھے۔ لہٰذا انگریز نے انہیں گرفتار کرنا چاہا۔ وہ تھانہ بھون سے فرار ہو کر انبالہ میں ایک مرید کے گھر میں آکر چھپ گئے۔ انعام کے لالچ میں کسی نے کمشنر کو مخبری کر دی کہ حضرت حاجی صاحبؒ گھوڑوں کے اصطبل کے پاس ایک کوٹھڑی میں چھپے ہوئے ہیں۔ کمشنر اس زمیندار کے گھر آیا اور کہا کہ آپ کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے۔ مجھے بھی اپنے گھوڑے دکھایئے۔ اس بہانے وہ اصطبل کی طرف گیا اور باتوں باتوں میں اس کوٹھڑی کو کھول کر دیکھنے لگا حاجی صاحبؒ کا وہ زمیندار مرید کانپ گیا۔ کہ اب حاجی صاحبؒ کی خیر نہیں مگر کوٹھڑی میں حاجی صاحب کو نہ پایا۔ کمشنر واپس چلا گیا تو اس نے حاجی صاحبؒ سے پوچھا۔ آپ کہاں تھے؟ فرمایا وہیں تم لوگوں کے قدموں میں تھا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ماہیت یا روح باقی رہتی ہے اور دوسرا جسم اختیار کر سکتی ہے اور پھر پہلے جسم کی طرف لوٹ سکتی ہے جب اولیاء اللہؒ ایسا کر سکتے ہیں تو وہ المیعد کیوں نہ کر سکے گا؟

میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی تھی جو مولوی صاحب ہمیں عربی پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن بات چل نکلی کہ دنیا کی پیدائش پر کتنا عرصہ گزر چکا ہو گا تو وہ فرمانے لگے زیادہ سے زیادہ دس ہزار۔ پھر کوئی چار پانچ سال کے بعد کسی عالم سے یہی سوال پوچھا گیا تو انہوں نے بھی یہی فرمایا۔ پھر کوئی چار پانچ سال بعد ایسا اتفاق ہوا کہ کسی عالم سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بھی قریب قریب یہی عرصہ بتایا مگر مجھے کبھی بھی اس جواب پر اطمینان نہیں ہوا۔ ہمارے علماء قریب قریب اتنا ہی زمانہ بتاتے چلے آئے ہیں۔ گو اس بارے میں نہ حدیث میں کچھ ہے نہ قرآن میں بس ان کا یہ قیاس ہے۔ مذہبی عقیدہ یا مذہبی اشارہ اس بارے میں نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ہزار سال کے قریب ہوئی۔ ان سے پہلے شیث وغیرہ گزرے تو آدم علیہ السلام تک چار پانچ ہزار سال ہو گئے ہوں گے اور پھر نوح کے بعد اب تک چار پانچ ہزار سال ہو گئے ہوں گے۔ اس طرح ہمارے علماء دس بارہ ہزار سال یا پندرہ بیس ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتے۔ اگر ہم اور آگے بڑھیں اور دس دھائی سو کر دیں تو زیادہ سے زیادہ ہم لوگوں کے نزدیک یہ

دنیا ایک لاکھ سال کی ہو گی مگر ایسا نہیں ہے۔

تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دنیا کروڑوں سال پرانی ہے۔ میرے خیال میں وہ حدیث صحیح ہے کہ **قَبْلَ هٰذَا الْاٰدَمِ اٰدَمُ** "اس آدم سے پہلے بھی آدم گزر چکے ہیں" تو پھر اسلامی خیال موجودہ تحقیقات کے مطابق ہو جائے گا۔ اس حدیث کی تائید نئی تحقیقات سے ہوتی ہے اور ویدک دھرم سے بھی ہوتی ہے کہ "پرلے" (قیامت) کئی بار آچکی ہے اور یہ کل جُگ ہے۔ اس کے بعد سب سے بڑی قیامت آئے گی اور دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے **پیشتر** تین جگ گزر چکے ہیں جو کئی کئی ہزار سال کے تھے اور اس کل جگ کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ کب ختم ہو گا اور کب پرلے (قیامت) آئے گی"

بہر حال حدیث مذکورہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم کے بارے میں وہ "المبدی" "معید" ہے یا جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ "مبدی" بھی ہے اور "معید" بھی۔

*

المانع جل جلالہ

یہ اسم قرآن شریف میں نہیں ہے۔ **مانعتهم۔ منع۔ یمنعون۔ منعک۔ منعهم۔ منعنا اور منع** وغیرہ آئے ہیں مگر ان کا تعلق اللہ سے نہیں غیر اللہ سے ہے اس "المانع" نے آدم علیہ السلام کو منع کر دیا تھا کہ اس درخت کے پاس نہ جانا **وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ** تم دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا مگر آدم علیہ السلام سے بھول ہوئی تو سزا یاب ہوئے۔ توبہ کی تو نبوت اور خلافت ارضی سے فیض یاب ہوئے۔

وہ شجرہ ممنوعہ کیا تھا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کسی کو نہیں معلوم کہ کیا تھا؟ بہر حال وہ جو کچھ بھی تھا اس سے فضلہ پیدا ہوتا تھا. بہشت کے دوسرے درختوں میں یہ بات نہ تھی. اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ گندم کا درخت تھا' کوئی کھجور کا اور کوئی کسی اور چیز کا بتاتا ہے پچھلے دنوں اخبار میں چھپا تھا کہ ایک پاکستانی محقق نے تحقیق کی ہے کہ وہ درخت جوار کا تھا۔ اس کے بھٹے اور دانوں سے انہوں نے استدلال پیش کیا ہے زیادہ خیال یہی چلا آتا ہے کہ وہ گندم کا پودا تھا۔

اس "المانع" نے حکم صادر کر دیا ہے کہ ابلیس اس کے متبعین اور بدکردار لوگوں کو بہشت میں جانے سے روک دیا جائے اور نیک لوگوں کو دوزخ میں نہ دھکیلا جائے

اس "المانع" نے ہمیں چوری' زنا' شراب نوشی اور حرام خوری وغیرہ سے منع کر دیا ہے۔ یہ بھی گیہوں کے پودے کی طرح شجر ممنوعہ ہیں کہ ان کے قریب جانیوالے جنت سے روک دیئے جائیں گے۔

اس "المانع" نے ہمیں قتل و غارت گری' جھوٹ' فریب کاری' دھوکا دہی' ظلم و ستم وغیرہ اخلاق بد کے ارتکاب سے منع کر دیا ہے اور ہر جرم کے لئے ایک

خاص سزا مقرر کی ہے۔

جملہ مذاہب عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا باتیں ہر مذہب میں حرام قرار دی گئی ہیں لہٰذا تمام مذاہب ایک ہیں۔ فروعات میں اختلاف ہے تو وہ کوئی چیز نہیں کچھ مذاہب کی اصل روح امتداد زمانہ سے بگڑ گئی ہے۔ دراصل سب کے اصول ایک ہی تھے اور ایک ہی ہیں۔ مادی مذاہب اور نئی سے نئی تہذیبوں میں بھی یہ باتیں ناجائز ہیں۔ تو مادی اور غیر مادی مذاہب' اخلاقی اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

اس "المانع" نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک دیا ہے سورج کو ہماری زمین کے قریب آنے سے روک دیا ہے چاند کو سورج کے ساتھ ٹکرانے سے روک دیا ہے کہکشاں کو چاند اور سورج کے قریب آنے سے روک دیا ہے اس طرح اس نے فضائے آسمانی میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں کہ ایک ستارہ دوسرے ستارے سے نہ ٹکرانے پائے۔

اس "المانع" نے مذکر کو مؤنث' گیہوں کو جو' بھلائی کو برائی' نیکی کو بدی' حیوان کو جماد اور جماد کو انسان بننے سے روک دیا ہے اس طرح مخلوقات کے درمیان طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ **مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ** دو سمندروں کا پانی سنگم پر آپس میں ملتا ہے۔ پھر بھی دونوں کے دھارے ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایک رکاوٹ ہے جو ایک کو دوسرے پر غالب نہیں آنے دیتی۔

دریائے اٹک کے نئے پل پر کھڑے ہو کر دیکھو تو دونوں دریاؤں کا پانی صاف صاف علیحدہ علیحدہ بہتا ہوا دکھائی دے گا معلوم ہوا بعض رکاوٹیں اس "المانع" نے ایسی قائم کر دی ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں مگر صداقت' صداقت ہی ہے اور جھوٹ' جھوٹ ہی ہے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر اس میں گڈ مڈ نہیں ہو جاتے' کھرا اور کھوٹا اگرچہ یک جا ہوں مگر وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا ہی رہتے ہیں

اس طرح اگر کارخانہ قدرت پر نظر کی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس "المانع"

کی بیشتر قائم کردہ رکاوٹیں دکھائی نہیں دیتیں اور وہ باوجود اپنی لطافت و نزاکت کے اس قدر مضبوط ہیں کہ دیوار چین بھی ان کی مضبوطی کے سامنے بے حقیقت ہے۔

ایک ہی ماں کے ذرا سے تنگ ترین رحم میں دو جڑواں بچے پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک مذکر ہوتا ہے اور ایک مؤنث۔ دونوں کے درمیان ایک قدرتی پردہ حائل ہوتا ہے دونوں اپنی حقیقت سے ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتے بکریوں، بلیوں اور کتیوں وغیرہ کے پیٹ میں **مختلف الجنس** بچے پرورش پا کر باہر نکلتے ہیں ہر ایک کے خواص جداگانہ ہوتے ہیں ذرا سے شکم میں اس "المانع" کی قائم کردہ رکاوٹوں کی وجہ سے ہر ایک اپنی جنس کے خواص لئے دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ **وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا** ہم نے ان کے آگے پیچھے رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔

انسان چونکہ حامل اخلاق خداوندی ہے اس لئے وہ بھی مانع بنتا ہے۔ وہ اپنی اولاد، اپنے متعلقین اپنے ماتحتوں، اپنے دوستوں اور شاگردوں وغیرہ کو بہت سی باتوں سے منع کرتا رہتا ہے۔ حکومتیں اور افسران حکم امتناعی جاری کرتے رہتے ہیں نافرمانوں کو سزا دیتے ہیں اور سر تسلیم خم کرنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازتے رہتے ہیں جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نافرمانوں کو سزا دیتا ہے اور فرمانبرداروں کو اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔

بری باتوں سے منع کرنا اور نیکیوں کا حکم کرنا اس امت کا وظیفہ حیات ہے اور پیدائش کی غرض اصلی یہی ہے۔ **وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** اور وہ لوگوں کو منکرات سے روکتے ہیں مگر نامناسب، ممانعت بری بات ہے اولاد کو ہر وقت روکتے ٹوکتے رہنا بھی برا ہے اس سے بچوں میں ضد پیدا ہو جاتی ہے بچوں اور جوانوں کو کچھ ڈھیل دینے کی ضرورت ہے سختی کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جہاں سختی آجاتی ہے خیر اٹھ جاتی ہے چھوٹوں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرو جو بچوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

سورۃ الماعون میں ہے۔ **اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ** ان پر

افسوس ہے کہ جو ریاکاری کرتے ہیں اور ماعون سے روکتے ہیں۔ ماعون ان معمولی معمولی چیزوں کو کہتے ہیں جو بہت حقیر اور ہر وقت کی ضرورت کی ہوتی ہیں جیسے آگ، پانی، ماچس، سوئی دھاگا وغیرہ اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو ذرا ذرا سی چیزوں کو روک روک کر رکھتے ہیں اور ان سے اگر کوئی طلب کرے تو نہیں دیتے یہ لوگ انتہا درجے کے بخیل ہوتے ہیں اگر کوئی پڑوسی ذرا سی چنگاری طلب کرتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں ایسی چیزوں کو منع کرنا بہت ہی بری بات ہے۔

ریا کو شرک اصغر کہا گیا ہے اس آیت میں ریا کار اور ایسے شخص کو جو معمولی چیزوں پر قدغن لگاتا ہے ریا کار کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ جو چیز اپنی ضرورت سے زیادہ ہو اور کوئی اسے طلب کرے تو منع نہ کرے خصوصاً ایسی چیزیں جو ماعون کے مفہوم میں داخل ہیں انہیں فراخدلی سے دینا چاہئے پیاسے کو پانی پلانا بڑا کار ثواب ہے اور ضرورت مند کی حاجت روائی کرنا بڑا بھاری ثواب ہے۔

اپنے متعلقین کو سوچ سمجھ کر منع کرو ہر وقت بڑائی جتانا اور خواہ مخواہ منع کرنا برا ہے اس سے انسان میں رعونت اور دوسروں میں بغاوت و نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اللھم لا مانع لما اعطیت و لا معطی لما منعت و لا ینفع ذا لجد منک الجد

*

اَلْمُتَعَالُ جل جلالہٗ

یہ پاک نام قرآن شریف میں صرف ایک جگہ آیا ہے پارہ تیرہ رکوع آٹھ میں ہے۔ **عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ**۔ وہ ہر چھپی اور کھلی بات کا جاننے والا ہے سب سے بڑا اور عالی مرتبت ہے۔ اس سلسلہ کے ''مصادر'' و ''مشتقات'' بکثرت آئے ہیں۔ **علی' علو' تعالو** وغیرہ۔ ساتویں پارے کے اٹھارویں رکوع میں ہے۔ **سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ**۔ وہ پاک اور برتر ہے ان سے جو وہ کہتے ہیں۔ یعنی برتر ہے ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے جنات سے جنہیں اس نے پیدا کیا اور بیٹوں اور بیٹیوں سے۔

اس کی ذات ہر شریک ہر برائی ہر احتیاج و نقص اور ہر شے سے برتر ہے۔ جس کی ذات برتر ہے اس کی صفات بھی برتر ہیں وہ ہر عمدہ صفت والا ہے۔

ہم کسی شخص کو بزرگ و برتر مانتے ہیں تو ایسا اس کی عمدہ صفات کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی اس کی بزرگی و برتری اس کی صفات کی مرہون منت ہوتی ہے اگر اس میں ایسے صفات نہ ہوں تو پھر ہم اسے اپنا ہی جیسا یا اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ''المتعال'' کیا اس بناء سے برتر ہے کہ وہ اچھی صفات والا ہے ایسا نہیں ہے اس کی ذات برتر ہے اگر بفرض محال اس میں یہ صفات نہ ہوتیں یا کچھ کم ہوتیں تب بھی وہ برتر از ہمہ ہوتا۔ جو لوگ خدا کی صفات کو اس کی ذات سے جدا مانتے ہیں وہ بھی اسے خالی عن الصفات برتر مانتے ہیں۔ جب کہ ہم تو اس کی صفات کو عین ذات مانتے ہیں ذات سے جدا نہیں مانتے۔

اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے یعنی کیا اس کی صفات ایک دوسرے سے برتر و افضل ہیں جیسے ''المحی'' ''الممیت'' سے برتر ہو اور ''الباسط'' ''القابض''

سے برتر ہو اس کی ساری صفات اعلیٰ وارفع ہیں۔ ہم ان میں سے ایک دوسرے کو فضیلت نہیں دے سکتے وہ بہتر جانتا ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم الحی کو بھی برتر مانیں اور الممیت کو بھی مگر "الحی" کو "الممیت" پر ترجیح دیں اسی طرح "الباسط" کو "القابض" پر۔ اول تو ہمیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا نہ یہ ہمارا منصب ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی بات سوچتا ہے تو اس کے لئے میں یہ بات لکھ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے الممیت الحی سے برتر ہوا اور القابض الباسط سے افضل ہو کیونکہ ہم کو تاہ بین ہیں صرف حال پر نظر رکھتے ہیں ہو سکتا ہے موت حیات سے بہتر ہو اور قبض ہمارے حق میں بسط سے بہتر ہو۔ اسی طرح اس کی جباریت و قہاریت ہمارے لئے اس کی رحمانیت و رُوفیت سے بہتر ہو۔

یہ ایسا نازک مقام ہے کہ یہاں خاموشی ہی بہتر ہے کیونکہ گمراہی کا خطرہ ہے جس طرح ہم ذات باری کے سمجھنے سے عاجز ہیں اسی طرح اس کی صفات کی حقیقت کے پانے سے بھی عاجز ہیں۔

ع شکستہ بال و پر آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

علو کی دو قسمیں ہیں ایک علوئے ذاتی اور دوسری علوئے صفاتی۔ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر و اعلیٰ ہے۔ ہر انسان خواہ وہ کوئی بھی ہو نباتات و حیوانات و جمادات سے افضل ہے ہمیں بفضلہ تعالیٰ علوئے ذاتی حاصل ہے علوئے صفاتی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے **تخلقو باخلاق اللہ** "اللہ کے سے اخلاق پیدا کرو"

وہ صفات جن سے انسان برتر ہوتا ہے سب جانتے ہیں۔ ان کے شمار کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اوصاف جن سے شرف انسانیت بلند ہوتا ہے۔ سب کو معلوم ہیں۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے دوستوں اپنے خاندان اپنی بستی میں جو اخلاق کریمانہ ہمیں معزز و مکرم بنا سکتے ہیں۔ ان کے لئے جدوجہد ضروری ہے۔ علوئے ذاتی تو اس "المتعال" نے ہمیں بغیر جہد کے بخش دیا ہے۔ علوئے صفاتی کے لئے ہمیں کوشش کرنی پڑے گی۔ ورنہ ہم محض حیوان ناطق ہی رہیں گے۔

وہ اوصاف جن سے انسان ہم چشموں کی نظر میں معظم و مکرم ٹھہرتا ہے۔ ان میں سرفہرست علم ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اطلبو العلم من المهد الی اللحد

"کہ علم کو گہوارے سے لے کر قبر تک حاصل کرتے رہو"

علم ہمیں وہ سب کچھ بتادے گا کہ ہمیں کونسے اوصاف اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہمیں علوئے صفاتی حاصل ہو۔ ویسے بھی ہر شخص بغیر علم کے بھی ان باتوں کو جان جاتا ہے معاشرہ اسے بتادیتا ہے کہ کون سی باتیں معیوب ہیں جو شرف صفاتی کو بٹہ لگادیتی ہیں۔

آدم علیہ السلام کو فضیلت صفاتی صرف علم کی بدولت حاصل ہوئی نماز۔ روزے یا تسبیح و تہلیل سے نہیں اس معاملے میں فرشتے ان سے بہت آگے تھے۔ علم سب سے افضل ہے اور علم کا سیکھنا سکھانا سب سے بڑی عبادت ہے وہ "المتعال" معلم اول ہے معلم کا بڑا درجہ ہے۔ علم انسان کا زیور ہے لہذا آپ بھی معلم بنیں۔ اس طرح ہمارے ملک سے ناخواندگی دور ہو جائے گی۔ اس سے اپنا بھی کچھ نقصان نہیں اور فیض بھی ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا۔

میاموز جز علم گر عاقلی — کہ بے علم بودن بود غافلی

علم ہی سیکھو اگر دانا ہو کیونکہ بے علم ہونا سراسر غفلت ہے۔

*

المتکبر جل جلالہٗ

بڑائی والا صرف وہی "المتکبر" ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ہم ایک ایسے بادشاہ کو فرض کئے لیتے ہیں جو کل خطہ ارضی کا بادشاہ ہو اور اس کے سوا کوئی بھی بادشاہ نہ ہو تو کیا وہ بڑائی والا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ ہستی بڑائی والی کیسے ہو سکتی ہے جس کی پرورش گندے بدبودار خون سے ہوئی ہو اور جس کے شکم میں پیشاب پاخانہ بھرا ہوا ہو جس کے رگ و ریشے میں گندگی کے ڈھیر ہوں جس کے غذائے فاخرہ شہد اور دودھ ہو جو حقیر مکھیوں کا اگال ور خون اور گوبر کے درمیان کی رطوبت ہے جس کا لباس فاخرہ ریشم کے کیڑوں کا فضلہ ہو ذلیل جانوروں کی اون اور کھال ہو جو جانوروں کے بالوں کو پہن کر فخر محسوس کرے۔ جسے بھڑیا بچھو کاٹ لے تو بے تاب ہو جائے جو معمولی جراثیم کو اپنے جسم سے دور نہ کر سکے۔ جسے مکھی اور مچھر جیسے حقیر حشرات عاجز کر دیں جسے سانپ کاٹ لے تو ہمیشہ کے لئے سو جائے جس کی طاقت وقوت کا مدار ہرن کی ناف کا میل اور مچھلیوں کا اگال ہو۔ جو مختلف دھاتوں اور پتھروں کو پہن کر "ہم چوما دیگرے نیست"" کا راگ الاپے جو غیروں کی چیزوں سے فخر کرے۔ جو کھانے پینے پہننے اور رفع حاجات کا محتاج ہو جسے اپنی پشت کے پیچھے کی خبر نہ ہو جو سونے کا اور آرام کا حاجت مند ہو جسے یہ تک معلوم نہ ہو کہ وہ دنیا میں کب آیا اور کب جائے گا جسے ذرا سا بخار بے آرام کر دے اور ذرا سا درد بے چین کر دے جسے بوڑھاپا توڑ مروڑ کر رکھ دے جو ہر وقت دوسروں کی مدد کا محتاج ہو ایسی ذات کیسے بڑائی والی ہو سکتی ہے؟ بڑائی والا صرف وہی "المتکبر" ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر انسان اس طرح پیدا نہ ہوا کرتا ہے کہ اب

اس طرح پیدا ہوا کرتی جیسی کہ اب پیدا ہوتا ہے اور کوئی شخص یا کوئی قوم پیدا ہوتی ہے تو لوگ انہیں سخت طعنے دیا کرتے کہ تو برے طریق سے پیدا ہوا ہے تیرا وجود باعث شرم ہے تو انتہائی ذلیل اور کمینہ انسان ہے مگر اب کوئی کسی کو کیسے کہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

کبھی کسی متکبر کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں اس نے کبھی بھی **وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ** "اپنے اندر غور کرو کیا دیکھتے نہیں ہو۔" پر غور نہیں کیا ورنہ یہ ہر گز اس طرح اکڑ کر نہ چلتا۔ اس نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا کہ میں کس راستے سے آیا اور کس راستے سے جاؤں گا میری کیا اصلیت ہے اور یہ جو میرے جوتے کپڑے وغیرہ ہیں یہ جانوروں کے فضلہ ہیں یا درختوں کے اجزاء ہیں یہ سونا چاندی اور پتھر میرے وجود کے غیر ہیں اگر یہ میرے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں تو یہ مجھ سے زیادہ افضل ہیں میرا کھانا پینا کیا ہے جسم میں کیا بھرا ہے اور میری ہستی ہی کیا ہے؟ بڑے بڑے متکبر زمین کا گز ہو گئے دیدہ عبرت چاہیئے۔

؎ جن کی نوبت کی صدا سے گونجتے تھے آسمان
چپ پڑے ہیں مقبروں میں "ہوں" نہ "ہاں" کچھ بھی نہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تکبر میری چادر ہے جو مجھ سے اسے چھینے گا اسے سخت عذاب دوں گا۔ اس حدیث پر غور کرتا ہوں تو اس کی صداقت پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا ہوں وہاں کی بات چھوڑو متکبر اسی عالم میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ہر ایک اس سے نفرت کرتا ہے سامنے نہ کہہ سکیں تو پیٹھ پیچھے اس کے دوست احباب اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور خواہ مخواہ بھی لوگ اسے ذلیل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ حضرت عطارؒ فرماتے ہیں۔

؎ تکبر مکن زینہار اے پسر — کہ روزے زستش در آئی بسر
؎ تکبر عزازیل راخوار کرد — بہ زندان لعنت گرفتار کرد
؎ چودانی تکبر چرامی کنی — خطامی کنی و خطامی کنی

سب سے پہلا متکبر شیطان ہے اور سب سے بڑا متکبر بھی وہی ہے سو اس

کا انجام سب کے سامنے ہے اور وہ حدیث مذکورہ بالا کی زندہ مثال ہے معلوم ہوا تکبر کار شیطان ہے کہ اس نے خاک کو ذلیل اور آگ کو عظیم سمجھا اور آگ کی طرح اوپر کو پرواز کی مگر آدم نے بعجزو انکساری کی اور تواضع و توبہ و استغفار کی تو قرب خداوندی پایا۔ باوجود خطاکار ہونے کے اتنا بڑا شرف حاصل کیا۔

اس "المتکبر" کی بڑائی کو کون بیان کر سکتا ہے۔ جو فرماتا ہے آپ فرمادیجئے اگر درخت قلم اور سمندر روشنائی ہوتے اور میرے پروردگار کی ثنا لکھنا چاہتے تو اس کی ثنا سے پہلے وہ ختم ہو جاتے اگرچہ اتنے ہی سمندر اور اس کام پر لگا لئے جاتے۔

وہ ذات بلاشبہ بڑائی والی ہے جسے کسی نے پیدا نہیں کیا جو سراپا نور و تقدس ہے جہاں ظلمت کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں جو نہ کھانے پینے کا محتاج ہے نہ سونے اور آرام کرنے کا نہ اس کے نزدیک سونا چاندی اور جواہرات کوئی قیمت رکھتے ہیں نہ اس کے لئے کوئی شے باعث فخر بن سکتی ہے نہ کوئی چیز اسے ضرر پہنچا سکتی ہے نہ کوئی اس کی ملکیت کو سلب کر سکتا ہے نہ گھٹا سکتا ہے وہ بے پرواہ ہے اور ہر بڑائی کا خالق ہے۔ سارے صفات حمیدہ سے متصف ہے اور صفات ناقصہ سے منزہ و مبرا ہے بلا شبہ وہی بڑائی والا ہے جس نے بادشاہوں کے سروں پر تاج رکھا اور انہیں معظم و مکرم بنایا اور جب چاہا وہ تاج ان کے سر سے اتار لیا وہ شہنشاہ اور قادر مطلق ہے کہ کوئی متکبر اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا "المتکبر" صرف اس کی ذات ہے جو بڑے بڑے متکبروں کو پل جھپکتے ذلیل و رسوا کر کے خاک میں ملا دیتا ہے۔

تکبر ایک نفسیاتی بیماری ہے جب یہ حد سے بڑھ جاتی ہے تو انسان خدائی کا دعوی کر بیٹھتا ہے جیسے فرعون، شداد، نمرود، قارون وغیرہ نے کیا اور یہ لوگ حدیث مذکورہ بالا کے مصداق بنے۔ کہتے ہیں نمرود کے دماغ میں ایک مچھر گھس گیا تھا وہ ہر وقت ڈنگ مارتا رہتا تھا اطباء علاج سے عاجز آگئے تو انہوں نے تجویز کیا کہ اس کے سر پر جوتا مارتے رہیں۔ بہرحال جوتے کی قسم کی کوئی چیز ہوگی تو اس کو سکون رہتا تھا فرعون غرق نیل ہوا اور شداد نے بصد حسرت جان دی ایک پل کی مہلت طلب کی تو وہ بھی نہ ملی۔ قارون مع اپنے خزانوں کے زمین میں دھنس

گیا۔
تکبر کے مدارج ہیں کوئی اپنے گھر میں سب سے بڑا بنا ہوا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ میں خاندان میں سب سے بڑا ہوں کوئی سمجھتا ہے میں بستی کا سب سے بڑا آدمی ہوں یہ سب لوگ متکبر ہوتے ہیں بقدر ظرف ہر ایک بڑا بنا ہوا ہوتا ہے مگر بڑائی تو صرف اس "المتکبر" کے لئے ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی اصلیت کو نہ بھولے۔

کسی کو مال و دولت پر غرور ہے کسی کو کرسی و جاہ پر کسی کو اپنی تجارت پر ناز ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب تفاخر بالغیر ہے اور کچھ نہیں۔ بڑائی وہ ہے جو اپنے اندر ہو۔ طرفہ تماشا یہ کہ کسی کو اپنے علم پر غرور ہے حالانکہ علم تو غرور نہیں تواضع سکھاتا ہے لوگ الٹی گنگا بہاتے ہیں۔

ے "رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا"

بعض اہل علم ہوتے کچھ بھی نہیں مگر اپنے آپ کو بڑا بھاری عالم سمجھتے ہیں۔ کوئی اپنے خیال میں فلسفی بنا ہوا ہے کوئی علامہ کوئی شیخ الرئیس اور کوئی یکتائے دوراں مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جہل مرکب میں مبتلا ہیں جو اہل علم کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے جس نے کہا میں جانتا ہوں وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ حقیقی علم رکھنے والا کیسے اپنے آپ کو عالم سمجھ سکتا ہے عالم وہی ہے جو اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا ہے۔

ایک دفعہ ایم اے عربی کلاس کے طالب علم کہنے لگے ہم نے آپ جیسا عالم نہیں دیکھا آپ تو ہر بات پر دریا بہاتے چلے جاتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی قسم کی بات ہو میں نے کہا نہیں مجھ جیسے بیسکڑوں ہیں میں تو ایک جاہل آدمی ہوں کہنے لگے آپ انکساری کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں واقعی میں آپ ہی جیسا طالب علم ہوں مگر بعض متکبر پروفیسروں سے بات کہی تو وہ لگے دون کی ہانکنے۔ تو طالب علموں کی نظروں سے گر گئے اس لئے کہ اس "المتکبر" کو تکبر پسند نہیں اور وہ ضرور بالضرور متکبر کو ذلیل کرتا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کسی طالب علم نے عرض کی حضرت میں بڑا متکبر ہوں کیا کروں؟ فرمایا "مسجد میں جا کر نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو" بزرگوں نے تکبر کے بہت سے علاج لکھے ہیں سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ انسان اپنی اصلیت کو سمجھے سورۃ القیامہ کے دوسرے رکوع میں ہے "کیا وہ نطفہ نہیں تھا پھر منجمد خون بن گیا اور اللہ نے اسے درست بنا دیا"

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب سب کچھ فنا ہو چکے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے این المتکبرون این الجبارون "متکبر و جبار لوگ کہاں گئے"؟ تکبر اسی کے لئے زیبا ہے جس نے زمین و آسمان سے کہا بخوشی یا بجبر چلے آؤ تو انہوں نے کہا ہم بخوشی حاضر ہوتے ہیں۔ تکبر اسی ذات کے لئے زیبا ہے۔ جس نے فرمایا اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان بالکل ٹھہر جا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے لئے صرف یہی آیت کافی ہے۔ (قیل یا ارض ابلعی مائک ویا سماء اقلعی) اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان خشک ہو جا۔ کیونکہ ایسا حکم تو وہی قاہر و جبار دے سکتا ہے کسی کی کیا مجال جو زمین و آسمان کو اس طرح کا حکم دے سکے۔

تکبر اسی ذات کا حق ہے جو فرماتا ہے ہم مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ان کے اعمال کو لکھتے ہیں اور ہر چیز ہم نے کتاب مبین میں لکھ دی ہے۔ "المتکبر" وہی ہو سکتا ہے جو مخلوق کو حکم دیتا ہے۔ جاوء یہاں سے نیچے چلے جاو تم سدا ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اسی کی ذات "المتکبر" ہو سکتی ہے جو فرماتا ہے **اَنَا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارِ میں اللہ واحد و قہار ہوں۔**

بے شک "المتکبر" اسی کی ذات ہے جس نے بے زر بے پر انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود جیسے پر شکوہ بادشاہ پر فتح دی۔ فرعون مصر کو ان کی بی بی کے سامنے سجدہ ریز کر دیا اور ایک بے کس قوم کے معمولی فرد کے سامنے فرعون مصر کو غرق نیل کر دیا۔ جس نے عادو ثمود جیسی عظیم قوموں کو دم بھر میں ملیامیٹ کر کے رکھ دیا جو تکبر و غرور میں مست کسی کو اپنی برابر نہ سمجھتے تھے۔ مضبوط قلعوں والے اور طاقتور تھے باغ ارم والوں کو زمین میں دھنسا دیا اور شداد کو اس

کے غرور کا مزا چکھا دیا۔ "المتکبر" اسی کی ذات ہے جو ارض و سما کا خالق ہے جس کے حکم کے بغیر ذرہ نہیں ہل سکتا جو اپنی مشیت میں کسی کا پابند نہیں جو چاہے کرے کوئی اس سے سوال نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں کیا۔ "المتکبر" اسی کی ذات ہو سکتی ہے جو کھانے پینے سونے وغیرہ کا محتاج نہیں۔ جو کسی کی مدد کا دست نگر نہیں جو ہر چیز سے بے نیاز ہے اور سب اس کے نیاز مند ہیں تکبر اسی کے لئے زیبا ہے جو ایک قطرۂ آب سے بڑے بڑے جھوٹے متکبروں کو پیدا کر دیتا ہے وہ بلند و بالا ہو کر غرور و تکبر سے سرشار ہو کر مخلوق خدا کو اپنا تابع فرمان بنا لیتے ہیں۔

*

المَتِینُ جل جلالہٗ

اس "ذوالقوۃ المتین" نے کئی طرح کی قوتیں پیدا کی ہیں۔ بعض قوی ہیں مگر متین نہیں اور بعض متین ہیں مگر قوی نہیں اور بعض قوی بھی ہیں اور متین و مضبوط بھی۔

ہوا پانی اور آگ قوی تو ہیں مگر متین نہیں جو چاہے ہوا کو ادھر سے ادھر کر دے قید کر دے۔ روک دے۔ کسی ڈبہ سے باہر خارج کر دے۔ کسی کمرے میں بند کر دے اور کسی مکان سے بالکل خارج کر دے۔ اس کی رفتار کو تیز کر دے یا دھیما کر دے۔ اسے سرد کر دے یا گرم کر دے۔ وہ قوی تو ہے مگر مضبوط نہیں۔ قوی ایسی کہ تناور درختوں کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ بجلی کے بڑے بڑے لوہے کے کھمبوں اور تاروں کو تہ و بالا کر دے مکانوں کی چھتیں اڑا کر لے جائے۔ سمندروں میں طوفان برپا کر دے اور بستیوں کی بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دے۔

رِیۡحٌ فِیۡهَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍۭ بِاَمۡرِ رَبِّهَا فَاَصۡبَحُوۡا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُهُمۡ

یہ ہوا جس میں عذاب الیم ہے ہر چیز کو برباد کر دیتی ہے حکم رب سے پھر وہ ہو گئے کہ بس صرف ان کے گھر دکھائی دیتے تھے۔

ہوا منٹوں میں بڑی بڑی کھیتوں کو برباد کر دیتی ہے۔ **رِیۡحٍ فِیۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَکَتۡهُ**۔ یہ ہوا جس میں شدید ٹھنڈک ہے ایک قوم کی کھیتی پر پہنچی اور اسے برباد کر دیا۔

ہوا تخت سلیمانؑ کو لئے لئے پھرتی تھی اور اس دور میں بھی ہمارے جہازوں اور راکٹوں کو اڑائے پھرتی ہے۔

پانی کی طاقت کا ہر اس شخص نے خوب اندازہ کر لیا ہو گا کہ جس نے کبھی کوئی طوفان آتے دیکھا ہو گا کہ یہ بھی شہروں کے شہر ذرا سی دیر میں غرق کر دیتا ہے۔ درختوں اور مکانوں کو بہا لے جاتا ہے۔ قوی تو ہے مگر متین نہیں۔ جو چاہے اسے گلاس میں قید کر دے۔ گرم و سرد کر دے۔ اس کی بھاپ بنا دے پی جائے یا پھینک دے۔

ایسی ہی کچھ حالت آگ کی ہے کہ طاقت ور اس قدر کہ بڑی بڑی بلڈنگوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ گھروں کو خاکستر بنا دے۔ منوں لوہے کو موم بنا دے جو بے حد متین و مضبوط ہے مگر خود متین نہیں جو چاہے جہاں چاہے اسے لے جائے اور اپنی خدمت پر لگا دے۔

پانی' آگ' ہوا ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا کر انقلاب برپا کر سکتے ہیں مگر مٹی اگرچہ متین اور ٹھوس ہے۔ ایسی قوت سے محروم ہے۔ وہ ایک ہی جگہ پڑی رہتی ہے۔ مگر یہ کہ کوئی شخص اسے پانی' آگ وغیرہ سے قوی کر کے کہیں اٹھا کر لے جائے۔

دھاتیں متین بھی ہیں اور قوی بھی۔ اتنی قوی کہ ہم انہیں جلا پھونک کر کشتہ کر دیتے ہیں۔ تب بھی ان کی قوت باقی رہتی ہے جبکہ دوسری چیزوں کو پیس کر خاکستر کر دیا جائے تو عموماً" ان کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے جانور۔ درخت اور اشیاء خاکستر ہو جانے کے بعد اپنی طاقت کو کھو دیتے ہیں۔ مگر ان کی قوتیں باقی رہتی ہیں اور کشتے بنانے کے بعد انہیں پھر زندہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

بعض چیزیں قوی تو ہیں مگر متین نہیں جیسے چیونٹی کہ طاقت ور تو ہے کہ اپنے سے چار گنا زیادہ بوجھ اٹھا لیتی ہے مگر ذرا اس پر انگلی پھیر دو تو اس کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔ اسی طرح بہت سے حشرات الارض بڑے نازک اور غیر متین ہیں مگر ان کے زہر اتنے قوی ہیں کہ بڑے سے بڑے جسم کو پانی کر دیتے ہیں۔

""قوت و متانت"" پر غور کیا جائے تو اس قادر مطلق ""ذوالقوۃ المتین"" کے عجیب و غریب کرشمے سامنے آتے ہیں۔ بظاہر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جو زیادہ متین

و جسیم ہو وہ کم جسم والوں اور کم متانت والوں سے زیادہ قوی ہو۔ مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔

اس کائنات کو کسی ایک یا دس یا زیادہ قوانین کے شکنجے میں نہیں محصور کیا جا سکتا۔ ان گنت قوانین ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ بعض لطیف ترین چیزیں قوی و متین چیزوں سے بہت زیادہ طاقت ور ہیں۔ ایک ذرا سا لطیف مادوں سے بھرا ہوا گولا بڑے قوی و متین ٹینک کو خاکستر کر دیتا ہے۔ لطیف ترین مادے اور لطیف ترین شعاعیں بڑی بڑی توپوں کو خاموش کر دیتے ہیں اور انہیں خاکستر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانون قوت و متانت کا یہ تقاضا ہے کہ متین ضعیف سے شکست نہ کھائے۔ چونکہ شیر کے اعصاب ہڈیاں اور گوشت وغیرہ ان جانوروں کے اعصاب وغیرہ سے زیادہ قوی اور متین ہیں جنہیں وہ کھا جاتا ہے۔ تو وہ جانور اس پر غلبہ نہیں پا سکتے اس لئے کہ وہ اس درجہ قوی اور متین نہیں ہیں۔

موت و حیات امراض، وبائیں، صحت و طاقت، حتیٰ کہ تخلیق بھی وہ ضعیف جراثیم کرتے ہیں جو ذرا سی بھی دھوپ روشنی یا ہوا کی تاب نہیں لا سکتے۔ اتنی غیر قوی و غیر متین مخلوق گھر کے گھر تباہ کر دیتی ہے اور گھر کے گھر آباد کر دیتی ہے تو باوجود غیر متین ہونے کے یہ کتنی بڑی طاقت کے مالک ہیں۔

انسان ضعیف **البنیان** (ناتواں انسان) باوجود ضعیف و غیر متین ہونے کے بڑے بڑے پہاڑوں کے جگر پھاڑ ڈالتا ہے زمین کا پیٹ چاک کر کے اس کے شکم میں سے اپنی ریل گاڑیاں گزار دیتا ہے۔ سمندروں اور دریاؤں کی تہ میں اپنی عمارتیں قائم کر لیتا ہے۔ اور فضا جو بڑی حد تک پوری کائنات پر حاکم ہے۔ اس میں اپنے اسٹیشن اور فیکٹریاں قائم کر لیتا ہے۔

قوت کے ان گنت درجات ہیں۔ اسی طرح متانت کے بھی۔ جس طرح اس کی مخلوقات کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ قوت و متانت کے درجات کو بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور قوت و متانت کا وہ تناسب جو اس نے اجسام کے اندر رکھا ہے وہ بھی ایک جیسا نہیں ہے۔ اس تناسب میں بڑا تنوع و اختلاف ہے۔ کہیں قوت زیادہ ہے متانت کم۔ کہیں متانت زیادہ ہے قوت کم کہیں قوت ایک حصہ

ہے تو متانت چار گنا زیادہ اور کہیں متانت آٹھ گنا ہے اور قوت دو گنا اور کہیں اس کے برعکس کہیں نسبت تساوی (برابر) ہے تو کہیں نسبت تضاعف (دوگنا)۔

يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ

اللہ جو چاہے پیدا کر دیتا ہے اور ثبت کر دیتا ہے سوال یہ ہے آیا قوت سرچشمہ متانت ہے یا متانت سرچشمہ قوت ہے۔ بیان بالا سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ایک دوسرے کا سرچشمہ نہیں ہیں کیونکہ اس "ذوالقوۃ المتین" نے کہیں قوت تو رکھی ہے متانت نہیں اور کہیں متانت و دیعت کی ہے مگر قوت نہیں۔ علاوہ ازیں اگر ایسا ہوتا تو ان دونوں میں کوئی تناسب ہوتا سو وہ بھی نہیں ہے۔

یہ لفظ قرآن شریف میں تین چار جگہ آیا ہے۔ چنانچہ ستائیسویں پارے کے دوسرے رکوع میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ

اللہ بڑا رزق دینے والا قوت والا زبردست ہے اس آیت میں اپنی ایک صفت کا ذکر کیا ہے یعنی رزاق تو اس کے ساتھ ذوالقوۃ اس لئے بڑھایا ہے کہ میں بڑی طاقت والا ہوں ہر ایک کو رزق پہنچانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ پھر متین کا اضافہ کیا کہ میں رزق پہنچانے کی زبردست طاقت رکھتا ہوں کہ اگر کوئی کسی کا رزق چھیننا چاہے تو نہیں چھین سکتا۔ مگر یہ کہ میں خود چاہوں۔

ایک جگہ نویں پارے کے تیرھویں رکوع اور پارہ ۱۹ رکوع ۴ میں یہ آیت مکرر آئی ہے۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ

میں انہیں مہلت دیتا ہوں میرا داؤ پکا ہے۔ یعنی میں کافروں کو مہلت دیتا ہوں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ایسا میرے عدم "ذی القوۃ المتین" ہونے سے ہوا ہے بلکہ باوجود قوت کے میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں ورنہ میرا داؤ بڑا مضبوط اور پختہ ہے۔

اَلْمُجِیْبُ جل جلالہ

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

"مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا"۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ

"مجھی سے دعا مانگو اور مجھی پر ایمان لاؤ۔" نیز فرمایا۔ "**اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ**" "اس کے سوا کون مضطر کی سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارتا ہے۔" رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ اس سے طلب کرو وہ دے گا اور بڑے سے بڑا سوال کرو کیونکہ اس کے لئے کوئی چیز بھاری نہیں ہے۔ نیز فرمایا "کثرت سے دعا مانگا کرو" نیز فرمایا۔ "اس سے مانگو وہ ضرور دے گا۔" دعا مانگنے کی آپ نے بکثرت تاکید کی ہے۔ نماز کے اندر درود کے بعد دعا پڑھی جاتی ہے اور نماز کے بعد دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اسلام میں دعا مانگنا بھی داخل عبادت ہے۔ اور کھانے پینے سونے جاگنے وغیرہ کے اوقات میں مختلف قسم کی دعاؤں کی آپ نے تلقین فرمائی ہے۔ دعاء کو عبادت کا مغز فرمایا ہے۔ اسلام ہی میں نہیں دنیا کے تمام مذاہب میں دعا مانگنا ضروری ہے۔ اور ان میں بھی طرح طرح کی دعائیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو اصدق القائلین ہے فرماتا ہے مجھ سے مانگو میں ضرور دوں گا۔ اور اس کا رسول بھی یہی کہتا ہے کہ مانگو ضرور دیا جائے گا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے رہو ضرور کھلے گا۔ مگر ہم تو رات دن یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مانگتے مانگتے تھک تھک جاتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ملتا تو پھر خدا اور رسول کے وعدوں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ وبائیں پھوٹتی ہیں، بلائیں ٹوٹتی ہیں قحط پڑتا ہے، لڑائیاں چھڑتی

ہیں، مخلوق دعائیں مانگتے مانگتے تھک جاتی ہے اور کوئی اثر نہیں دیکھتی، مظلوم چیختا رہ جاتا ہے اور ظالم مزے اڑاتا ہے اور کسی بزرگ کا یہ شعر بے معنی ثابت ہوتا ہے!

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

اور یہ شعر صحیح معلوم ہوتا ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے۔
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں۔

بلکہ کسی شاعر نے تو معاملہ الٹ دیکھ کر یوں کہہ دیا

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

مریض تکلیف سے تڑپتا ہے اور اس کے عزیز دعائیں مانگتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہوتا آخر مرجاتا ہے، بیوہ اور یتیم بچے پیچھے چھوڑ جاتا ہے جن کا کوئی سہارا بھی نہیں ہوتا، گھر برباد ہو جاتا ہے۔ مال و متاع میں آگ لگ جاتی ہے۔ تاجر دعائیں مانگتا ہے مگر خسارے پر خسارہ ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ کوئی اپنی گاڑھی کمائی کو خدا کی حفاظت میں دے کر سو جاتا ہے دعا کرتا ہے کہ اللہ اس کے مال کو محفوظ رکھے مگر چور ڈاکو اس کا سارا مال لے جاتے ہیں۔ کوئی شخص کسی مقصد کے لئے روز و شب دعائیں مانگتا ہے۔ جدوجہد کرتا ہے۔ اور ناکامی ہی کا منہ دیکھتا ہے بزرگ کہتے ہیں دعا مانگا کر ملے گا۔ مگر ہم آئے دن یہ تماشے دیکھتے ہیں۔ تو دعا کے موثر و غیر موثر ہونے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے۔

میں جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا اس دور میں تھانیدار کی تنخواہ تیس روپے اور سپاہی کی دس روپے تھے۔ امام مسجد کی تنخواہ دس روپے اور عالم فاضل مدرس کی تنخواہ بیس روپے تھی۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کے بعد والی پود میں صرف میں نے ہی عربی پڑھی تھی ہمارے رشتے دار

ماں باپ سے کہا کرتے تھے تم اسے عربی پڑھا رہے ہو دیو بند سے فارغ التحصیل ہو کر اگر کسی مسجد میں امام بنا تو دس روپے ملیں گے اور اگر مدرس ہو گیا تو بیس روپے۔ ایسے دور میں اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن مرحوم و مغفور کا محکمہ امور مذہبی دیو بند کے فارغ التحصیل کو سو روپے ماہانہ تنخواہ دیا کرتا تھا جب کہ انگریز حکومت کلرک کو تیس روپے دیتی تھی تو دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر لوگ حیدر آباد دکن کا رخ کیا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب علامہ قاضی ظہور الحسنؒ ناظم سیوہاروی کا دکن میں اچھا رسوخ تھا لہٰذا فضلائے دیوبند ان کے پاس جاتے اور کہتے ہیں عبدالصمد کا دوست ہوں وہ انہیں محکمہ امور مذہبی میں ملازم کرا دیتے۔ ایک دفعہ ایک مولوی صاحب والد صاحب کے پاس اسی سلسلہ میں گئے دوپہر کا وقت تھا۔ والد صاحب نے فرمایا مولوی صاحب اس وقت تو گرمی ہے کھانا کھا لو آرام کر کے شام کو چلیں گے وہ والد صاحب کی چار پائی کے برابر بچھی ہوئی چار پائی پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہنسنے لگے۔ والد صاحب نے دریافت کیا کیا ہوا؟ کہنے لگے ""قاضی جی! میں لیٹے لیٹے یہ سوچنے لگا کہ اگر مجھے سو روپے کی ملازمت مل گئی تو میری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ پھر سوچنے لگا شادی کے بعد یہ رقم ناکافی ہو گی تو میں نے اپنی تنخواہ دو سو قرار دے لی۔ اور دل میں کہنے لگا اگر دو سو مل گئے تو چین سے گزرے گی پھر سوچا بچے ہوں گے تو یہ تنخواہ ناکافی ہو گی۔ اس طرح میں اپنی تنخواہ بڑھاتا چلا گیا اور کسی طرح اخراجات پورے نہ ہوئے تو میں ایک ملک کا بادشاہ بن گیا اور مجھے ہنسی آگئی۔""

دعا مانگنی چاہئے۔ دعا مؤثر ہے۔ وہ ""المجیب"" سب کی دعائیں سنتا ہے۔ مگر قبولیت دعا کے کچھ اصول ہیں اگر وہ ""المجیب"" ہر شخص کی ہر دعا سنا کرتا تو ہر شخص بادشاہت سے کم کی دعا نہ مانگتا اور پھر ""تو بھی رانی میں بھی رانی، کون بھرے گا پانی"" والا نقشہ ہوتا تو نظام عالم کیسے چلتا۔ وہ ""المجیب"" اپنی حکمت و صوابدید کے مطابق ہر ایک کی دعا سنتا ہے۔

زمانہ ایک امتداد غیر مرئی و غیر مادی ہے جو ازل سے ابد تک چلا گیا ہے اپنے تصرف سے ہم نے خیالی طور پر اس کے تین ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ یعنی ماضی

حال اور مستقبل میں اسے تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم بالکل اضافی اور خیالی ہے کیونکہ جو اس وقت حال ہے وہ اس آن سے پہلے مستقبل تھا۔ اور اس آن کے گزرنے کے بعد ماضی بن جائے گا جسے ہم ماضی کہتے ہیں وہ پچھلے زمانے والوں کے لئے حال یا مستقبل تھا اور جو ہمارے لئے مستقبل ہے وہ بعد میں آنے والوں کے لئے ماضی بن جائے گا بلکہ ہمارے لئے بھی مستقبل ماضی بن جاتا ہے۔

یہ جو قرآن و حدیث و اقوال بزرگان میں ہے کہ ہر دعا سنی جاتی ہے واقعۃً ایسا ہی ہے ہر دعا سنی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس زمانے میں نہیں تو اس زمانے میں۔ جو درحقیقت وہی ایک زمانہ ہے مگر انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔ **اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا** "انسان گھبرالو پیدا کیا گیا ہے۔" فوری چاہتا ہے۔ حال پر نظر رکھتا ہے۔ مستقبل سے بے خبر ہے۔ ہر مظلوم کی فریاد رسی ہو گی۔ ہر دعا مانگنے والے کی دعا قبول ہو گی اور اس عالم سے بہتر صورت میں ملے گی۔ کوئی چور یا ڈاکو کسی کا مال لے کر نہیں بھاگ سکتا مال والے کو اس کا مال ضرور ملے گا۔ مصیبت زدہ کو اس کا اجر دیا جائے گا۔ غمزدہ کا غم غلط کیا جائے گا۔ مریض کو شفا عطا کی جائے گی۔ ناکام کو کامیابی سے ہم کنار کیا جائے گا۔ بے سہارا بیواؤں اور یتیموں کو بہتر سہارا ملے گا۔ مبتلائے قحط و زلزلہ و جنگ و جدل و وبا کی دادرسی ہو گی۔ زخموں پر مرہم دھرا جائے گا۔ روتوں کو ہنسایا جائے گا۔ بے گھروں کو گھر دیئے جائیں گے۔ بھوکوں کو شکم سیر کھلایا جائے گا۔ مبتلائے جنگ و جدل کو ٹھنڈا سکون بہم پہنچایا جائے گا۔ الغرض ہر ایک کو اس کی مطلوبہ شے ملے گی۔ لہٰذا مانگو ملے گا۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ ضرور کھلے گا۔ "**وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَدَّعُوْنَ**" "تمہارے لئے وہاں وہ ہو گا۔ جو تم چاہو گے اور جو کچھ تم مانگو گے۔

"ایک صاحب جو ہر وقت حقہ چوستے رہتے تھے جن کا نام لوگوں نے ابوالحقہ رکھ دیا تھا۔ اس آیت کو سن کر کہنے لگے ہم تو جنت میں حقہ چاہیں گے مگر وہاں آگ کا کیا کام تو کام کیسے بنے گا؟ حقہ کیسے بھرا جائے گا اور تمباکو کیسے دھواں دے گا؟ حاضرین میں سے جھٹ ایک صاحب نے کہا۔ میاں دوزخ سے جا کر آگ لے آنا وہاں آگ کی کیا کمی۔ بہر حال وہاں ہر شخص کو اس کے ذوق کے مطابق سب کچھ

ملے گا۔

میں کہا کرتا ہوں انار تو یقیناً جنت کا میوہ ہے وہاں کے پھلوں کا ایک نمونہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہمیں دکھا دیا ہے اسی لئے اس میں فضلہ بالکل نہیں ہے بلکہ ہر فضلے کو روکتا ہے سخت قابض ہے قے دست اور خون کو بند کر دیتا ہے۔ ایسے ہی وہاں کے تمام پھل اور غذائیں ہوں گی کہ کھانے کے بعد حاجت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ "لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا تَأْثِيمٌ"

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "میں نماز عید کے لئے جانے والوں کی ہر دعا قبول کروں گا مگر جنہیں ان کے لئے مناسب سمجھوں گا ورنہ آخرت میں دوں گا۔" معلوم ہوا دعائیں تو وہ قبول کرتا ہے مگر اپنی صواب دید کے مطابق اس عالم میں دیدیتا ہے اور باقی کو ذخیرہ کردیتا ہے۔ جس حکیم نے اتنا بڑا عالم پیدا کیا ہے ہم اس کی حکمتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ہر دعا فوراً قبول ہو جایا کرتی تو نظام عالم ایک پل بھی نہ چل سکتا۔ اگر ایک غریب انسان بے سہارہ بیوہ اور یتیموں کو چھوڑ کر نہ جاتا تو امیروں کے گھروں میں نوکر اور نوکرنیاں کہاں سے آتیں؟ مزدور کیسے پیدا ہوتے؟ اور اگر اس مرنے والے اور اس کے بیوی بچوں کی دعائیں قبول کر لیتا تو خادم معاشرہ کیسے جنم لیتے؟ اور ان کی مصیبتوں کا اجراء انہیں بہتر دنیا میں کیسے مل سکتا؟

لاہور میں سرکلر روڈ پر جلال دین ہسپتال سے کتنی مخلوق فیض یاب ہو رہی ہے۔ جلال دین اور اس کی بیوی نے اولاد کے لئے کیا کچھ جتن نہ کئے ہوں گے اور کتنی دعائیں مانگی ہوں گی مگر اللہ نے ان کی ایک نہ سنی کیونکہ اولاد سے بہتر انہیں نام اور کام کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اور ایک مخلوق کو اس کے مال سے فیض پہنچانا تھا جو یقیناً اس کے لئے اولاد سے بہتر ہے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانیں وہ الحکیم ہر کام کسی حکمت کے تحت کرتا ہے خواہ کوئی کتنی ہی آہ و زاری کرے اور کتنی ہی دعائیں مانگے اور کتنا ہی صدمہ کیوں نہ کرے پھر بھی سنتا اور دیتا ضرور ہے وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ دیر بھی ہماری اپنی طبیعت کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان "ہلوع و عجول" بہت گھبرالو بہت جلد باز پیدا کیا گیا ہے ورنہ

درحقیقت دیر بھی نہیں ہے کیونکہ زمانہ ایک امتداد بسیط ہے جو ابد تک چلا گیا ہے۔

قبولیت دعا کی کچھ شرائط ہیں اگر ان کی رعایت سے دعا کی جائے تو عموماً قبول ہو جاتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص اپنے ملک، خاندان یا ماحول کے خلاف دعا مانگتا ہے تو یہ دعا قبول نہیں کی جائے گی جیسے ایک غریب جاہل یہ دعا کرے کہ میں بادشاہ بن جاؤں تو یہ دعا چونکہ مبنی بر حکمت نہیں، سراسر حماقت ہے لہٰذا ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جائے گی۔ اگر کوئی شخص کسی کام کے لئے بالکل جدوجہد نہیں کرتا یا بالکل غلط کوشش کرتا ہے اور کامیابی کی دعا مانگتا ہے تو قبول نہیں ہو گی۔ جیسے کوئی طالب علم پڑھے نہ لکھے اور دعا کرتا رہے کہ میں امتحان میں کامیاب ہو جاؤں تو ایسی دعا نہیں سنی جائے گی۔ اس لئے کہ عادت الٰہی کے خلاف ہے اور عالم اسباب سے باہر ہے۔۔۔۔۔ ایک بوڑھی نے سنا کہ شب قدر میں ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ساری رات دعا مانگتی رہی کہ میری چکی کے پاٹ سونے کے ہو جائیں صبح ہوتے ہی دوڑی گئی تو وہ جوں کے توں تھے ایسی حماقت بھری دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور وہ بھی قبول نہیں ہوتیں جو صرف حسد، رشک یا دشمنی کی بنا پر دوسرے کے حق میں بددعائیں کی جائیں

لوگ کہتے ہیں ہم تو دعائیں مانگتے مانگتے تھک گئے قبول ہی نہیں ہوتیں اس کے بارے میں ایک حدیث کو ملحوظ رکھنا چاہیئے حدیث میں ہے کہ بندہ رب رب کرتا ہے مگر اس کا گوشت پوست اس کا لباس اس کا کھانا پینا حرام کا ہوتا ہے تو رب اس کی کیسے سنے؟ یہ وجہ ہے جس کے لئے ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں پھر بھی مانگتے ہی رہنا چاہیئے۔ شاید وہ الکریم والغفور معاف فرما کر سن لے اور اگر نہیں سنتا تو کیا کیا جائے۔ وہ مالک الملک اور منتقم و جبار بھی ہے۔

ایک شخص مبتلاء مصائب ہوتا ہے وہ یا اس کے متعلقین شدید بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں مال ضائع ہوتا ہے یا مقدمہ بازی یا ڈاکٹروں وکیلوں کی نذر ہوتا رہتا ہے اور وہ گڑگڑا کر دعائیں کرتا رہتا ہے مگر شنوائی نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ سزا کے طور پر مبتلا کیا گیا ہے اس نے حرام مال جمع کیا ہے لہٰذا ایسے لوگوں کی

دعائیں ضائع جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے بہت سے پراگندہ بال جنہیں دربدر سے ٹھکرا دیا جاتا ہے اگر وہ خدا کو قسم دیں تو وہ ضرور پوری کرے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر دعا قبول کی جاتی ہے مگر وہ بندہ تو ہو۔ اس حدیث کو توڑ مروڑ کر علامہ اقبال نے اس طرح منظوم کر دیا ہے۔

؎ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اپنے بندے کی ہر دعا وہ "المجیب" ضرور قبول کرتا ہے پیغمبروںؑ اولیاءؒ و علماءؒ کے قصے پڑھ کر دیکھ لو۔ اس نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں۔ جب رسول اور اس کے ساتھی (مایوس ہو کر) کہنے لگے مدد الٰہی کب پہنچے گی؟ سنو مدد الٰہی قریب ہے۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام، حضرت رسول اللہؐ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہ کی دعائیں سنیں اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود انہیں بڑی بڑی مملکتوں پر فتح دی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے کوڑھی اچھے ہو جاتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے سمندر دو ٹکڑے ہو گیا۔ حضرت رسول اللہؐ کی دعا سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کی دعائیں پوری ہوئیں بعض اولیاءؒ اللہ سیف زبان گزرے ہیں۔ جس کے حق میں جو دعا کی پوری ہوئی معلوم ہوا وہ "المجیب" ہر دعا سنتا ہے مگر مانگنے والا صحیح آدمی ہو۔

اسمائے الٰہی کو ننانوے میں محصور سمجھنا غلطی ہے اس کے بے شمار نام ہیں مگر اسمائے توقیفی ننانوے ہیں ایک سو چالیس کے قریب نام تو میں گنا سکتا ہوں۔ بہر حال اس مجیب الدعوات کا ایک نام "المجیب" بھی ہے۔ چونکہ وہ غنی ہے کسی چیز کا محتاج نہیں لہٰذا وہ "المجیب" تو ہے السائل نہیں، وہ کس سے سوال کرے اور کس چیز کے لئے سوال کرے لہٰذا ایسے نام اس کے نہیں ہو سکتے۔ وہ کس کی رضا جوئی کرے کس کی عبادت کرے، اور کس کے لئے قربانی پیش کرے وہ والد و ولد ہونے سے برتر ہے ایسے نام اس کے لئے زیبا نہیں۔

ایک دفعہ لندن میں تمام مذاہب کی عالمی کانفرنس منعقد کی گئی ہر مذہب کے عالم نے اپنے مذہب کے نظریات پیش کئے اور اس کے تفوق پر دلائل دیئے۔ ایک پادری نے عیسائی مذہب کی خوبیاں بیان کیں اور بڑے فخر کے ساتھ دین اسلام پر دین عیسوی کے تفوق کے لئے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی دی تو اللہ نے بھی قربانی دی یعنی باپ نے اپنے بیٹے کی قربانی دی۔

ہمارے شاگردوں میں علامہ خالد محمود بڑے ہی ذہین عالم ہیں انہوں نے فورا" برجستہ ایک سوال ٹھونک دیا ابراہیم علیہ السلام نے تو اپنے بیٹے کی قربانی خدا کی رضاجوئی کے لئے کی تھی خدا نے اپنے بیٹے کی قربانی کس کے لئے دی تھی؟ وہ بشپ منہ دیکھتا رہ گیا جس بات کو بڑے فخر سے پیش کیا تھا گلے پڑ گئی اور کوئی جواب نہ بن سکا کہنے لگا ہم اس پر ریسرچ کر کے جواب دیں گے۔

ملا آن باشد کہ چپ نہ شود یہ ریسرچ بھی اس دور کے اہل علم کے لئے بڑا اچھا ہتھیار ہے جہاں کسی پروفیسر سے جواب نہیں بنتا کہتا ہے اس کے بارے میں ہم نے ریسرچ نہیں کی یا جہاں کہیں بالکل غلط بات کہہ جاتا ہے اور کوئی اور دوسرا صحیح بات پیش کر دیتا ہے تو کہتا ہے اچھا آپ نے اس کے بارے میں ریسرچ کی ہو گی میں نے کبھی اس پر ریسرچ نہیں کی۔

علم ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے کہ ہر مسئلے پر ہمیں ایک معمولی سا طالب علم بھی زچ کر سکتا ہے بعض اوقات مجھے معلوم نہ ہوتا تو میں دریافت کرنے والے سے صاف کہہ دیتا کہ مجھے معلوم نہیں۔ ایک روز ایم اے عربی کلاس کے طالب علم مجھ سے کہنے لگے آپ تو صاف کہہ دیتے ہیں مجھے معلوم نہیں۔ دوسرے اساتذہ کی زبان سے ہم نے کبھی یہ جملہ نہیں سنا میں نے کہا میں جواب دوں یا نہ دوں بہر حال صارم ہوں دوسرے ڈر کر دھوکا دیتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے جس نے کہا میں نہیں جانتا وہ آدھا عالم ہے۔

دل سے اور وثوق قلبی کے ساتھ دعا کرنے سے اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے اسی لئے ماں باپ کی دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ سب سے بہتر دعا یہ ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

المجید جل جلالہٗ

"مجید" "ماجد" "امجد" صرف اسی کی ذات پاک ہے۔ جو **ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ** اور **فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ** ہے جس نے مجدد بزرگی کو پیدا کیا۔ حقیقتاً مجید و امجد وہی ہے باقی مخلوق کی عظمت تو عارضی وفانی ہے۔ جس طرح اس کی ذات غیر فانی ہے اس کی صفات بھی غیر فانی ہیں۔

اسلام میں بہت سے فرقے ہوئے جن میں سے بعض فرقے بالکل فنا ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ یہ بھی کہتا تھا کہ اللہ میاں کرسی پر بیٹھے ہیں اور کرسی عرش پر دھری ہے اور ان کے سر پر سونے کا جواہرات جڑا تاج ہے۔

اسلام کیا ہر مذہب میں جب بھی کوئی فرقہ پیدا ہوا تو اس کے رد عمل کے طور پر اور ضدا ضدی میں دوسرا فرقہ اس کے برعکس پیدا ہوا صدیوں تک مسمانوں کا عمل فقہ پر رہا اور اب تک ہے کوئی امام ابو حنیفہؒ وغیرہ کا مقلد ہے تو کوئی امام جعفر صادقؒ کی فقہ پر عامل ہے صدیوں کے بعد فقہ کے رد عمل میں ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے کہا کہ حدیث کے ہوتے ہوئے ہم فقہ کی کیوں پیروی کریں؟ یہ اہل حدیث کہلائے یہ ہر وقت حدیث حدیث کرتے تھے قرآن کا کم ہی ذکر کرتے تھے لہٰذا اہل حدیث کے رد عمل کے طور پر اہل قرآن پیدا ہوئے انھوں نے کہا قرآن کے ہوتے ہوئے حدیث کی کیا ضرورت؟ مستند کے ہوتے ہوئے غیر مستند کو کیوں لیا جائے؟ یہ منکرین حدیث اہل قرآن کہلائے جیسے منکرین فقہ اہل حدیث کہلائے۔

اسی طرح مجسمہ و مشبہہ کے رد عمل کے طور پر ایک فرقہ منزہ پیدا ہوا۔ یہ تنزیہہ باری تعالیٰ میں اس قدر آگے بڑھے کہ انہوں نے کہا کہ خدا محض ذات ہے وہ تمام صفات سے عاری ہے کیونکہ اگر اسے صفات والا مانا جائے تو صفات

بھی اس کی ذات کی طرح قدیم ہوں گی تو یہ شرک ہو گیا ہم لوگ ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ اس کی صفات عینِ ذات ہیں اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں لہٰذا شرک لازم نہیں آتا۔

منزہ فرقہ خدا کو بے صفت مانتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر وہ خالق ورازق نہ ہوتا تب بھی مجد و بزرگی والا تو ہوتا ہی' یہ تو بہر صورت ماننا ہی پڑے گا لہٰذا ان کا قول باطل ہو گیا اس کی مجد و بزرگی کسی صفت کی محتاج نہیں کہ وہ خالق و رازق ہونے کی وجہ سے امجد ہے بلکہ مجدد وبزرگی اس کی ذات کی عین ہے۔

بہر حال اس کی ذات والا صفات مجید و ماجد و امجد ہے اور مخلوق کی مجد و بزرگی زائل ہو جاتی ہے۔ جب تک کوئی شخص وزیر رہتا ہے لوگ اس کا شاہانہ استقبال کرتے ہیں پھر کوئی بھی نہیں پوچھتا جب تک کسی کے پاس مال رہتا ہے اس کا احترام کرتے ہیں جب وہ تہی دست ہو جاتا ہے تو سب آنکھیں پھیر لیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں اور اس کو احمق گردانتے ہیں مگر مولیٰ تعالیٰ کی مجدو بزرگی مد و جزر' فنا و زوال سے برتر ہے۔

اس "المجید" نے طرح طرح کی عظمتیں پیدا کی ہیں کسی کو عظمتِ جسمانی دی ہے کہ وہ ڈیل ڈول کے اعتبار سے عظیم لگتے ہیں کسی کو عظیم قوت سے نوازا ہے۔

اس طرح بہت سی مادی عظمتیں پیدا کیں تو کچھ روحانی عظمتیں بھی بنائیں جس طرح مادی عظمتوں والوں میں درجات ہیں اسی طرح روحانی عظمتوں والوں میں بھی درجات ہیں۔ "وَفَوْقَ كُلِّ ذِى عِلْمٍ عَلِيمٌ" ایک عالم پر دوسرا عالم فضیلت رکھتا ہے اور ایک پیغمبر پر دوسرا پیغمبر فضیلت رکھتا ہے۔

مادے کا مقدر فنا ہو جانا ہے لہٰذا جسم' طاقت' مال و عیال' جائیداد' افسری و بادشاہی کی بنا پر حاصل شدہ عظمتیں انسان کی موت کے ساتھ مر جاتی ہیں مگر علمی، عملی اور روحانی عظمتیں باقی رہتی ہیں بلکہ بڑھتی رہتی ہیں جیسے علم خرچ کرنے سے اور زیادہ بڑھتا ہے اسی طرح اس کی عظمتیں بھی مرورِ زمانہ کے ساتھ

ساتھ بڑھتی رہتی ہیں مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَاءِ تُؤْتِىْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا

"پاکیزہ بات کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ زمین میں ہو اور شاخیں آسمان میں۔ وہ اذن الٰہی سے ہر دم پھل دیتا رہتا ہے۔ اللہ زیادہ کر دیتا ہے جتنا چاہے اور باقی رکھتا ہے جتنا چاہے اس کے پاس الکتاب ہے"

مشاہیر عالم، پیغمبر، فلاسفہ، علما اور دانشور اپنے دور میں لوگوں کی نظروں میں اتنے عظیم نہ تھے جتنے کہ اب ہیں ورنہ کسی کے سر پر آرا کیوں چلایا جاتا اور کسی کو سولی پر کیوں لٹکایا جاتا اور کسی کے درپے آزار دقتل ناسمجھ لوگ کیوں ہوتے؟ سقراط لوگوں کی نظروں میں اپنے دور میں اتنا عظیم نہ تھا جتنا کہ اب ہے بلکہ گردن زدنی تھا تب ہی تو اسے زہر کا پیالہ پلایا گیا **علامہ سبزیؒ** کی زندہ کی کھال کھچوائی گئی شہاب الدین سہروردیؒ سالار سلسلہ سہروردیہ کو قتل کیا گیا امام احمد بن حنبلؒ و امام ابن تیمیہؒ وغیرہ کو مارا پیٹا گیا اور قید کیا گیا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں ان کے ایک ہم عصر لکھتے ہیں ایک شخص ہے جس کے ماوراء النہر والے **معتقد** ہیں زندگی میں علامہ اقبالؒ کو اکثر و بیشتر اہل علم نے کچھ زیادہ وقعت نہیں دی تھی مگر اب ان کے نام کا سکہ چلتا ہے اور ان کی عظمت روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور بڑھتی ہی چلی جائے گی یہی حال غالب وغیرہ کا ہے۔

الغرض علمی عظمتیں فنا نہیں ہوتیں باقی رہتی ہیں۔ بلکہ اور زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں جس قدر معتقدین کی نسل میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی قدر وہ بلند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ مشاہیرِ عالم اتنے بڑے نہ تھے جتنے کہ اب بڑے دکھائی دیتے ہیں بعض تو اپنے دور میں بالکل ایک معمولی سی ہستی تھے مگر مرنے کے بعد ان کی عالمانہ باتوں نے انہیں ہر روز بلند سے بلند تر کر دیا۔

یہی حال روحانی عظمتوں کا ہے کہ ان میں روز بروز ترقی ہی ہوتی چلی جاتی ہے کیونکہ مرنے کے بعد ہی روح کے ہاتھ ایک وسیع میدان آتا ہے ظاہر ہے جس شخص کی دنیا ثناخواں و دعاگو ہو گی وہ ترقی ہی کرے گا حدیث شریف میں

آتا ہے بعض اہل بہشت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے میرے بندے اور بلند ہوتا چلا جا! جن لوگوں کے علمی و روحانی فیوضات اپنے شاگردوں میں جس قدر پھیلتے جائیں گے وہ اسی قدر بلند ہوتے چلے جائیں گے جس پیر فقیر یا عالم نے کسی کو روحانی ترقی پر لگایا اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ترقی ہو گی۔ کیونکہ **الدال علی الخیر کفاعلہ۔** "نیکی کی راہ بتانے والا اس پر عمل کرنے والے کی مانند ہے" یعنی گویا اس نے بھی وہی عمل کیا جو اس کے مرید نے کیا اور اسی جزاء کا مستحق ہوا جس کا متبع مستحق ہوا۔ یہی حال اعمال کی عظمتوں کا ہے کہ ان میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس شخص نے کسی مردہ قوم کو زندہ کر کے اسے کسی جابر سلطان سے آزادی دلائی اس قوم کا جو بھی فرد کبھی بھی کوئی عظیم کام کرے گا اس قائد کی عظمت میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح اس کی چند سالہ جدوجہد آزادی کے درخت کی جڑیں اگرچہ اس کے ملک کی سرزمین میں گڑی ہوں گی مگر اس کی شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوتی رہیں گی۔

ہر نیک عمل صرف آپ ہی تک محدود نہیں رہتا آگے کو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے گو آپ کو دکھائی نہ دے اور آپ کو پتہ بھی نہ چلے کہ اس نے آپ کی ذات کے لئے دوسروں پر اثر کیا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کے ایثار سے کتنے لوگوں نے ایثار کرنا سیکھا اور ان کے ایثار نے کتنے لوگوں کو ایثار کرنا سکھایا اور لوگوں کے ایثار کرنے سے کیسے کیسے خوب صورت پھول کھلے۔ کتنوں کی حاجت روائی ہوئی اور کتنوں کی مشکلات حل ہوئیں۔ بڑے بڑے کارنامے ہی بڑے کارنامے نہیں ہیں۔ ہر نیک عمل ایک بڑا کارنامہ ہے یہ جو تاریخ کی کتابوں میں آپ مشاہیر عالم کے کارنامے پڑھتے ہیں ان سے بھی عظیم کارنامے لوگ کر گئے اور کسی کو پتہ بھی نہیں اور بعض عظیم کارنامے کرنے والوں کے پیچھے ایسے خفیہ ہاتھ تھے جن سے تاریخ بالکل ناواقف ہے۔ دنیا میں جو بڑے بڑے فاتحین اور شیر دل مشہور ہوئے ان میں سے بعض نے ایک مچھر تک نہیں مارا مگر وہ اس لئے مشہور ہو گئے کہ وہ سلاطین و امراء تھے لیکن جو سپاہی ان کے جھنڈے تلے شجاعت کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیکر موت سے بے دھڑک لپٹ گیا اسے کوئی جانتا تک

نہیں۔

بعض لوگ دوسروں کے کارناموں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے ذرا سے کام کو بڑا سمجھتے ہیں۔ یہ نفسیاتی بیماری ہے۔ ہمیشہ اپنے کارناموں کو چھوٹا سمجھیئے تاکہ آپ اور بڑے بڑے کام انجام دے سکیں مگر ایسا بھی نہ ہو کہ آپ کے اپنے کرنے کے جو کام ہوں انہیں حقیر سمجھ کر چھوڑ دیں۔ یہ بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے کہ اپنے اعمال کو انسان بالکل حقیر سمجھے اور دوسروں کے کارناموں کو عظمت کی نگاہ سے دیکھے۔ حق ہمیشہ افراط و تفریط کے درمیان ہوتا ہے۔ اعتدال ہی ہر کام میں بہتر ہے کیونکہ اقتصاد و میانہ روی ہی عدل ہے۔ حضرت لقمانؒ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا **وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ** درمیانی چال چلا کرو۔ یہی وہ صراط مستقیم ہے جسے آپ پانچوں وقت نماز میں **اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ** کہہ کر اللہ سے طلب کرتے ہیں۔

؎ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا
رہتا ہے نام، کام سے دنیا میں اے اثر
اولاد سے تو ہے یہی دوپشت چار پشت

*

اَلْمُحْصِیُ جلّ جلالہٗ

یہ نام قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا البتہ اس کے افعال کئی جگہ آئے ہیں جیسے **اَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا** "اس نے تو ہر چیز کو فردا" فراد" شمار کر رکھا ہے"۔ **کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ** ہم نے ہر چیز کو ایک کھلی کتاب یعنی "لوح محفوظ" میں محفوظ کر رکھا ہے۔ **اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔ لَقَدْ اَحْصٰھُمْ وَعَدَّھُمْ عَدًّا۔** جتنی بھی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں، ہیں سب خدا تعالیٰ کے رو برو غلام ہو کر حاضر ہوتے ہیں (اور) اس نے سب کو (اپنی قدرت میں) احاطہ کر رکھا ہے اور سب کو شمار کر رکھا ہے۔

یہ دنیا لاکھوں سال سے قائم ہے۔ بڑے بڑے لمبے چوڑے طاقتور جانور اس زمین پر تھے جن کا اب کہیں کوئی وجود نہیں۔ ان گنت انسان اور حیوان پیدا ہوئے مگر لاکھوں برس کی دنیا اور ان گنت انسان و حیوان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "المحصی" کا محکمہ شماریات اتنا زبردست اور منظم ہے کہ کبھی بھی اس سے فروگذاشت نہیں ہوتی ورنہ کوئی ایک انسان یا حیوان تو اتنے سارے سالوں میں ایسا بچ جاتا جس کے نام موت کا سمن بھول چوک سے رہ جاتا مگر کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی۔ **وَکَمْ اَھْلَکْنَا قَبْلَھُمْ مِنْ قَرْنٍ ہ ھَلْ تُحِسُّ مِنْھُمْ مِنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَھُمْ رِکْزًا ہ** "اور ہم نے ان سے قبل بہت سے گروہوں کو (عذاب و قہر سے) ہلاک کر دیا ہے سو کیا آپ ان میں کسی کو دیکھتے ہیں یا ان کی کوئی آہستہ آواز سنتے ہیں؟" حیوان و انسان تو کیا شجر و حجر، سمندر اور پہاڑ تک فنا سے نہ بچ سکے۔ بڑے بڑے شہروں اور بستیوں کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس "المحصی" نے ہر ایک کے لئے گنے چنے دن، ماہ، سال یا صدیاں رکھی ہیں۔ جب ان کی مہلت پوری ہو جاتی ہے اور ان کے دیئے ہوئے دنوں کی تعداد ختم ہو جاتی ہے تو ٹھیک وقت پر فنا کا پیغام پہنچ جاتا ہے۔۔۔۔۔!

ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے شمار کرتا ہے؟ آیا دنوں اور سالوں کی پیائش کے لئے کوئی پیانہ ہے یا اعداد و شمار ہیں؟ ظاہر ہے ہمارے اعداد و شمار اور پیانے وہاں کام نہیں دے سکتے کیونکہ ان گنت چیزوں پر یہ احاطہ نہیں کر سکتے جبکہ وہ فرماتا ہے **اَحْصیٰ کُلَّ شَیْئٍ عَدَدًا۔** "اس نے ہر چیز کا شمار کر لیا ہے۔" تو پھر کوئی نوری سلسلہ ہو گا۔ جیسے اب ہمنے نور' آواز اور روشنی کے ذریعہ شمار کرنا شروع کر دیا ہے اور نوری سال کی اصطلاح گھڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اب ہمارے اعداد وشمار اور پیانے ناکافی ہو گئے ہیں۔ وہ کہتا ہے **کُلَّ شَیْئٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَار۔** اس کے ہاں ہر چیز کی ایک مقدار ہے"! اگر ہر چیز کی اس کے پاس ایک مقدار ہے تو وہ کیسے باٹ ہیں؟ کیسی ترازو ہے اور کیسے تولتا ہے؟

وہ "المحصی" الحسیب محاسب حسبان ومیزان والا ہے اور یوم حساب بھی اس نے رکھا ہے تو اس کے حساب کا کیا طور ہے جو یہ فرماتا ہے۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَان۔ "ستارے" جڑی بوٹیاں اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔"

جو چیز سجدہ کرے گی کنٹرول میں ہو گی۔ اور جو چیز کنٹرول میں ہو گی وہ زیر حسبان ہو گی۔ ہماری سمجھ سے یہ حساب کتاب باہر ہے جیسے گورنمنٹ اپنے سارے کارندوں کی ایک خفیہ فائل رکھتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص کی ایک خفیہ فائل ہے جو یوم حساب میں اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ مجھے تو اپنی خفیہ فائل اکثر و بیشتر میرے خوابوں میں دکھائی جاتی ہے میرے خواب کیا ہوتے ہیں۔ اچھی خاصی فلم سی گھنٹے آدھ گھنٹے مسلسل چلتی رہتی ہے میں حیران رہ جاتا ہوں کہ آج سے ستر سال پہلے کا بھی میرا سارا اعمال نامہ بالکل محفوظ ہے اور ایک ایک معمولی سے معمولی چیز بھی محفوظ ہے۔

مَا لِھٰذَا الْکِتَابِ لَایُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّا اَحْصَاھَا۔ "یہ کس غضب کا اعمال نامہ ہے نہ چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو چھوڑتا ہے نہ بڑے کو"۔

وہ لوگ جو اچانک نہیں مرتے اور مرتے دم تک ان کے ہوش و حواس بجا رہتے ہیں انہیں تو زندگی کی پوری فلم یہیں مرنے سے پہلے دکھا دی جاتی ہے وہ

انکار کرنا چاہتا ہے مگر کر نہیں سکتا کہ یہ حساب کتاب بالکل صاف صحیح اور بڑا ہی مضبوط ہوتا ہے۔

میں نے کئی مرنے والوں کو دیکھا جنہیں ان کی زندگی کی پوری فلم مرتے وقت دکھائی جا رہی تھی اور وہ پچھتا رہے تھے پشیمان ہو رہے تھے اور توبہ تلا کر رہے تھے مگر پچھتاوے اور توبہ کا وقت گزر چکا تھا۔

آلْاٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ "ارے اب کیا! تو تو بڑا ہی نافرمان تھا۔۔۔۔۔!"

ہم جو رات دن یہ حساب کتاب کرتے ہیں یہ اعداد و شمار ہمیں اس "المحصی" نے سکھائے ہیں۔ معلم اول وہی ہے۔ جیسے خالق اول وہ ہے اور خالق ثانی ہمارا باپ ہے اسی طرح معلم اول وہ ہے اور معلم ثانی ہمارا استاد ور نہ ہم کب گننا جانتے تھے پتھروں اور کنکروں سے کام نکالتے تھے۔ عرب میں حِصَاۃ کنکر کو کہتے ہیں چونکہ ابتدائے زمانۂ تہذیب میں انسان کنکروں اور پتھروں کے ذریعہ شمار کیا کرتے تھے اس لئے حِصَاۃٌ سے اِحْصَاءٌ بمعنی شمار کر دن بنالیا گیا۔ پھر جب یہ کنکریاں اور پتھر ہماری ضروریات کے لئے کافی نہ رہے تو اس نے ہمیں اعداد سکھا دیئے۔ اب اس دور میں اعداد نے بھی سپر ڈال دی تو نوری سال بتا دیا کہ اس سے حساب لگایا کرو پھر یہ بھی ناکافی ہو جائیں گے تو کچھ اور بتادے گا۔ یہ فائلیں بنانا، کمپیوٹر سسٹم اور محکمہ شماریات قائم کرنا بھی ہمیں اسی نے سکھایا ہے۔ یہ انسان وہی کچھ کرتا ہے جو اس کا خدا کرتا ہے وہاں محکمہ شماریات ہے تو یہاں بھی ہے۔ ہمارا غلط وہاں کا صحیح ہے۔

ہم کسی چیز کو شمار کرتے ہیں تو اس لئے کہ ہمیں اس کی تعداد معلوم ہو جائے۔ بغیر شمار کئے ہم نہیں جان سکتے کہ یہ چیز کتنی ہے اور بغیر تولے نہیں جان سکتے کہ اس چیز کی مقدار کیا ہے؟ شمار کرنے سے پہلے ہم بالکل تاریکی میں ہوتے ہیں۔

یہاں یہ ایک بڑا بھاری سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ عالم الغیب ہے تو اسے شمار کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی اس سے تو جہل باری تعالیٰ لازم آتا ہے تو وہ "المحصی" کیوں بنا؟ وہ کس لئے شمار کرتا ہے؟ کیا بغیر شمار کئے وہ نہیں

جان سکتا؟

بات یہ ہے کہ وہ "المحصی" ہماری طرح کا محصی نہیں ہے کہ بغیر شمار کئے نہ جانے وہ بغیر شمار کئے جانتا ہے مگر وہ "المحصی" ہما شما کے لئے ہے جیسے "خالق و رازق" دوسروں کے لئے ہے۔ کبھی ہمیں کسی چیز کا عدد معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہم دوسرے شخص کو گن گن کر دیتے ہیں۔ تاکہ حساب کتاب درست رہے۔ نظام صحیح قائم رہے اور لینے والا جان سکے کہ اسے کیا دیا گیا ہے۔ بعض اوقات حساب کتاب صرف بنظر شمار نہیں کیا جاتا نظام قائم رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ بعض میاں بیوی گھر کا ایک ایک پائی کا حساب رکھتے ہیں تاکہ نظامِ خانہ درست رہے۔ محض شمار کرنا ہی ان کا مقصود نہیں ہوتا۔

اس نے نظام قائم رکھنے کے لئے اعداد و شمار کو واسطہ بنایا ہے اور ہماری خاطر وہ "المحصی" بنا۔ **اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ** شمس و قمر دو ہیں۔ دن سات برج بارہ ہیں سال کے مہینے بارہ رکھے۔ سو سال کی صدی بنا دی۔

"**تِلْکَ عَشَرَةٌ کَامِلَة**" "**وَلَیَالٍ عَشْرٍ وَ الشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ**" "**وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ**" "**وسبعتہ اِذَا رَجَعْتُمْ**" "**مِنَ الْبَقَرِا ثْنَیْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ**" "**لَہٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نعجتہ وَلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَہ**" "**رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا**"۔ "**لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ**"۔ اس قسم کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "المحصی" خود جاننے کے لئے نہیں دوسروں کو بتانے کے لئے بنا۔ فرماتے ہیں۔!

وَیَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ "جسے چاہتا ہے بغیر حساب رزق دیتا ہے۔"

معلوم ہوا رزق کی تقسیم حساب سے ہے مگر بعض لوگوں کو بے حساب دیتا ہے تو وہ ہر چیز کا حساب کتاب رکھتا ہے اور وہ چونکہ کسی کا پابند نہیں لہٰذا بے حساب سلسلہ بھی ہے۔

اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ "المحصی" ہے تو کیا ذرات کو بھی شمار کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات ساری مخلوقات سے نہیں لگتیں مثلاً وہ رازق ہر مخلوق کے لئے نہیں ہے۔ وہ رازق صرف اس مخلوق کے لئے ہے جسے اس نے شہوت طعام عطا کی ہے۔ اور جنہیں

شہوت طعام عطا نہیں کی ان کے لئے وہ رازق بھی نہیں ہے جنہیں شکم یا آلات ہضم دیئے ہیں وہ انہیں رزق دیتا ہے اور جنہیں شکم یا آلات ہضم نہیں دیئے۔ انہیں وہ رزق نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح وہ غفار غفور رحیم رحمان ستار وغیرہ بھی ہر مخلوق کے لئے نہیں ہے کیونکہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا اور وہ کسی قانون کے پابند بھی نہیں ہیں کہ وہ ان کے لئے قہار و جبار بنے اور ان کی گرفت کرے یا انہیں بخش دے۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کوئی کام فضول نہیں کرتا اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور ذرات کا گننا ایک بے سود عمل ہے اور اگر اسے ان کا علم ہے تو تحصیل حاصل ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ذرات کے لئے "المحصی" ہے۔

قرآن مجید میں ہے "اللہ تعالٰی ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے اور ہر اس چیز کو جانتا ہے جو آسمان سے اترتی ہے اور اسمان میں چڑھتی ہے"

زمین میں جو کچھ داخل ہوتا ہے یعنی پانی، بیج، گٹھلی، مردے، دفینے اور جو نکلتا ہے نباتات، معدنیات، چشمے اور حشر میں جومردے زمین سے نکلیں گے آسمان سے جو اشیاء اترتی ہیں بارش کا پانی، فرشتے، اللہ کی کتابیں اور اللہ کی رحمتیں۔

آسمان میں جو اشیاء چڑھتی ہیں یعنی بندوں کے نیک اعمال، بندوں کی دعائیں، مظلوموں کی آہیں، کلمہ طیبہ، مرنیوالوں کی ارواح۔ ان سب کا علم اللہ کو ہے اس لئے کہ میرا رب عالم الغیب ہے۔ علیم و خبیر ہے اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

ذرہ برابر بھی کوئی چیز اس سے غائب نہیں خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں۔ ذرہ کی مقدار سے چھوٹی اور بڑی ہر چیز کے بارے میں کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے "تری اور خشکی کی تمام اشیاء کا علم بھی اسی کو ہے خواہ کوئی چیز بیابان میں ہو یا دریا میں اور سمندر میں ہو۔ درخت سے کوئی پتہ تک نہیں گرتا اور زمین کے اندر کوئی بیج نہیں پڑتا مگر وہ سب کو جانتا ہے اور ہر

تر و خشک چیز "لوح محفوظ" میں مرقوم اور مکتوب ہے۔

نیز قران پاک میں ہے وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر اس کو سب خبر ہے کیونکہ وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ اللہ فرماتے ہیں دلوں میں بھید اور راز کی باتیں میں نے ہی تو پیدا کی ہیں تو پھر کیا میں نہیں جان سکتا کہ بندوں کے دلوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ کیا خالق اپنی مخلوق کو نہیں جانتا؟ بے شک اب تک جو وہ مخلوق بنا چکا ہے اس کو اور آئندہ جو کچھ بنائے گا اس تمام کو وہ جانتا ہے۔ حضرت سعید ابن مسیبؒ فرماتے ہیں ایک آدمی رات کے وقت جنگل میں (جہاں ہر طرف درخت ہی درخت تھے) چلا جا رہا تھا ہوا بہت تیز چل رہی تھی درختوں پر سے پتے گر رہے تھے اس کے دل میں خیال آیا کہ جس قدر کثرت اور تیزی سے پتے گر رہے ہیں کیا اس کا علم اللہ کو ہے؟ قریب ہی ایک جھاڑی تھی جہاں سے بڑی بھاری آواز میں ندا آئی اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ "بھلا جس نے پیدا کیا ہے وہ اپنی مخلوق سے بے خبر ہو سکتا ہے؟ حالانکہ وہ بڑا باریک بیں اور پورا باخبر ہے"

ایک دیہات کے رہنے والے صحابی رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں خوب اللہ کی حمد و ثناء بیان کر رہے تھے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنا اس پر خوشی کا اظہار کیا اور سونا بطور انعام مرحمت فرمایا جس کے چند جملے یہ ہیں۔ "اے وہ اللہ جو پہاڑوں کے وزن' سمندروں کے پیمانے' بارش کے قطروں کی تعداد' اور درختوں کے پتوں کی تعداد کو جانتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جن پر رات کی تاریکی چھا جاتی ہے اور جن پر دن روشنی ڈالتا ہے نہ اس سے ایک آسمان دوسرے آسمان کو چھپا سکتا ہے' نہ ایک زمین دوسری زمین کو' نہ سمندر ان چیزوں کو چھپا سکتا ہے جو اسکی تہہ میں ہیں اور نہ کوئی پہاڑ ان چیزوں کو چھپا سکتا ہے جو اس کی سخت چٹانوں میں ہے۔"

*

المحیی جل جلالہٗ و الممیت جل جلالہٗ

وہ حی و قیوم زندہ اور ہمیشہ رہنے والا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ "الحی" تھا تو حی و قیوم ہی رہتا "المحی" کیسے بنا؟ بات یہ ہے کہ اس کی صفت حیات دوسری صفات کی مانند صاحب فیضان ہے لہٰذا اس تک محدود نہیں رہتی۔ وہ رحیم ہے تو اس کی رحمت مخلوق پر سایہ فگن ہے۔ کریم ہے تو مخلوق اس کے فیض و کرم سے سرفراز ہے جمیل ہے تو اس کی صفت جمال نے گلہائے رنگ رنگ کھلا دیئے۔ علیم ہے تو ان گنت عالم پیدا ہو گئے۔

اسی طرح اس کی صفت حیات پھیلی تو بے شمار زندہ پیدا ہو گئے اور وہ "الحی" "المحی" بن گیا زندگی سب سے بڑی نعمت ہے وہ چونکہ منعم ہے لہٰذا اس نے اس نعمت سے مخلوق کو بہرہ ورکیا اور جن وانس' حیوانات' واشجار' و احجار' میں زندگی پھونک دی۔ ان زمینوں' پہاڑوں' سمندروں اور دریاؤں میں بھی روح ہے مگر بعض میں واضح بعض میں واضح تر اور بعض میں اتنی دھیمی کہ عام مخلوق خیال کرتی ہے کہ یہ روح سے بے بہرہ ہیں۔

زندگی کسی میں کم اور کسی میں زیادہ کیوں ہوئی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب فیضان حیات ہوا تو جو زیادہ قریب تھے زیادہ مستفید ہوئے اور جو دور تھے وہ کم مایہ رہے یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی ہوا تو کوئی ولی کوئی مومن ہوا تو کوئی کافر۔

تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تخلیق دو شعاعوں نیگٹیو اور پازیٹو سے ہوئی اب شاید ہمارے ملک کے مایہ ناز سائنس داں عبدالسلام نے یہ ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ تخلیق صرف ایک ہی نور سے ہوئی جو ان دو کا مرکز ہے۔

بہرحال مسلمان تو یہی سمجھتے چلے آئے ہیں کہ مرکز تخلیق صرف ایک ہی ہے اور اسی نور سے دوسرے انوار پیدا ہوئے اور قریب والے زیادہ مستفید ہوئے

جو کم قریب تھے وہ ملائکہ، جن، وانس، وحیوان، کہلائے اور جو دور تھے وہ شجرو حجر بنے۔ تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ نور جس قدر کثیف ہوتا گیا اسی قدر مخلوقات میں کثافت آتی چلی گئی اور یہ بات قرب و دوری کی بناء پر ہوئی۔

کہتے ہیں کالبد آدم برسوں بغیر روح کے پڑا رہا جب اس میں زندگی بھر گئی تو وہ زندہ ہو گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات پہلے سے تھی مگر مردہ تھی پھر صفت حیات نے ان میں زندگی پھونکی اس بات سے یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ قرب و بعد کا کیا مطلب ہے اور مخلوقات رفتہ رفتہ پیدا ہوئی جیسا کہ سائنس کا یہی نظریہ ہے۔

اس بیان سے یہ بات تو صاف ہوگئی ہے کہ وہ "الحی" سے "الحی" کیسے بنا مگر اب ایک اور سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ "الحی" کیوں بنا اور اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ یعنی دنیا جہان میں زندگی پھیلانے کا مقصد کیا ہے۔

اس مسئلے کو صوفیہ نے حل کیا ہے۔ وہ ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً فَاَحبَبتُ اَن اُعرَفَ میں پوشیدہ خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ صوفیہ کے اس مسئلے کو ان پر بھروسہ کرتے ہوئے شعراء اس مضمون کو لے اڑے حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال بھی اس سے نہ بچ سکے۔

یہ تو موضوع حدیث ہے بلکہ کسی صوفی کا قول ہے اور اس کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ یہ بات بالکل لغو اور بے ہودہ ہے کہ اپنے تعارف کے لئے اتنے پاکھنڈ کئے اور مخلوق کو مصیبت میں ڈال دیا۔

وحدۃ الوجودیوں نے بھی اس مسئلے کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بھاگوت گیتا میں ہے اسے ارجن تو لڑ اور قتل کر کہ میں ہر قسم کے مزے چکھنا چاہتا ہوں یعنی یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے تخلیق اس لئے کی کہ وہ دکھ درد غم خوشی غرض ہر قسم کے مزے چکھے۔

اس سوال کا جواب قرآن نے دیا ہے میں نے جن وانس کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے نہ کہ کھانے پینے کے لئے یہ کتنا عمدہ جواب ہے یہ تو سبھی جانتے

ہیں کہ باقی مخلوق ہم عابدوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔
عبادت نماز روزے اور حج و زکوۃ ہی کا نام نہیں ہے عبادتیں طرح طرح کی ہیں۔ حیوانات و نباتات بھی عبادت کرتے ہیں اور ہر مخلوق کی عبادت مختلف رنگ کی ہے۔ ہر فرشتے کی عبادت مختلف طرح کی ہے جو روح پھونکتا ہے۔ روح پھونکنا اسکی عبادت ہے جو مارتا ہے مارنا اس کی عبادت ہے جیسے پڑھنا پڑھانا ہماری عبادت ہے۔
اب سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے تو بتاؤ اسے ہماری عبادت حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ اس بے نیاز کو کیا ضرورت پڑتی۔ اس کی ضرورت ہمیں ہے اور ہمارے فائدے کے لئے ہے جیسے ہمیں رزق کی ضرورت ہے۔
کائنات کے بارے میں فلاسفہ کے جو بہت سے نظریات ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ساری مخلوق خالق کائنات میں جذب ہو جائے گی۔ ہندو مذہب میں اسے کہتے ہیں خدا سے لین ہو جانا یعنی اس میں ضم ہو جانا۔ مطلب یہ ہے کہ جس مرکز نور سے یہ کائنات نکلی ہے سب اسی میں مل جائے گی۔ اس نظریے کو ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنایا ہے ان کا یہ خیال ہے کہ جنت و دوزخ میں ہمیشہ کوئی نہیں رہے گا۔ یہ تو وہ راہیں ہیں۔ ان سے گزر کر اور پاکیزہ ہو کر ہر ایک خدا میں مل جائے گا۔
یہ امور ایسے ہیں کہ ان کا پوری طرح انکشاف نہیں کیا جا سکتا۔ بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے۔ اسرار الٰہی ہیں یہی کہتے بنتی ہے کہ جیسے اس نے چاہا کیا اور جو چاہے گا کرے گا۔ وہ مختار کل ہے۔ اس سے کون پوچھ سکتا ہے؟
اس ''الحی'' نے دو قسم کی حیات پیدا کی ہیں۔ ایک تو یہی جسے آنکھوں سے دیکھتے ہو اور دوسری وہ جسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ یعنی ایک حیات جسمانی ہے اور دوسری روحانی حیات روحانی پر جسے اب کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا موت بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ علماءؒ صلحاؒ اور اولیاءؒ وغیرہ کی یہ حیات روحانی جوں کی توں مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اور وہ زندہ رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کی

ایک تھوڑی سی جھلک ہم آپ کو دکھائے دیتے ہیں۔ دنیا میں سینکڑوں آدمی مر گئے ان کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں مگر اہل علم، اخباروں، رسالوں، کتابوں، جلسوں، محفلوں میں اب تک زندہ ہیں صفحۂ قرطاس پر ان کی زندگی کے آثار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو زندگی اور جہالت کو موت سے تعبیر کیا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ اہل علم کی ایک اور زندگی بھی ہوتی ہے اور جاہل کی صرف ایک ہی زندگی ہوتی ہے۔

اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ "الحی" تھا تو "الممیت" کیوں بنا؟ بات یہ ہے کہ وہ المنعم ہے زندگی سب سے بڑی نعمت ہے اس نے مخلوق کو زندگی بخشی مگر موت اس سے بھی بڑی نعمت ہے لہٰذا وہ بھی مخلوق کو بخش دی اور اس طرح وہ "الحی" الممیت بن گیا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

؎ موت کو سمجھا ہے غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

شائد اس لئے بھی کہ اگر موت نہ ہوتی تو ہر ایک ہم سری کا دعویٰ کرتا اللہ بہتر جانتا ہے کہ کچھ اور حکمتیں بھی ہوں گی کیونکہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ موت ہماری نجات دہندہ ہے۔ ورنہ ہم سر پھوڑتے پھرا کرتے۔

جس طرح حیات کی دو قسمیں ہیں۔ موت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہی جسمانی موت جسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری روحانی موت اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مردوں سے تعبیر کیا ہے۔

وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ۔ کیا آپ مردوں کو سنا سکتے ہیں۔ یعنی نہیں

روحانی و قلبی موت والے بھی ہماری ہی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہیں مگر ان کے دل مردہ ہوتے ہیں اور چونکہ ان کے دل مردہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس موت کا احساس بھی نہیں رکھتے اور جو لوگ روحانی و قلبی موت نہیں رکھتے وہ انہیں بھی اپنا ہی جیسا سمجھتے ہیں۔

زندگی بھی نعمت ہے اور موت بھی نعمت ہے یہ بات اس حدیث سے واضح ہے۔ دو صحابیوں نے آپس میں یہ بات ٹھہرائی کہ ہم میں سے جو کوئی پہلے مرے گا وہ دوسرے کے لئے ایصال ثواب کرتا رہا کرے گا قضاء" ایک صحابیؓ

شہید ہو گئے اور دوسرے عرصے تک زندہ رہے پھر وہ بھی شہید ہو گئے تو صحابہؓ کہنے لگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلا خوش نصیب تھا کہ پہلے شہید ہوا۔ فرمایا نہیں دوسرا اس سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ اسے کچھ دن زندگی کے اور مل گئے جن میں وہ عبادت کرتا رہا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ بعض گنہگار تمنا کریں گے کہ ہمیں پھر دنیا میں کم از کم صرف اتنی سی دیر ہی کے لئے بھیج دیا جائے کہ ہم وہاں جا کر صرف سبحان اللہ کہہ سکیں۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ زندگی بڑی بھاری نعمت ہے اور شہید کی موت بڑا درجہ رکھتی ہے "شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے" قبر کی مٹی سے زندگی دوام کا پودا پھوٹتا ہے۔

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

وہ "الحی" و "الممیت" جس طرح افراد کو جلاتا اور مارتا ہے قوموں، ملکوں، شہروں، بستیوں، پہاڑوں، سمندروں اور دریاؤں کو بھی مارتا اور جلاتا رہتا ہے۔

قرآن شریف میں ایک مردہ بستی کا سورۃ البقرہ میں ذکر آیا ہے۔

کیا تم نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ایک مردہ بستی پر گزرا تو کہنے لگا اللہ اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟

یہ حضرت عزیز علیہ السلام تھے جو فلسطین گئے تو دیکھا کہ اس کی چھتیں گر گئی ہیں اور ساری بستی خالی پڑی ہے تو کہنے لگے اس مردہ بستی کو اللہ کیسے زندہ کرے گا۔ پھر وہ حکم الہٰی سے وہیں مر گئے۔ سو سال کے بعد زندہ کئے گئے تو وہ مردہ بستی پھر سے زندہ ہو چکی تھی۔

اچھی خاصی رہتی بستی، گلیاں اور بازار مردہ ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑ نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور سمندروں کی جگہ پہاڑ لے لیتے ہیں۔ باغ کھیتیاں اور اشجار و احجار بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ دریا خشک ہو جاتے ہیں۔ ہرے بھرے جنگل بیابان بن جاتے ہیں اور بیابان سرسبز و شاداب جنگل۔

اچھی خاصی زندہ قومیں مردہ ہو جاتی ہیں اور مردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی افراد کی طرح مرتی اور جیتی ہیں۔ جوان اور بوڑھی ہوتی ہیں الغرض حیات و موت سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

ہر آن اور ہر لمحہ حیات و موت کا چکر چلتا رہتا ہے یہ دونوں ہر وقت بر سرِ پیکار رہتی ہیں۔ کبھی اس کی جیت کبھی اس کی جیت حیات چاہتی ہے کہ میرا بازار ہر دم گرم رہے اور موت چاہتی ہے کہ میرا بول بالا رہے۔ ہر جگہ موت تاک لگائے بیٹھی رہتی ہے کبھی کسی شکار پر اوچھا وار پڑ جاتا ہے کبھی پورا اور کبھی شکار اس کے داؤ میں نہیں آتا۔

چپہ چپہ پر زندگی اور موت کی کشتی ہوتی رہتی ہے اور دونوں چپکے چپکے اندھیرے میں خفیہ خفیہ کام کرتے رہتے ہیں تخلیق بھی پوشیدگی سے ہوتی ہے اور موت بھی بڑی پوشیدگی سے ہوتی ہے ایسی ایسی بلائیں اور جراثیم ہیں کہ نظر نہیں آتے اور ایسے ان دیکھے بندھن ہیں کہ اگرچہ بہت نازک ہیں مگر ان کا توڑ بڑا ہی مشکل ہے۔ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ

*

المصور جل جلالہ

اس مصور کی مصوری کے شاہکاریوں تو ہر جگہ اور ہر مقام پر ہیں مگر اس نے نہ معلوم کیوں پہاڑوں پر خوب خوب اپنی مصوری کے شاہکار بکثرت بنائے ہیں؟ شاید اس لئے کہ عمدہ تصویریں لطیف و نظیف فضاء کو چاہتی ہیں۔ بستیوں میں جو طرح طرح کے پھول نظر آتے ہیں عموماً" حضرت انسان انہیں پہاڑوں سے چن چن کر لائے ہیں۔ ایسے ایسے خوب صورت پھول پہاڑوں پر کھلے ہیں کہ چشم بینا حیران رہ جاتی ہے کیسی کیسی نازک پتیاں اور پنکھڑیاں ہیں کہ نزاکت ان پر سوجان سے صدقے واری جاتی ہے کیسے کیسے رنگ بھرے ہیں کہ بے ساختہ زبان سے واہ واہ نکل جاتی ہے بعض بوٹیاں ایسی ہیں کہ ان کی پتیاں ہی پھولوں کو شرماتی ہیں اور بعض بوٹیوں پر نہ پھول ہیں نہ رنگ مگر ان کا کٹاؤ ایسا لطیف ہے کہ سنبل کو شرماتی ہیں۔

کوے کو اپنا کالا کالا بچہ ہی بھلا لگتا ہے اور کالے کبوتر کو اپنے سے رنگ کا بچہ اچھا لگتا ہے اسے سپید رنگ والے اچھے نہیں لگتے اسی طرح انسان کو نسوانی حسن ہی فریفتہ کرتا ہے حالانکہ پھول' بوٹے' عورت سے کہیں زیادہ حسین' لطیف' رنگین' پاکیزہ اور جاذب نظر ہیں کہ عورت کا حسن ان کے سامنے ہیچ ہے۔ مگر انسان نسوانی حسن کو تو دل دے بیٹھتا ہے پھول پتی کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا بات دراصل یہ ہے کہ خواہش نفس نے ہمیں عورت کا گرویدہ بنا دیا ہے ورنہ پھول بوٹوں کے مقابلے میں اس کا حسن ہیچ ہے۔

؎ آہ بے چارے کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

پہاڑوں کے قدرتی مناظر آبشاریں اور جھیلیں کس قدر حسن و رعنائی سے بھری ہوئی ہیں کہ دست صانع پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے ایک دفعہ "سیف

الملوک" جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی اور ہی دنیا میں آگیا ہوں جو حسن و رعنائی سے بھرپور ہے مجھے ایسا لگا کہ میں اس عالم خاکی میں نہیں ہوں کسی جنت میں پہنچ گیا ہوں یا یہ جگہ پریوں کا مسکن ہے جہاں پریاں "بدر منیر" کو "سیف الملوک" سے ملانے لایا کرتی تھیں بے ساختہ اس انشا پرداز کو داد دینے لگا جس نے اپنے ناول میں بدر منیر کو شہزادہ سیف الملوک سے ملانے کے لئے اس لطیف مقام کا انتخاب کیا تھا ایسا لگتا تھا کہ واقعی بقول اس قصہ نویس کے یہاں "پریوں" ہی کا گزر ہو سکتا ہے اور پریاں ایسے ہی مقام پر رہتی ہوں گی کالام بھی جنت ارضی ہے اور بحرین و مدین بھی۔ شروع موسم بہار میں جبکہ سیاح بکثرت سیف الملوک نہ آئے ہوں یہاں کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں بھرا سبز قالین حد نظر تک بچھا ہوا ہے اور پہاڑون کے شگافوں میں کچی چاندی بھری ہوئی ہے جھیل کا ستھرا ستھرا پانی اور اس کے بیچوں بیچ برف کی صاف شفاف چھوٹی سی پہاڑی اس "المصور" کی تصویر کشی کا ایک خوبصورت نمونہ پیش کرتی ہے۔

معلوم نہیں پہاڑوں پر اس نے کیوں اس قدر ذوق و شوق سے گل کاری کی ہے کیا وہاں پریوں کا مسکن ہے یا بہشتی پرندوں کے آشیانے۔ شاید اس لئے کہ قدموں کی زد سے محفوظ رہیں اور انسان انہیں خراب نہ کر سکیں۔

انسانی حسن سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شعراء کے دیوان چشم و ابرو، قد و گیسو کی تعریفوں سے یونہی تو نہیں بھرے پڑے ہیں کیسے کیسے چلتے پھرتے، ہنستے بولتے بت تراش کر رکھ دیئے ہیں کہ ان کے قدموں پر جبیں فرسائی کو جی چاہتا ہے اور مصور کو بھول کر تصویر ہی کے ہو رہنے کو طبیعت تقاضا کرتی ہے۔

اس "المصور" نے لاتعداد تصویریں تو بنائی ہی ہیں۔ بے شمار مصور بھی بنا دیئے ہیں کہ وہ بڑے انہماک سے تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ بعض پرندے بڑے خوبصورت آشیانے بناتے ہیں۔ بعض حیوانات و حشرات الارض بڑی اچھی چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بناتے ہیں اور سمندر کے کیڑے عجیب و غریب نقاشی کرتے رہتے ہیں انسان جو اس کا خلیفہ ہے آئے دن نئی نئی تصویریں بناتا رہتا ہے لوگ دیکھتے

ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔
حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا۔ تو پھر پہلی تصویر خط مستقیم سے بنی۔ اسی خط مستقیم کو اس نے گول کر دیا تو ارض و سما اور چاند سورج پیدا ہو گئے اور اسی ایک خط کو بیضوی شکل دے دی تو لکھوکھا اجرام فلکی و ارضی بن گئے۔

اس نے بعض تصویریں صرف ایک خط سے بنائی ہیں اور بعض دو خطوط سے بعض تین سے اور بعض چار یا اس سے زیادہ خطوط سے جن تصویروں کو زیادہ مضبوط بنانا تھا انہیں گول یا بیضوی شکل دی ہے کہ یہ شکل بہ نسبت دوسری اشکال کے پائیدار ہے اور صدمات کو کم قبول کرتی ہے اسی لئے ہمارے سروں کو بیضوی بنایا ہے کہ یہ شکل ضرب کے اثر کو قبول تو کرتی ہے مگر کم۔

تصویریں ہم بھی بناتے ہیں مگر ہماری تصویروں یا مجسّموں میں جو کچھ ہوتا ہے ظاہر ہوتا ہے باطن کچھ نہیں مگر اس ''المصور'' نے جو تصویریں بنائی ہیں ان کا ظاہر بھی ہوتا ہے اور باطن بھی ہر صورت اپنے اندر کچھ نہ کچھ چھپائے ہوئے ہے اور کچھ ایسا ہے کہ ہر صورت اپنے باطن سے خبردار کرتی ہے کہ میرے فائدے اور نقصانات کیا ہیں۔

وہ ''المصور'' ایک عظیم نقاش اور پینٹر بھی ہے پتھروں، پودوں، پھولوں، تتلیوں، جانوروں، اور انسانوں پر اس نے طرح طرح کے نقش و نگار بنا دیئے ہیں اور بڑے مناسب و موزوں رنگ بھرے ہیں آڑو کو دیکھئے کہ رنگوں کی کیسی آمیزش کی ہے۔ جنگلی کبوتروں کو دیکھئے بظاہر کالے سے ہیں مگر فیروزی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ یہ عالم رنگ وبو بھی عجیب ہے۔ طرح طرح کے رنگ اور قسم قسم کی خوشبوئیں ہیں ہر جگہ تناسب کا خیال رکھا ہے۔ اگر ہاتھی کی آنکھیں اس کے جسم کے مطابق ہوتیں تو کوئی بھی دیکھنے کی تاب نہ لا سکتا اور وہ کتنی بری اور ڈراؤنی لگتیں۔ اونٹ کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں مگر بے ڈول ہوتے ہوئے بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ اب تو ہمارے آرٹسٹ چند ایک ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ کر لوگوں سے داد لینے لگے ہیں عجیب عجیب ٹیڑھے ترچھے مکان بننے لگے ہیں اور

ٹیڑھا ترچھا فرنیچر تیار ہونے لگا ہے بلکہ اب تو ہر چیز ٹیڑھی ترچھی بننے لگی ہے۔
اشیاء کے رنگ ان کے خواص کا پتہ دیتے ہیں شکلیں خبث باطن و حسن باطن سے آگاہ کرتی ہیں چیزوں کی جسامت و ضخامت غذائیت سے خبردار کرتی ہے۔

پھلوں اور حیوانوں کے اجسام پر اس نے پینٹ پر پینٹ کیا ہے اور اوپر ایسا چکنا وارنش پھیر دیا ہے جس سے رنگ محفوظ رہتا ہے لال بیگ کو دیکھو گندگی، نمی اور گندے پانی میں رہتا ہے مگر اس کا رنگ خراب نہیں ہوتا

تتلیوں اور دیگر پرندوں کے پروں اور حیوانوں کی کھالوں پر بھی اس نے اپنی مصوری کے خوب خوب کمالات دکھائے ہیں۔ ایک ہی پر کہیں سے زرد کہیں سے سرخ اور کہیں سے سبز ہے پھر یہ سب مل کر ایک خوشنما نمونہ پیش کرتے ہیں۔جو کوئی بھی جاندار کی تصویر بنائے گا اسے مبتلائے عذاب کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اس کے اندر جان ڈال

*

مزہ تصویر کا اس وقت آئے گا مصوّر کو
کہے گا اُس سے جب خالق کہ اس میں جان پیدا کر

ہر مصور تصویر بنانے میں دیوار یا پردہ، لکڑی، کینوس، رنگ و روغن، برش یا قلم اور روشنی اور کیمرے کا محتاج ہے کوئی مصور اندھیرے میں تصویر نہیں بنا سکتا یا پانی پر صورت گری اور نقش و نگار نہیں بنا سکتا۔

مگر مصور حقیقی نے تین اندھیروں میں انسان کی صورت بنائی ہے اور کمال ہے کہ پانی پر بنائی ہے کہ وہاں دیوار ہے نہ پردہ نہ لکڑی نہ کینوس نہ رنگ و روغن نہ برش نہ قلم نہ روشنی نہ آجکل کے جدید کیمرے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُ كُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ "وہی تو ہے جو رحم مادر میں تمہاری صورت جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں وہ بڑا زبردست بڑی حکمت والا ہے"

عموماً" تصاویر خواہ کپڑے پر بنائی گئی ہوں یا کاغذ پر پانی اور نمی سے بگڑتی ہیں۔ مگر "المصور" کی تصاویر پانی سے بگڑتی نہیں نکھرتی ہیں۔ میل کچیل، گرد و غبار دھل جاتا ہے اور چاند سا مکھڑا نکل آتا ہے۔

شکل و صورت کا اختلاف اندھیرے یا رنگ و روغن کی قلت و کثرت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے کمال قدرت اور بھرپور حکمت کی وجہ سے ہے ایک ہی طرح آنکھ، ابرو، بھنویں، گال، تل، ناک اور اسکا ابھار، کان، ہونٹ، دانت، ٹھوڑی نہیں بنائی بلکہ انواع و اقسام کی بنائی کہ اللہ کے کمال قدرت پر دلالت ہو کہ آنکھ، ابرو، بھنویں، گال، تل، ناک وغیرہ کی ایک ہی SHAPE نہیں ہے بلکہ اس کے کارخانہ صورت گری میں مختلف ورائٹیاں، مختلف شیپ اور مختلف سائز ہیں جیسی صورت چاہتا ہے بناتا ہے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاحب میری ناک ایسی، کان ایسے بھوئیں یوں، ہونٹ اس طرح گال اس طرح

بنائے۔ اس لئے کہ وہ اپنے فیصلے میں غالب ہے۔
حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرق و امتیاز ملحوظ رہے۔ وگرنہ روز یہ جھگڑا رہتا ایک کہتا کہ یہ میری بیوی ہے دوسرا کہتا کہ یہ میری ہے۔ **علی ھذا القیاس** خاوند' بیٹا' بیٹی پر جنگ کا بازار گرم رہتا۔ ہر ایک مدعی ان پر اپنا حق جتلاتا دوسرا انکار کرتا بالآخر لڑ جھگڑ کر ہر ایک اپنی اپنی ملکیت پر امتیازی نشان لگاتا اور مخصوص علامت مقرر کرتا لھذا "المصور" نے اپنے کارخانہ صورت گری میں تصاویر پر علامتی نشان بھی مقرر کر دیئے کہ جنگ و جدال کا باب بند ہو۔ واللہ اعلم باسرارہ۔

*

المعز جل جلالہٗ و المذل جل جلالہٗ

عزت و ذلت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اسباب تو محض بہانہ ہیں وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے و تعزمن تشاء و تذل من تشاء

مجرم کا مقام پستی ہے آدمؑ و حواؑ اور شیطان نے جرم کیا تو انہیں بلند مقام سے گرا کر ایک پست و تاریک مقام کی طرف دھکیل دیا گیا کیونکہ مجرم کے لئے پستی ہی زیبا ہے پھر آدمؑ نے اپنے جرم کا اقرار کیا معافی چاہی اور اسی بارگاہ کی طرف رجوع کیا تو اسے خلافت ارضی کا تاج پہنایا گیا اور شیطان ذلیل و خوار ہی رہا آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بڑے اعزاز سے نواز اور اسے مقام رفیع عطا کیا پھر اس کی اولاد کو مختلف عزتوں سے نوازا اور بعض پیغمبروں کو بعض سے بلند مرتبہ دیا تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ پھر ان میں سے ایک کو سب سے بڑا مرتبہ دیا اور معراج کا شرف بخشا۔

اسی طرح کائنات میں بعض کو بعض سے اشرف بنایا انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور پتھر کو سب سے زیادہ ذلیل ٹھہرایا کہ اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے۔ نہ حرکت کر سکتا ہے نہ کھاپی سکتا ہے جو چاہے اس کے سر پر ہتھوڑے برسائے وہ کچھ نہیں کر سکتا اسے ذلت کے ساتھ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے گو اسے بھی ذی روح بنایا ہے مگر اس کی روح ایسی ہے کہ بیشتر مخلوق قائل ہی نہیں کہ اس میں بھی روح ہے اس کی روح اتنی کمزور ہے کہ اس کے کسی کام نہیں آسکتی۔

اس "المعز" نے نباتات کو جمادات پر فضیلت دی کہ وہ ہل جل سکتے ہیں کھا پی سکتے ہیں اور بہت سے نباتات حشرات الارض اور جانوروں کو شکار بھی کر سکتے ہیں اور اپنے آپ سے کسی حد تک مدافعت بھی کر سکتے ہیں آپس میں عداوت و محبت بھی کر سکتے ہیں۔

اس "المعز" نے حیوانات کو نباتات پر فضیلت دی کہ وہ انہیں توڑ موڑ کر

کھا پی سکتے ہیں چلتے، پھرتے، بولتے، سوتے، کھاتے، پیتے اور کسی حد تک کائنات کو سمجھ بھی سکتے ہیں اپنے دشمن کو گزند بھی پہنچا سکتے ہیں اور دوستوں کو منفعت بھی وہ کائنات میں انسان کے شریکِ محنت اس کے دوست اور اس کے قرب میں رہنے والے ہیں خلیفۂ الٰہی کے دستِ راست ہیں اور اس کی محبت کے شریک۔ پھر عزت و ذلت کے اعتبار سے ان حیوانات کے بھی مدارج ہیں کہ بعض کو خلیفۂ الٰہی اپنا قرب عطا کرتا ہے اور بعض سے نفرت کرتا ہے۔

اس "المعز" نے انسان کو سب سے زیادہ معزز بنایا ان میں بھی عزت کے اعتبار سے بے شمار مدارج ہیں مجرم ذلیل ترین انسان ہے اور متقی عزیز ترین۔ **اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ** پھر کسی کو عزت دنیوی سے نوازا ہے اور کسی کو عزت اخروی سے۔ کوئی سینکڑوں کا محکوم ہے اور کسی پر بس ایک دو افسر برتری رکھتے ہیں۔

اس نے بادشاہوں کو عزت دنیوی بخشی اور متقیوں کو عزت اخروی، وزیروں کو دوسروں سے سرفراز بنایا اور ان کی ماتحت افسروں کو ماتحتوں سے بلند رتبہ دیا اللہ نے بادشاہ کو عزت دی اور رعایا کو ذلت۔

کسی بادشاہ نے اپنے شہزادے کو دشمن سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا پرانے زمانے میں سفر آسان نہ تھا دشمن کا علاقہ دور تھا شاہزادہ ایک منزل پر دو دن آرام کرتا اور زرہ وغیرہ اتار دیتا تھا۔ سپہ سالار لشکر نے بادشاہ کو شاہزادے کے اس رویے کے بارے میں شکایت لکھ بھیجی کہ شاہزادہ بہت آرام طلب ہے تو بادشاہ نے بطور نصیحت شاہزادے کو خط لکھا بیٹا! اللہ نے عزت و ذلت کو پیدا کیا اور راحت و کلفت کو بھی پیدا کیا پھر عزت بادشاہوں کو دی اور ذلت رعایا کو پھر عزت کو کلفت کا قرین ٹھہرایا اور ذلت کو راحت کا۔ اگر بادشاہ آرام و آسائش کو پسند کرتا ہے تو اسے مملکت کی عزت سے ہاتھ دھو لینا چاہیئے۔ راحت رعایا کا حق ہے اور کلفت بادشاہوں کا۔ عزت و راحت کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اس حکایت کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عزت کلفت میں ہے اور راحت میں ذلت ہے۔ جو قوم عیش و آرام کو ترجیح دیتی ہے ذلیل ہوتی ہے اور جو فرد جس قدر کلفت

اٹھاتا ہے عزت پاتا ہے۔

تاریخ عالم اٹھا کر دیکھ لو جب بھی کوئی قوم تعیش میں مبتلا ہوئی ذلیل و محکوم ہوئی اور جو قوم جدوجہد میں لگی رہی عزیز و سربلند ہوئی۔ **لیس للانسان الا ماسعی** اگر عزت چاہتے ہو تو آرام نہ کرو اور خود اپنی عزت کرو انسان جس قدر خود اپنی عزت کرتا ہے اسی قدر دوسرے اس کی عزت کرتے ہیں اور جو شخص خود اپنی عزت نہیں کرتا دوسرے بھی اس کی عزت نہیں کرتے۔ عزت نفس بڑی چیز ہے مجرم اپنی عزت نفس کو خاک میں ملا دیتا ہے تو ذلیل ہوتا ہے' سزا پاتا ہے' قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے' کوڑے کھاتا ہے' سولی چڑھ جاتا ہے' طعن تشنیع دشنام سنتا ہے۔ چور اپنی عزت نفس کو بالائے طاق رکھ کر مال کی عزت کرتا ہے تو ذلیل ہوتا ہے۔

اس ''المذل'' نے مجرم کا مقام ذلت وپستی ٹھہرایا ہے فرشتوں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا تو وہ بارگاہ قدس میں رہتے ہیں اور انسان سے بلند ہیں مگر جو انسان خود اپنی عزت کرتا ہے وہ فرشتوں سے بھی بلند تر ہو جاتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ شیطان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے ہر گناہ انسان کو ذلیل کرتا ہے اور نیکی بلند کرتی ہے۔

سیکڑوں اولیاءؒ اللہ' صوفیہؒ' علماءؒ اور فلاسفہ ایسے گزرے ہیں کہ بادشاہِ وقت تخت سے اتر کر نیچے بیٹھا اور انہیں اپنے تخت پر بٹھایا کیونکہ یہ لوگ اپنی عزت آپ کرتے تھے یعنی کسی صغیرہ و کبیرہ میں اپنے نفس کو مبتلا نہ ہونے دیتے تھے ہارون الرشیدؒ نے ایک عالمؒ کی دعوت کی کھانے سے فارغ ہو کر وہ عالم ہاتھ دھونے کے لئے اٹھے تو ہارون نے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا وہ عالمؒ نابینا تھے سمجھے کہ کوئی خادم ہاتھ دھلا رہا ہو گا ہارون نے ان سے دریافت کیا کیا آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے ہاتھ کون دھلا رہا ہے؟ فرمایا نہیں! کہا امیر المومنین آپ کے ہاتھ دھلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا امیرالمومنین! آپ ایسا علم کی تعظیم کے لئے کر رہے ہیں۔ سلطان الہند شاہجہاں اور شاہزادہ داراشکوہ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان کے چھوٹے سے حجرے میں چٹائی پر بیٹھے رہتے تھے ایسا کیوں تھا اس لئے کہ انھوں نے اپنی عزت آپ کی تھی یعنی ہر چھوٹے

بڑے جرم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا تھا معلوم ہوا جرم سے عزت نفس کو بٹہ لگ جاتا ہے اور جس قدر انسان جرائم سے دور ہوتا ہے مخلوق اس کی عزت کرتی ہے۔

میں جس زمانے میں الازہر میں تعلیم پاتا تھا مصطفیٰ المراغیؒ شیخ الازہر تھے ماہ رمضان میں جامع سیدہ زینبؒ میں وہ قرآن کا درس دیا کرتے تھے تو شاہ فاروق عام سننے والوں کے ساتھ زمین پر بیٹھا ہوتا تھا اور علامہ مصطفیٰ المراغیؒ تخت پر۔

علامہ مصطفیٰ المراغیؒ پر ایک بات یاد آگئی یورپ کا مایہ ناز فرزند ایچ جی ویلز مشرق کے دورے پر آیا تو مصروہند بھی آیا واپسی پر اس نے جو مضمون لکھا اس میں لکھتا ہے میں مشرق سے مایوس لوٹتا اگر مولانا ابوالکلام آزادؒ اور علامہ مصطفیٰ المراغیؒ سے نہ ملتا۔

ہمارے دور میں مصطفیٰ المراغیؒ بہت ضعیف ہو چکے تھے لہٰذا اس قدر آہستہ بولتے تھے کہ بس پہلی صف تک ہی ان کی آواز جا سکتی تھی اس لئے جب وہ بولتے تو نہ کوئی کھانستا نہ ذرا سی بھی کسی چیز کا کھڑکا ہوتا۔ بس سب ایسے ہو جاتے **کان علی رؤسہم الطیر** "گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں" مصطفیٰ المراغیؒ پہلے شیخ الازہر تھے جو حنفی تھے ورنہ ہمیشہ صرف شافعی ہی شیخ الازہر ہوا کرتا تھا وہ شیخ الازہر بننے سے پہلے مصر کے قاضی القضاۃ تھے انہوں نے کسی مقدمہ میں ایک بدو کے خلاف فیصلہ دیا تو اس نے عدالت کے کمرے ہی میں اسی وقت ان پر تیزاب پھینک کر مارا مگر وہ ان کی گردن پر گرا اس کا نشان ان کی گردن پر صاف دکھائی دیتا تھا۔

بادشاہ وقت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ڈرتا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی عزت نفس کو کبھی آنچ نہیں آنے دی تھی ایک دفعہ سپاہی چھکڑوں میں بادشاہ کے لئے شراب کے مٹکے لئے جا رہے تھے۔ اللہ کی شان شیخؒ کی نظر پڑ گئی۔ سارے مٹکے اسی وقت تڑوا دیئے اور فرمایا بادشاہ سے کہنا توبہ کرے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ، حضرت علاء الدین صابر کلیریؒ، حضرت فرید الدین شکر گنجؒ، حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ وغیرہ کی خدمت میں بڑے بڑے راجے مہاراجے آتے تھے تو کیوں صرف اس لئے کہ

انہوں نے اپنی عزت کو میلا نہ ہونے دیا تھا۔
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ "اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے مکرم و معظم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو" صرف اللہ ہی کے نزدیک نہیں بلکہ ساری مخلوق کے نزدیک کیونکہ جس کی اللہ عزت کرے مخلوق لامحالہ عزت کرے گی حتیٰ کہ حیوانات اور درندوں تک نے ان کی عزت کی ہے ایسے بھی سیکڑوں واقعات ہوئے ہیں یاد نہیں رہا ایک سفر میں ایک مجاہد صحابی رضی اللہ عنہ قافلے سے بچھڑ کر جنگل میں جا نکلے سامنے سے شیر آگیا انہوں نے کہا اے شیر! میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی ہوں مجھے میرے قافلے تک پہنچا دے تو اس نے ان کی رہبری کی۔
سعدی شیرازیؒ بوستان میں لکھتے ہیں۔

؎ یکی دیدم درعرصۂ رودبار
که پیش آمدم بر پلنگے سوار

میں نے رودبار کے میدان میں ایک شخص کو سامنے آتے دیکھا کہ چیتے پر سوار ہاتھ میں سانپ کو کوڑا بنائے ہوئے چلا آرہا ہے میں نے تعجب سے اس سے دریافت کیا یہ کیا؟ کہنے لگا۔

؎ تو گردن زحکم خدا ہم نہ پیچ
که گردن نہ پیچد زحکم تو ہیچ

"تو خدا کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیر سکے" معلوم ہوا جس متقی کی خدا عزت کرتا ہے مخلوق بھی اس کی عزت کرتی ہے۔ حیوان تو حیوان جمادات بھی ایسے انسان کی عزت کرتے ہیں اور اس کا حکم مانتے ہیں انبیاء علیہم السلام کے سیکڑوں معجزات اس پر شاہد ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جمادات سلام کرتے تھے سنگریزے آپ کی کف مبارک میں کلمہ پڑھتے تھے معلوم ہوا جمادات میں بھی روح ہے مگر بہت دھیمی کہ کسی کے بیدار کرنے ہی سے کچھ بیدار ہو سکتی ہے۔
عزت کی بہت سی قسمیں ہیں مال کی بنا پر جاہ کی وجہ سے، عیال کی وجہ

سے، شہرت کی وجہ سے اور علم کی وجہ سے۔ ساری عزتیں شاذونادر ہی کسی کے حصے میں آتی ہیں جنھیں اللہ نے عزتِ علم سے سرفراز فرمایا ہے انہیں مال نہیں دیا جنہیں مالی عزت دی ہے انہیں علم نہیں دیا بہت سے مالدار اولاد کو ترستے ہیں اور بہت سے مشاہیر جاہ و مال سے محروم رہے بہت سے اہل علم ایسے گزرے ہیں کہ اللہ نے انہیں بڑا علم عطا کیا مگر اہلِ دنیا نے انہیں تسلیم نہیں کیا مارا پیٹا اور قتل کیا مرنے کے بعد پھر اللہ نے انہیں شہرتِ دوام بخشی غالب کو ان کی زندگی میں کسی نے تسلیم نہ کیا تنگ دست رہے مگر مرنے کے بعد شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ سیکڑوں پبلشروں نے غالبؔ کی وجہ سے کوٹھیاں بنالیں اور ہزاروں پروفیسر لاکھوں میں کھیل رہے ہیں ہر یونیورسٹی میں غالبؔ چیئر ہے اور سیکڑوں لیکچرر، ریڈر اور پروفیسر عیش کر رہے ہیں قریب قریب ایسا ہی کچھ حال اقبالؒ کا ہے۔

جس طرح ''المعز'' نے طرح طرح کی عزتیں پیدا کی ہیں طرح طرح کی ذلتیں بھی اس ''المذل'' نے پیدا کر دی ہیں اور جس طرح عزت کے بیشمار درجات ہیں۔ ذلت کے بھی ہیں۔ اسی ''المذل'' نے بڑے بڑے مغرور بادشاہوں کو گداگر بنایا وہ اور ان کی اولاد جان چھپاتی بھیک مانگتی اور ہر ایرے اغیرے نتھو خیرے کی کفش برداری کرتی پھری شہزادیاں باورچن بنیں اور بادشاہوں نے لباس فقیری پہن لیا۔

دنیا کی ہر شے میں مدّو جزر ہے عزت و ذلت میں بھی مدّوجزر ہے کبھی ایک شخص انتہائی عزت دار ہوتا ہے اور کبھی وہی نہایت ذلت کے ساتھ سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے ریٹائرڈ ہو کر بڑے بڑے متکبر افسر سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اسی طرح کبھی کوئی قوم دنیا میں بڑی عزیز ہوتی ہے پھر کچھ دنوں کے بعد بہت ذلیل ہو جاتی ہے کبھی ایک خاندان ترقی کرتے کرتے بام عروج پر پہنچ جاتا ہے اور کبھی وہی خاندان ذلیل ہو جاتا ہے سدا عزت تو اسی ''المعز'' کی رہے گی **إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا**۔ خدا سب کو عزت دے اور ذلت سے بچائے آمین۔

؎ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا! چاہ بنا! مسجد و تالاب بنا!

المعطی جل جلالہٗ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں نہیں آیا سورہ الکوثر میں ہے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ہم نے آپ کو کوثر عطا کی تو وہ بلاشک معطی تو ہوا۔ اس کے افعال و مصدر اعطی اور عطاء وغیرہ قرآن شریف میں آئے ہیں۔

اس "المعطی" کا سب سے پہلے عطیہ یہ ہے کہ اس نے ہمارے کالبدِ خاکی میں اپنی روح پھونکی پھر دوسری روح ہمارے قلب میں بصورتِ قرآن پھونکی اس نے قرآن کو اپنے کلمہ اور اپنی روح سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس "المعطی" کے دو اتنے بڑے عطیات ہیں جن کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا اور یہ دونوں عطیے اس نے ہمیں بغیر مانگے دیئے۔

کہتے ہیں سخاوت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مانگے سے دے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بغیر مانگے دے۔اس کی تمام صفات' صفات کمالیہ ہیں اس لئے وہ "المعطی" سخاوت کے درجہ بلند کا مالک ہے۔

علمائے اخلاق نے سخی کی کئی قسمیں قراردی ہیں ایک یہ کہ دے اور دے کر رنجیدہ ہو یہ سب سے گھٹیا درجے کا سخی ہے۔ دوسرے یہ کہ دے اور دل برا نہ ہو۔ یہ دوسرے درجے کا سخی ہے اور تیسرے یہ کہ دے اور دے کر خوش ہو یہ اعلیٰ درجے کا سخی ہے ایک عربی شاعر ایسے ہی سخی کی ان الفاظ میں تصویر کھینچتا ہے۔

"وہ دیتے وقت خوشی سے ایسے جھومتا ہے جیسے ترشاخ ہواؤں سے جھومتی ہے"۔

اس "المعطی" نے ہمیں سب کچھ دیا اور دے کر ایسا خوش ہوا جیسے ماں اپنے بچے کے منہ میں لقمہ دے کر خوش ہوتی ہے۔

ان دو مذکورہ بالا عطیات کے علاوہ اس کا ایک بڑا بھاری عطیہ یہ ہے کہ اس نے ہمیں خلافت ارضی سپرد کی **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ** فرماتے ہیں **اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ** ہم نے امانت پیش کی آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر تو وہ ڈر گئے اور انہوں نے انکار وعذر پیش کر دیا مگر انسان نے اسے اٹھا لیا اس کے بارے میں مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ امانت سے مراد خلافت ارضی ہے اور بعض نے لکھا ہے کہ مراد عبادت ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہو بہر حال اس امانت کو قبول کرنے سے ہر ایک نے معذوری ظاہر کر دی اور انسان نے اسے قبول کر لیا تو پھر ان کا یہ فرمانا کہ انسان ظالم و جاہل ہے بلکہ بڑا ظالم و جاہل ہے بظاہر کچھ جچتا نہیں ہمارے تمام مفسرین یہی لکھتے چلے آئے ہیں کہ انسان نے بار امانت کو برداشت کر کے جبکہ وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اپنے اوپر ظلم و زیادتی اور نادانی کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے "ظلوم و جہول" فرمایا مفسرین کی اسی تفسیر کی بناء پر فارسی و اردو شعراء نے بڑا واویلا کیا ہے کہ ہم نے امانت قبول کی اور ہم ہی جناب والا! ظلوم و جہول ٹھہرے؟

"ظلوم و جہول" کے ظاہر معانی کو لے کر جو کچھ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے اور اس کو لے کر ہمارے شعراء نے واویلا کیا ہے کبھی میرے دل کو نہ لگی کیونکہ ہم نے آسمانوں زمینوں پہاڑوں سے امانت کو نقب نہیں کیا نہ امانت والے سے زبردستی چھینا تو ہم ظالم کیسے ٹھہرے؟ وہ امانت لئے پھرے کسی نے قبول نہ کی ہم نے قبول کر لی تو ہم تعریف کے مستحق ہوئے نہ کہ برے القاب و الفاظ کے؟ اور وہ ہستی جسے اس نے سارے اسماء کی خود تعلیم دی جاہل کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ خود فرماتے ہیں **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا** بنی آدم ہم نے بنو آدم کو مکرم و معظم بنایا ہے تو جسے اس نے مکرم و معظم بنایا ہو وہ ظالم و جاہل کیسے ہو سکتا ہے؟

بات یہ ہے کہ ہمارے مفسرین سمجھے نہیں "ظلوم و جہول" بطور پیار کے فرمایا ہے لعن و طعن کے طور پر نہیں۔ جیسے ہم بچوں کو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو بڑا ہی شریر ہے حالانکہ مقصود برائی نہیں ہوتی پیار میں شریر کہتے ہیں نہ وہ شریر ہوتا ہے یا جیسے اہل عرب کسی شاعر کے اچھے شعر کو سن کر کہتے ہیں قاتلک اللہ،

خدا کرے تو مرجائے۔ تو یہ کوسنا نہیں ہوتا اگرچہ بظاہر کوسنا ہے مگر مقصود داد ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں تو پیار میں "**ظلوم و جہول**" فرمایا ہے لوگ ظاہرِ الفاظ سے دھوکا کھا گئے۔ ہماری عورتیں دلہن کے گیت میں گاتی ہیں۔ مری دلہن تو کچھ بھی نہ جانے ری۔ مری نادان دلہن۔ تو وہ پیار میں اسے نادان اور سب کچھ کہہ جاتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں جاہل فرمایا ہم کیوں جاہل ہوتے۔ ایسی امانت تو عالم ہی قبول کر سکتا ہے جاہل کیسے قبول کرے گا۔ چنانچہ جاہلوں نے انکار کر دیا اور عالم نے بڑھ کر تھام لیا۔ ہم بھی رات دن کسی اچھے شاعریا فن کار کو کہہ دیتے ہیں۔ ارے ظالم کمال کیا ہے۔ ارے مار ڈالا۔

کلام عرب میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی اور آیت کا یہ ٹکڑا کلام عربی کے محاورے کے مطابق ہے کیونکہ قرآن عربی مبین پر ہے۔

ہماری بات یہاں تک ختم ہوئی۔ اگر مفسرین کی بات کو لے لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں "**ظلوم و جہول**" بطور طعن فرمایا تو میں کہوں گا۔ معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی

؎ بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبدلب لعلِ شکر خارا

پھر یہ کہ ہم بہت معظم و مکرم ہیں۔ ایک دو گالی سے معظم و مکرم کی عزت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

؎ سوجوتوں سے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے جو خالی نہیں ہوتا

جسے وہ خود عزت دے اس کی عزت دو لفظوں سے خاک میں نہیں مل سکتی کہ ہمارے شعراء واویلا کریں اور زبان شکوہ و شکایت دراز کریں۔

فرماتے ہیں **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** ہم نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا جس ذات کو انہوں نے احسن تقویم پر پیدا کیا وہ ظالم و جاہل کیسے ہو سکتی ہے؟

اس "المعطی" کے عطیات صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہیں

ذرہ ذرہ کو اس کے عطیات پہنچتے ہیں جو بھی موجود ہے اسے اس "المعطی" نے عطیہ وجود دیا جو خود ایک بڑی نعمت ہے۔

جب بارش برستی ہے تو ہر پتی کو اس کا عطیہ پہنچتا ہے کہ اس کا پیاسا جگر تر ہو جاتا ہے اور اس کی رگ رگ میں شادابی سرایت کر جاتی ہے پیاسی زمین سیراب ہو جاتی ہے اور چرند و پرند اس کے عطیے سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

عطیات الٰہی بے شمار ہیں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور وہ "معطی مطلق" جو ٹھہرا اس کے عطیات کے بیان کے لئے دفتر درکار ہیں بشر کی کیا مجال کہ انہیں شمار کر سکے؟

اس نے اپنے ایک عطیے کا ذکر سورہ رحمان کے شروع میں کیا ہے **عَلَّمَہُ الْبَیَانَ** قوت بیان کا عطیہ ایک ایسا عطیہ ہے کہ حیطۂ بیان میں نہیں آسکتا۔ اس عطیے سے ہم اتنے بے شمار فائدے اٹھاتے ہیں کہ انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا رات دن اسی سے کام چلاتے ہیں درس و تدریس، تقریر و تحریر، شعر و شاعری، گانا بجانا سب کچھ اسی کا ممنون ہے۔ حضور فرماتے ہیں۔ **انما انا قاسم واللہ یعطی**

حضرت حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

آسمان بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زوند

آسمان بار امانت نہ اٹھا سکا۔ قرعۂ فال مجھ دیوانہ کے نام نکالا گیا۔

چونکہ میدان شعر تنگ ہے لہٰذا حافظ نے صرف آسمان کا ذکر کیا ورنہ یوں فرماتے۔

آسماں ارض جبل بار امانت نہ کشید

انہوں نے بھی اسی "ظلوم و جہول" کے خیال کے مطابق اپنے آپ کو اور ہمیں دیوانہ قرار دے دیا ہم دیوانے کیسے ہو گئے ہم تو فرزانے تھے تو ہم نے دوڑ کر اسے قبول کر لیا۔ دیوانہ کیا قدر جانے لہٰذا ہم نے دیکھا کہ اچھا اعزاز و اکرام ہے تو ہم نے قبول کر لیا۔ حافظ بھی اسی رو میں بہہ گئے جس میں سارے فارسی و اردو شعراء بہہ گئے مگر انہوں نے خدا پر کوئی اعتراض نہیں کیا جیسا کہ عام شعراء

نے کیا ہے اور قوالیوں میں تو گستاخی کی حد تک اور کفر کی حد تک شاعری کی گئی ہے ہمارے خیال کے مطابق یہ شعر اس طرح ہونا چاہئے تھا۔

؎ آسمان ارض و جبل بار امانت نہ کشید
قرعۂ فال بنام منِ فرزانہ زدند

اب بات ٹھیک ہے اور ان کے اُس شعر کے مطابق ہے جو وہ اسی غزل میں فرماتے ہیں۔

؎ ساکنانِ حرم سرِ عفافِ ملکوت
بامن راہ نشین بادۂ مستانہ زدند

ساکنانِ حرمِ ملکوت نے مجھ راہ نشین کے ساتھ بادۂ مستانہ پی۔

جو فرزانہ ایسا تھا جیسا کہ ہم نے بیان کیا تو یہ شعر اس کی تقویت کرتا ہے کہ پھر ایسا ہوا کہ مجھ عالی قدر فرزانے کے ساتھ فرشتوں نے جام پیا تو اب ایک موزوں بات ہو گئی اور ان سے بلند شخصیت کو دیوانہ کہنا بے جا سی بات ہے۔

اس دوسرے شعر میں توالی و تتابع اضافات (پے در پے اضافتوں کا آنا) عیب ہے علماء بلاغت کہتے ہیں کہ پے در پے اضافتیں کلام کو فصاحت سے گرا دیتی ہیں لہٰذا حافظ کا پہلا مصرعہ غیر فصیح ہے مگر اسے قاعدہ کلیہ بنانا غلط ہے کیونکہ ہر جگہ اس سے کلام فصاحت سے نہیں گرتا بلکہ بعض جگہ حسن پیدا ہو جاتا ہے خصوصا مقام مذمت میں جیسے شاعر کے اس شعر میں ہے۔

یا علی بن حمزة بن عمارة انت واللہ ثلجتہ فی خیارة

اے علی بن حمزہ بن عمارہ تو بالکل ٹھنڈا ہے جیسے ککڑی میں برف کا ٹکڑا ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ذکر رحمتہ ربک عبدہ زکریا اس میں مذکورہ بالا عیب ہے مگر یہاں عیب نہیں۔ غالب فرماتے ہیں۔

؎ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤنوش ہے

اس مصرعہ کو کون برا کہہ سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں "ظلوم و جہول" قرار دیا تھا مگر حافظ صاحب دوقدم اور آگے بڑھ گئے اور بالکل لٹیا ہی ڈبو دی کہ ہمیں پاگل بنا دیا ظالم و جاہل تو ہم رات دن ایک دوسرے کو کہتے رہتے ہیں مگر پاگل تو گالی ہے کوئی ظالم پاگل نہیں ہوتا ظالم تو بڑا زیرک ہوتا ہے گو اس کی زیرکی برے دھارے پر بہنے لگتی ہے بڑے بڑے ظالم بڑے زیرک ہو گزرے ہیں اسی طرح جاہل آدمی پاگل نہیں ہوتا بلکہ بعض جاہل تو اہل علم سے بھی زیادہ عاقل ہوتے ہیں تو پاگل یقیناً ظالم و جاہل سے زیادہ سخت بات ہے پھر یہ کہ پاگل کو کوئی کبھی قرعہ اندازی میں شریک نہیں کرتا کوئی باؤلا ہی ہو گا جو پاگل کو قرعہ اندازی میں شریک کرے کیونکہ پاگل تو خود ہر چیز سے دست بردار ہو چکا ہوتا ہے اس کے انتخاب کی کسی کو کیا ضرورت لہٰذا یہ مصرعہ یونہی ہونا چاہئے تھا۔

قرعۂ فال بنامِ منِ فرزانہ زوند

حافظ صاحب جو بجائے فرزانہ کے دیوانہ لائے ہیں اس میں ہم انہیں زیادہ قصور وار نہیں سمجھتے کیونکہ یہ ان کے ماحول اور شاعرانہ طبیعت کے تحت ایسا ہوا۔ ہر شاعر پاگل ہوتا ہے اور جتنا بڑا شاعر ہوتا ہے وہ اسی درجے کا پاگل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ سارے شاعروں کے دیوانوں میں جنون' دیوانگی' ویرانی' وحشت' گریبان چاک کرنا' آشفتہ سری' حیرت' یاس' قنوط' غم و الم' گریہ وزاری' صحرا نوردی' شب بیداری اور عشق وغیرہ کا بہت زیادہ ذکر ہوتا ہے اور چونکہ یہ لوگ دیوانگی پسند ہوتے ہیں اسی لئے ان کے دیوان پاگلوں کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں مجنوں' لیلیٰ' فرہاد' ہیر' رانجھا' سسی' پنوں وغیرہ اور دیوانگی وغیرہ کے ذکر کے علاوہ ان کے دیوانوں میں اور کیا دھرا ہے؟ اسی لئے یہ اپنے تخلص بھی سودائی قسم کے پسند کرتے ہیں۔ مجنوں' وحشت' ویراں' بیدم' بیدل' داغ' حسرت' یاس' زخمی' محشر' حشر' حزیں' محزون' چرکیں' بوم' سیماب' شورش' سوز' الم' آرزو' دیوانہ' درد' سودا' آتش' صحرائی' مضطر' پریشاں' بے خود' فانی' جنوں' تنہا' خلوت' حرماں' عشقی' شوقی' عشق' عاجز' بیگانہ' مجروح' پروانہ' ناکارہ' وغیرہ جیسے الفاظ بوجہ حسب دیوانگی کے پسند کرتے ہیں۔

غالب کو تو ویرانی، صحرا نوردی، قیس و فرہاد سے بڑی ہی دلچسپی تھی فرماتے ہیں۔

اللہ رے ذوق صحرا نور دی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"۔ اور "رہیئے اب ایسی جگہ چل کے" والا قطعہ تو سراسر پاگل پن کا آئینہ ہے بالکل ایسا ہی ایک قطعہ علامہ اقبالؒ کا ہے۔

"دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب" شاعر کہتا ہے

شکر، صد شکر میان من او صلح فتاد
حوریان رقص کناں بادہ مستانہ زدند

شکر، صد شکر کہ میرے اور محبوب کے درمیان صلح ہو گئی۔ حوروں نے رقص کرتے جام لنڈھائے اور جشن منایا۔

ایرانی چونکہ بہادر قوم ہے لہٰذا ان کی زبان میں زدن پر بے شمار محاورات ہیں۔ سخن زدن اور حتی کہ جام زدن وغیرہ بھی اسی طرح کشتن پر بھی بہت سے محاورات ہیں حتی کہ چراغ بجھانے کے لئے بھی "چراغ را بکش" کہتے ہیں۔

حضرت علامہ زمخشری کو اپنی عربی دانی پر بڑا ناز تھا ایرانی لوگوں کو اہل عرب اپنی بیٹیاں نہیں دیتے تھے علامہ صاحب عربی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے دعویٰ کر بیٹھے کہ میں عربی النسل ہوں وہ واقعی بڑے ادیب و لغوی تھے بیٹی والے دھوکا کھا گئے شادی کر دی شب زفاف میں علامہ صاحب نے بیوی سے فرمایا **اقتلی السراج** چراغ بجھا دے یہ **اقتلی السراج** انہوں نے فارسی محاورے "چراغ را بکش" کے مطابق فرمایا اور احساس نہ ہوا کہ اہل عرب ایسے نہیں بولتے پھر کیا تھا دلہن نے شور مچا دیا کہ یہ تو ایرانی ہے چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئی۔

انگریز قوم چونکہ کھیل کود کی بڑی شوقین ہے لہٰذا انگریزی زبان میں عموماً" ہر چیز کے لئے Play آتا ہے۔

ہمیں بھی اپنی عربی دانی پر بڑا ناز تھا جب میں مصر سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو خشکی کے راستے سفر اختیار کیا تاکہ تمام بلاد عربیہ کی سیر کر سکوں میں

نے ہر جگہ اپنے آپ کو مصری بنایا تو کسی فلسطینی شامی یا عراقی کو شبہ نہیں ہوا مگر علامہ صاحب جیسا واقعہ ہمیں بھی پیش آیا ہمنے قاہرہ میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جمعہ کے روز ایک غریب لڑکا مکان کی صفائی کر جایا کرتا تھا ڈاکٹر مجتبیٰ حسن مرحوم صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میرے ساتھ رہتے تھے ہم دونوں چلے جا رہے تھے کہ وہ لڑکا مل گیا اس نے سلام کیا تو میں نے بطور تعریف کہا **هذا الولد بَطَّالٌ** وہ مجتبیٰ حسن سے کہنے لگا۔ دیکھئے صارم مجھے گالی دیتا ہے۔ میں نے کہا میں نے تو کوئی گالی نہیں دی۔ میں نے تو **هذا الولد بَطَّال** کہا ہے مجتبیٰ ہنس کر کہنے لگے۔ بس تم اپنی عربی دانی کو رہنے دو۔ بَطَّال تو بے کار کو کہتے ہیں۔ بطل البتہ تعریف کا لفظ ہے میں نے کہا۔ میں نے تو ازراہ تعریف بطل کا بَطَّال بنایا تھا جیسے عالم کا عَلَّام۔ ہیکل کی کتاب بَطَلُ الاَبْطَال حضور کی سیرت پر مشہور ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی مرحوم صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ساتھ مکہ شریف میں پیش آیا تھا۔

*

اَلْمُغْنِیُ جل جلالہٗ

یہ اسم قرآن پاک میں کہیں نہیں آیا البتہ اس کے افعال استعمال ہوتے ہیں چنانچہ سورۃ والضحیٰ میں ہے **وَوَجَدَکَ عَائِلاً" فَاَغْنٰی**۔ آپ کو تہی دست پایا تو غنی کردیا یعنی مال والا کردیا یا مستغنی کردیا۔

سورۃ ابی لہب میں ہے۔ **"مَا اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ"** اس کا مال کچھ فائدہ نہ پہنچا سکا یا جو کچھ اس کے پاس تھا وہ اسے مستغنی نہ کرسکا یعنی اس کا مال وکسب اسے ہلاکت سے نہ بچا سکا۔

بہر حال حضورؐ کے بارے میں جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں غنی کردیا تو وہ "المغنی" یقیناً" اللہ تعالےٰ جس ذات کے بارے میں بتائے کہ ہم نے تمہیں غنی کردیا اس کے غنا کی کیا حد ہوسکتی ہے۔ اللہ جسے مستغنی کردے اس سے بڑا مستغنی اور کون ہوسکتا ہے؟ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ صبح کے ناشتے کے لئے رات کی بچی ہوئی روٹی رکھنے لگے فرمایا "اے بلال! خرچ کردو ۔ صاحب عرش سے قلت و تہی دستی کی توقع نہ کر"۔ **انفق یا بلال ولا تخش عن ذی العرش اقلالا**۔ وہ ہستی جو اگر یہ چاہتی کہ احد پہاڑ سونا بن کر ساتھ چلے۔ اس ہستی کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا کیا وقعت رکھتا تھا مگر بلالؓ کے لئے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ دیکھو فقر بلالؓ و غنائے رسولؐ کا فرق۔

وہ "المغنی" کسی کو غنائے ظاہری عطا کرتا ہے کہ اس کے پاس زروجواہر کے ڈھیر ہوتے ہیں مگر چونکہ اسے غنائے باطنی عطا نہیں فرماتا لہٰذا وہ **ہل من مزید** ہی پکارتا رہتا ہے اور مرتے دم تک اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ **سلاطین** جہاں کبھی مستغنی نہیں ہوپاتے۔

وہ "المغنی" کسی کو غنائے باطنی عطا فرماتا ہے گو وہ بالکل ہی تہی دست

ہوتا ہے مگر بادشاہوں کے دلوں سے زیادہ اس کا دل مستغنی ہوتا ہے وہ فقر وفاقہ کے باوجود بھی غنی معلوم ہوتا ہے نادان اسے غنی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ کسی سے سوال نہیں کرتا۔

"یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ"۔ مگر پہچاننے والے ان کے چہروں سے اندازہ لگالیتے ہیں کہ وہ تہی دست ہیں مگر دل کے غنی ہیں۔

بعض لوگ وہ ہیں جنہیں وہ "المغنی" غنائے ظاہری وباطنی سے نوازتا ہے ایسے کم ہیں کہ مال ودولت کی فراوانی بھی ہو اور دل ان سب سے بے نیاز بھی ہو۔

اس "المغنی" نے بعض لوگوں کو ساری دنیا سے ایسا مستغنی کردیا ہے جیسے سورج کو ستاروں سے کہ وہ اس کے محتاج ہیں مگر وہ کسی کا محتاج نہیں۔ چاند سورج کا محتاج ہے گو وہ دوسرے ستاروں سے مستغنی ہے۔ بعض لوگ چاند کی طرح کسی ایک کے محتاج ہیں مگر اس کے علاوہ سب سے مستغنی ہیں۔ بعض ستارے بعض ستاروں کے محتاج ہیں مگر باقی ستاروں سے بے نیاز ہیں اسی طرح بعض انسان بعض افراد کے محتاج ہیں مگر دوسرے انسانوں سے بے نیاز ہیں۔

"تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" "وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے" جسے چاہتا ہے کسی کا محتاج بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کسی فرد کا محتاج نہیں بناتا بلکہ دوسرے اس کے محتاج ہوتے ہیں۔

تخلقوا باخلاق اللہ "اپنے اندر اخلاق الٰہی پیدا کرو"۔ اس "المغنی" کی طرح دوسروں کے لئے "المغنی" بنو جس قدر دوسروں کے کام آؤ گے شان بے نیازی پیدا ہوتی جائے گی سوائے خدا کے کسی کے آگے ہاتھ مت پھیلاؤ تو وہ "المغنی" تمہیں سب سے زیادہ غنی و مستغنی کردے گا۔ ؎

دست سوال سینکڑوں عیبوں کا عیب ہے
اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیو

المقتدر جل جلالہ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں تین جگہ آیا ہے پارہ ۲۷ رکوع ۱۰ میں ہے
اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَہَرٍ ۝ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ ۝
ترجمہ :۔ پرہیز گار لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے سچی عزت کے مقام پر بادشاہ قادر مطلق کے پاس۔

دوسری جگہ پارہ ۱۵ رکوع ۱۸ میں ہے **وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا**"۔

ترجمہ :۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

پارہ ۲۵ رکوع ۱۰ میں ہے۔

اَوْ نُرِیَنَّکَ الَّذِیْ وَعَدْنٰہُمْ فَاِنَّا عَلَیْہِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ۔

ترجمہ :۔ یا ہم آپ کو ان کا وہ عذاب دکھادیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے بے شک ہم ان پر قادر ہیں۔

فصاحت قرآنی کا یہی تقاضا تھا کہ یہاں "مقتدر" کی جگہ "مقتدرون" کہا جائے اور صیغہ جمع متکلم لایا جائے اگر **اَنَا عَلَیْہِمْ مُقْتَدِرٌ** فرماتے تو وہ زور کلام پیدا نہ ہوتا جو اب ہوا اور یہ مقام تقاضا کرتا ہے۔

دراصل قدرت واقتدرا اسی قادر مطلق کے لیے ہے جو آنا" فانا" بڑے بڑے بادشاہوں کو بستر نرم سے خاکستر گرم پر بٹھا دیتا ہے پچھلے زمانوں میں ایران کی وہی حیثیت تھی جو دنیا میں آج کل امریکہ کی ہے عظیم سلطنت کا جبار بادشاہ خسرو پرویز مسلمانوں سے شکست کھا کر منہ چھپاتا پھرا اور جاکر ایک پن چکی میں چھپ گیا جواہرات سے مرصع ہار اور زرق برق لباس آنکھوں کو چکا چوند کررہے تھے پن چکی والے کو لالچ ہوا اس نے سر پر اس زور سے لاٹھی ماری کہ مرگیا۔

اگر اس دور میں کوئی غریب فقیر چھوٹی سی قوم امریکہ کو برباد کردے تو کیا

آپ خیال کرتے ہیں کہ وہاں کے دانشور اپنے علم و قلم کو روکے بیٹھے رہیں گے اور کسی نہ کسی صورت سے انتقام نہ لیں گے۔

مسلمانوں نے جتنے بھی ممالک فتح کئے ان میں سب سے بڑی سلطنت ایران کی تھی یہ فتح مسلمانوں اور اسلام کو بے حد گراں پڑی اور مسلمانوں میں تفرقہ پڑ گیا چونکہ فاتح ایران عمرؓ بن الخطاب تھے لہٰذا ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئیں اور انہیں خوب خوب بدنام کیا گیا۔

دراصل اقتدار اس قادر مطلق کو ہے جو منٹوں میں بڑے بڑے شہروں کو تباہ کر دیتا ہے سمندوروں کو پہاڑ اور پہاڑوں کو سمندر بنا دیتا ہے جس نے سکندر جیسے صاحب اقتدار پیدا کیے اور پھر انہیں خاک میں ملادیا جس نے شیر وشاہین جیسے صاحب قدرت پیدا کیے اور پھر انہیں خاک میں ملادیا۔

دراصل اقتدا راس قادر مطلق کو ہے جو اگر چیونٹی کو ہاتھی پر مسلط کردے تو اس کا پتہ پانی ہوجائے جو ناتواں سے توانا کا سر کچلوا دیتا ہے اور حقیر سے کبیر کو پچھڑوا دیتا ہے جس نے طالوت جیسے ایک غریب نوجوان سے جالوت جیسے عظیم الشان بادشاہ کو شکست دلادی جس نے داوٗد جیسے غریب لڑکے سے جالوت کے لشکر کو ہلاک کرادیا اور جس نے سلیمان جیسے عظیم شہنشاہ کو تخت سے اتار کر در بدر پھرادیا کہ سب لوگ ان پر ہنستے تھے وہ سلیمان کہ اس جیسا بادشاہ چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا جس کی حکومت جن وانس، بادو آتش، حیوان وانسان دریاؤں اور پہاڑوں سب پر تھی۔

دراصل اقتدار اس قادر مطلق کو ہے جس نے ہمیں اور آپ کو صاحب اقتدار بنایا پھر کسی کا اقتدار صرف اس کے گھر تک محدود ہے، کسی کا دفتر تک، کسی کا شہر تک، کسی کا ضلع تک، کسی کا صوبے تک تو کسی کا پورے ملک تک اور بعض کا دنیا کے بیشتر حصہ تک

وہ "المقتدر" جیسا بھی اقتدار آپ کو بخشے اسے صحیح طور پر استعمال کرنا چاہیئے اگرچہ دیکھا یہی گیا ہے کہ صاحب اقتدار ظلم ہی کرتے ہیں اور اس عطیۂ خداوندی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس ”المقتدر“ نے اگر کچھ جانور آپ کے قبضۂ اقتدار میں دے دیے ہیں تو ان کی تکلیف کا ہردم خیال رکھو کہ وہ بھی آپ کا سا دل، جگر رکھتے ہیں اگر خدا نے آپ کو مال دیا ہے تو اس اقتدارِ مالی کا یہ حق ہے کہ اسے ناجائز استعمال نہ کرو، یونہی نہ اڑا دو، اس کی حفاظت کرو۔ اگر اس نے کچھ مال ومتاع آپ کے قبضۂ اقتدار میں دیا ہے تو اسے ضائع ہونے سے بچاؤ اسے صاف ستھرا رکھو۔ اسی طرح اگر اس ”المقتدر“ نے آپ کو گھر کا بادشاہ بنایا ہے تو بیوی بچوں کے ساتھ رحم وکرم کا برتاؤ کرو انہیں کارِ خدمت سے ہلکان نہ کرو اور ان کے جذبات کا خیال رکھو، اسی طرح اگر اس ”المقتدر“ نے آپ کو ایک گھر کا مالک بنایا ہے تو اس گھر کو صاف ستھرا رکھو۔ اگر اس نے چارپائی یا میز کرسی پر آپ کو اقتدار دیا ہے تو ان چیزوں کا خیال رکھو۔

وہ ”المقتدر“ اگر آپ کو اقتدار دیتا ہے تو متکبر نہ بنو مقتدر ہی رہو بلکہ عبد ”المقتدر“ رہو کیونکہ تکبر اسے پسند نہیں وہ فرماتا ہے **الکبریاء ردائی فمن نازعنی نازعتہ**

ترجمہ ۔ ”کبریائی میری چادر ہے جو مجھ سے جھگڑے گا میں اس سے جھگڑوں گا“۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون ونمرود وشداد نے اس کی چادر کے بارے میں مخاصمت کی تو اس نے انہیں فنا کردیا۔ عزازیل نے تکبر کیا تو راندۂ درگاہ ہوا۔ مقتدر بنو تو سایہ دار، پھل دار درخت بنو کہ مخلوق آپ کے اقتدار سے فائدہ اٹھائے تو دعائیں دے

؎ تواضع زگردن فرازاں نکوست

گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

سربلندوں سے تواضع بھلی لگتی ہے فقیر تواضع کرے تو کیا ہوا یہ تو اس کی عادت ہے۔

*

المقدم جل جلالہٗ والموخر جل جلالہٗ

یہ دونوں اسمائے الٰہی قرآن شریف میں نہیں آئے البتہ ان کے افعال مستعمل ہوئے ہیں اخرنا بائیسویں پارے کے پہلے رکوع میں ہے **اَخَّرْتَنِیْ' اَخَّرْتَنَا' اَخَّرْتُمُوْنَا** وغیرہ بھی آئے ہیں۔

تقدیم و تاخیر اسی "المقدم والموخر" کے ہاتھوں میں ہے اس نے جسے چاہا مقدم کر دیا ہم اس کی بعض تقدیم و تاخیر کی وجوہات جانتے ہیں اکثر کی نہیں کہ اس نے فلاں چیز کو فلاں چیز پر کیوں مقدم کیا اس راز کو وہی جانتا ہے اور تقدیم و تاخیر اسی کے دست قدرت میں ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے افلاک کی موجودہ ترتیب کس لحاظ سے قائم کی ہے؟ اور آسمان دنیا کو سب سے نیچے کیوں رکھا ہے؟ نہ ہم ترتیب نجوم کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ اس نے چاند کو کرۂ ارضی سے قریب رکھا ہے کیونکہ اس کی روشنی ٹھنڈی ہے ہم اسے برداشت کرسکتے ہیں اور سورج کو اس لیے اس سے اوپر رکھا ہے کہ ہم اس کی حدت کی تاب نہیں لاسکتے دن میں ہمیں تیز اور گرم روشنی کی ضرورت ہے تاکہ ہم اچھی طرح دیکھ بھال سکیں اور ہمارے قویٰ گرم رہیں اور رات میں ہمیں ٹھنڈی روشنی درکار ہے کہ دماغ پرسکون رہے اور چراغ شب (نائیٹ لیمپ) دھیما دھیما جلتا رہے ہمارے پھلوں اور فلوں میں اس کی روشنی سے مٹھاس پیدا ہو اور ہر طرف پرسکون ماحول ہو جب ہم دن کی جلا دینے والی روشنی سے گھبرا جائیں تو رات کو ایک ٹھنڈی میٹھی روشنی سے لطف اٹھائیں جو حیوانات و نباتات پر غنودگی طاری کردے اور ساری مخلوق آرام کی نیند سو جائے پھر وہ ستارے جو دن کی روشنی میں سو گئے تھے پوری آب و تاب کے ساتھ بیدار ہوجاتے ہیں اور نیلی چادر پر موتی بکھر جاتے ہیں مخلوق کے لیے بڑا پرسکون خوشنما منظر پیدا ہوجاتا ہے اور ساری مخلوق اس

سے محظوظ ہوتی ہے کھلے آسمان کے نیچے سونے والے پودے' پھول' اور بہت سے جاندار بڑا حظ اٹھاتے ہیں اور اس سے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

اس نے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق پر مقدم کیا کہ سب ایک دوسرے کے کام آئیں اور بعض کو بعض پر فضیلت دی ایک نور کو دوسرے انوار پر مقدم رکھا کسی کو مقدم رکھا' کسی کو متوسط اور کسی کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کردیا اس کی حکمتوں کو کون جانے؟۔

اس نے ارواح میں ایک خاص ترتیب رکھی روح انسانی کو سب پر مقدم رکھا۔ روح حیوانات کو اس کے پیچھے' روح نباتات کو اس کے پیچھے اور روح جمادات کو سب سے پیچھے' پھر ان میں بھی تقدیم و تاخیر کی بعض کو قوی اور نورانی روحیں عطا کیں ' بعض کو ضعیف و تاریک۔ حیوانوں کے مدارج قائم کیے۔ نباتات و اشجار میں ترتیب قائم کی اور انسانوں کی ارواح کو ایک دوسرے پر فضیلت بخشی پھر قبائل و خاندان کے اعتبار سے کسی کو دادا بنایا' کسی کو باپ اور کسی کو بیٹا۔

تقدیم و تاخیر کا یہ چکر ساری دنیا پر حاوی ہے ہر شے میں تقدیم و تاخیر ہے وہ جس کی ۔ دت کو چاہے مقدم کردیتا ہے اور جس کی موت کو چاہے مؤخر کسی کی رسی دراز کرتا چلا جاتا ہے اور کسی کی رسّی کو کھینچ لیتا ہے۔

ممالک و اقوام میں کسی ملک و قوم کو سب پر تقدیم دے دیتا ہے اور کسی کو سب سے پیچھے پھینک دیتا ہے پھر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کردیتا ہے۔ اسی طرح ملوک و امراء و حکام و افراد میں بھی یہ زیر و بم چلتا رہتا ہے۔ کبھی مقدم سے موخر کو ایسا پڑتا ہے کہ وہ اور زیادہ مؤخر ہوتا چلا جاتا ہے اور کبھی موخر سے مقدم کو پڑا دیتا ہے۔ یہ عالم کیا ہے؟ ایک شطرنجی بساط ' جس پر کھیلنے والا نت نئی چالیں چلتا رہتا ہے اس تقدیم و تاخیر کے نتیجے میں ایسے ایسے انقلابات رونما ہوتے ہیں کہ مخلوق حیران رہ جاتی ہے کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ لوگ توجیہات کرتے ہیں مگر وہ سب طفل تسلیاں ہوتی ہیں' اصل حقیقت تو اسی کو معلوم ہوتی ہے جو بساط عالم پر شطرنجی چالیں چلاتا رہتا ہے۔قدرت کے اسرار نہاں کی کس کو خبر ہے کیا معلوم

المقسط جل جلالہ

قرآن شریف میں یہ نام نہیں آیا البتہ "مقسطین" تین جگہ آیا ہے تینوں جگہ ہے۔ **اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ** "اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" قاسطون ایک جگہ سورۃ الجن میں آیا ہے **وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ** "ہم میں سے بعض حکم ماننے والے ہیں اور بعض نافرمان ہیں" یہ بات جنات نے اپنے لوگوں کے بارے میں کہی تھی کہ ہم میں سے کچھ مسلمان ہیں اور کچھ کافر! **قسط** کا لفظ قرآن شریف میں پندرہ جگہ آیا ہے اور **قسطاس** دو جگہ **وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ** "سیدھی ترازو سے تولو"۔

وہ پروردگار عالم چونکہ خود "المقسط" ہے لہٰذا **قسط۔مقسطین** فرماتا ہے۔ **مقسط** یعنی عادل قسط کرکے ہر شخص کو اس کا **واجبی** حصہ دلا دیتا ہے اسی طرح اس "المقسط" نے ہر چیز کے حصے بخرے مقرر کردیئے ہیں۔

اس نے ہمارے مال کے حصے مقرر کردیئے ہیں کہ اولاد کا اتنا' بیوی کا اتنا اور ماں باپ وغیرہ کا اتنا۔ جبکہ ہندو مذہب میں مال موروثی کی تقسیم عدل وانصاف وقسط پر مبنی نہیں ہے۔اسلام ہر حقدار کو اس کا حق دلانا چاہتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی کو مایہ کا سانپ بنا کر بٹھا دے کیونکہ مال کو اسلام فتنہ قرار دیتا ہے پھر ہمارے مال میں اس نے فقراء ومساکین کو بھی حصہ دار بنا دیا۔ زکوٰۃ کا تعین کرکے مال کی یہ قسط غریبوں کو دلادی اور خیرات وصدقات کا حکم دے کر مزید حصہ انہیں دیا۔ عزیز واقارب' دوست' احباب اور مہمان کے حصے بتا دیئے کہ خود اکیلے ہی نہ کھاجاؤ دوسروں کو بھی شریک طعام کرو۔

اس "المقسط" کے نظام مال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے مال کو چار اقساط میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک حصہ اپنے اور گھر والوں کے

لئے ایک غریبوں، محتاجوں کے لئے، ایک دوست، احباب اور مہمانوں کے لئے اور ایک حصہ جمع کرنے کے لئے۔ فرمایا **وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ** "پوری طرح ہاتھ کو کھلا نہ چھوڑو کہ حسرت واندوہ کے شکار ہو جاؤ" نیز فرمایا "اللہ نے تمہارے لئے مال کو بقائے حیات کا ذریعہ بنایا ہے"۔

اس "المقسط" نے جس طرح ہمارے مال کے حصے بخرے مقرر کئے ہیں ہماری جان کے بھی حصص مقرر کردیے ہیں چنانچہ حضورؐ نے فرمایا۔ **ولنفسک علیک حق** "تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے"۔ لہٰذا ہم مسلمان اپنے نفس کو اس کا حق دیتے ہیں۔ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، سوتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں اور نفس کو اس کی جائز خواہشات دیتے ہیں۔

ایک دفعہ میں ہردوار گیا تو کیا دیکھتا ہوں، کسی نے ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے پاؤں سکھادیئے ہیں کسی نے ہاتھ اونچا کئے کئے ہاتھ کو سکھا دیا ہے، کسی نے آنکھیں موند کر، آنکھوں کو برباد کرلیا ہے اور کسی نے اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ کر انگلیاں وغیرہ سکھادی ہیں ہندو مذہب میں جان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ننگے مادرزاد رہنا، شادی بیاہ نہ کرنا، خاک پھانکنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟

اسلام نے اس جانی انصاف کو بڑی حد تک مدنظر رکھا ہے۔ دوسرے مذاہب میں شادی نہ کرنا عبادت ہے ہمارے مذہب میں شادی کرنا عبادت ہے۔ حتیٰ کہ بیوی کے ساتھ پیار و محبت کی باتیں کرنے کا ثواب نفل نماز کے برابر ہے۔ اولاد کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ عبادت ہے، عزیز واقارب اور دوستوں کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ پڑوسیوں سے میل ملاپ عبادت ہے حتیٰ کہ کسب حلال عبادت ہے۔ جبکہ دوسرے مذاہب میں تعطل ومعذوری عبادت ہے۔

اس طرح اگر نظام کائنات پر غور کیا جائے تو اس کا نظام عدل تمام کائنات میں جاری وساری ہے **مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ** "مجال نہیں کہ کوئی اس نظام عدل سے آگے بڑھ کر تفاوت پیدا کرسکے"۔ **فتذکروا یا اولی الالباب** "اے عقل والو یاد کرو اور نصیحت پکڑو"۔

چونکہ وہ "المقسط" ہے اور تقاضائے عدل یہ ہے کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے جیسا کہ ہر عادل کرتا ہے تو وہ "المقسط" ہمیں ہمارے جرائم پر سزا

دیتا ہے۔ کچھ جرائم ایسے ہیں جو انسان کے جسم تک ہی محدود رہتے ہیں تو ان کی جلد یا بدیر سزا مل جاتی ہے۔ بعض جرائم ایسے ہیں جو اپنی ذات کے لئے تو نہیں دوسروں کے لئے باعث اذیت ہوتے ہیں۔ ان کی سزا اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا میں مل جاتی ہے کبھی اللہ تعالیٰ ایک ظالم کو دوسرے ظالم پر مسلط کردیتے ہیں۔ اس طرح وہ نادانستہ طور پر دوسروں کا بدلہ لے لیتا ہے۔

ناجائز حاصل کیا ہوا مال چوری' آتش زنی' بیماری یا مقدمہ بازی وغیرہ میں لگ جاتا ہے۔امراض' مصائب و آلام سب ہمارے پیدا کردہ ہوتے ہیں وہ "المقسط" کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ فرماتا ہے **وَمَا ظَلَمْنَا هُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ** "ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہی اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے"۔ نیز فرمایا "ہم ایک ظالم کو دوسرے ظالم پر مسلط کردیتے ہیں"۔

جن کے ساتھ تقاضائے عدل یہاں پورا نہیں ہوا ان کے ساتھ وہاں پورا کیا جائے گا۔ **لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ** تم یقیناً" جہنم کو دیکھو گے۔ **فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ** "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا تو اسے پالے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اسے پالے گا"۔ کیا جانتا نہیں جب قبریں اکھاڑ کر نکالا جائے گا۔ اور سینوں کے دفینے واشگاف کردیئے جائیں گے۔ اللہ اس دن ان سے خوب واقف ہوگا۔

وہ "المقسط" فرماتا ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** "میں نے جن وانس کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے"۔ عبادت سے مراد نیک کام ہیں یعنی نیک کاموں کے کرنے کے لئے پیدا کیا ہے تو دن اس نے کام کے لئے بنایا اور رات اپنے مزدور کے آرام کے لئے بنائی۔ رات کے وقت اپنے فوجی مقرر کردیئے کہ جو بھی نکلے اسے مارڈالو پرندوں کے لئے چمگادڑ' الو' شکرا اور باز وغیرہ پیدا کیئے۔ زمین پر چلنے والوں کے لئے بلی اور کتے وغیرہ پیدا کیئے سبحان اللہ! عدل الٰہی!

عام طور پرلوگ دو طرح کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہیں نوے فی صد لوگ اپنی قیمت بہت زیادہ ڈالتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی کہتے ہیں اتنا بڑا کہ وہ درحقیقت اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ یہ بات "حُبِّ نفس" کی وجہ سے

ہوتی ہے، ہر شخص اپنے آپ سے بے حد محبت کرتا ہے اور محبت اندھی ہوتی ہے۔ دیکھو انسان اپنی ناک، تھوک اور غلاظت سے اس قدر نفرت نہیں کرتا جتنا کہ دوسرے شخص کی گندگی سے۔ ایسا "حُبِّ ذات" کی وجہ سے ہوتا ہے تو ہر ایک اپنے آپ کو ان نعمتوں کا حق دار سمجھتا ہے جنکا وہ کسی طرح بھی مستحق نہیں ہوتا للذا زمانے اور تقدیر کو کوستا ہے ان کے برخلاف دس فی صد لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو اتنا بے وقعت سمجھتے ہیں جتنے کہ بے وقعت وہ درحقیقت نہیں ہوتے۔ وہ اپنے آپ کو حقیر اور چھوٹا سمجھتے ہیں یہ بھی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں للذا ترقی نہیں کرسکتے۔

عموماً" لوگ اپنے آپ کو ایسی نعمتوں کا حق دار سمجھتے ہیں وہ جن کے قابل نہیں ہوتے اس "المقسط" نے جسے جس حال میں رکھا ہے دراصل وہی اس کا مقام ہے اس نے عدل وقسط کے ساتھ ہر ایک کی قسط و حصہ ناپ تول کر مقرر کردیا ہے۔ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی۔

دنیاوی عیش و عشرت کا کوئی تعلق ایمان یا پرہیزگاری سے نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا بے وقعت ہے تو ایسا نہیں ہے کہ جو متقی پرہیزگار ہو وہ صاحب عروج بھی ہو۔ اس نے دنیوی ترقی کے اور اسباب مقرر کئے ہیں اور اخروی ترقی کے لئے اور جو ایک دوسرے کے برخلاف ہیں تو دنیا۔ دنیوی اسباب سے ملتی ہے اور آخرت اخروی اسباب سے۔ اسی لئے کافر و بے ایمان، حرام خور، رشوت خور، عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور رزق حلال کے متلاشی بھوکے رہتے ہیں۔ ان کا عیش و عشرت اور ان کی تنگ دستی عین قسط وعدل ہے۔ پرہیزگاری کا معاوضہ یہاں نہیں ملے گا اس نے ایک اصول مقرر کردیا ہے دنیوی اسباب کا ارتکاب جو بھی کرے گا۔ ترقی کرے گا اور جو انہیں ٹھکرائے گا ترقی نہیں کرسکتا البتہ اس کے لئے اخروی ترقی ہے اگر نیک لوگ مبتلائے مصائب و آلام رہتے ہیں وہ جاہ ومنزلت سے محروم رہتے ہیں تو ہم اسے ان کی کوتاہی سے تعبیر کرسکتے ہیں اس "المقسط" کے عدل کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں کرسکتے نہ ہمیں یہ حق پہنچتا ہے یا دنیا لے لو یا دین۔ دونوں تو گاہے گاہے ہی جمع ہوتے ہیں۔

اَلْمُقِيْتُ جل جلالہٗ

جس طرح مخلوق انواع واقسام کی ہے اسی طرح "قوت" یعنی روزی کی بھی بے شمار قسمیں ہیں سطح زمین ایک وسیع دسترخوان ہے جہاں صلائے عام ہے "بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست" کافر و مومن ' فاسق وفاجر اور زاہد و متقی کا کوئی امتیاز نہیں ' اسے مانتا ہو یا نہ مانتا ہو ' اس کی حمد و ثنا کرتا ہو یا گستاخ بارگاہ ہو سب برابر ہیں۔ وہ "المقیت" سب کو اس کے مناسب حال روزی پہنچاتا رہتا ہے گوشت خور کو گوشت سبزی خور کو سبزی پھل اور میوے کھانے والوں کو پھل اور میوے ' پھول کھانے والے کو پھول حتیٰ کہ شراب نوش کو شراب سگریٹ کش کو سگریٹ پان خور کو پان چائے پینے والے کو چائے اور لسی شربت والے کو لسی شربت الغرض اس نعمت کدہ کا عجیب وغریب اور بڑا ہی وسیع نظام ہے۔ **وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا** "ہر جانور کا رزق اللہ کے ذمہ ہے"۔

بے شمار انواع واقسام کے روزینے ہیں گوشت ' سبزی ' پھل ' پھول ' شہد ' لکڑی ' آگ ' مٹی ' دھواں ' ہوا ' پانی ' ریت ' نمی ' کیچڑ ' کیڑے ' مکوڑے ' خون ' پیپ ' بلغم گندگی ' کوڑا کرکٹ ' میل ' کانٹے ' گھاس ' پھونس ' ہڈی ' کوئلہ ' کائی بیج ' نمک مختلف قسم کے جواہرات اور پتھر ' طرح طرح کی رطوبتیں ' درختوں کی جڑیں ' تنے ' پتے ' چھلکے اپنے ہی جسم کے بعض اجزاء اور رطوبتیں ' اپنے ہی ماں باپ کا جسم ' گوبر ' لید مینگنیاں ' پیشاب ' پاخانہ ' اگال ' رال ' منہ کی جھاگ ' گوند ' گٹھلیاں ' روئی ' درختوں کی چھال اور پوست ' برادہ ' آٹا ' دودھ ' انڈے الغرض طرح طرح کے برے بھلے رزق ہیں کہ جن کی غذا ہیں ان کے لئے بہرحال بھلے ہی بھلے ہیں جن سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اگرچہ وہ دوسروں کے لئے قابل نفرت ہیں۔

اس "المقیت" نے ہر ایک کی غذا کے لئے اس کے مناسب حال دانت زبان ، تالو، معدے اور آنتیں بنائی ہیں تاکہ وہ اس کی دی ہوئی غذا سے خوب لطف اندوز ہوں درندوں کے دانت اور تالو ان جانوروں کے دانتوں اور تالو سے مختلف ہیں جو گوشت نہیں کھاسکتے درندے آگ جلا کر گوشت نہیں پکاسکتے مرچ مسالہ اس میں شامل نہیں کرسکتے تو ان کے لئے گرم گرم نمکین چٹ پٹا گوشت جانوروں کے جسموں میں پیدا کردیا کہ تازہ بتازہ پکی پکائی غذا انہیں میسر آجائے پھر یہ گوشت بھی مختلف مزوں کے بنائے ہیں کہ وہ ایک جیسا گوشت کھا کھا کر اکتا نہ جائیں۔ ہرن کے گوشت کا اور مزہ ہے۔ نیل گائے کے گوشت کا اور ذائقہ ہے۔ پہاڑی بکرے کے گوشت کا اور ہی لطف ہے اور جنگلی بھینسوں کے گوشت کا ذائقہ جدا گانہ ہے۔ پھر ان کے معدے اور آنتیں ایسی بنائی ہیں کہ بخوبی ہضم کرلیتی ہیں شکار کرنے کے لئے ایسی پتلیاں بنائی ہیں کہ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور پنجے ایسے کہ چھری کانٹے کا کام دیتے ہیں۔ جو جانور جڑی بوٹیاں اور گھاس کھاتے ہیں ان کے دانت اور جبڑے ایسے مناسب بنائے ہیں کہ انہیں گھاس پھونس کے نگلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور اگر بھاگ دوڑ میں کھانا پڑجائے تو وہ فرصت کے وقت مزے لے لے کر جگالی کرسکتے ہیں اور اس طرح اپنی غذا کو قابل ہضم بناسکتے ہیں پھر ہر گھاس کا مختلف مزا رکھا ہے کوئی میٹھی ہے تو کوئی ترش کہ میٹھے سے جی بھر جائے تو ترش سے مونہہ سلونا کرلیں کوئی گھاس میٹھی ہے تو کوئی چرپری جیسے ہم اپنے دسترخوان پر چٹنیاں ، اچار اور مربے مہمانوں کے لئے سجاتے ہیں اسی طرح سے اس نے اپنے دسترخوان نعمت پر اپنے مہمانوں کے لئے طرح طرح کی جڑی بوٹیاں پیدا کردی ہیں اس "المقیت" کی قدرت کا تماشا دیکھئے کہ ببول کا سخت کانٹا اونٹ کے لعاب دہن سے پانی ہوجاتا ہے بکری کے مونہہ کو بیری کے کانٹے کوئی اذیت نہیں پہنچاتے مچھلی کے کانٹے بگلے کی چونچ میں موم بن جاتے ہیں بگلے کی ہڈیوں میں اس نے کچھ ایسی طاقت رکھی ہے کہ ذرا سی ہڈی ہانڈی میں ڈال دی جائے تو گوشت گل کر رانگ ہوجاتا ہے مچھلی کانٹوں سمیت پک کر فوراً تیار ہوجاتی ہے اور خوب گھل مل جاتی ہے۔

ذرا سے لکڑی کے کیڑے کو ایسا مضبوط دانت دیا ہے کہ شب وروز کٹر کٹر کرتا رہتا ہے اور مزے لے لے کر لکڑی کھاتا رہتا ہے لکڑی کے اندر اسے ہوا پہنچتی رہتی ہے تاکہ اس کا دم نہ گھٹے پتھر کے اندر کا کیڑا پتھر چاٹتا رہتا ہے اور مگن رہتا ہے اس بند مکان میں اس کا دم نہیں گھٹتا۔ آگ کے کیڑے کو آگ نہیں جلاتی وہ کوئلہ راکھ اور انگارے کھاتا رہتا ہے۔

خون، پسینہ، پاخانہ، پیشاب، اور دنیا بھر کی گندگی کو مکھی بڑے شوق سے کھاتی ہے اور مکھی کے لئے مکڑی بڑا خوبصورت محل تیار کرتی ہے کہ وہ پھنسے تو اسے لقمہ تر بنائے قسم قسم کے کیڑے مکوڑوں کے لئے ان کا من بھاتا جگہ جگہ گندا دسترخوان بچھا ہوا ہے کہ آئیں اور مزے اڑائیں۔ جیسے بھنگ، چرس، گانجا اور مدک پینے والے ان گندگیوں سے خوش ہوتے ہیں اور حقہ سگریٹ پینے والے دھواں پی کر ہی چست وچالاک بنتے ہیں انکے پھیپھڑوں کے جراثیم کو اس طرح اللہ تعالیٰ نکوٹین اور دھواں پہنچاتا رہتا ہے تاکہ وہ بھی زندگی کا لطف اٹھائیں۔

گدھ، چیلیں، کوے، کتے، بلیاں، مکھیاں، کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ چیونٹیاں صرف رات رات بھر میں منوں گندگی چٹ کر کے اور اسے اپنا جزوبدن بنا کر میٹھی نیند سوجاتے ہیں یہ اس "المقیت" کا "عملۂ صفائی" ہے۔

چچڑی، مچھر، کھٹمل، گوتھی (سبز رنگ کا کیڑا جو گھاس میں پایا جاتا ہے) اور پسو وغیرہ کے لئے اس نے خون کو غذا ٹھہرایا تو انہیں باریک ترین **انجیکشن** کی سوئیاں عطا کیں وہ زبردست سے زبردست مخلوق کا خون پی جاتے ہیں ان کے لئے جگہ جگہ خون کی نہریں جاری ہیں اسی طرح دودھ پینے والوں کے لئے دودھ کی نہریں بہتی ہیں پانی پینے والوں کے لئے پانی کی کوئی کمی نہیں مٹی چاٹنے والوں کے لئے مٹی کی فراوانی ہے اور ہوا پہ گزارہ کرنے والوں کے لئے ہوا کی افراط ہے کہتے ہیں سانڈہ ہوا سے پیٹ بھرلیتا ہے یہی اس کی غذا ہے اور خوب عیش کرتا ہے چونکہ اسے کھانے کے لئے دانتوں کی ضرورت نہیں پڑتی لہٰذا اسے بے دانت پیدا کیا ہے یہی حال اکثر وبیشتر مچھلیوں کا ہے بس جسے جیسی غذا کی ضرورت ہے اس کے مطابق اس کے کام ودہن ہیں۔

شہد کی مکھیوں کے لئے شہد کی کوئی کمی نہیں وہ خود بھی اس سے اپنا پیٹ بھر لیتی ہیں اور اپنے بچوں کے لئے بھی افراط کے ساتھ جمع کر لیتی ہیں کیسے کیسے عمدہ عمدہ پھول ان کے لئے پیدا کئے ہیں جو کیڑے پتے چاٹتے ہیں ان کے لئے طرح طرح کے پتے پیدا کر دیئے ہیں۔

جو جانور مٹی' گچ اور ریت کھاتے یا چاٹتے ہیں ان کے لئے ان چیزوں کی کوئی کمی نہیں جیسے سانپ' کچھوا' مینڈک' مچھلیاں' جونکیں اور خراطین ریگ ماہی کے لئے ریت کی کوئی کمی نہیں بڑا سانپ چھوٹے سانپ کو اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو بڑے جراثیم چھوٹے جراثیم کو کھا جاتے ہیں سو ان کی بھی کوئی کمی نہیں ہے بیر بھوٹی اور دوسرے بہت سے کیڑے کائی کے دلدادہ ہوتے ہیں' اس "المقیت" نے ان کا من بھاتا کھاجا بے حدو بے انتہا پیدا کر دیا ہے' دیمک' کرم کتابی اور کھوئی کے جراثیم کو رزق کی کوئی کمی نہیں

۔ ریشم کے کیڑوں کو شہتوت کے پتوں کی کوئی قلت نہیں اور اونی یا ریشمی کپڑوں میں جو کیڑے لگ جاتے ہیں وہ ہمارے کپڑوں میں عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔

وہ جراثیم جو ہمیں دکھائی نہیں دیتے معلوم نہیں کیا کھا کر جیتے ہیں بہرحال پلتے' بڑھتے' زندہ رہتے اور نسل چلاتے ہیں بچھو کے بچے' بعض مکڑیوں اور جانوروں کے بچے اپنے ماں باپ کو کھا جاتے ہیں وہ اس دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو انکے لئے ایک مزیدار دستر خوان بچھا ہوتا ہے۔

بعض جانور اپنے انڈوں' بچوں اور اپنے جسم کی بعض رطوبتوں اور اجزاء کو کھا جاتے ہیں اس "المقیت" کی قدرت کا تماشا دیکھئے جب بلی بچے کو دودھ دیتی ہے تو وہ چوہے کے برابر ہوتے ہیں لہٰذا یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی بلا یا بلی انہیں کھا نہ جائے اس لئے بلی کو دو تین روز تک کچھ کھائے پیئے بغیر بنظر حفاظت بیٹھنا پڑتا ہے تو وہ بچے دیتی جاتی ہے اور وہ برقعہ یا جیل جس میں بچے کی پیکنگ ہوتی ہے کھاتی جاتی ہے اس کے خون اور رطوبت سے اور بچوں کی رطوبت سے اپنی پیاس بجھا لیتی ہے اس غذا سے بچوں کے لئے دودھ بھی خوب اترتا ہے بچوں کے

آنکھوں کے ڈھیٹ اور پیشاب یا پاخانے کی جگہ کو مزے لے لے کر خوب چاٹتی ہے پھر ہر صبح بھی ایسا ہی کرتی ہے اور اس نمکین رطوبت سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

بہت سے کیڑے ہماری غلاظتوں سے محظوظ ہوتے ہیں' مرغی اور مکھی ناک' تھوک' بلغم اور ہر گندی سے گندی چیز کو بڑے لطف سے کھاجاتی ہے۔ کتے کو جب کچھ بھی کھانے کو میسر نہیں آتا تو ہمارا پاخانہ کھا کر پیٹ بھرلیتا ہے اور خنزیر کی تو یہ مرغوب ترین غذا ہے۔

ایک دفعہ خوشاب کے ایک پہاڑ کھوڑے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میرا یہ دستور تھا کہ منہ اندھیرے رفع حاجت کے لئے جنگل چلا جاتا اور پھر نماز وغیرہ سے فارغ ہوکر دو چار میل' ٹہلنے جایا کرتا تھا۔ واپسی پر میری نظر اپنے پاخانے پر پڑگئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں جان پڑگئی ہے۔ بڑا حیران ہوا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ وہاں ایک بڑا سا کیڑا ہوتا ہے جو پاخانے کے اندر گھس کر سارے اجزائے غذائیہ کھا جاتا ہے جنہیں ہمارا معدہ' آنتیں اور جگر وگردے ہضم نہیں کرسکتے۔ غروب آفتاب سے پہلے پھر میں اسی جگہ گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صرف مٹی ہی مٹی رہ گئی ہے معلوم ہوا چاول' گیہوں' پھل' سبزی' ترکاری' گوشت' انڈے اور دودھ وغیرہ یہ سب مٹی ہی کی مختلف شکلیں ہیں جس میں اس ''المقیت'' نے ہمارے دل بہلانے کے لئے مختلف' رنگ' مزے' خوشبوئیں اور رطوبتیں پیدا کردی ہیں۔ مٹی کا کیڑا مٹی ہی کھاتا ہے۔ مٹی ہی سے پیدا ہوا' ساری عمر مٹی ہی کھائی اور مٹی ہی میں مل گیا عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

؎ ہم کہاں آتے ہیں واعظ تیرے بہکانے میں
اسی میخانے کی مٹی اسی میخانے میں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ۔ ''تمہارا رزق آسمانوں میں ہے'' ہمارا رزق تو زمین ہی میں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آسمانکی طرف اس لئے رزق کی نسبت کی ہے کہ بارش ہی سے کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ پھل پھول

پیدا ہوتے ہیں۔ چاند کی روشنی سے گندم اور پھلوں میں مٹھاس پیدا ہوتی ہے اور سورج کی دھوپ دانوں اور پھلوں کو پکا کر قابل غذا بنا دیتی ہے درختوں اور کھیتوں کو پروان چڑھاتی ہے اور ان میں طرح طرح کی دھاتوں کی آمیزش کر دیتی ہے۔ معلوم ہوا ہمارا رزق آسمان ہی سے اترتا ہے۔ اگرچہ زمین پر اترتا ہے چودھویں کے چاند سے سمندروں میں جوش پیدا ہوتا ہے' بخارات پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہ بخارات بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ اس فلسفے کو کسی شاعر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

طوفان تھا شباب کسے اپنا ہوش تھا
تھا چودھویں کا چاند سمندر کا جوش تھا

سمندروں میں طوفان نہ آئیں تو بارشیں کیسے ہوں؟ اور قلوب انسانی میں طوفان برپا نہ ہوں تو باغ باغیچے اور کھیتیاں کیسے لہلہائیں' طرح طرح کے مشروبات ' حلوے' مٹھائیاں اور ٹافیاں کیسے پیدا ہوں؟

چونکہ وہ "المقیت" ہے۔ لہٰذا اس کی اس صفت کا ظہور کامل واکمل طریق پر ہونا چاہیئے تھا سو ایسا ہی ہے۔ انسان ہو یا حیوان' جڑی بوٹیاں ہوں یا نباتات سب۔کے لئے اس نے رزق پیدا کر دیا ہے' عقل والا ہو یا بے عقل' زبان والا ہو یا بے زب چلنے پھرنے والا ہو یا ساکن وصامت اس معاملے میں سب برابر ہیں۔ کسی مذہب وملت' ملک وقوم' شرقی وغربی اور کافرومومن کا کوئی فرق نہیں۔ دعوت عام ہے اور صلائے تام ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں جس کسی نے اولیاء اللہ میں سے اس بارے میں امتیاز برتا انہیں تنبیہہ کی گئی کہ فلاں شرابی وزانی کے ساتھ تم نے کیوں کھانے کے بارے میں فرق کو ملحوظ رکھا؟ کیا وہ ہمارا بندہ نہیں ہے؟ اگر چہ گنہگار ہے۔ ہم امتیاز نہیں کرتے تو تم کیوں ایسا کرتے ہو؟ روایت ہے کہ ایک فاحشہ عورت کو صرف اس لئے بخش دیا گیا کہ اس نے پیاس سے مرتے ہوئے کتے کو اپنے موزے میں دوپٹہ باندھ کر کنویں سے پانی نکال کر پلا دیا تھا۔ بابر کو ایک ہرنی کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی وجہ سے سلطنت بخش دی گئی تھی۔ وہ کافروں کو پلاؤ زردے کھلاتا ہے اور مومنوں کو چٹنی روٹی' رزق کا

معاملہ جدوجہد پر موقوف ہے' اسلام و کفر پر نہیں ہے۔

؎ بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

؎ کم عالم عالم اعیت مذاہبہ
وجاہل جاہل تلقاہ مرزوقا

؎ ھذا الذی ترک الاوھام حائرۃ
وصیر العالم النحریر زندیقا

"کتنے ہی عالم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور کتنے ہی جاہل مزے اڑا رہے ہیں - یہ دیکھ کر عقلیں حیران ہیں اور عالم نحریر (عظیم عالم) زندیق بن جاتا ہے"۔

چونکہ رزق کا دارومدار اس نے کفروایمان یا اعمال حسنہ و سیئہ پر رکھا ہی نہیں۔ لہٰذا وہ مرنے کے بعد کبھی سوال ہی نہیں کرے گا کہ بتاؤ تم نے دنیا میں پلاؤ زردہ کھایا تھا یا چٹنی روٹی؟

اس "المقیت" نے ہر ایک کو رزق حاصل کرنے کے طریقے بھی بتادیئے ہیں۔ مناسب آلات تو دیئے ہی ہیں حیلے اور طور طریق بھی سکھادیئے ہیں' مرغی کا بچہ پیدا ہوتے ہی زمین پر ٹھونگ مارتا ہے۔ اسے کوئی مرغی یا مرغ نہیں بتاتا کہ تو ایسا کر مگر بعض نوواردوں کو ان کی مائیں اشارہ کرتی ہیں اور پھر وہ الہام خداوندی سے پستان یا تھن کو چوسنے لگتا ہے۔ جب گائے یا بھینس یا بلی یا کتیا بچہ دیتی ہے تو مادر مہربان بار بار اس کے منہ کی طرف اپنے تھن کرتی ہے۔ وہ "المقیت" کے الہام سے اسے چوسنے لگتا ہے تو شراب طہور پاتا ہے۔ پھر تو خوب چٹخارے لے لے کر پینے لگتا ہے۔ اپنا سر یا ہاتھ یا پنجے مار مار کر دودھ زیادہ سے زیادہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور نعمت خداوندی سے سیراب ہوتا ہے۔

کبھی وہ بلا کسی سبب یا وسیلے کے بھی رزق پہنچا دیتا ہے مگر ایسا بہت کم ہے۔ بہت سے اولیاء اللہ کے ساتھ ایسا ہوا ہے کہ ان کے لئے پکی پکائی روٹی اور پانی آسمان سے اترا اور پھل کھانے کو ملے۔ ہاں کبھی کبھی وہ چھپر پھاڑ کر بھی دیتا ہے اس کی قدرت رزق رسانی دیدنی ہے۔

پہنچتا ہے ہر ایک میکش کے آگے دور جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطف عام اس کا

*

اَلْمُنْتَقِمُ جل جلالہٗ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں نہیں آیا مگر ھو شدید الانتقام وہ سخت انتقام والا ہے یہ لفظ چھ بار قرآن میں آیا ہے اور **فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ**' ہم نے ان سے انتقام لیا یہ بھی دو تین بار آیا ہے لہٰذا وہ بلا شبہ "المنتقم" تو ہوا۔ **نقموا** ۔ **اومنتقمون** بھی قران میں آیا ہے۔

اس "المنتقم" نے سب سے پہلا انتقام شیطان سے لیا کہ اس نے تعمیل حکم کیوں نہیں کی آگ مظہر جلال ہے اور مٹی مظہر جمال' آگ کی خاصیت رفعت وبلندی ہے اور مٹی کی خاصیت پستی وفروتنی ہے۔

چونکہ ابلیس' اس کی صفت جلال کا مظہر اتم ہے لہٰذا وہ خاک کے پتلے کے سامنے سر نہ جھکا سکا کہ وہ پست وبارد ہے اس نے توبہ نہیں کی' نہ کرتا ہے۔ نہ کبھی کرے گا کیونکہ وہ سراپا حرارت وناریت ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھا' بہر حال اس کی مخلوق تھا اور مخلوق کو خالق کا حکم ماننا چاہیئے اس نے نہ مانا تو اللہ نے اسے انتقاما" مردود بارگاہ کردیا۔

دوسرا انتقام اس نے آدم علیہ السلام اور حوا علیھا السلام وغیرہ سے لیا کہ انہوں نے بھی نافرمانی کی لہٰذا انہیں انتقاما" جنت سے نکال دیا اور زمین پر پھینک دیا مگر آدم کے خمیر میں چونکہ عاجزی وفروتنی تھی لہٰذا انہوں نے بتقاضائے فطرت عجزوانکساری کا اظہار کیا۔ نادم ہوئے اور توبہ کی اور یہ توبہ قبول کرلی گئی۔

انتقام خداوندی سے ڈرتے رہنا چاہیئے عزت ودولت وجاہ ومرتبے پر گھمنڈ کرکے ظلم پر کمر نہیں باندھنی چاہیئے۔ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے بے بسوں کا انتقام لے لے اگر وہ تمہارے مظالم کا انتقام اس دنیا میں لے لے تو یہ بہت ہی اچھا ہے' نہ لے تو تمہارے لئے بہت ہی برا ہے۔

دنیا میں ایسے ایسے عجیب وغریب واقعات انتقام خداوندی کے ہوئے ہیں
کہ دل لرز جاتا ہے' ہلاکو خان پاگل ہوکر مرا' ہٹلر کا برا انجام ہوا ایران کے پرانے اور نئے بادشاہ کاانجام برا ہی ہوا۔ عموماً" ہر بستی ہر شہر ہر قریہ اور ہر دور میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں جو عبرت حاصل کرنے والوں کیلئے باعث عبرت ہوتے ہیں اندھے لوگ انہیں اتفاقات سمجھتے ہیں۔

مشہور مصنف مولوی محمد یحییٰ تنہا بڑے ہی متقی پرہیزگار آدمی تھے انہوں نے اور انکے دوست نے مل کر ایک کوٹھی الاٹ کرائی' وہ دوست نیچے رہا اور مولوی صاحب کو اوپر کا حصہ دے دیا کچھ دنوں کے بعد اس دوست کا انتقال ہوگیا اور اس کا ایک بیٹا جو شرابی تھا اس بات کے درپے ہوگیا کہ انہیں اوپر کے حصہ سے نکال دے لہٰذا زبردستی انکا سامان پھینک کر اوپر کے کچھ حصہ پر قابض ہوگیا مولوی صاحب نے مقدمہ دائر کردیا تو مقدمہ اور اپیل ہر جگہ سے ہار گئے کیونکہ فریق ثانی مجسٹریٹوں کو رشوت و شراب پہنچادیتا تھا پھر دو بڑے بھاری کتے اس نے ان کے زینے کے ادھر ادھر بندھوادیئے غرض بری طرح اس مرد خدا کو تنگ کیا مولوی صاحب اور ان کے بیٹے بڑے ہی شریف تھے سب کچھ جھیلتے رہے اچانک اس کا جوان بھائی اپنے ٹرک کے الٹ جانے سے دب کر مرگیا' تب مولوی صاحب کی جان چھوٹی' اس کی ماں' بہنوں اور بیوی نے کہا کہ یہ ان کا صبر ہم پر پڑا ہے کہ ہم نے انہیں رات دن طرح طرح سے ستایا اور دوست احباب کا آنا جانا تک بند کردیا۔

ایک بیوہ عورت کے بیٹے کو کسی نے قتل کردیا تو تھانیدار نے ان سے رشوت لے کر اس کی ماں پر قتل کا مقدمہ درج کر دیا کہ یہ بدچلن تھی لہٰذا اس نے بیٹے کو قتل کیا ہے' ثبوت بہم پہنچادیا ور اس بیوہ کو سزا دلادی وہ عورت اسے روزانہ خواب میں نظر آتی حتیٰ کہ وہ پاگل ہوگیا اور سڑکوں پر یہی کہتا پھرا کرتا تھا۔ عائشہ مجھے معاف کردے۔

ایک پٹھان کے گھر بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا کسی فقیر نے اس سے کہا کہ کسی نوجوان لڑکے کا خون پی تو لڑکا ہوگا اس نے ایسا ہی کیا وہ لڑکا برابر اسے خواب میں

نظر آتا رہا حتیٰ کہ اس نے خود تھانے جاکر اقرار جرم کیا اور اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

میرے دو عزیز تھانیداری سے ریٹائرڈ ہو کر وطن آئے' کیا بیان کروں' ان کے کیسے نوابانہ ٹھاٹ تھے مگر ان کی زندگی ہی میں انکے بیٹوں نے ساری دولت شراب و کباب اور رنڈی بازی میں اڑادی تھی وہ معذور و مجبور ہو گئے تھے۔ ایک بیٹی بھی معذور ہوگئی تھی لڑکے ان کی بیوی کو مار پیٹ کر زیورات لے جاتے کبھی ایک آتا اور کبھی دوسرا۔ ان کے محل نما مکان بھی ویران پڑے ہیں۔

سیالکوٹ کے ایک مالی کا بیٹا بڑھتے بڑھتے آگرہ کالج کا پرنسپل ہوگیا میٹرک وغیرہ پاس کرنے کے بعد' ماں باپ کو پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔ باتنی میں لندن سے پی ایچ ڈی کرکے آیا اور بڑی جگہ شادی کی ماں باپ تو ٹوہ میں رہتے ہی تھے پتہ چلاکہ وہ بہت بڑا آدمی ہوگیا ہے اور آگرہ میں پرنسپل ہے وہ بصد اشتیاق اس کی کوٹھی پر پہنچ گئے تو اس نے انہیں اپنے چپراسی کی کوٹھڑی میں ٹھہرایا اور پھر نکال دیا آگرہ کے ایک بڑے مال دار گھرانے کے لیکچرر سے ناچاقی ہوگئی تو اس نے آگرے کے قصابوں سے اس کے ہاتھ پاؤں تڑوا دیئے گورنمنٹ نے بڑے علاج معالجے کرائے آرام نہ ہوا انڈیا کا یہ مشہور ماہر نباتات آگرہ کی سڑکوں پر بھیک مانگتا پھرا کرتا تھا شاید مہتہ اس کا نام تھا۔

یہ واقعہ ابھی چند سال ہوئے کراچی میں ہوا تھا کہ کراچی کا ایک مشہور ماہر دماغ سرجن کا بیٹا اس سے ملنے ہسپتال آرہا تھا ایکسیڈنٹ ہوا اور سر پھٹ گیا۔ لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔

ہسپتال کے عملے نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب دماغی آپریشن کا کیس آیا ہے چل کر آپریشن کردیجئے کہنے لگا فیس کون دے گا؟ عملے نے کہا یہ تو ایک حادثہ کا شکار ہے لوگ پہنچا گئے ہیں وارث معلوم نہیں کون ہیں؟ اس نے انکار کردیا۔ اور مزے سے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا جب وہ مرگیا توپتہ چلا کہ اس کا اپنا ہی بیٹا ہے خدا نے اس سے انتقام لے لیا کہ فیس کو اہمیت دی انسانی جان کو نہیں دولت اس کی دیوی تھی۔ خدمت نہیں۔

میرا ایک عزیز سول سرجن تھا بغیر رشوت لئے کسی سے بات نہیں کرتا تھا بڑی دولت جمع کی کینسر ہوا لندن میں چھ سات بار اپریشن کیا گیا اور چھ سات لاکھ ضائع کر کے گھر آکر مر گیا۔

یہ جو آثار قدیمہ والے مختلف ممالک میں ہزاروں سال پہلے کے بڑے بڑے شہر کھود کر نکالتے ہیں یہ عبرت گاہیں انتقام الٰہی کے نمونے ہیں قرآن شریف میں ہے ہم نے ظالموں کی بستیوں کو الٹ دیا جیسے وہ کل تک یہاں تھے ہی نہیں عاد و ثمود کو برباد کیا جنہوں نے پہاڑوں کو کھود کر محلات بنائے تھے اللہ نے ان کی بستیوں کو زمین میں دھنسا کر زمین برابر کردی ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کردیا کیا تم نے نہیں دیکھا اللہ نے عاد کے ساتھ کیسا کیا۔ ارم کے ساتھ کیا کیا جنہوں نے بڑے بڑے ستونوں والے محلات اور باغات بنائے تھے کہ ان جیسی عمارتیں کہیں بھی نہ تھیں اور ثمود کو جنہوں نے وادی میں پہاڑوں کی چٹانیں کھود کر محلات بنائے تھے اور فرعون کو جو بڑے بڑے ستونوں والا تھا جنہوں نے بڑی سرکشی کی تھی اور فساد برپا کیا تو اللہ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔

اگر وہ "المنعم"، "المنتقم" نہ ہوتا تو دنیا بالکل بے سری ہوجاتی انتقام میں بھی اس کی حکمت ہے۔

ہم نے دیکھے ہیں زمانے میں بہت سے انقلاب
اہل دولت سے کہو اتنا نہ اترایا کریں

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

*

اَلْمُنْعِمُ جل جلالہٗ

یہ اسم پاک قرآن شریف میں نہیں آیا مگر **انعمنا علیھم** آیا ہے کہ "ہم نے ان پر نعمت نازل کی تو وہ "**المنعم**" ہے"۔ پھر بہت سی جگہ اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اس لئے اس کے "**المنعم**" ہونے میں کیا شک کیا جاسکتا ہے۔

اس کے افعال و متعلقات بکثرت قرآن میں آتے ہیں **نَعَمَ نَعِمَ نَعْمَاءُ نِعْمَتً نَعَّمَ اَنْعَمَ اَنْعَمْتَ اَنْعَمْتُ اَنْعُمِ اَنْعَمَھَا** وغیرہ۔

اس "**المنعم**" کی نعمتوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا سب سے بڑا انعام ہمارے اوپر یہ ہے کہ اس نے ہمارے باپ آدمؑ کو پیدا کیا اس کے بعد اس نے اپنی روح پھونکی پھر اسے پیار و محبت سے لکھایا پڑھایا۔ پھر اپنے اس شاگرد کو اپنا خلیفہ بنایا اور ہمیں اس کی پشت سے پیدا کیا پھر اسنے ہماری تعلیم و تہذیب کے لئے مقدس کتابیں جیسے تورات' انجیل' زبور اور قرآن نازل کیں۔ اس طرح وہ ہمارے باپ کا بلا واسطہ استاد ہے اور ہمارا بالواسطہ۔ اس نے ہمارے باپ کو مسجود ملائک ٹھہرایا اور ہمیں مسجود خلائق!

اس نے ہماری تہذیب و تعلیم کے لئے کتابیں نازل فرمائیں اور ہر ایک کو عقل سے نوازا جو اس کے ایک رسولؐ کی طرح ہر وقت ہمارے ساتھ ہے اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہے کہ اس تک کسی پیغمبر کی تبلیغ نہیں پہنچ سکی تب بھی اس سے معرفتِ الٰہی کے بارے میں سوال ہوگا۔ کیونکہ عقل رسول کی مانند ہے اسے اپنی عقل سے ہدایت طلب کرنی چاہیئے تھی۔ عقل سلیم ہدایت کے لئے کافی ووافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مرد وزن بغیر کسی کی تبلیغ کے راہ ہدایت پاجاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی عقل سلیم سے ہدایت طلب کرتے ہیں تو وہ انہیں سیدھی راہ دکھا دیتی ہے۔

اس کی نعمتیں اس قدر بے شمار ہیں کہ انہیں گنا نہیں جاسکتا کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ بھی قسم قسم کی نعمتیں ہر وقت دست یاب ہیں۔ حرام خوروں کے لئے حرام کی کمی نہیں۔ حلال خوروں کے لئے حلال کی کمی نہیں۔

حلال خور پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہندوستان میں اچھے پڑھے لکھے لوگ چوڑھے بھنگی کو حلال خور کہتے ہیں اس لئے کہ اس کی کمائی بلا شبہ حلال کی ہے۔ بے چارہ گندگی اٹھاتا ہے۔ گرمی سردی بارش میں گھر گھر پھرتا ہے۔ اور اسے ملتا کیا ہے؟ چند پیسے۔ ایک دفعہ میں ایم اے عربی کلاس کے طالب علموں کو ایک نکتہ بتانے لگا کہ عربی میں کسی کو اسکی ضد سے تعبیر کردیتے ہیں جیسے کوئی بزدل ہوتو اسے بہادر کہہ دیتے ہیں یا کوئی بخیل ہوتو اسے کہتے ہیں وہ بڑا سخی ہے قرآن شریف میں بھی ایسا آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ** "ارے دوزخی! میرا عذاب چکھ تو بڑا ہی عزت والا شریف ہے" آپ نے سنا ہوگا۔ ع۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

ایک طالب علم یہ سن کر بولا سر جیسے بھنگی کو حلال خور کہہ دیتے ہیں میں نے کہا ایسا نہیں ہے وہ تو سراپا حلال خور ہے اس لئے اسے حلال خور کہتے ہیں کہنے لگا نہیں گندگی اٹھانے کی وجہ سے بجائے حرام خور کے اسے حلال خور کہنے لگے۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہے وہ کوئی گندگی کھاتا تو نہیں لے جاتا ہے اور اس محنت کے اسے صرف چند ٹکے ملتے ہیں تو اس کی کمائی بلا شبہ حلال کی ہے۔

کبوتر بازوں کے لئے بے شمار کبوتر ہیں۔ پتنگ بازوں کیلئے بے شمار پتنگ ہیں۔ تیتر' بٹیر والوں کے لئے تیتر اور چوپاؤں سے محبت کرنے والوں کے لئے گائے بیل بھینس بکری کتے اور نہ جانے کیا کیا۔

الغرض جو شخص بھی جس بازی سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا غم غلط کرنے کیلئے اس کا من بھاتا سامان موجود ہے جسے گانے سے دلچسپی ہے۔ وہ ساری عمر گانے میں گزار دے مگر موسیقی کا احاطہ نہ کرسکے۔ جسے ناچنے سے لگاؤ ہے وہ ساری عمر رقص میں لگا رہے اور رقص کے فن کا احاطہ نہ کرسکے۔ یہی حال ساز والوں کا ہے۔ جسے مصوری سے دل چسپی ہے وہ ساری عمر مصوری سے دل لگا

سکتا ہے اکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسے تجارت سے شغف ہے اس کے لئے نعمت بے بہا ہے بیچتا اور خریدتا ہے حتیٰ کہ مرجائے اور تجارت ختم نہ ہو۔ جسے سیاست کا شوق ہو تو بڑا میدان اس کے سامنے ہے رات دن جوڑ توڑ کرتا رہے اور مزے لیتا رہے۔ جسے سیاحت کا شوق ہو تو ساری دنیا پڑی ہے گھومتا پھرے اور طرح طرح کے نظارے دیکھے۔ جسے علم سے دلچسپی ہو اس کے لئے علم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

راحت و آلام کی لذت' نیند کی نعمت' بیوی' بچوں اور دوستوں کے ساتھ باتیں کرنے کے مزے' ہنسی مذاق اور مضحکہ خیز چیزیں' دنیا کی گہما گہمی' جدوجہد کا لطف کامیابی و کامرانی کی سرفرازی' کھیل تماشے' نظارے' دعوت چشم وگوش' موسموں کی خوشگواری' گرمی' سردی اور برسات کا لطف' اس طرح کی بے شمار نعمتیں ہیں کہاں تک گناؤں جو بالکل مفت اور بے محنت مل جاتی ہیں اور امیر وغریب کس وناکس سب کو میسر آجاتی ہیں۔ اس کی نعمتوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ حیوان وانسان سب پر اس کی نعمتیں عام ہیں۔ ع۔ برین خوان یغما چہ دشمن چہ دوست!

ایک دفعہ میں گنگا کنارے گیا' کیا دیکھتا ہوں کہ حد نظر تک مرغابیاں ہی مرغابیاں ہیں گنگا حد نظر تک جاری تھی اور مخلوق خدا اس سے سیراب ہو رہی تھی۔ کوئی پانی پی رہی تھی کوئی پانی میں نہارہی تھی تو کوئی پانی پر تیر کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں نے کہا واہ میرے پروردگار کیسا خوان یغما(عام لنگر) بچھا رکھا ہے کہ ہزاروں مزے لوٹ رہے ہیں اور تیرا دسترخوان اسی طرح آراستہ پیراستہ ہے کہ ذرہ برابر کمی نہیں ہوتی۔ سب سیر ہو رہے ہیں اور یہ جوں کا توں باقی ہے۔

پھر آگے جنگل کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ ان گنت تتلیاں' شہد کی مکھیاں' بھونرے اور کیڑے مکوڑے پھولوں سے رس چوس رہے ہیں اور میٹھے شہد کے مزے لے رہے ہیں مفت کی نعمتیں لوٹنے میں مصروف ہیں۔

پھر آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں طوطے اور چڑیاں طرح طرح کے میوے کھا کھا کر خوشی سے چہچہا رہے ہیں۔ انواع و اقسام کے پھول پھل اور قسم قسم کی

نباتات پھیلی پڑی ہیں۔ سب کھانے اور گن گنانے میں مصروف ہیں۔ خوش خوش اس درخت سے اس درخت پر اڑتے اور پھدکتے پھر رہے ہیں اور اسکی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

زمین پر نظر ڈالی تو قسم قسم کے کیڑے مکوڑے کھانے اور غذائیں لانے لے جانے میں مصروف ہیں خوان یغما بچھا ہوا ہے مخلوق کھا رہی ہے اور کوئی کمی نہیں۔

درختوں اور جڑی بوٹیوں کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں سب نعمتیں کھا کھا کر خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ دھرتی ماتا سب کو اپنے سینے سے دودھ پلا رہی ہے اور سب خوب خوب پروان چڑھ رہے ہیں۔

اے پروردگار! ہمیں دکھا ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام واکرام کیا۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ

اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے

اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا ناانصاف اور بڑا ہی ناسپاس ہے۔

*

المومن جلّ جلالہٗ

عالم کون وفساد میں امن وامان کا قیام اسی "المومن" کی ذات سے قائم ہے ورنہ لمحہ بھر کے لیے بھی امن وسلامتی اس عالم کون وفساد میں محال ہے وہ جہاں چاہتا ہے اور جب تک چاہتا ہے امن وامان قائم رکھتا ہے۔ اور جب اور جہاں چاہتا ہے اپنے عطا کردہ امن وامان کو اٹھالیتا ہے اور کسی مصلحت یا انتقام وغیرہ کی وجہ سے وہاں صفت جبروقہر کا ظہور کردیتا ہے تو اس خطے کا امن برباد ہوجاتا ہے۔

ہمارے جسم میں بھی امن وامان کا قیام اسی "المومن" سے ہے ورنہ ایک پل کے لیے بھی ہمارے بدن میں امن وامان قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ وہ ایسے متضاد عناصر سے بنا ہے جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ایک ہی آشیانے میں بسر نہیں کرسکتے مگر اس "المومن" نے انہیں ایسی خوبی سے ترتیب دیا ہے کہ وہ جب تک چاہتا ہے سب کے سب سر جوڑ کر کام کیے جاتے ہیں ورنہ منتشر ہوجاتے ہیں۔

؎ زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہور ترتیب!
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشان ہونا!

مٹی پستی کو پسند کرتی ہے اور آگ بلندی کو' ہوا آزاد رہنا چاہتی ہے اور پانی بہنا چاہتا ہے مٹی سراپا خنکی ہے اور آگ سراپا حرارت' پانی مرطوب ہے اور ہوا رطوبت کو اڑادینے والی سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں مگر ہمارے کالبد میں آرام سے رہتے ہیں۔ نہ صرف آرام سے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔

بالکل ہمارے جسم کی طرح یہ عالم صغیر ہے کہ متضاد عناصر سے بنا ہے اور سب مل جل کر کام کررہے ہیں۔ زمین کے اندر ایسے ایسے جلا دینے والے مادے بھرے

پڑے ہیں جو پلک جھپکتے اسے تہس نہس کردیں اس کے جگر کو پھاڑ دیں اور اس کے ٹکڑے اڑا دیں کہ بڑے بڑے پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑتے نظر آئیں ہوا چاہے تو سارے عالم کو اڑا کر لے جائے اور پانی چاہے تو سب کو غرق کردے۔ سانپ بچھو اور حشرات الارض نکل پڑیں تو ساری مخلوق کو فنا کردیں درندے، اور وحشی جانور تباہی مچادیں بارشیں اور آسمانی بجلیاں خرابی پھیلادیں ان سارے اسباب فساد کے ہوتے ہوئے بھی عالم کون وفساد مامون و محفوظ ہے تو صرف اسی ''المومن'' کی صفت امان سے محفوظ ہے ان دیکھی بلائیں' وبائیں' بیماریوں اور جراثیم سے یہ دنیا بھری پڑی ہے پھر بھی مخلوق محفوظ ہے یہ مکھیاں اور مچھر ہی ہماری ہلاکت کے لیے کافی ہیں مگر وہ ''المومن'' انہیں روکے رکھتا ہے اور جس حد تک ان سے کام لینا چاہتا ہے لے لیتا ہے' جس گندے خطے کو چاہتا ہے اس سے اپنی امان کو اٹھالیتا ہے تو وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں۔

اس عالم کون وفساد میں سب سے بڑے مفسد تو خود یہ حضرت انسان ہی ہیں۔ دنیا چوروں ' ڈاکوؤں' ظالموں رشوت خوروں ' لڑنے والوں ' شریروں' فتنہ پردازوں اور قاتلوں سے بھری پڑی ہے پھر بھی مخلوق خدا میٹھی نیند سوتی ہے کیونکہ اس ''المومن'' نے ان کو لگام دے رکھی ہے اگر وہ انہیں قابو میں نہ رکھتا تو ایک کو ایک کھا جاتا علاوہ ازیں ہمارا اخلاق وکردار ہی امن وامان کی بربادی کیلئے کافی تھا مگر بقول علامہ اقبالؒ

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

بس وہ بندہ نوازی فرماتے رہتے ہیں تو امن وامان قائم رہتاہے ورنہ اپنے کارن تو ایسے نہ تھے کہ دم بھر بھی کوئی سانس لے سکتا۔ انسانوں میں ایسے بے شمار درندے ہیں جو وحشی درندوں سے کہیں زیادہ خون پی جانے والے ہیں ہر محلے' ہر بستی اور ہر شہر میں یہ درندے ہمارے آپ کے پاس آتے جاتے ہیں مگر اس ''المومن'' کی امان کی وجہ سے من مانی نہیں کرپاتے۔ خود ہمارے اندر ایسے کردار موجود ہیں جو ہماری اپنی ذات کو بھسم کردیں مگر قربان جائیے اس ''المومن'' کے وہ

ہمیں بدامنی سے بچاتا رہتا ہے۔

عقلائے دہر کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا آیا انسان امن پسند ہے یا جنگ پسند؟ بعض نے لکھا کہ امن پسند ہے۔ بعض نے لکھا کہ جنگ پسند ہے یہ سوال اور اس کا جواب لام بندی سے متعلق تھا سو آپ جس زاویۂ نظر کو پسند کریں آپ کو اختیار ہے مگر میں تو یہی کہوں گا کہ عالم میں امن و امان امن پسندی کی وجہ سے نہیں ہے یہ شرارت کا پتلا کب نچلا بیٹھنا چاہتا ہے یہ تو مجبوراً" امن پسند ہے خوف نے اسے دبا رکھا ہے رسم و رواج' برادری کی شرم' مذہب و وطن کا پاس لالچ اور کچھ اس طرح کی چیزیں اسے دبائے رہتی ہیں جنہیں اس "المومن" نے اس کا ہاتھ روکنے کے لیے اس کے دل و دماغ میں پیدا کر دیا ہے۔ میری مراد یہاں امن سے وہ نہیں ہے جو جنگ کا مقابل ہے بلکہ عام امن مراد ہے نظم کا برقرار رہنا اور سکون و آشتی کا ہونا خدا کی قسم اگر رزق انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتا تو یہ لوگوں کو بھوکوں مار دیتے' کسی شاعر نے اسی نظریہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

ے یہ کہہ کر مرگئی بلبل قفس میں　　　کوئی بندہ نہ ہو بندے کے بس میں

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ امن عالم' توپ' بندوق اور جدید ترین حربی آلات کی وجہ سے ہے؟ اور اسلحہ کی دوڑ جنگ کو روکے ہوئے ہے؟ ایسا نہیں ہے یہ تو ایک دوسرے کا خوف ہاتھا پائی سے روکے ہوئے ہے جسے اللہ نے ظالموں کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے لالچ اور تجارت و منفعت روکے ہوئے ہے جنہیں اللہ نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کی ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں بنا دیا ہے پھر جب وہ ظالموں کو سزا دینا چاہے گا تو ان رکاوٹوں کو اٹھا دیگا اور جنگ کا بازار گرم ہو جائے گا۔

کبھی اپنے اوپر غور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں نے جو یہ امن و امان کے ستر سال گزار دیئے کیا ماں باپ کی امان کے زیر سایہ؟ یا اپنے علم و فہم و کردار کی وجہ سے؟ یا مال و جاہ کے طفیل؟ یا عزیز و اقارب اور دوست احباب کی وجہ سے؟ تو مجھے ہر سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے عرصہ دراز کسی "المومن" ہی نے مجھے اپنے حفظ و امان میں رکھا ہے اپنے جسم پر غور

کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ یہ تن وتوش ہرگز باعث امن نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں طرح طرح کی غلاظتیں اور جراثیم کے انبار لگے ہوئے ہیں ایسی ایسی غلاظتیں کہ اگر ذرا رک جائیں تو اپنا کام تمام ہوجائے میرے پھیپھڑوں اور آنتوں وغیرہ میں مہلک جراثیم نے اپنے گھر، سڑکیں اور گزرگاہیں تعمیر کررکھی ہیں اور بارہا میں نے مسموم غذائیں مشروبات اور دوائیں کھائی اور پی ہیں۔

اپنے اخلاق وکردار پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس بد اطواری کے ساتھ دنیا نے مجھے کیسے برداشت کیا۔ بارہا میں نے نقص امن کے کام کیے، لوگوں کو ستایا اور مخلوق خدا کو تنگ کیا کہ میں یقیناً سزا کا مستحق تھا اور کتنی ہی دفعہ میں نے اپنے بعض دشمنوں کو قتل کرنا چاہا مگر حفظ وامان خداوندی سے وہ بھی محفوظ رہے اور میں بھی۔

بچپن سے لے کر جوانی تک میں بڑا ہی سیدھا سادہ بھولا بھالا اور بے وقوف تھا کہ میری ماں بہنیں کہا کرتی تھیں خدا ہی ہے جو اسے اپنی امان میں رکھے میری بہنیں کہتیں بھیا! ذرا ڈھور ڈنگر سے بچ کر چلا کرو ذرا بیل تانگے سے ہشیار رہا کرو۔ دیوبند سے آنا جانا ہوا کرے تو ریل میں بیٹھنے کے بعد کسی اسٹیشن پر اترا نہ کرو دہلی ، بریلی جانا ہوا کرے تو کاروں اور ٹریم سے بچ کر چلا کرو اور ہماری پھوپھو کہتیں جاؤ اللہ کی امان میں دیا اب سوچتا ہوں تو واقعی میں اللہ کی امان میں چلتا پھرتا تھا اور اب بھی تو لاہور کی سڑکوں پر ضعیف بصارت وپیری میں اس کی امان سایہ فگن ہوتی ہے ورنہ قدم قدم پر خطرات درپیش ہوتے ہیں۔

☆

*

المهیمن جل جلالہٗ

سب کا نگہبان وہی وحدہ لا شریک ہے۔ اس نے ہر چیز کی نگہبانی کا پورا پورا سامان کیا ہے۔ ہمارے جسم میں سب سے نازک عضو آنکھ ہے تو دیکھو اس کی حفاظت اس نے کس مضبوطی سے کی ہے

دل جو ہمارے جسم کا بادشاہ ہے پسلیوں کی نگہبانی میں ہے۔ یہ پسلیاں ٹیڑھی میڑھی ہیں اگر سیدھی ہوتیں تو اس قدر حفاظت نہ کرسکتیں ان کی کجی ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ بعض لوگ اپنے سینے پر سے جیپ گزاردیتے ہیں اور بعض ہتھوڑا بجواتے ہیں اور بعض بے شمار بوجھ لدوادیتے ہیں اور بعض کئی کئی آدمیوں کو نیچے اوپر کھڑا کردیتے ہیں۔

دماغ جہاں سے جسم کے سارے احکامات صادر ہوتے ہیں' اس کو ایک جھلی پھر دوسری جھلی میں محفوظ کرکے کاسئہ سر کی نگہبانی میں دے دیا جس کی ساخت کچھ ایسی بے ڈول سی ہے کہ وہ اپنے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے مغز کی خوب حفاظت کرسکتا ہے۔

اس "المھیمن" نے ہر چیز کی نگہبانی کے لیے کوئی نہ کوئی چیز پیدا کی ہے بعض کو حفاظت کے لیے ڈنک عطا کئے بعض کو کاٹنے کے لیے دانت' بعض کو پنجے' بعض کو اچھلنے کودنے کی طاقت' بعض کو دم اور چونچ' بعض کو سینگ' بعض کو قدرتی مکہ زنی' بعض کو ٹکر مارنے کی طاقت' بعض کے جسم میں ایک قسم کی بجلی اور بجلی کا سا کرنٹ پیدا کردیا ہے اور پھولوں کی نگہبانی کے لیے کانٹے پیدا کئے۔ بعض جانوروں کی حفاظت ان کی بدبو کرتی ہے۔ اور ہماری نگہبانی کے لیے عقل پیدا کی۔

موسم برسات میں جو گھروں میں چھوٹی چھوٹی مینڈکیاں پھرتی رہتی

ہیں۔میں نے ان میں سے ایک کو پکڑ لیا تو اس نے پیشاب کر دیا۔ یکایک گلگلاہٹ سے ہاتھ نے فورا اسے چھوڑ دیا۔ پھر اسی مینڈکی کو پکڑا تو پھر اس نے یہی حرکت کی۔ پھر اسی کو پکڑا تو پھر بھی ایسا ہی کیا۔ میں بے ساختہ کہہ اٹھا" **سبحان اللہ**" تو نے ہر چیز کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ سامان کیا ہے۔

ایک دفعہ ایک جنگل میں جا رہا تھا۔ ایک جھڑ بیری پر بڑے خوبصورت بیر لگے ہوئے تھے لپکا تو کانٹوں نے استقبال کیا کہ میاں ذرا دیکھ کر ہاتھ چلاؤ بقدر ضرورت چن لو ورنہ یہاں ان کے بہت سے نگہبان ہیں۔

چوہے کو رات اور دن میں یکساں دکھائی دیتا ہے لہذا وہ ہر وقت بلی سے اپنا بچاؤ کر سکتا ہے مگر چھچھوندر کو دن میں دکھائی نہیں دیتا لہذا اس کی حفاظت اس کی بدبو کرتی ہے کہ اسے کوئی جانور قبول نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ایک حوض میں بڑی خوبصورت رنگدار مچھلیاں دیکھیں جی للچایا پکڑنے کی ہزار کوشش کی مگر ایک بھی ہاتھ نہ آئی ۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے جسم کو اس قدر لیس دار بنایا ہے کہ وہ معمولی غنیم کے حملے سے بچ سکتی ہے۔ ایک قسم کی مچھلی میں بجلی کا سا کرنٹ ہوتا ہے کہ جو پکڑتا ہے کرنٹ کی ضرب سے چھوڑ دیتا ہے۔

بعض کو اس قدر ننھا جسم عطا کیا ہے کہ وہ دشمن کو دکھائی نہیں دیتے اور نہ کسی طرح اپنے حقیر ہونے کی وجہ سے قبضے میں آتے ہیں۔ بعض جانور جیسے چھپکلی اپنا رنگ تبدیل کرنے پر قادر ہوتے ہیں اور اس طرح وہ بچ نکلتے ہیں۔ گرگٹ رنگ بدلنے میں ضرب المثل ہے۔ یہ دشمن سے بچاؤ کے لئے اپنا رنگ تبدیل کر لیتا ہے۔ جس رنگ کی لکڑی یا درخت ہوتا ہے اسی کا سا رنگ اختیار کر لیتا ہے کہ دیکھنے والا دیکھ نہ سکے۔

ہرن، خرگوش اور بعض جانوروں کو اس "المھیمن" نے اتنی برق رفتاری عطا کی ہے کہ وہ دن رات درندوں کے درمیان رہتے ہیں اور جب تک وہ چاہتا ہے اس کی نگہبانی میں رہتے ہیں۔

بعض کو ایسا بدصورت اور بے مایہ بنایا ہے کہ ان کی طرف کوئی بھی آنکھ

اٹھا کر نہیں دیکھتا ان کی بے مصرفی ہی ان کی حفاظت کی ضمانت ہے۔ کسی کو اس قدر زور آور اور طاقت ور بنایا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے۔

بعض کو حفاظت کے لیے بال عطا کیے ہیں۔ ریچھ بڑے مزے سے شہد پی جاتا ہے اور مکھیاں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔

درختوں کی حفاظت ان کی جڑیں اور دور دور تک پھیل جانے والی نسیں کرتی ہیں۔ زمین کی حفاظت پہاڑ کرتے ہیں اور کواکب کی حفاظت ان کی آپس کی کشش ان کی فضا اور ان کا ماحول۔ ایک فلک کو دوسرے فلک کا ماحول راس نہیں آتا لہٰذا وہ ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوپاتے اور ان کے کواکب انہی کی نگہبانی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

یہ تو تھا حال مادی عالم کی نگہبانی کا وہ "المہیمن" روحانی طور پر بھی ہماری نگرانی کرتا ہے اس کے محافظ فرشتے مخلوق کی حفاظت کرتے ہیں۔ رات کے فرشتے اور ہیں اور دن کے اور۔ وہ اپنے نیک بندوں کی فرشتوں کے ذریعے حفاظت کرتا ہے خواہ وہ درندوں کے درمیان لق ودق صحرا میں سو رہیں۔۔ اولیاء اللہ کے تذکروں میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے ورغلایا تو انہیں حضرت یعقوبؑ نظر آئے ظاہر ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو تو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں چہ جائیکہ وہ انہیں گناہ سے بچانے آتے اور آتے بھی کیسے؟ تو وہ کون تھا دراصل وہ اللہ کا فرستادہ فرشتہ تھا جو یعقوب علیہ السلام کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ غزوہ بدر وغیرہ میں فرشتوں نے مسلمانوں کی نگہبانی کی۔ سیکڑوں صحابہؓ نے انہیں دیکھا بالخصوص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص طور پر نگہبانی کی گئی۔ غزوۂ حنین میں ایک کافر نے جو بعد میں سچا مسلمان ہوا۔ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کئی بار آپ کو شہید کرنا چاہا وہ آپ کے قریب آیا اور کئی بار حملہ کرنا چاہا مگر کچھ دیکھ کر باز رہا اور ایمان لایا۔ اس کا بیان ہے کہ میں نے آسمان سے فرشتے اترتے دیکھے جو آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔

میں کسی زمانے میں تہجد کا بڑا پابند تھا کئی بار ایسا ہوا کہ سفر کی تکان یا کسی مصروفیت یا بیماری کی وجہ سے یہ تہیہ کر کے لیٹا کہ آج نہیں اٹھوں گا تو کسی نے

میرے پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر عین اس وقت ہلادیا جس وقت کہ میں اٹھنے کا عادی تھا۔ اور بعض اوقات کسی نے ندا دی مگر اب تو اپنی یہ حال ہے کہ قوی مضمحل ہوگئے اور ذرا سی بھی تکلیف گوارہ نہیں کرتے بے چاری کتاب پر اپنا زور چلتا ہے سو اسے لئے پڑے رہتے ہیں۔

وہ "المھیمن" اپنے بندوں کی ہر طرح کی نگرانی کرتا ہے۔

(مضمون طویل ہوجائے گا کیونکہ بات لمبی ہے ایک دفعہ خواب میں **حضرت بایزید بسطامیؒ** تشریف لائے اور میرے حسب حال یہ شعر پڑھا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم ودام ما

میں اس زمانے میں کسی کتاب کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا کہ بایزید کا کوئی تصور دماغ میں ہوتا شاید کئی سال کے بعد سفینتہ الاولیاء۔ یا تذکرۃ الاولیاء پڑھ رہا تھا تو اس میں بایزید کے تذکرے میں لکھا تھا کہ وہ سالار قافلہ عشاق ہیں۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ جنید بغدادی یا کوئی اور صوفی بھی خواب میں آسکتا تھا اور بایزید کوئی اور بھی شعر پڑھ سکتے تھے۔ یہ سالارِ قافلۂ عشاق سے ایسا شعر کسی اور ہی نے سنوایا تھا۔ معلوم ہوا وہ "المھیمن" ہر طرح اپنے بندوں کی نگرانی کرتاہے۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ امیر رئیس لوگ بیٹھے تھے آپ انہیں دین کی باتیں بتارہے تھے کہ ایک نابینا صحابیؓ کچھ دریافت کرنے آنکلے تو آپ کو ناگواری ہوئی اور ان کی طرف سے پشت مبارک پھیرلی تو اس "المھیمن" کو جو ہر وقت اپنے رسولؐ کی نگرانی کرتا تھا یہ بات ناپسند ہوئی اور فوراً سورۃ عبس نازل ہوئی۔

قرآن شریف کی یہ سورت تمام سورتوں میں بالکل منفرد ہے اور مجھے بڑی اچھی اور عجیب سی لگتی ہے کیونکہ اس میں نفسیات کے بہت سے مسائل آگئے ہیں اور یہ ایک خاص فلسفۂ نفس کی متحمل ہے۔ ماہرین نفسیات کے لئے اور منکرین وحی الٰہی کے لئے اس میں بڑا عمیق مقام غوروفکر ہے۔

سورۃ عبس میں ان آیتوں کے بعد اور بھی کئی فلسفیانہ مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں الغرض وہ "المھیمن" اپنے بندوں کی ہر وقت نگہبانی کرتاہے۔

اَلنَّافِعُ جل جلالہ

یہ اسم پاک قران شریف میں نہیں آیا بلکہ یہ لفظ بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا البتہ اس کے اخوات و مشتقات وغیرہ بکثرت قرآن میں آئے ہیں اس کا مصدر نفعا بھی آیا ہے اور (**نفعت نفعتہ نفعہا ینفع۔ ینفعک۔ ینفعکم۔ منافع۔ ینفعنا ینفعکم۔ ینفعہ۔ نیفعہم۔ تنفع۔ تنفعکم۔ تنفعہم۔ تنفعہ تنفعہا**) وغیرہ آئے ہیں اس "النافع" نے ایمان وغیرہ اور دیگر بہت سی مادی اشیاء میں ہمارے لئے منافع رکھے ہیں تو وہ نافع تو یقیناً ہوا جتنے بھی اسمائے الٰہی ہیں سوائے ان کے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں وہ سب تقریبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی اسمائے مبارک ہیں وہ "النافع" سبحانہ و تعالیٰ ہمیں ایک نیکی کے بدلے میں دس اجر مرحمت فرماتا ہے کیونکہ اس کی ذات ستودہ صفات "النافع" ہے تو وہ اپنے نیک بندوں کو خوب خوب نفع پہنچاتا ہے ویسے بھی اس کی ذات حکم و احکام سے بالا تر ہے وہ جو چاہے کرے کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں۔

دراصل "النافع" اپنے بندوں کو نفع در نفع دیتا ہے سودو زیاں سے اس کی ذات اقدس بالا تر ہے اگر وہ متکبر جبار و قہار و منتقم و مصور وغیرہ ہے اور ہمیں ان باتوں سے روکتا ہے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اعتراض کریں کہ آپ خود تو تکبرو جبرو قہر کرتے ہیں اور ہمیں روکتے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں **مَنْ ذَالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا** کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تو وہ اسے دو چند سہ چند بلکہ بہت زیادہ لوٹا کر دے۔ اس قسم کی کئی آیات ہیں جن میں صراحت سے ذکر کیا ہے کہ ہمیں قرض دو تو ہم تمہیں دو چند سو چند بلکہ بہت زیادہ لوٹا کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَلَکُمْ فِیْہَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ** "تمہارے لئے اس میں منافع و

النافع جل جلالہٗ

یہ اسم پاک قران شریف میں نہیں آیا بلکہ یہ لفظ بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا البتہ اس کے اخوات و مشتقات وغیرہ بکثرت قرآن میں آئے ہیں اس کا مصدر نفعا بھی آیا ہے اور **(نفعت نفعتہ نفعہا ینفع۔ ینفعک۔ ینفعکم۔ منافع۔ ینفعنا ینفعکم۔ ینفعہ۔ نیفعہم۔ تنفع۔ تنفعکم۔ تنفعہم۔ تنفعہ تنفعہا)** وغیرہ آئے ہیں اس "النافع" نے ایمان وغیرہ اور دیگر بہت سی مادی اشیاء میں ہمارے لئے منافع رکھے ہیں تو وہ نافع تو یقیناً ہوا جتنے بھی اسمائے الٰہی ہیں سوائے ان کے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں وہ سب تقریبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی اسمائے مبارک ہیں وہ "النافع" سبحانہ و تعالیٰ ہمیں ایک نیکی کے بدلے میں دس اجر مرحمت فرماتا ہے کیونکہ اس کی ذات ستودہ صفات "النافع" ہے تو وہ اپنے نیک بندوں کو خوب خوب نفع پہنچاتا ہے ویسے بھی اس کی ذات حکم و احکام سے بالا تر ہے وہ جو چاہے کرے کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں۔

دراصل "النافع" اپنے بندوں کو نفع در نفع دیتا ہے سودو زیاں سے اس کی ذات اقدس بالا تر ہے اگر وہ متکبر جبار و قہار و منتقم و مصور وغیرہ ہے اور ہمیں ان باتوں سے روکتا ہے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اعتراض کریں کہ آپ خود تو تکبرو جبرو قہر کرتے ہیں اور ہمیں روکتے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں **مَنْ ذَالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا** کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تو وہ اسے دو چند سہ چند بلکہ بہت زیادہ لوٹا کر دے۔ اس قسم کی کئی آیات ہیں جن میں صراحت سے ذکر کیا ہے کہ ہمیں قرض دو تو ہم تمہیں دو چند سو چند بلکہ بہت زیادہ لوٹا کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَلَکُمْ فِیْہَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ** "تمہارے لئے اس میں منافع و

مشارب ہیں۔" ان منافع کا منبع و مرکز وہی "النافع" ہے۔ جس ہستی نے منافع پیدا کئے وہ یقیناً النافع ہے۔ اس "النافع" نے روئے زمین پر ہمارے لئے بے شمار منافع پیدا کئے ہیں جن کا ذکر ہم رزاق رحیم و کریم والبر وغیرہ کے تحت کر چکے ہیں تکرار سے بچنے کے لئے ہم ان کا ذکر نہیں کرتے ان اسماء کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔

اس "النافع" نے نہ صرف دنیا میں بلکہ عالم آخرت میں بھی ہمارے لئے بے شمار منافع پیدا کئے ہیں جن سے کتب احادیث و مواعظ بھری ہوئی ہیں۔ بات ہی ختم ہو گئی جب فرما دیا **وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ** "وہاں تمہارے لئے ہے جو تم چاہو گے اور جو کچھ تم طلب کرو گے۔" الغرض آسائش ہی آسائش اور منافع ہی منافع ہیں جہاں خسارے کا کوئی امکان نہیں۔

پس بچو اس یوم نفع کے خسارے سے جس دن نہ سفارش کام آئے گی نہ معاوضہ دینے سے رہائی ہو گی نہ کوئی کسی کی مدد کرے گا **لَا يَنفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَ** نہ مال فائدہ دے گا نہ بیٹے نہ فدیہ کام دے گا' نہ سونا چاندی قبول کیا جائے گا۔ نہ عزت و مرتبہ کام آئے گا۔

"آپ کہہ دیجئے کیا میں تمہیں بتا نہ دوں کہ سب سے زیادہ خسارے میں کن لوگوں کے کام ہیں؟ ان کی کوششیں حیات دینوی کے سنوارنے میں کھپ گئیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کر رہے ہیں یہ نافرمان ہیں۔ لہٰذا ان کے اعمال بے سود گئے قیامت کے دن یہ بالکل بے وزن رہیں گے ان کی سزا جہنم ہے"۔

انسان کو خدا و رسول کے اتباع میں نافع بننا چاہیئے جہاں تک ممکن ہو مخلوق کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو کہ تم بھی نافع کہلاؤ اور لوگ تمہیں مرنے کے بعد بھلائی سے یاد کریں۔

؎ آں چناں زی کہ بعد مردنِ تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

ترجمہ۔ اس طرح جیو کہ تمہارے مرے پیچھے سب روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔
دوسروں کو نفع پہنچانے سے انسان کو خود نفع پہنچتا ہے کر کے دیکھ لو آزما

کر دیکھ لو صحیح پاؤ گے

ے نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

جس طرح اس "النافع" نے تمہیں نفع پہنچایا اس طرح تم اس کی مخلوق کو نفع پہنچاؤ۔

افضل العبادتہ خدمتہ الخلق سب سے بڑی عبادت خدمت خلق ہے۔

*

النُّور جل جلالہ

یہ اسم مبارک اسمائے الٰہی و اسمائے نبوی دونوں میں سے ہے قرآن مجید کو بھی نور فرمایا ہے۔ روح کو بھی نور سے تعبیر کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیائے کرام اور مقدس کتابیں بھی نور ہیں سورج اور چاند وغیرہ بھی نور ہیں۔

یہ لفظ قرآن شریف میں تیس سے زیادہ مقامات میں آیا ہے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے نور کی اپنی طرف نسبت کی ہے اور بندوں کی طرف بھی **نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ** ان کا نور پیش پیش ہے۔

ہر چیز کا ایک مرکز ہوتا ہے ذرات چمکتے ہیں ظاہر ہے ان کا اپنا کوئی نور نہیں ہے مگر اپنے شفاف ہونے کی وجہ سے سورج کے نور سے منور ہو جاتے ہیں اسی طرح شمس و قمر و نجوم کا بھی اپنا کوئی ذاتی پیدا کردہ نور نہیں ہے یہ سارے انوار اس ''النور'' ہی کی ذات پر انوار سے ہیں۔

''النور'' اس کا اسم صفت ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب اس صفت سے متصف ہوا؟ چونکہ اس کی صفات بھی مثل اس کی ذات کے ازلی وابدی ہیں لہٰذا وہ ہمیشہ سے ''النور'' ہے اور ہمیشہ ''النور'' رہے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نور اس کا عین ذات ہے یا غیر ذات؟ یعنی ذات سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔ بعض اسلامی فرقوں نے صفات الٰہی کو عین ذات قرار دیا ہے اور بعض نے غیر ذات۔ جن لوگوں نے غیر ذات مانا ہے ان پر تعدد و شرک کا اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ کی طرح ازلی و ابدی ہوئے جن لوگوں نے عین ذات مانا ان پر بھی اعتراضات وارد کئے گئے لہٰذا ایک تیسرا فرقہ پیدا ہوا اس نے کہا نہ عین ذات ہے نہ غیر ذات یہ خیال پسند کیا گیا اور یہی تقریباً

تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے ہم اسی کو حق مانتے ہیں کہ اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** "اللہ آسمان و زمین کا نور ہے" تو اس آیت سے ثابت ہوا کہ نور عین ذات ہے کیونکہ محمول اور محمول بہ ایک ہوتے ہیں جیسے ہم کہیں زید فاضل ہے تو جو زید ہے وہ فاضل ہے اور جو فاضل ہے وہ زید ہے زید اور فاضل جداگانہ دو ہوں ایسا نہیں ہے زید قائم ہے جو زید ہے وہی قائم بھی ہے۔

جن لوگوں نے خدائے تعالیٰ کو سراپا نور مانا یہ ہر نورانی چیز کی پرستش کرنے لگے شمس و قمر و نجوم و آتش وغیرہ کی پرستش یہیں سے شروع ہوئی آتش پرست کہتے ہیں کہ ہر شئے میں اسی کا نور ہے اور آگ نور کا مظہراتم ہے لہٰذا ہم اس کی پرستش کرتے ہیں ایک اسلامی شاعر بشار بن برد کہتا ہے۔ "ترجمہ آگ روشن ہے اور مٹی تاریک ہے"

آگ جب سے ہے معبود ہے وہ کہا کرتا تھا اگر ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا تو ٹھیک ہی کیا۔ اسے زندقہ کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اللہ فرماتے ہیں ترجمہ۔ "وہ اپنی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں" مولانا ظفر علی خاںؒ نے اس کا ترجمہ شعر میں یوں کیا ہے۔

ے ۔ نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

"زمیندار" اخبار کی پیشانی پر یہ شعر لکھا رہتا تھا۔ اس آیت میں فرمایا **نوراللہ** ۔ اللہ کا نور۔ تو معلوم ہوا نور عین خدا نہیں غیر خدا ہے اس آیت سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں صفات الٰہی غیر الٰہی ہیں کیونکہ مضاف غیر مضاف الیہ ہوتا ہے اگر ہم کہیں کتاب زید تو ظاہر ہے کتاب اور چیز ہے زید اور ہے، اسی طرح قلم زید میں زید اور قلم ایک نہیں ہو سکتے جیسے زید قائم اور زید

فاضل میں ایک تھے کیونکہ کسی چیز کی اضافت کسی چیز کی طرف تب ہی کی جا سکتی ہے جبکہ وہ آپس میں غیر غیر ہوں مسلمہ اصول ہے اضافت شے الی نفسہ باطل ہے۔

اللہ بہتر جانتا ہے نور عین الٰہی ہے یا غیر الٰہی ہم تو لاعین لاغیر مانتے ہیں کہ یہی مسلک اسلم ہے جس طرح اس کی ذات عقل و فہم سے بالاتر ہے اسی طرح اس کی صفات بھی ہماری دسترس سے باہر ہیں الغرض جو کچھ بھی ہو ہم یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ وہ "نورٌ علیٰ نور" ہے تاریک نہیں ہے بس اتنا ہی ایمان کافی ہے باقی خاموشی بہتر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا نور کیسا ہے بعض صوفیہ نے لکھا ہے کہ نور الٰہی سیاہ آنکھ کی سیاہ پتلی کی مانند چمک دار ہے شاید آپ کو معلوم ہے کہ حجراسود کو یداللہ (اللہ کا ہاتھ) کہتے ہیں حجراسود کا نور سیاہ ہے چاند سے جو پتھر لائے گئے وہ بھی کالے کالے ہیں۔

کہتے ہیں جب آدم علیہ السلام جنت سے رخصت ہونے لگے تو بطور یادگار یہ پتھر ساتھ لے آئے اگر ایسا ہے تو معلوم ہوا جنت بھی پتھروں سے خالی نہیں ہے دیکھا جائے تو زیادہ تر اس نے پتھر ہی پیدا کئے ہیں سنگریزے کنکر اور پتھر وغیرہ سے یہ دنیا بھری پڑی ہے۔

اگر آج سے پچاس سال پہلے کوئی کہتا کہ چاند میں پتھر ہی پتھر ہیں تو لوگ اسے پاگل کہتے کہ اس قدر روشن ستارے میں پتھر کیسے ہو سکتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا بھی پہاڑوں اور پتھروں سے بھرا ہوا ہے سمندروں میں بھی پتھر ہی پتھر ہیں۔ شعراء کو تلامیذالرحمن کہتے ہیں شاید اسی لئے کہ ان کا بعض کلام الہامی ہوتا ہے آج سے پچاس سال پہلے ہم نے ایک غزل لکھی تھی جو اس دور میں صحیح ثابت ہوئی مکمل غزل یوں ہے

؎ مہ و انجم نہ کہو' ہے یہ چمن پتھر کا
دل بھی رکھتا ہے تو یہ چرخ کہن پتھر کا
سرخ لب پھولوں کی پتی سے سوا نازک ہیں
کیسی تشبیہ کہ ہے لعل یمن پتھر کا

خاک کے پتلوں پہ ڈھاؤ نہ ستم تم اتنا
ڈھونڈ لو مشق ستم کے لئے تن پتھر کا
سنگ طفلاں سے یہ تا زیست رہا ہے مانوس
چاہیئے کشتۂ الفت کو کفن پتھر کا
دیکھ کر خال سیاہ چوٹ مرے دل پہ لگی
کیا ترا نافہ ہے اے مشک ختن پتھر کا
سنگلاخ ایسی زمین تو نے نکالی صارم
اس سے پہلے تو نہ تھا ملک سخن پتھر کا

"نور" کا لفظ سنتے ہی دھیان سپیدی کی طرف جاتا ہے تو اس "النور" کا نور سپید ہی ہو گا یا آسمانی بجلی کی طرح سرخ ہو گا کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی تو وہ بجلی کی سی چمک اور کڑک تھی اس سے پہلے انہیں درخت کے نیچے جو نور دکھائی دیا تھا آتشیں تھا یدبیضاء کا نور مانند نور آفتاب کے سپید اور چمک دار تھا بعض نے نور الہٰی کو بے رنگ مانا ہے۔

نور ہر رنگ کا ہو سکتا ہے سیاہ و سرخ و سپید، قرمزی گلابی فیروزی اور سبز و نیلگوں وغیرہ بھی سب رنگ اللہ کے ہیں اور جگہ جگہ اس کا نور مختلف رنگوں میں بکھرا ہوا ہے چشم بینا درکار ہے ہر چیز روشن ہے۔

تمام فلاسفۂ یونان و اسلام وغیرہ کا اس پر اتفاق تھا کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں ہماری آنکھوں سے نور کی شعاعیں نکل کر اس چیز کو گھیر لیتی ہیں جسے ہم دیکھنا چاہتے ہیں یہ فلاسفۂ عالم کا ایک ہی عالمی متفقہ فیصلہ تھا ظہور اسلام سے کئی صدی بعد ابن الھیثم پیدا ہوا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ بات غلط ہے کہ ہمیں چیزیں اس لئے دکھائی دیتی ہیں کہ ہماری شعاعیں نکل کر اسے گھیر لیتی ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ہر چیز روشن ہے اور اشیا کا ہماری پتلی پر عکس پڑتا ہے تو وہ چیزیں ہمیں دکھائی دے جاتی ہیں ابن الھیثم کے اس نظریے کو بے چوں چراں سارے فلاسفہ نے تسلیم کیا اور آج تک یہی نظریہ یورپ اور باقی دنیا میں مسلم ہے اور اسی نظریہ کے تحت ایجادات کی جا رہی ہیں جیسے فوٹوگرافر کے کیمرے کے سامنے جو چیز آ جاتی

ہے منعکس ہو جاتی ہے یہی حال ہماری آنکھ کا ہے تو ابن الھیثم نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اشیاء روشن ہیں اور جو اشیاء روشن ہوتی ہیں ان کا عکس ہماری پتلی پر نمایاں ہو جاتا ہے جو اس نے کہا کہ اشیاء روشن ہیں تو سب اسی کے نور سے روشن ہیں اور سارے عالم پر اس کا نور چھایا ہوا ہے۔

پھولوں کی پتیوں پر اس کے مختلف رنگ کے انوار بکھرے ہوتے ہیں کسی ستارے کا کیسا رنگ ہے کسی کا کیسا۔ اس کا کوئی خاص رنگ نہیں سب رنگ اسی کے ہیں ہماری والدہ ماجدہ چونکہ پیروں کے خاندان سے تھیں لہٰذا تہجد کی نماز کے بعد ذکر با لجہر کیا کرتی تھیں

ے میرے مولیٰ تو ہی تو تیرا جلوہ چار سو
ے جس دم نکلے تن سے روح اس دم ہو یہ گفتگو
اللہ ہو اللہ ہو شاعر کہتا ہے

ے گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا کوہ و جبل و دشت و دریا دیکھوں
ے ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟

جنت کے کیسے کیسے انوار و تجلیات ہوں گے ان کا ذکر احادیث میں جنت کے ذکر میں بھرا پڑا ہے موتیوں کے محل، زمرد کی راہیں، لعل و جواہر کے سنگریزے، خوبصورت پرند اور حور و قصور

انوار الٰہی انواع و اقسام کے ہیں جنہیں ہم ان مادی آنکھوں سے رات دن دیکھتے ہیں کچھ ایسے انوار بھی ہیں جنہیں ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا نور نبوت پیغمبروں کے ساتھ خاص ہے، نور ولایت اولیا اللہ کے ساتھ خاص ہے نور بصیرت ہر نیک انسان کو میسر آ سکتا ہے
ڈاکٹر اقبال مرحوم فرماتے ہیں۔

ے الٰہی آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے

حدیث شریف میں آیا ہے

ترجمہ۔۔ ”مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نور الٰہی سے دیکھتا ہے“۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور زنا ان کی آنکھوں میں بھرا ہوا ہوتا ہے حضرت عثمانؓ کو کیسے پتہ چلا وہی فراست مومن ہے جسے نور بصیرت کہتے ہیں۔

*

اَلْوَاجِدُ جل جلالہٗ

قرآن شریف میں یہ لفظ نہیں آیا البتہ اس کے افعال متعدد جگہ آئے ہیں۔ چنانچہ پارہ ۹ رکوع ۳ میں ہے۔

ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو بد عہد پایا اور اکثر کو نافرمان پایا۔

ستائیسویں پارہ رکوع ایک میں ہے۔

ہم نے وہاں سوائے ایک گھر کے کوئی گھرانہ مسلمان نہ پایا۔

اِنَّا وَجَدْنٰہُ صَابِرًا"۔ "ہم نے انہیں صابر پایا۔" جس نے جو کچھ پایا وہ بہر حال "واجد" تو ہے۔ مگر عربی زبان میں "واجد غنی" کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ سب کچھ پاتا ہے مگر پانے کا مفہوم کچھ ایسا ہے کہ پہلے نہ تھا پھر پالیا یا گم شدہ چیز کو پالیا۔ سو بندے کو جو واجد کہا جاتا ہے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ مگر ذات باری تعالیٰ کو جو "واجد" کہا جاتا ہے وہ ان دونوں اعتبار سے نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے "واجد و غنی" ہے ایسا نہیں ہے کہ اس نے جو کچھ کھو دیا ہو اور پھر پالیا ہو یا وہ کسی وقت غیر "واجد" تھا پھر "واجد" بن گیا ہو۔

مندرجہ بالا آیات میں "پایا"۔ کا مفہوم کچھ ایسا ہے جیسے "دیکھا" کا مفہوم ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں "ہم نے اسے ہمیشہ بد عہد ہی دیکھا۔" "ہم نے تو اسے صابر ہی دیکھا" "ہم نے تو اسے گم کردہ راہ ہی دیکھا۔"

ہم دنیا میں آتے ہیں تو غیر "واجد" سے "واجد" بن جاتے ہیں۔ پھر زندگی بھر بعض اعتبار سے "واجد" اور بعض اعتبار سے غیر "واجد" بنتے رہتے ہیں مگر ذات باری تعالیٰ چونکہ نفع و نقصان سے بالا تر ہے لہٰذا وہ ہمیشہ "واجد" ہی رہتا ہے۔ انسان و حیوان اور اس کی دیگر مخلوقات کبھی "واجد" اور کبھی غیر "واجد" بنتی رہتی ہے۔ پھر کچھ لوگ یہاں سے کچھ لے کر جاتے ہیں اور کچھ بدنصیب خالی

ہاتھ ہی جاتے ہیں سورۃ العصر میں ہے۔

"زمانے کی قسم انسان ٹوٹے میں ہے۔ مگر وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور صبرو حق کی تلقین کی۔"

قرون اولیٰ میں جب مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے تو عموماً" یہ سورت پڑھا کرتے تھے۔ پھر یہ رواج چھوٹ گیا اور معاملہ سلام و مصافحہ تک رہ گیا۔ غور کیا جائے تو یہ سورت بڑی ہی جامع ہے اور اس میں سارا دین و مذہب سمو دیا گیا ہے۔ اسی کو اعجاز بیانی کہتے ہیں۔ چند فقروں میں سبھی کچھ آگیا ہے۔ ایمان، عمل، تبلیغ اور صبرو رضا۔ صبر میں سب کچھ آگیا صبرِ صوم، صبر جہاد، صبرِ صلوٰۃ صبرِ تکالیفِ حج، صبر مصائبِ دہر، صبرِ ایذاءِ کفار۔ اسی طرح حق کے لفظ میں سب کچھ آگیا۔ حقانیتِ توحید، حقانیتِ رسالت، حقانیت آخرت، حقانیتِ جنت و جہنم، حقانیتِ جزا و سزا، حقانیت حقوق و فرائض اور حقانیتِ حقائق وغیرہ۔ پھر تبلیغ میں ہر قسم کی تبلیغ آگئی تبلیغَ نیک و بد، تبلیغِ احکام دین اور تبلیغِ توحید و رسالت وغیرہ۔ اسی طرح خسارے میں ہر قسم کے خسارے آگئے۔ جنہیں مذہب خسارہ تصور کرتا ہے۔ اسی طرح عصر میں سارے زمانے آگئے۔ ماضی بھی، حال بھی، مستقبل بھی۔ کوئی موجودہ زندگی کے اعتبار سے خسارے میں ہے، کوئی مستقبل کے اعتبار سے کوئی دونوں میں خَسِرَ الدُّنیَا وَالاٰخِرَۃَ کسی کے تینوں زمانے تاریک ہیں۔ کسی کا صرف ایک کسی کے سارے روشن۔ اور ایسا شاذ و نادر ہی ہے۔ الغرض یہ تین فقرے اعجاز قرآنی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

دنیوی خساروں کے بارے میں میر صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے۔

"مقدر میں ہی گر سودوزیاں ہے
تو ہم نے کچھ نہ یاں کھویا نہ پایا"

الواحد جل جلالہٗ

قرآن شریف میں واحد بائیس جگہ آیا ہے اور واحداً پانچ جگہ مگر "الواحد" کہیں نہیں آیا۔

عموماً" ہر شے کا منبع و مرکز ایک ہوتا ہے ایک سے لے کر اربوں اور کھربوں تک چلے جائیں سب کے سب اعداد ایک سے نکلے ہیں اور خواہ اعداد کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں ایک پھر بھی سب میں قائم رہتا ہے۔ دو کا عدد کیا ہے۔ ایک جمع ایک۔ گیارہ میں ایک گیارہ بار ہوگیا تو وہ گیارہ بن گیا۔ اسی طرح ہزار میں ایک ہزار بار آگیا تو وہ ہزار کہلایا اور لاکھ بار آگیا تو لاکھ نام ہو گیا۔ غور سے دیکھا جائے تو سب ایک ہی ہیں اور سب میں ایک ہی ہے' اگر ایک نہ ہوتا کوئی بھی عدد معرض وجود میں نہ آتا۔ سارے اعداد ایک کا ظہور ہیں۔

پھر کوئی ایک سے قریب ہے تو کوئی دور اور بہت دور' یہی حال ساری مخلوق کا ہے کوئی "الواحد" سے قریب رہی کوئی دور اور کوئی بہت دور۔ جس قدر کثافت اور ضخامت و ظلمت بڑھتی چلی گئی دوری ہوتی چلی گئی۔

دنیا بھر کی جتنی بھی شکلیں ہیں خواہ مثلث ہو یا مربع و مخمس وغیرہ سب ایک خط مستقیم سے نکلی ہیں۔ اس خط مستقیم کو گول کر دیا تو مدور شکل بن گئی توڑ مروڑ دیا تو مثلث و مربع و مخمس وغیرہ بن گئے ہر شکل میں کسی نہ کسی حد تک خط مستقیم موجود ہے۔ یہ ان گنت شکلیں خط مستقیم کی بنائی ہوئی ہیں سب شکلیں ایک ہی کا ظہور ہیں یا ایک نقطہ سے ساری شکلیں بنی ہیں۔ نقطہ بڑھتے بڑھتے خط مستقیم بن گیا کبھی دائرہ اور کبھی کچھ اور نقطے سے جس قدر دوری ہوتی چلی گئی' شکل و صورت بدلتی چلی گئی۔

سارے حروف صرف ایک الف سے بنے ہیں خواہ وہ اٹھائیس ہوں یا

بتیس چونتیس سب کے سب الف کا ظہور ہیں۔ الف کو لٹا دیا تو با بن گئی تین نقطے لگا دیئے تو پ یا ث گول کر دیا تو نون۔ دندانے اور مرکز لگا دیئے تو کوئی اور صورت ہو گئی۔ ہے سب میں الف ہی۔

مختلف شکلوں کے راستوں سے سورج کی روشنی گزرتی ہے تو مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ گول روشندانوں سے گول' مربع سے مربع' مثلث سے مثلث' اور سوراخوں سے ان کے مطابق۔ دیکھنے والا انہیں مختلف سمجھتا ہے مگر اصل کے اعتبار سے وہی ایک روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ہم کسی روشنی کو مختلف رنگ کے آئینوں سے گزارتے ہیں تو گو اس کے رنگ بدل جاتے ہیں مگر دراصل سب کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔

سورج کی شعاعیں کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہیں؟ مگر سب شکلوں کا منبع و مرکز واحد ہے جیسے سارے رنگوں کا منبع سفید رنگ ہی ہے۔ اسی ایک سپید رنگ پر تغیر و تبدل سے مختلف رنگ پیدا ہو گئے پھر ان رنگوں کے آپس کی موافقت سے نت نئے رنگ پیدا ہو گئے۔

ایک نور سے ساری کائنات پیدا ہوئی۔ جوں جوں وہ ظلوع ہوتا گیا رنگ برنگی مخلوقات پیدا ہوتی گئیں۔ جیسے پتھر میں آگ چھپی ہوتی ہے سب میں نور سرایت کئے ہوئے ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ جیسے پتھر اور لوہے وغیرہ میں آگ تو ہے مگر بہت کم جتنی انگاروں میں ہے اتنی ان میں نہیں ہے۔

آگ کی مختلف اقسام ہیں مگر سب ایک ہی آگ سے نکلی ہیں۔ جیسے سارے افراد انسانیت ایک انسانِ کُلّی ہی کے افراد ہیں اور وہ انسانِ کُلّی ہر فرد کے اندر موجود ہے یعنی اپنے افراد کے ضمن میں پایا جاتا ہے اگرچہ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے ہی وہ "الواحد" ہر شے میں ہے۔ مگر دکھائی نہیں دیتا۔

ہوا' ایک ہی ہے مگر کہیں خوشبودار ہے۔ کہیں بدبو والی' کہیں گرم اور کہیں سرد مگر ہے وہی ایک ہوا جو بو' یا ماحول سے متاثر ہو کر ایک خاص نوعیت اختیار کر گئی۔ جیسے پانی کو مختلف برتنوں میں رکھ دیا جائے تو وہ مختلف اشکال اختیار کر لیتا ہے حالانکہ سارے پانی ایک ہی ہوتے ہیں۔ جس گلاس میں کوئی رنگ

ڈال دیا جائے تو وہ پانی رنگین ہو گیا۔ چینی ڈال دی تو میٹھا ہو گیا۔ اور اگر نمک ڈال دیا تو شور ہو گیا۔ بہر صورت پانی پانی ہی ہے۔

وہ "الواحد" ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے خواہ اپنے نور کے اعتبار سے خواہ اپنی روح کے اعتبار سے۔ ورنہ کم از کم صانع کی حیثیت سے تو ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔

ایک دفعہ اورنٹیل کالج میں روسی پروفیسروں کا ایک طائفہ آیا۔ اور امام غزالیؒ پر تحقیقی مقالہ پڑھا تو ایک طالب علم نے ان سے سوال کیا کہ آپ خدا کو کیوں نہیں مانتے؟ وہ کہنے لگے اگر خدا کے وجود کا کوئی ثبوت مل گیا تو دنیا میں سب سے پہلا ملک روس ہو گا جو اس پر ایمان لائے گا۔

عجیب بات ہے اگر خدا کوئی ایسی چیز ہوتا جو دوربینوں اور خوردبینوں یا تحلیل کیمیاوی سے معلوم ہوتا تب تو جواب صحیح ہو سکتا تھا۔ اسے تو صرف ایسی ہی باتوں سے جانا جا سکتا ہے جو اوپر لکھی گئیں۔ سائنس تو کیا وہ کسی بھی چیز کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ علاوہ ازیں ہر چیز کے جاننے اور پرکھنے کا ایک جداگانہ طریقہ ہے تو اس کے جاننے کے لئے بھی ایک خاص طریقہ ہے۔ اس سے اسے جانا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ ہم بیشتر حقائق کو دیکھ نہیں سکتے تو "حقیقتہ الحقائق" کو کیسے دیکھ سکتے ہیں؟

ہوا نظر نہیں آتی، درد نظر نہیں آتا، عقل دکھائی نہیں دیتی، مگر مانتے ہیں کہ انکا وجود ہے، اس کا پتہ آثار و قرائن سے چلتا ہے، اسی طرح آثار و قرآئن (پتہ پتہ، ذرہ ذرہ) اللہ کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ ۔۔۔ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

ہر گیاہے کہ از زمیں بروید ۔۔۔ وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید

ترجمہ: ہر گھاس جو زمین سے اگتی ہے وحدہٗ لا شریک لہٗ کہتی ہے۔

اَلْوَدُوْدُ جل جلالہٗ

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر مادر مہربان سے بھی زیادہ مہربان ہے اور مادر مہربان کی شفقت کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہیں کہ ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تو ماں بے تاب ہو گئی اگر معمولی سا بھی بخار ہوا تو وہ ساری رات جاگتی رہی اور طرح طرح کی بدگمانی سے بے چین رہی سونے کا نوالہ کھلایا تب بھی اسے حقیر ہی سمجھا اور یہی بس ہوا کہ دنیا جہاں کو اس کے پیٹ میں اتار دوں۔

سودائے عشق بری بلا ہے انسان کو بالکل اندھا کر دیتا ہے کہتے ہیں ایک نوجوان کسی عورت پر بری طرح فریفتہ ہو گیا اس ڈائن نے کہا مجھے اپنی ماں کا دل چیر کر لا دے تب میں جانوں گی کہ تو سچا عاشق ہے اس نے ایسا ہی کیا دل کو تھالی میں رکھ کر بارگاہ حسن کی طرف چلا تو ٹھوکر لگی اور گر پڑا دل میں سے آواز آئی بیٹا چوٹ تو نہیں لگ گئی۔

اس قصے سے ماں کی محبت کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے تو محبت خداوندی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس نے ہمیں دو آنکھیں دیں اور ان میں اپنا نور بھرا ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ آنکھ کچھ دیکھ سکتی خواہ کیسی ہی خوبصورت ہوتی مگر نرگس کی طرح بے نور ہی رہتی دو آنکھوں سے قاعدے کے مطابق ہر ایک چیز کی دو چیزیں نظر آتیں جبکہ بیچ میں ناک کے بانسے کا بھی ستون کھڑا ہے مگر ایسا نہیں ہے دونوں آنکھوں سے ہم ہر ایک چیز کو ایک ہی دیکھتے ہیں۔ پردہ در پردہ نور کی حفاظت کی۔ ایسے پردے کہ جو حفاظت بھی کر سکیں اور دیکھنے میں خلل بھی نہ ڈال سکیں سات پردوں میں نور کو محفوظ کر کے پتلی کو گھومنے کی طاقت عطا فرمائی کہ ہر طرف دیکھ سکیں۔ دو کان دیئے کہ دونوں رخ کی آوازیں سن سکیں۔ دو ہاتھ

عطا کئے اور ان میں اتنے سارے اعصاب و مفاصل پیدا کئے کہ ہم چیز کو آسانی سے پکڑ سکیں انگوٹھے کو انگلیوں سے جدا اور نیچے لگایا کہ پوری طرح گرفت ہو سکے اور انگلیوں کو چھوٹا بڑا بنایا کہ مضبوطی سے پکڑ سکیں اگر ساری انگلیاں برابر ہوتیں تو ہم چیزوں کی گرفت خوبی سے نہ کر سکتے اور اگر انگوٹھا اس طرح کا نہ ہوتا تو سارا ہاتھ ہی بے کار ثابت ہوتا۔ دو پاؤں دیئے کہ چل پھر سکیں اگر ایڑی نہ ہوتی تو چلنا ممکن نہ ہوتا اور اگر پنجے نہ ہوتے تو جگہ جگہ پھسل کر گرا کرتے کس قدر باریک بینی سے ہماری ہر تکلیف کا خیل رکھا ہے جو انتہائی مودت و محبت رکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔

زندگی کا دارومدار سانس پر ہے تو دو پھیپھڑے پیدا کئے تاکہ آسانی رہے۔

خون صاف ہوتا رہے اور تنفس میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو دولب دیئے الغرض ڈبل اعضاء پیدا کئے کہ ایک بیکار ہو جائے تو دوسرا کام دے سکے اس فراوانی سے اپنی مہربانیوں کی بارش کی ہے اور بے مانگے دی ہیں کہ اس کے "الودود" ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔

اس کی کس کس نعمت کا شمار کیا جائے **"وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"** سونگھنے کے لئے ناک، چکھنے کے لئے زبان، چھونے کے لئے ہاتھ، چلنے کے لئے پاؤں اور دیکھنے کے لئے آنکھیں، رزق پینے کے لئے دانت، کاٹنے کے لئے کچلیاں، نگلنے کے لئے حلق اور طرح طرح کی رطوبتیں کہ آسانی سے غذا جزو بدن ہو سکے۔

ہارون الرشیدؒ نے ایک بزرگؒ سے کہا مجھے نصیحت کیجئے خلیفہ اس وقت پانی پی رہا تھا انہوں نے کہا امیر المومنین اگر آپ کو سخت پیاس لگی ہو اور پانی کے عوض اپنی آدھی سلطنت دینی پڑے تو کیا آپ منظور کریں گے کہا ہاں فرمایا اور اگر یہ آدھا گلاس پانی آپ کے جسم سے کسی طرح خارج نہ ہو سکے مگر اس شرط پر کہ آپ اپنی آدھی سلطنت دیں تو کیا آپ منظور کریں گے کہا یقیناً فرمایا تو یہ ہے آپ کی سلطنت کی قیمت۔

جو بھی سانس اندر جاتا ہے ایک نعمت ہے اور جو بھی سانس باہر آتا ہے ایک نعمت ہے پس ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔ زندگی خود سراپا ایک نعمت اور دلیل مودت الٰہی ہے۔ ہم خود اپنے جسم میں غور کریں تو ان گنت نعمتوں اور محبتوں کا مجموعہ ہے۔

ماؤں کو اپنے بچوں کے آرام کا بہت خیال ہوتا ہے اس نے ہمارے آرام کے لئے نیند پیدا کی کہ اس کے بندے آرام سے سوئیں اپنے غم و الم کو بھول جائیں اور صبح دم تازہ ہو کر اٹھیں محنت و مشقت سے جسم کے باریک خلیوں میں جو ٹوٹ پھوٹ ہو گئی ان کی مرمت ہو جائے اور بچوں کو پتہ تک نہ چلے کہ انہیں بے ہوش کر کے خاموشی سے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ ان کی نیند میں خلل نہ پڑے اور وہ آرام سے سوتے رہیں۔

اس "الودود" کی مودت و محبت کی مخلوق گواہ ہے مخلوق سوتی ہے تو "نائٹ لیمپ" روشن کر دیا جاتا ہے کہ ٹھنڈی روشنی میں آرام سے سوئیں اور دن میں تیز روشنی والا لیمپ جلا دیا جاتا ہے کہ جسم میں حرارت پیدا کرے اور کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دے۔

نسیم سحر اس کی محبت کے پیام لاتی ہے اور بادصبا اس کی محبت کے دلائل پیش کرتی ہے طلوع و غروب اس کی شفقت سے خبردار کرتے ہیں۔ بارش اس کی محبت کی پھواروں سے نوازتی ہے۔

ہماری سواری کے لئے طرح طرح کے جانور پیدا کئے اور ہر ملک میں اس کے مناسب حال سواری پیدا کی۔ اپنے بندوں کے لئے دودھ کا انتظام کیا اور ایسے پھل پیدا کئے جو بنے بنائے حلوے ہیں۔ قسم قسم کی سبزیاں اور گوشت پیدا کئے۔

اس "الودود" نے اپنے بندوں کی بیماریوں کے دفع کرنے کے لئے جگہ جگہ شفا خانے کھول رکھے ہیں سورج' پانی' ہوا' بوٹیاں اور مختلف پھل امراض کے دور کرنے کے لئے بنائے مختلف قسم کی زینیں بنائیں کہ اپنا شوق پورا کریں۔

اپنے بندوں کی زینت کے لئے طرح طرح کے جواہرات' دھاتیں اور موتی وغیرہ بنائے کہ دل بہلائیں اور دیکھ کر خوش ہوں خوشی کے ان گنت

اسباب پیدا کیے کہ ساری عمر وہ اسباب نعمت و مسرت ختم نہ ہوں اور خرچ کیے سے کم نہ ہوں۔

الخلق عیال اللہ اس نے اپنی عیال کے لباس کے لئے طرح طرح کی چیزیں پیدا کیں۔ اون ریشم سوت قسم قسم کے چمڑے اور کھالیں اور انواع و اقسام کی دوسری چیزیں جن سے وہ موسم کے اثرات سے محفوظ رہے۔ بعض درخت اسے لباس مہیا کرتے ہیں تو بعض جانور اور کیڑے بھی اس کے تن ڈھانپنے کا انتظام کرتے ہیں۔

ان گنت خدمت گار پیدا کیے جو شب و روز خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی گندگی صاف کرنے پر لگا ہے تو کوئی بار برداری میں مصروف ہے کوئی سفر کی سہولتیں مہیا کرتا ہے تو کوئی اور دوسری خدمات انجام دیتا ہے۔

کہاں تک شمار کیا جائے سارا کارخانہ قدرت بڑے پیار و محبت سے ہمارے لئے بنایا ہے کہ ماننا پڑتا ہے وہ بے شک "الودود" ہے اگر اسے ہم سے محبت نہ ہوتی تو یہ احسن تقویم اور اس کے ان گنت خادم کہاں ہوتے۔

یہ سب کچھ جاننے اور ماننے کے باوجود یہاں ایک باریک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ واقعی "الودود" ہے تو کیوں رات دن ہماری دنیا میں بھی پٹائی ہوتی رہتی ہے اور آخرت میں بھی مار پڑے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ ماں اپنے بچے کو مارتی ہے استاد اپنے شاگرد کو پیٹتا ہے ڈاکٹر اپنے مریض کے نشتر گھونپتا ہے یہ سب گو بظاہر سزا و غضب کے مظہر ہیں مگر دراصل مودت و محبت کے مظہر ہیں کوئی ماں اپنے بچے کو مار کر خوش نہیں ہوتی۔ بعض ماؤں نے اپنے بچوں کو قتل کیا یا قتل کرایا کیونکہ وہ اسی کا مستحق تھا۔ مگر انہیں روتی بھی رہیں۔ استاد شاگرد کو مار کر خوش نہیں ہوتا مگر ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ محبت بصورت عداوت ہے۔ ڈاکٹر نشتر چلاتا ہے کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور بہتری کی اس کے بغیر اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہماری بہتری کے لئے ایسا کرتا ہے مقصود اصلاح ہوتی ہے محض ایذاء نہیں پھر بھی اگر تمام مصائب کا مقابلہ۔ ان سب نعمتوں کے

ساتھ کیا جائے تو یہ بہت ہی قلیل ہیں ہر وقت جو محبتوں کی بارشیں کرتا رہتا ہے ان کے مقابلے میں یہ امراض و آلام ہیچ ہیں جبکہ یہ آلام و مصائب و امراض خود ہمارے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ **مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ۔** اگر امراض و آلام سے ہمارا سابقہ نہ پڑتا تو ہر شخص فرعون ہوتا۔ یہ ہماری اصلاح کرتے رہتے ہیں جیسے نار جہنم صرف اصلاح کے لئے ہے جب کھوٹ جل چکے گا سب جنت میں پہنچ جائیں گے جو بھی گھر میں داخل ہو جائے گا۔ اس کے لئے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

بعض بدنصیبوں کی یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہے کہ سارے آلام و مصائب و امراض اللہ نے انہیں ہی دے دیئے ہیں۔ بظاہر تو ان کی یہ شکایت درست معلوم ہوتی ہے مگر دراصل بالکل غلط ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو اللہ آخرت میں عذاب دینا نہیں چاہتے تو اس دنیا میں مبتلائے عذاب رکھتے ہیں اور یہ دلیل مودت ہے۔ دلیل غضب نہیں ہے عموماً نیک بندوں کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے بڑے بڑے پیغمبر اور اولیاء اللہ مبتلائے مصائب رہے اور انہیں مال' جان' اولاد کے لئے بڑے بڑے صدمے سہنے پڑے۔

ایک اور بات ہے کہ بدنصیب لوگ شکایت تو کرتے ہیں۔ کاش انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ سب انہیں کی خاطر ہے گو بعض بدنصیب ایسے بھی ہیں کہ وہ کہہ سکتے ہیں ہم بے قصور ہیں مگر انہیں معلوم نہیں کہ وہ بھی قصوروار ہیں اسرار تقدیر کا انکشاف جائز نہیں اور اگر کر بھی دیا جائے تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیگا اور اگر آبھی جائے تب بھی "کیوں؟ کا سوال" کہیں ختم نہیں ہوتا جو اندھا پیدا ہوا وہ اسی قابل تھا اور جس کا اکلوتا جوان بیٹا مرا وہ اسی کا مستحق تھا بس اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ تقدیری امور ہوتے ہیں بالکل صحیح ہی ہوتے ہیں وہ "الودود" کسی پر ظلم نہیں کرتا "الودود" جو ٹھہرا۔

الوارث جل جلالہ

"الوارث" قرآن شریف میں صرف ایک جگہ پارہ دوئم رکوع چودھویں میں آیا ہے جہاں دودھ پلانے والی ماں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری شوہر پر ہے اگر وہ مرجائے تو اس کے وارث پر یہ ذمہ داری ہے فرماتے ہیں۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَالِكَ "اور اس کے وارث پر بھی یہ ذمہ داری ہے۔"

پارہ ۲۰ رکوع ۹ میں ہے۔ **وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ** "ان کے ہم ہی وارث ہوئے" یعنی جب ہم نے اس قوم کو عذاب کی بناء پر ہلاک کردیا تو ہم ان کے وارث ہوئے پارہ ۱۶ رکوع ۴ میں ہے **اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ** "سو ہم ہی زمین کے اور جو کچھ اس پر ہے وارث ہوں گے اور وہ ہماری ہی طرف لوٹ آئیں گے"

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو وارث قرار دیا ہے لہٰذا "الوارث" کو اسماء الٰہی میں داخل کر لیا گیا۔ انسانوں کو بھی اس نے "الوارث" کہا ہے چنانچہ فرماتے ہیں **اُولٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ** "یہ لوگ ہی وارث ہیں" یعنی جو لوگ عہد و امانت و نماز کا پاس لحاظ رکھتے ہیں یہ جنت کے وارث ہوں گے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو کہا **وَاَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ** پارہ ۱۷ رکوع ۶ میں ہے "اے پروردگار! مجھے بے وارث نہ چھوڑ تو بہتر وارث ہے۔" بلاشبہ وہ "الوارث" خیر الوارثین ہے۔

يَرِثُنِىْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ بھی قرآن میں آیا ہے چنانچہ پارہ ۱۶ رکوع ۴ میں ہے **يَرِثُنِىْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ** حضرت زکریا چونکہ بہت بوڑھے اور بے

اولاد تھے تو انہوں نے یہ دعا مانگی کہ "اے پرودگار! مجھے بیٹا دے جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث بنے اور اسے نیک اور صالح بنا کہ تو اس سے راضی رہے اور وہ پسندیدہ اخلاق والا ہو"

پارہ ۱۹ رکوع ۱۷ میں ہے۔ وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ اور سلیمان داود کا وارث ہوا۔ پارہ ۱۱ رکوع ۹ میں ہے وَرِثُوا الْكِتَابَ "ان کے مرنے کے بعد والے کتاب کے وارث ہوئے اور انہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور شہوتوں کا اتباع کیا۔"

پارہ ۱۶ رکوع ۸ میں ہے وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ "وہ جو کچھ اپنی آل و مال بتاتا ہے اسے وہ پیچھے چھوڑ جائے گا اور ہم سے خالی ہاتھ آکر ملے گا" اس طرح اس "الوارث" نے ہمیں بہت سی چیزوں کا وارث اور پیچھے چھوڑ جانے والا بھی بتایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ۔ پارہ ۹ رکوع ۳۔ "کیا ان لوگوں کے مرنے کے بعد اگر ہم چاہتے تو انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے مصیبت میں ڈال دیتے اور عذاب میں مبتلا کر دیتے"

پارہ ۴ رکوع ۱۳ میں وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً آیا ہے اور اگر کلالہ کی وارثت کا معاملہ ہو۔ وَرِثَهٗ اَبَوَاهُ۔ اور اگر کوئی بے اولاد مر جائے اور اس کے والدین اس کے وارث ہوں۔

پارہ ٦ رکوع ۴ میں وَهُوَ يَرِثُهَا شوہر بیوی کا وارث ہو گا اگر وہ بے اولاد مری ہو۔ ان تمام آیتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت کسی کے مرنے کے بعد جاری ہوتی ہے اور جب سب مرجائیں تو اللہ وارث ہو جائے گا چنانچہ فرماتے ہیں کہ "ہم ہی زمین کے اور جو کچھ زمین پر ہے اس کے وارث ہوں گے۔ اور وہ سب ہماری ہی طرف لوٹ آئیں گے۔"

تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ "الوارث" تب ہی "الوارث" کہلانے کا مستحق ہو گا جبکہ سب کچھ فنا ہو جائے گا اور کیا وہ اب "الوارث" نہیں ہے۔ جس طرح قرآن شریف میں وراثت کا ذکر آیا ہے۔

وصیت کا بھی ذکر ہے اور وصیت مرنے پر ہوتی ہے چنانچہ فرمایا مِنْۢ بَعْدِ

وَصِیَّتِہٖ ''اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد جو اس نے مرتے دم کی'' اور خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں ''یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ'' ''اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے'' تو کیا نعوذباللہ اس نے دم نزع وصیت کی؟ بلکہ یوصی بمعنی ینصح ہے یعنی اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے وارث ہونے کو قیاس کرلیا جائے۔ یہ تو ایک طرز کلام ہے وہ ہمیشہ سے ''الوارث'' ہے اور ہمیشہ ''الوارث'' رہے گا۔ وارث یعنی مالک۔ ایسا مالک جو مالک مطلق ہے کسی کے مرنے یا فوت ہونے کے بعد وارث نہیں ہوا۔ ''ہم وارث ہیں زمین کے اور جو کچھ اس پر ہے اور وہ سب ہماری ہی طرف لوٹیں گے۔'' یعنی ہم مالک ہیں۔ سب کے والی وارث ہیں۔ ہم رات دن کہتے ہیں آپ ہی میرے والی وارث ہیں یعنی سرپرست ہیں۔ یہ بات ہم غیرلوگوں سے کہتے ہیں جہاں وارثت کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔

ہم رات دن یہ بھی کہتے ہیں اللہ سب کا والی وارث ہے یعنی اس وقت بھی والی وارث ہے تو یہاں مرنے کے بعد معنی کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ والی وارث یعنی مالک و حاکم و مختار۔ کہیں دور سفر پر جاتے ہوئے بھی ہم اپنی آل و اولاد سے کہتے ہیں۔ ''اللہ وارث'' حالانکہ ہم زندہ ہوتے ہیں۔ مرنے نہیں جا رہے ہوتے ہیں صرف سفر پر جاتے ہوتے ہیں۔

کوئی وارث کیسا ہی نالائق برا یا بدقماش کیوں نہ ہو اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے وارث بننے کا دعویدار ہوتا ہے اس کے لئے جھگڑتا ہے اور جدوجہد کرتا ہے جنت ہمارے باپ کی جاگیر ہے ہم خداو رسول سے جھگڑ نہیں سکتے مگر خدا سے رحم کی اپیل اور رسول سے شفاعت کی درخواست ضرور کریں گے۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہوں گے اور رسول نے فرمایا ہے جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے گا جنت میں جائے گا جنت ہمارا حق ہے اگرچہ ہم کیسے ہی برے اور بدقماش کیوں نہ ہوں۔ آخر مادۂ شرارت بھی تو اسی نے ہمارے اندر رکھا ہے۔

''الوارث'' جل جلالہ پر مضمون لکھتے ہوئے ہمیں اپنے ایک دوست مولانا وارث خاں کاملؒ یاد آگئے وارث خاں اخبار مدینہ بجنور کے سب ایڈیٹر تھے تقسیم

ملک کے بعد لاہور چلے آئے تو شورش کاشمیریؒ نے انہیں اپنے اخبار چٹان کی ادارت سپرد کر دی اس زمانے میں ان سے کچھ عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کرایا خدیجۃ الکبریٰ بڑی اچھی کتاب مرحوم کی لکھی ہوئی مکتبہ چٹان سے شائع ہوئی تھی۔ اور بھی کئی اچھی کتابیں مکتبہ چٹان نے ان کی شائع کی تھیں وارث کامل دن میں چٹان میں کام کیا کرتے اور رات میں ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے وہ ملتان روڈ پر رہتے تھے رات کو ٹیوشن سے فارغ ہو کر آتے تو ایک قبرستان سے گزر کر آیا کرتے تھے لوگوں نے انہیں روکا کہ رات کے وقت آپ قبرستان کے اندر سے نہ آیا کریں مگر وہ نہ مانے جاڑوں کی رات تھی اور وہ رضائی اوڑھے قبرستان سے گزر رہے تھے کہ رضائی میں سخت حرکت پیدا ہوئی۔ وہ گرتے پڑتے گھر پہنچے۔ پسینے میں شرابور تھے کیونکہ انھیں خیال ہوا کہ کوئی بدروح یا جن بھوت لپٹ گیا ہے۔ گھر آکر جو رضائی کو اتار کر پھینکا اس میں سے چوہا نکل کر بھاگا۔ بات یہ ہوئی کہ وہ جس گھر میں ٹیوشن پڑھانے جایا کرتے تھے وہاں جا کر رضائی ان کے پلنگ پر رکھ دیا کرتے تھے تو بنولہ کھانے کے لئے چوہا اس کے اندر گھس گیا اور وہ اسے اسی طرح اوڑھے چلے آئے سارے راستے تو وہ ڈرا ڈرا خاموش رہا۔ مگر پھر صبر نہ کر سکا اور اتفاقاً قبرستان والی راہ میں اس نے نکلنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ وہ سمجھے کہ کوئی بھوت لپٹ گیا ہے تو پریشان ہو گئے۔ وارث خاں بڑے لمبے تڑنگے طاقتور پٹھان تھے اکثر میرا مونڈھا دبا کر کہا کرتے تھے تو مر جائے گا اور میں ابھی برسوں زندہ رہوں گا۔ مگر وہ چند سال ہی زندہ رہے اور پچاس تک پہنچ کر وفات پا گئے۔

الخلق عیال اللہ مخلوق اللہ کی اولاد ہے۔ دراصل حقیقی باپ تو وہی ہے اس نے ہمیں زمین اور جو کچھ زمین پر ہے اس کا وارث بنایا ہے بیٹے کا مال باپ کا مال تو اگر **اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ** کا یہ ترجمہ کیا جائے کہ ہم زمین کے وارث ہیں تو یہ بات فی الحال بھی ٹھیک بیٹھتی ہے اور اگر اس کا ترجمہ کیا جائے کہ ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے جب کہ سب فنا ہو جائیں گے تو اگر بیٹا مر جائے اور کوئی بھی اس کا وارث نہ ہو تو باپ ہی وارث ہوتا ہے اس لئے جب سب ہی فنا

ہو جائیں گے تو وہی زمین اور جو کچھ زمین پر ہے اس کا وارث و مالک ہو گا بہر حال وہ اب بھی اور جب بھی "الوارث" و مالک ہے۔

علماء کہتے ہیں علم میراث جسے وہ علم الفرائض سے تعبیر کرتے یں نصف دین کا علم ہے اگر اسلام کے قانون وراثت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دولت کا فنا چاہتا ہے بقا نہیں چاہتا جبکہ ہندو مذہب باوجود ترک دنیا' رہبانیت' اور جوگ کی تعلیم دینے کے مال کا بقا چاہتا ہے۔ ہندو مذہب کے قانون وراثت کے دیکھنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کیونکہ صرف بڑا بیٹا ساری جائیداد کا وارث ہوتا ہے اور اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ باپ چھوڑ گیا ہے اس میں اضافہ کرے اسے کم نہ ہونے دے عورت کا تو ہندو مذہب میں کوئی مقام ہی نہیں لہٰذا بیٹیاں بالکل محروم اور بیوی وغیرہ بھی محروم سوائے بڑے بیٹے کے سب بیٹے محروم۔ اس طرح دولت کا ایک خاندان میں ارتکاز ہو جاتا ہے اور اسلامی قانون وراثت کی رو سے دولت تقسیم در تقسیم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور متوفی کے ہر اہل خانہ کو اس کی دولت سے حصہ ملتا ہے اور اس طرح اشتراکیت کی سی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہندو مذہب میں بیٹیوں کا کوئی حق نہیں اسی ناقص قانون کی وجہ سے ان میں جہیز کی رسم نے جنم لیا کہ داماد سسر سے فرمائش کرتا ہے کہ اتنا دینا پڑے گا۔ تب شادی کریں گے اور وہ اتنا بڑا جہیز مانگتا ہے جو عموماً" اس کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتا ہے جو سسر سائیکل نہیں دے سکتا اس سے سائیکل مانگی جاتی ہے جو موٹر سائیکل نہیں دے سکتا اس سے موٹر سائیکل کا سوال کیا جاتا ہے اور جو کار نہیں دے سکتا اس سے کار طلب کی جاتی ہے۔

ہندو مذہب نے عورت کو مال سے زیادہ وقعت نہیں دی۔ اسی لئے شوہر کے مرنے کے بعد اسے ستی ہونا پڑتا تھا کیونکہ اس کا خود کوئی وجود تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ اسے مال سے بھی کم وقعت خیال کیا گیا کہ متوفیٰ کے مال کو تو نہیں جلایا جاتا۔ اس کی پوری پوری حفاظت کی جاتی ہے اور اسے نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔

ایک ایرانی شاعر نے جو ستی کا انسانیت سوز وحشت ناک منظر دیکھا تو یہ شعر کہے بغیر نہ رہ سکا ۔۔

؎ درمحبت چوں زن ہندی کسے دیوانہ نیست
سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

"محبت میں ہندوستانی عورت کی طرح کوئی بھی دیوانہ نہیں بجھی ہوئی شمع پر جلنا ہر پروانے کا کام نہیں" جس طرح اس "الوارث" نے ہمیں وارث ارض و سماء بنایا ہے اپنے اخلاق کا بھی وارث بنایا ہے بعض انسان و حیوان و نباتات صفت جلال کی گرفت میں ہیں اور بعض صفت جمال کے زیر سایہ ہوتے ہیں اور ہنس مکھ، نرم خو، سخی، رحم دل، نازک طبع و نازک اندام، حسین و جمیل، ظریف الطبع، عفو و درگزر کرنے والے، متحمل مزاج، لطافت و نزاکت و ظرافت پسند، حسن پرست، فنون لطیفہ سے شغف رکھنے والے کھانے پینے اور پہننے میں نفاست طلب لوگ اس کی صفت جمال سے زیادہ حصہ پانے والے ہوتے ہیں۔ یہی حال جانوروں کا ہے درندے، گوشت خور پرندے اور بعض وحشی اور ایذاء دینے والے حشرات الارض صفت جلال کے تحت ہوتے ہیں یہی حال نباتات کا ہے پھول، پھول دار درخت اور خوشنما جڑی بوٹیاں صفت جمال سے آراستہ ہوتی ہیں اور کانٹے اور کانٹے دار درخت صفت جلال سے۔ پھر بعض انسان و حیوان و نباتات دونوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ تلخ، چرپری، تیز، گرم چیزیں صفت جلال والی ہیں۔ شیریں عمدہ مزے والی صفت جمال والی ہیں۔

جس طرح ہم اپنے آباو اجداد کی چھوڑی وراثت پاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے اخلاق وعادات بھی ہمیں وراثت میں ملتے ہیں۔ جو تعلیم و تربیت و نصیحت سے کم ہی اثر پذیر ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح ان کے امراض بھی ہمیں وراثت میں ملتے ہیں۔ ان موروثی امراض کو کوئی حکیم یا ڈاکٹر زائل نہیں کر سکتا البتہ کم کر سکتا ہے موروثی اخلاق و امراض کے لئے سخت ضرب کی ضرورت ہوتی ہے یہ معمولی تدابیر سے درست نہیں ہوتے۔

؎ پر تو نیکا نگیرد ہر کہ بنیادش بداست

تربیت نا اہل راچون گردگان بر گنبد است

بری بنیاد والا نیکوں کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا نا اہل کی تربیت ایسی ہے جیسے گنبد پر اخروٹ۔ ایک دوست کہنے لگے صارم میں نے بڑے مجاہدات و مراقبات کئے ہیں دل کالے کا کالا ہی رہا۔ میں نے کہا آپ اسے کالا ہی رہنے دیجئے۔ اپنا کام جاری رکھیئے۔

اس "الوارث" نے وضاحت کے ساتھ متوفی کے حصے بخرے متعین کر دے ہیں اس کے باوجود گھر گھر کی لڑائیاں اور مقدمہ بازیاں ہیں۔ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے کوئی ایک نا انصاف وارث دوسروں کے حق پر دست درازی کرتا ہے اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کو بے چین بنا دیتا ہے اتنے کی جائیداد نہیں ہوتی جتنا کہ مقدمہ بازی پر خرچ ہو جاتا ہے اور جگہ جگہ عدالتوں میں زمین پر لڑے پھرتے ہیں عدل و انصاف سے کام لیں تو خود بھی آرام اور پیار و محبت کی زندگی بسر کریں اور دوسرے بھی' کوئی بھائی کو قتل کرتا ہے کوئی بہن کو' کوئی باپ کو' کوئی ماں کو' پھر پکڑے پکڑے ہوئے پھرتے ہیں۔ عدالتوں میں زیادہ جھگڑے میراث ہی کے ہیں۔

میراث پر ہمیں ایک قطعہ یاد آگیا لکھے دیتا ہوں جوانی دیوانی کے دور میں ہم شہرت طلب' فخر والے اور مغرور تھے پھر تو یہ حالت ہو گئی۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامیؔ
کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

بندۂ عشق ہو گئے ہو جامیؔ اب حسب نسب کی باتیں چھوڑ دو کیونکہ یہاں فلاں بن فلاں کوئی چیز نہیں مجھے یہ شعر بڑا اچھا لگتا ہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در محفلِ رندان خبرے نیست کہ نیست

ہمیں شاعری کا بڑا شوق تھا مشاعروں میں جاتے تو پہلے یہ قطعہ پڑھتے۔

بیخود کا میں تلمیذ ہوں ناظم کا ہوں فرزند
حصہ مجھے قسّامِ ازل نے دیا دوچند

ہے شاعری میراث بزرگوں کی ہمارے
کہتے تھے جنھیں غیر بھی اردو کے خداوند

جب دیکھا کہ اہل پنجاب شاعر کی بڑی توہین کرتے تو مشاعروں میں آنا جانا چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک گم نام شاعر ہو کر رہ گئے شاعری ہمارے خاندان کی میراث ہے حتی کہ جاہل مردوزن بھی شعر کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نہال سیوہاروی اور آج کل ہندوستان کا مشہور شاعر ہلال سیوہاروی اسی خاندان قاضیان سے ہیں ۔ ہمارے اجداد میں ثاقب سیوہاروی (جو میر کے ہم عصر تھے) میر صاحب نے (نکات الشعراء) میں ان کی تعریف کی ہے کہ "وہ صوفی منش' نیک آدمی ہے' خوب کہتا ہے "

میں حضرت سائل دہلوی کی خدمت میں گیا دریافت فرمایا کیا نام ہے؟ میں نے کہا قاضی عبدالصمد فرمایا "آپ دیر سے تشریف لائے اب تو ہم بوڑھے ہو چکے ہیں اب قاضی کی کیا ضرورت رہ گئی"

*

الواسعُ جل جلالہٗ

واسع۔ وسیع، موسع، درحقیقت اسی کی ذات پاک ہے جو یہ کہتا ہے **وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔** اس کی قدرت زمین و آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور یہ فرماتا ہے **وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ** اور جنت جس کی پہنائی آسمان و زمین ہے۔ جس کی پہنائی اتنی ہے تو لمبائی کتنی ہو گی؟ اور جو یہ فرماتا ہے **وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ** ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور ہم وسعت پیدا کرنے والے ہیں "**وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ**" اور زمین کو بچھا دیا پس ہم بہترین بچھانے والے ہیں جو ماھدون ہوتے ہیں وہ موسعون بھی ہوتے ہیں کیونکہ کسی چیز کو بچھانے والا وسعت پیدا کرتا ہے تو گویا یوں فرمایا **وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمُوْسِعُوْنَ۔** اگر یوں فرماتے **وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا الْمٰهِدُوْنَ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمُوْسِعُوْنَ** تب بھی بات درست بیٹھتی مگر فرشنا کے ساتھ الماھدون ہی مناسب ہے اور وہاں الموسعون ہی زیبا ہے۔

اس "الواسع" نے افلاک بنائے جن کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہکشاں کی کوئی پیمائش نہیں کر سکتا۔ سوائے چند ایک ستاروں کے باقی ستاروں کی لمبائی چوڑائی تک کسی کی پہنچ نہیں اور جن کی پیمائش کا انسان دعویدار ہے وہ بھی بالکل یقینی اور حتمی نہیں ہے ان افلاک کی کسی کو نہ ابتداء معلوم نہ انتہا۔

ان افلاک کے نیچے اور درمیانی فاصلوں کی وسعت کو کوئی نہیں بتا سکتا کہ کتنی ہے یہ جو فضا ہم رات دن دیکھتے ہیں اس کی وسعت کا کسی کو اندازہ نہیں کتنی وسیع و عریض ہے۔ ہوا کتنی لمبی چوڑی ہے کسی کو پتہ نہیں۔

یہ زمین جس پر ہم رات دن چلتے پھرتے ہیں کوئی نہیں بتا سکتا کہ روئے زمین کے پہاڑوں کی کتنی وسعت ہے ان کی مجموعی لمبائی اور اونچائی کا بھی صحیح

کسی کو علم نہیں تو ان کی اندرونی سطحوں کی وسعتوں کو کون بتا سکتا ہے؟ کون بتا سکتا ہے کہ ان کے اندر چھپی ہوئی معدنیات کی کیا وسعت ہے؟ تیل گیس اور پانی کتنا ہے کیچڑ کوئلہ اور آگ کتنی ہے۔

سمندروں کی وسعتوں کا کسی کو صحیح اندازہ نہیں ان کے اندر پہاڑ اور گہرائی کو کوئی نہیں ناپ سکتا ان کی وسیع آبادی کا کوئی پتہ نہیں چلا سکتا سمندر تو سمندر دریاؤں تک کی صحیح وسعت اور گہرائی کا ہمیں علم نہیں۔

ان وسعتوں کے علاوہ بھی لاتعداد وسعتیں ایسی ہیں جن کا ہمیں کچھ بھی علم نہیں جن بہشتوں کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے ان کی وسعت کا ہمیں کچھ علم نہیں اس کی قدرت بڑی وسیع ہے اس کا دسترخوان رزق اتنا وسیع ہے کہ زمین و آسمان میں پھیلا ہوا ہے اور طرح طرح کے رزقوں سے آراستہ ہے صرف رزق ہی نہیں اس وسیع القدرت نے مخلوق کی چھوٹی سے چھوٹی ضروریات کا بڑا خیال رکھا ہے اور ان کے پورا کرنے کے لئے ایک وسیع دنیا پیدا کر دی ہے کہ اس نے ہماری سواری کے لئے اونٹ گھوڑے اور گدھے پیدا کئے ہماری باربرداری کے لئے حیوانات بنائے اور انہیں ہمارے تابع فرمان بنا یا پھر جوں جوں ہماری ضروریات بڑھتی گئیں آبادی اور فاصلے بڑھتے گئے تو جہاز' ریل' کاریں' بسیں' ویگنیں' موٹر' سائکلیں اور ہیلی کاپٹر وغیرہ بنا دیئے کہ ہم ان پر اڑے اڑے پھرتے ہیں اس "وسیع القدرت" نے ہمیں ایسی وسیع قدرت عطا کی ہے کہ اس نے بطور نمونہ ایک آم کا پودا بنایا تو ہم نے پانچ سو قسم کے آم بنا دیئے اس نے ایک کھجور کا درخت پیدا کیا تھا ہم نے سینکڑوں قسم کی کھجوریں بنا ڈالیں اس نے چھوٹے چھوٹے شلجم اور مولی گاجر پیدا کئے تھے ہم نے انہیں کئی کئی کلو کا بنا دیا اس نے گھوڑے اور گدھے پیدا کئے تھے ہمنے خچر پیدا کر دیا جو طاقت میں گدھے سے زیادہ بوجھ اٹھا سکے اور گھوڑے کی رفتار سے چل سکے۔

اس نے ہماری ضروریات کے پیش نظر آگ' ہوا' پانی اور مٹی کو عام کر دیا تاکہ ہم ان کی مدد سے اپنی ضروریات کی چیزیں بنا سکیں۔ ضروریات تو ضروریات اس کی قدرت کے طفیل ہم اپنے بچوں کے دل بہلانے کے لئے ایسے

کھلونے بنانے لگے ہیں جو خود بخود چلتے، بولتے، ہنستے اور روتے ہیں اس طرح اگر ہم خود اپنی قدرت کی وسعت کا اندازہ لگانا چاہیں تو نہیں لگا سکتے۔

وہ "الواسع" وسیع القدرت تو ہے ہی "وسیع العلم" بھی ہے۔ **وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ۔** "ایک پتا بھی برو بحر کی اندھیروں میں گرتا ہے تو اسے اس کا علم ہوتا ہے۔"

حدیث شریف میں ہے اندھیری رات میں کالی چٹان پر سیاہ چیونٹی بھی رینگتی ہے تو اسے اس کا علم ہوتا ہے چونکہ وہ وسیع العلم ہے اس لئے وسیع القدرت بھی ہے کیونکہ بغیر علم کے قدرت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں جس چیز کا کوئی علم ہی نہ ہو ہم اس پر کیسے قدرت حاصل کر سکتے ہیں؟ قدرت کے لئے پیشگی علم کا ہونا ضروری ہے اگرچہ ہم اس کی ذات کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ پس و پیش سے بالا تر ہے۔

اس "علام الغیوب" نے اپنے بعض بندوں کو ایسا وسیع العلم بنایا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور کیسے کیسے وسیع العلم انسان پیدا کروئے ہیں کہ وہ ستاروں پر کمند ڈالنے لگے ہیں آسمانوں پر فیکٹریاں اور گھر بنانے لگے ہیں۔

اس "وسیع العلم" "وسیع القدرت" نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کیئے چنانچہ فرماتا ہے **وَمِنْ کُلِّ شَیْئٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ** ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا۔ اس آیت کی تفسیر علمائے اسلام پر قرض ہے۔

عالم انسان و حیوان میں یہ بات واضح ہے کہ سب جوڑے جوڑے ہیں عالم نباتات میں بھی کچھ ایسا ہی ہے اور جن جراثیم و نباتات میں یہ بات واضح نہیں ہے وہاں خود ان کے اپنے جسم میں مذکر و مونث ہوتے ہیں مگر ہر چیز کا جوڑے جوڑے ثابت کرنا مشکل ہے کہتے ہیں ایٹم میں بھی نیگیٹو اور پوزیٹو ہوتے ہیں۔

علم الاخلاق پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام اخلاق جوڑے جوڑے ہیں مثلاً اسراف اور بخل ایک اخلاقی جوڑا ہے ان دونوں کے ملاپ سے

سخاوت جنم لیتی ہے کہ سخی بر محل خوب خرچ کرتا ہے اور بے محل کچھ خرچ نہیں کرتا اسی طرح تہور اور بزدلی جوڑے جوڑے ہوتے ہیں کہ ان کے ملاپ سے شجاعت جنم لیتی ہے کہ بہادر آدمی بلاوجہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالتا اور اس معاملہ میں اس کا عمل بزدلانہ ہوتا ہے مگر موقع و محل پر تہورانہ شان دکھاتا ہے اور جان کی پرواہ نہیں کرتا یہی حال بقیہ اخلاق کا ہے ہر نیگیٹو اور پوزیٹو کے ملنے سے ایک خصلت فاضلہ پیدا ہوتی ہے۔

وہ "الواسع" وسیع الحلم ہے وسیع قدرت رکھتے ہوئے بھی اپنے دشمنوں کو کچھ نہیں کہتا وہ اس کی وسیع و عریض زمین پر دندناتے پھرتے ہیں اور اس کے وسیع و عریض آسمان کے نیچے عیش کی بنسری بجاتے رہتے ہیں وہ ان کی سب حرکتیں دیکھتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا وہ تو وہ اس کے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کا یہ حال ہے کہ دشمنوں کے ساتھ وسیع الحلمی کا برتاو کرتے ہیں اور اسی کی تعلیم دیتے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں جو شخص تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے آگے دوسرا گال بھی پیش کر دے ایک شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بڑی سخت کلامی کر رہا تھا اور آپ ضبط کئے جا رہے تھے بلکہ بڑی نرمی سے اسے سمجھا رہے تھے تو ایک شاگرد نے کہا آپ کیوں اس کے ساتھ نرمی برت رہے ہیں فرمایا اس لئے کہ یہ مجھ سے ادب آداب سیکھے حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

؎ فریدا جے تیں مارن مکیاں تناں نہ ماریں گم
آن پڑے گھر جائی اپے پیر تناں دے چم

فرید! اگر کوئی تجھے تکلیف دے تو تو اسے زک نہ پہنچا بلکہ اس کے گھر جا کر اس کے پاؤں چوم وہ "الواسع" وسیع الرحمتہ ہے **ورحمتی وسعت کل شئی** "میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے" حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر اس کی رحمت سایہ فگن نہ ہوتی تو زمین و آسمان کبھی کے برباد ہو جاتے ہم اس کی رحمت کے بارے میں الرحمن الرحیم میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں لہٰذا یہاں اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

وہ "الواسع" وسیع الغفران بھی ہے اس پر بھی ہم "الغفور" وغیرہ میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اگر وہ وسیع الغفران نہ ہوتا تو ساری دنیا جہنم کدہ بن جاتی سوائے چند ایک نفوس قدسیہ کے کوئی بھی جنت میں قدم نہ رکھ سکتا۔
وہ "الواسع" وسیع و موسع ہوتے ہوئے بھی ہمارے دل میں سما جاتا ہے اس لئے دل کو عرش الٰہی اور بیت اللہ کہا گیا ہے۔

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ، کہ جہاں تو سما سکے

یہ دل بھی عجیب و غریب شے ہے

دیکھو اللہ ہے چھوٹوں کو بڑائی دیتا ہے
آسماں آنکھ کی پتلی میں دکھائی دیتا ہے

حقیقت قلبیہ شاہکار قدرت ہے

یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہو گی
جادہ راہ بقا ہے خط پیمانہ دل

یہ گوشت کا ٹکڑا اتنا وسیع ہے کہ نہ فاصلوں کو خاطر میں لاتا ہے نہ زمانوں کو بڑی سے بڑی مادی رکاوٹ اس کے نفوذ میں مانع نہیں ہو سکتی اور بڑی سے بڑی ظلمت اس کے نور کو نہیں روک سکتی۔
اس "وسیع العلم" نے علم کو اتنی وسعت دی ہے کہ زمین و آسمان اس کی زد میں ہیں۔ عقل، علم سے زیادہ وسیع ہے مگر عشق کو اس سے بھی وسیع تر اور تیز تر بنایا ہے کہ جہاں علم قدم نہیں رکھ سکتا عشق بے محابا پہنچ جاتا ہے اور جہاں عقل سرگریباں ہو جاتی ہے عشق ورائے سراپردہ چلا جاتا ہے۔

فرش زمیں پہ مصطفےٰ عرش بریں پہ کبریا
پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلہ دراز عشق

یہ ایٹم بڑا ہی زبردست ہے

اک لفظ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

ایک ماں امریکہ میں بیٹھی ہوئی اپنے بیٹے سے جو پاکستان میں رہتا ہے رشتہ محبت استوار رکھ سکتی ہے۔ برو بحریا فضائی آلودگیاں اس کی محبت میں کوئی رخنہ نہیں ڈال سکتیں کیونکہ محبت فاصلوں کی پابند نہیں۔

یقولون لیلیٰ بالعراق مریضۃٌ   فیالیتنی کنت الطبیب المداویا

کہتے ہیں لیلیٰ عراق میں بیمار ہے کاش میں اس کا طبیب ہوتا۔

جس طرح محبت فاصلوں سے متاثر نہیں ہوتی زمانوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ہ فلو اَنَّ لیلیٰ قد تدُبُّ علی العصا
لکان ھوی لیلیٰ جدیدًا اوائلہٗ

اگر لیلیٰ لاٹھی ٹیک کر بھی چلنے لگتی تو اسکی محبت کے اوائل جدید سے جدید تر ہوتے چلے جاتے۔

*

اَلوَکِیلُ جل جلالہٗ

ہمارا ایک وکیل ہے جو ہمیں کبھی جتوا دیتا ہے اور کبھی ہرا دیتا ہے ہم اس کے جتوا دینے سے خوش ہوتے ہیں اور اس کے ہرا دینے سے مطمئن رہتے ہیں اگر وہ ہمیں ہمیشہ کامرانی و خوشی سے ہی سرفراز کرتا رہتا تو زندگی اجیرن ہو جاتی

ے زندگی زندگی نہیں ہوتی   جب تک آشفتگی نہیں ہوتی

اور اگر ہمیں ہمیشہ شکست و غم سے ہی آشنا رکھتا تو زندگی وبال جان ہو جاتی اگر ہمیشہ ہماری جیت ہی جیت ہوتی رہتی تو ہم یہ تک نہ جانتے کہ جیت کسے کہتے ہیں؟ اور اس میں کیا لطف ہے؟ شادمانی و مسرت کیا ہے؟ اور اس میں کیا مزہ ہے؟ تلخی نہ ہوتی تو اس میں شیرینی کا احساس نہ ہوتا غم نہ ہوتا! تو ہم خوشی کو کیسے پہچانتے؟

ہم اپنے اس وکیل کی ہار جیت پر اس لئے مطمئن ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمارے مناسب حال کرتا ہے جہاں جتانا مناسب ہوتا ہے وہاں جتا دیتا ہے اور جہاں ہرانا مناسب ہوتا ہے وہاں ہرا دیتا ہے اس نے شکست و غم میں بھی ایک مزہ رکھا ہے دل دردمند ہوتا ہے اور آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں تو عجیب لطف آتا ہے جسے ''غم نصیب لوگ'' یا ''عشق کے مارے'' اچھی طرح جانتے ہیں

ے تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

ایک رات ساری رات نیند نہ آئی ہر چند کوشش کی کہ ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگ جائے مگر نہ لگی۔ سوچا دو بجے تک نیند آ جائے گی مگر نہیں آئی پھر سوچا کہ فجر کی اذان کے وقت تو ضرور ہی آ جائے گی مگر کہاں ساری رات بے چینی میں گزر گئی اختر شماری کرتے تھک گیا اس شب معلوم ہوا کہ اختر شماری کسے

کہتے ہیں ایسا لگتا تھا کہ ستارے ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں

بقول عربی شاعر

؎ فیالک من لیل کان نجومہ بامراس کتان الی صم جندل

افسوس اے رات تو ایسی لگتی ہے جیسے تارے کتان کی رسی سے ٹھوس چٹانوں سے باندھ دیئے گئے ہیں

وہ رات کتنی دراز تھی کہ ختم ہی ہونے میں نہ آتی تھی ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ تھا ایسی رات کی درازی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

؎ دعویٰ بہت ہے فن ریاضی میں آپ کو

طول شب فراق ذرا ناپ دیجئے

الغرض بڑی بے چینی رہی اور ہم اس شعر کے مصداق رہے۔

؎ کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں

جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

صبح ہو گئی اور نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔

؎ رات بھر دیدۂ خوں بار نے سونے نہ دیا ہائے بیمار کو بیمار نے سونے نہ دیا

اس غزل میں ایک بڑا اچھا شعر ہے

؎ بندھ گیا چشم و خط وخال و دہن کا جو خیال

رات بھر بس انہی دو چار نے سونے نہ دیا

ایک رات داڑھ کے درد نے نیند حرام کر دی اس رات اندازہ ہوا کہ یہ جو نعمت بے منت و بے زر ہر روز ہاتھ آ جاتی تھی اس کی کتنی بھاری قدر و منزلت ہے۔

بہر حال اس "الوکیل" نے جو ہار جیت کا چولی دامن کا ساتھ رکھا ہے یہ بڑا ہی ضروری تھا ہم چیزوں کو صرف ان کے اضداد سے پہچان سکتے ہیں وہ یہ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

قرآن شریف میں بائیس جگہ یہ لفظ آیا ہے کہیں اس کے معنی "کارساز" کے ہیں کہیں "ذمہ دار" اور "ٹھیکیدار" کے کہیں "مسلط" کے اور کہیں

"نگہبان" کے بہرکیف وہ "الوکیل" ہمارا کارساز بھی ہے ذمہ دار بھی نگہبان بھی اور مسلط بھی ہم اس کی ہر ادا پر خوش ہیں۔

اس "الوکیل" نے ہمیں بڑی عزت سے نوازا ہے مگر کبھی کبھار ایسا موقعہ بھی آ جاتا ہے کہ ہمیں ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس دم ہمیں اس کی عطا کردہ عزت کی قدر ہوتی ہے ورنہ کبھی خیال تک نہیں آتا کہ اس نے ہمیں یہ نعمت بھی دی ہے اور بغیر مانگے دی ہے کیونکہ ہم نے کبھی اس سے عزت کی طلب نہیں کی تھی ایسے کسی ناگہانی ذلت و خواری کے وقت ہم خوش ہوتے ہیں کہ ہمیں اس کی دی ہوئی نعمت کا احساس ہوا اور غرورِ نفس ٹوٹ گیا ورنہ ہم بڑے مغرور اور خودسر ہو جاتے۔ کسی خود سر جاہل سے پالا پڑ جاتا ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اور ہم جتنے بڑے بنے پھرتے ہیں اتنے بڑے نہیں ہیں اس کی ڈالی ہوئی ذلت خودشناسی کا ذریعہ بن جاتی ہے جو بجائے خود ایک نعمت ہے۔

ہم نے اپنے سارے کام اس "الوکیل" کے سپرد کر دیئے ہیں کہ وہی ہمارا کارساز و کفیل ہے بلکہ ہم نے سپرد نہیں کئے اس نے خود ذمہ داری اٹھائی ہے اگر ہم چاہیں بھی کہ اس کی وکالت و کفالت سے نکل جائیں تو نہیں نکل سکتے کیونکہ وہ ہم پر مسلط ہے وہ خود ہی ہمارا نگہبان بنا ہے تو ہمیں کسی اور سے منت سماجت کی کیا ضرورت؟

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احسان اٹھایئے

ہم اس کی نگرانی میں پیدا ہوئے پلے بڑھے جوان ہوئے اور مدۃ العمر کو پہنچے تو اور کیا چاہیئے؟ مرنا جینا جب اسی کے تسلط سے ہے تو پھر کیا رہ گیا؟

ہمارے ایک نوجوان دوست نے وکالت کا امتحان دیا پھر وکالت شروع کی مگر کچھ ہاتھ نہ آیا تو گھبرا کر مکہ شریف چلے گئے بے زر بے پر پاس کچھ نہ تھا۔ عربی جانتے نہ تھے، بھوکے پیاسے کئی روز تک خانہ کعبہ یا روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھے رہے وہاں کے کسی پاکستانی تاجر نے جو اس نوجوان کو کئی روز

ایک جگہ بیٹھے دیکھا تو حال دریافت کیا معلوم ہوا تعلیم یافتہ جوان ہے' اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیٹی سے شادی کردی اور کہا میں بھی یہاں اسی طرح بے زر بے پر آیا تھا میں نے سوائے خدا کے کسی سے نہیں مانگا اور تم دیکھتے ہو میرے پاس سب کچھ ہے۔ دیکھو جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگنا' کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا ہمارے اسی وارثی دوست نے ایسا ہی کیا تھا اور ایسا ہی کہا اب وہ وہاں کے دولت مند لوگوں میں ہیں دیکھو اس "الوکیل" پر بھروسہ کرنے والے یہ دونوں شخص کیسے اچھے رہے۔ فرماتے ہیں

؎ میر بندوں سے کام کب نکلا ‌ ‌ ‌ ‌ مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

؎ آگے کسی کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

وہ "الوکیل" صرف ہمارا تمہارا ہی نہیں ساری دنیا کا کارساز ہے اسی کی کارسازی سے سبزہ سنگلاخ زمین سے سر اٹھاتا ہے پھلتا پھولتا اور لہلہاتا ہے اسی کی کارسازی سے دن اور رات آتے جاتے ہیں' موسم تبدیل ہوتے ہیں سورج چاند اور ستارے طلوع وغروب کرتے ہیں وہی زمین و آسمان کو تھامے ہوئے ہے وہی سیاروں کی رفتار کو کنٹرول کرتا ہے ورنہ کبھی کے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔

والشمس تجری لمستقرلها ذالک تقدیر العزیز العلیم سورج اپنی راہ پر گامزن ہے یہ غالب و علیم کا درست اندازہ ہے

؎ کارساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کا ما آزار ما

وہ "الوکیل" سب کا نگہبان ہے۔ جب تک چاہتا ہے وہ اور اس کے مقرر کردہ فرشتے انسان کی حفاظت کرنے میں لگے رہتے ہیں اور جب وہ اپنی حفاظت کو اٹھا لیتا ہے تو پھر کسی صورت کہیں پناہ نہیں ملتی۔

وہ "الوکیل" سب کا ذمہ دار ہے ہر مخلوق کو اس کی ضروریات کے مطابق آلات واعضاء رزاق دیئے ہیں اور جب چاہتا ہے ان پر مسلط ہو کر سب کچھ چھین لیتا ہے۔

اَلْوَالِیُ جل جلالہٗ

یہ اسم مبارک قرآن شریف میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ تیرھویں پارے کے آٹھویں رکوع میں ہے۔

وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْءً فَلَا مَرَدَّ لَہٗ وَمَا لَھُمْ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ۔

"جب اللہ کسی قوم کے ساتھ مصیبت کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کو دور نہیں کر سکتا اور خدا کے سوا ان کا کوئی والی نہیں ہوتا"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ گنہگار و معذب قوم کا بھی والی ہے۔ وہ سب کا والی یعنی کارساز ہے۔ ولی وغیرہ اس کے دوسرے **مشتقات** تو بکثرت قرآن شریف میں آئے ہیں مگر یہ اسم مبارک صرف ایک ہی جگہ آیا ہے۔ کارساز صرف اسی کی ذات ہے۔ اس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔ باقی ساری مخلوق کارکن تو ہے۔ مگر کارساز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارے وسائل ہوتے ہوئے بعض اوقات ناکامی ہوتی ہے۔ اگر ہم کارساز ہوتے تو کبھی بھی کسی کو ناکامی کا سامنا کرنا نہ پڑتا اور ہر شخص اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا۔ کامیابی تب ہی ہوتی ہے کہ ہماری کارکنی کے ساتھ اس کی کارسازی لگ جائے ورنہ کامیابی نہیں ہوتی۔ دیکھو ایک کسان پوری تندہی سے بالکل صحیح طور پر کاشت کرتا ہے مگر اس کی کوشش بار آور نہیں ہوتی ایسا کیوں ہے ایسا اس لئے ہے کہ کسان کارکن ہے کارساز نہیں ہے۔ کارسازی اس نے اپنے دست قدرت میں رکھی ہے جسے چاہتا ہے کامیاب کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کا والی نہیں بنتا۔

ایک شخص کارخانہ لگاتا ہے ہر طرح صحیح کام کرتا ہے آگ لگ جاتی ہے اور اس کا کارخانہ تباہ ہو جاتا ہے وہ صرف کارکن تھا کارساز نہ تھا اگر کارساز ہوتا تو نفع ہی نفع ہوتا اس کارساز نے اس کی کارسازی نہیں کی تو برباد ہو گیا اس کی سب مشینری بیکار گئی اور اس کے کارندوں کی مہارت کسی کام نہ آئی۔

ایک تاجر بالکل صحیح طور پر تجارت کرتا ہے۔ نفع کماتا ہے۔ خوب کاروبار پھیلاتا ہے کہ ایک رات چور سارا مال صاف کر جاتے ہیں تاجر کار ساز نہ تھا کار کن تھا لہٰذا نقصان کو روک نہ سکا۔

اسی طرح ایک بادشاہ پوری طرح اپنی فوج کو لیس کر کے دشمن کے مقابلے پر بھیجتا ہے جو دشمن بہت کمزور کم سامان اور کم نفری والا ہوتا ہے مگر اسے شکست فاش ہو جاتی ہے اگر بادشاہ کارساز ہوتا تو شکست نہ ہوتی وہ تو صرف کار کن تھا لہٰذا شکست کھا گیا۔

ہم، ہماری مشینیں، کارخانے، انجن، ریلیں، ہوائی جہاز، بندوقیں، مشین گنیں یہ سب کار کن ہیں۔ کارساز نہیں ہیں۔ معالجوں، طبیبوں، ڈاکٹروں کی تدابیر آپریشن اور دوائیں سب کار کن ہیں کارساز نہیں ہیں ورنہ کبھی کوئی بادشاہ یا امیر بیمار نہ ہوتا یا نہ مرتا۔

یہ سارے کار کن اسی وقت کار گر ثابت ہوتے ہیں جب اس "الوالی" کی کارسازی ان کے ساتھ لگ جاتی ہے ورنہ سب بالکل فیل اور غیر موثر ثابت ہوتے ہیں۔ کام جب ہی بنتا ہے کہ وہ کارسازی کرے اور شفا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کی کارسازی دوا علاج کا ساتھ دے ورنہ ساری دوائیں بے کار بلکہ الٹا اثر کرتی ہیں۔ دنیا میں سینکڑوں مثالیں ایسی ہوئی ہیں کہ طبیب حیران رہ گئے کہ ہماری دوا نے الٹا اثر کیوں کیا یعنی ایسا تو ہوتا ہے کہ دوا اثر نہیں کرتی مگر الٹا اثر کرنا یہ عجیب سی بات اور حیران کن ہوتی ہے مولانا رومؒ نے بجا فرمایا ہے۔

؎ چون قضا آید طبیب ابلہ شود — روغن بادام ہم خشکی کند

"جب موت آجائے تو طبیب بے وقوف ہو جاتا ہے روغن بادام بھی خشکی کرتا ہے"

آپ سوال کریں گے کہ اگر وہ ہمارا کار ساز ہے تو ہم مبتلائے مصائب کیوں ہوتے ہیں؟ بیمار کیوں پڑتے ہیں؟ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟ رنج و آلام میں مبتلا کیوں ہوتے ہیں؟ کیا کارسازی ہوئی؟

بات یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ کافر مومن ہر فرد کا والی

ہے جیسے وہ سب کا رزاق ہے مگر اس کی ہر صفت ہر آن ہر فرد کے ساتھ نہیں گئی اگر ایسا ہوتا تو نظام عالم ہی نہ چلتا ہر طرح ہر فرد کو کامیابی ہی کامیابی ہوتی تو بتاؤ کائنات کا نظام کیسے چلتا کامیابی و ناکامی ہی سے نظام عالم قائم ہے۔ اگر ناکامی ہی ناکامی ہوتی تب بھی نظام عالم نہ چل سکتا یہی حال کامیابی کا ہے۔ وہ نہ صرف ہمارا تمہارا والی و ناصر ہے بلکہ ساری کائنات کا والی وارث ہے اگر وہ کائنات کا والی نہ ہوتا تو اتنا بڑا نظام ایک آن بھی نہ چل سکتا۔ اتنا عظیم نظام اسی کے والی وحامی ہونے سے چل رہا ہے ایک ذرا سا کارخانہ کسی نگہبان کے بغیر نہیں چل سکتا تو یہ عظیم کارخانۂ قدرت کیسے کسی نگران کے بغیر چل سکتا ہے؟ وہ نباتات' حیوانات و جمادات سب کا والی ہے اور کسی کی زیر ولایت یہ کارخانہ چل رہا ہے۔

وہ ہستی جس نے اتنا عظیم کارخانہ قائم کیا ہے۔ ہمارا ذرا سا دماغ اس کی حکمتوں کو نہیں سمجھ سکتا اس اتنی بڑی کائنات میں ہمارا وجود کیا حیثیت رکھتا ہے ہم اپنے ہی جیسے عقلاء و فلاسفہ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تو اس کی حکمتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جس نے یہ کارخانہ قائم کیا ہے وہی جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئیے اور کیسے کرنا چاہئیے ہم اس کے قائم کردہ نظام کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کی حکمتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ صَاحِبُ الدَّارِ اَدْرٰی بِمَا فِیْهَا۔ ''گھر والا ہی جان سکتا ہے کہ گھر میں کیا ہے''۔

اس عقدے کو میں ایک ذرا سی قریبی مثال سے مزید واضح کئے دیتا ہوں ایک ڈاکٹر یا جراح نشتر مارتا ہے' چیر پھاڑ کرتا ہے یا کوئی عضو کاٹ کر پھینک دیتا ہے یہ ڈاکٹر یا جراح کارساز کہلانے کا مستحق ہے اس کو کارسوز نہیں کہا جا سکتا۔

ٹھیک اسی طرح اس کی کارسازی کبھی بصورت مرض و الم و ضرر ہوتی ہے وہ جو کچھ کرتا ہے ہماری بہتری کے لئے کرتا ہے کبھی مصائب سے ہماری اصلاح مقصود ہوتی ہے اور کبھی ہماری روحانی ترقی مطلوب ہوتی ہے اگر رنج و الم و ناکامی نہ ہوتیں تو ہر انسان فرعون ہوتا اور ''ہم چوما دیگرے نیست'' کا راگ الاپتا۔

وہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے بیوہ' یتیم' غریب' مسکین' ظالم اور چور ڈاکو کیوں بنائے ہیں ان کا وجود بھی نظام عالم چلانے کے لئے ضروری تھا اگر کسی کا

مال چور لے گئے یا آگ لگ گئی یا اولاد مر گئی تو ٹھیک ہی ہوا۔ اللہ کو اس کی اصلاح مقصود تھی یا روحانی ترقی دینا مطلوب تھی۔

ایک شخص نے حرام مال جمع کیا ایک رات چور سارا گھر صاف کر گئے۔ صاحب مال اور اسکے گھر والے رونے لگے لوگ کہنے لگے بڑا ظلم ہوا بے چارے کا سب کچھ چلا گیا مگر اس "الوالی" نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔ چور کی اولاد نے اور خود اس نے بے تحاشا کھایا اور عیش کئے وہ بیمار پڑ گئے۔ بظاہر ظلم ہوا مگر ٹھیک ہی ہوا۔ ڈاکٹروں نے اس چور' رشوت خور یا حرام خور سے بڑی بڑی فیسیں وصول کیں وہ اور اس کے گھر والے پریشان پھرے۔ کوئی مر گیا کوئی معذور ہو گیا یہ جو کچھ اس "الوالی" نے کیا ٹھیک ہی کیا۔ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا گو بظاہر ظلم ہوا۔ ڈاکٹر مر گیا اور اس کی ساری دولت نیک وارثوں کو پہنچ گئی۔

اس طرح نفع و نقصان کا لمبا سلسلہ چلتا رہتا ہے کوئی کیا جانے کیا ہو رہا ہے۔ مگر درحقیقت ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔ کسی کا اکلوتا جوان بیٹا مر جاتا ہے وہ ساری عمر روتا رہتا ہے اللہ کو اسے روحانی ترقی دینی مقصود ہوتی ہے۔ الغرض وہ "الوالی" بہر صورت ہمارا والی و حامی ہے۔

وہ "الوالی" سبھوں کا والی وارث ہے خواہ جمادات ہوں یا نباتات و حیوانات ان جڑی بوٹیوں اور درختوں میں بھی روح ہے ان کے بھی جذبات ہوتے ہیں انہیں بھی خوشی و غم لاحق ہوتا ہے ہرن کسی جڑی بوٹی کو کھا جاتا ہے تو اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے وہ سوچتی ہے مجھ پر بڑا ظلم ہو رہا ہے کہ ہرن کے جبڑے میں بری طرح پستی جا رہی ہوں۔ یہ تکلیف برحق ہے مگر یہ بات بھی برحق ہے کہ وہ اب عالم نباتات سے ترقی کر کے عالم حیوانات میں داخل ہو گئی۔ ہرن کو شیر کھا گیا۔ وہ سوچتا ہے بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ مگر اسے یہ معلوم نہیں کہ پہلے وہ بے بس ہرن تھا اور اب ایک طاقتور شیر بن گیا ہے۔

کبھی عاملانِ قضاء و قدر کسی کے سارے کاروبار کو برباد کر دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سے بہتر کام کرے اگر برباد نہ کرتے تو وہ دوسری راہ اختیار نہ کرتا اسے اپنے کاروبار کی تباہی پر رونا آتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد ہنستا ہی رہتا

ہے۔

دیکھتے نہیں ہو جب نئی تعمیر کرنا چاہتے ہو تو پہلے پرانی عمارت کو برباد کر دیتے ہو۔

کارسازما، بفکر کارما   فکرما، در کارما، آزما

ہمارا کارساز ہمارے کام کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ہمارا اپنے کام کے بارے میں فکر کرنا باعث تکلیف ہے۔

*

الولی جل جلالہٗ

وہ ''الولی'' سب کا رازق' خالق' منعم' رب مالک' مغنی' معطی' نافع' ستار' شافی' کافی' سلام' مئومن' مہیمن' وہاب' مصور' باسط' رافع' معز اور الرحمان ورحیم ہے۔ خواہ وہ کافر ہو' مشرک ہو یا مومن ہو' فاسق ہو یا متقی مگر ولی صرف مومن و متقی کا ہے۔ اور کسی کا ولی نہیں۔ یہ خصوصیت صرف مومن و متقی کی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اللہ مومنوں کا دوست ہے۔ نیز فرماتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ

اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مدد گار نہیں۔ اس قسم کا مضمون قرآن شریف میں کئی جگہ آیا ہے بعض مقامات پر بعینہ یہی الفاظ ہیں۔ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) اللہ مومنوں کا دوست ہے انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لاتا ہے اور کافروں کے دوست شیطان ہیں۔ انہیں نور سے تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ (پ ۳ ع ۲)

اسی پارے کے پندرھویں رکوع میں ہے۔ **وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ترجمہ۔ اگر آپ نے کفار کی خواہشات کی اتباع کی اس علم کے پہنچنے کے بعد جو آپ کو ملا ہے تو اللہ آپ کا دوست اور مدد گار نہیں رہے گا۔ (پ ۱۳۔ ع۔ ۱۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر مومن خواہ وہ کیسا ہی متقی کیوں نہ ہو۔ حکم الٰہی سے سرتابی کرے گا تو دوستی کا رشتہ منقطع ہو سکتا ہے الا یہ کہ وہ غفور و

غفار و تواب درگزر فرمائے بڑے بڑے انبیاءؑ اولیاءؒ کی گرفت کی گئی ہے اس کی دوستی پر مغرور و مامون ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کثرت قیام و درد سے متورم ہو جاتے (سوج جاتے) تو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرض کرتیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنے کو اس قدر ہلکان کیوں کرتے ہیں؟ تو فرماتے (ترجمہ) کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

پندرھویں پارے کے سولھویں رکوع میں ہے۔

ترجمہ۔ ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں۔ اکیسویں پارے کے چودھویں رکوع میں ہے۔

ترجمہ۔ اس کے سوا نہ تمہارا کوئی دوست ہے نہ ہی مدد گار۔ ایسا ہی مضمون پارہ نمبر سات رکوع ۱۴ میں ہے۔ وہاں ما لکم کی جگہ مالھا ہے۔

پچیسویں پارے کے اٹھارویں رکوع میں ہے۔

ترجمہ۔ اللہ پرہیز گاروں کا دوست ہے۔ پچیسویں پارے کے چھٹے رکوع میں ہے۔

ترجمہ۔ جسے خدا گمراہ کر دے تو پھر اس کا کوئی مدد گار نہیں۔

اس سے چند آیات کے بعد ہے۔

ترجمہ۔ خدا کے سوا ان کے کوئی حمایتی نہ ہوں گے کبھی تن تنہا ایک دوست کئی دوستوں کے برابر ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ترجمہ۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

ہر جگہ اپنے لئے مفرد ولی استعمال کیا ہے مگر اس آیت میں اپنے لئے اولیاء لائے ہیں کہ دنیوی دوستی اور طرح کی ہو گی اور آخرت کی دوستی اور طرح کی تو گویا دو دوست ہو گئے۔ حیات دنیوی میں اس دوست سے تکالیف بھی پہنچ سکتی ہیں۔

مجھے یہ آیت بڑی اچھی لگتی ہے جو ہستی دنیاوی زندگی میں بھی دوست ہو اور اخروی زندگی میں بھی تو پھر انسان کو اور کیا چاہیئے تو پھر کسی دوست کی اور کیا ضرورت ہے؟ اور پھر دنیا و آخرت کے بعد رہ بھی گیا کیا؟

اولیاءؒ کے لفظ پر کچھ کچھ مزے دار باتیں یاد آگئیں۔ لکھے دیتا ہوں۔ پرانے زمانے میں جب تعلیم عام نہیں تھی تو لوگ حافظ قرآن کو نہ معلوم کیا سمجھتے تھے۔ جس نے نورنامہ کلاں اور قرآن پڑھ لیا وہ بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ یہ دور شارٹ ہینڈ کا ہے۔ قرآن بھی بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ پہلے زمانوں میں قرآن بڑے لمبے چوڑے اور بھاری بھر کم ہوتے تھے۔ ایک ان پڑھ بڑھیا کا بیٹا "نورنامہ کلاں" اور قرآن وغیرہ پڑھ گیا تھا تو کہنے لگی میرا بیٹا چکی سا قرآن پڑھ گیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں اولیاء نہ ہو جائے۔ "نورنامہ کلاں" "قصۂ ہرنی" اور "معجزہ آل نبی" کیا کیا پڑھ گیا ہے۔

کبھی کبھی ہمارے مطب میں عبدالمجید صدیقی ایڈووکیٹ تشریف لاتے ہیں تو میں بعض سمجھدار اور تعلیم یافتہ مریضوں سے کہا کرتا ہوں ان سے دعاء کراؤ۔ یہ وکیل صاحب اولیاء ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں سے اس لئے کہتا ہوں کہ گریجویٹ لوگ ہی میری یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ وکیل کی صورت ایسی بن سکتی ہے کہ وہ اولیاء بن جائے۔

ایک دفعہ وکیل صاحب فرمانے لگے آپ مجھے اولیاء کہتے ہیں میں تو ولی بھی نہیں پھر یہ کہ آپ غلط اردو بولتے ہیں۔ میں نے کہا میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ "دلی کی زبان" سب سے مستند ہے آپ نے دیکھا نہیں کہ دہلی کے ایک اسٹیشن کا نام "حضرت نظام الدین اولیاءؒ" ہے اور پھر دیکھئیے بوڑھی نے بھی اولیاءؒ ہی کا لفظ استعمال کیا۔ ہم کیا کریں۔ اردو والوں نے اولیاء کو مفرد معنوں میں بھی استعمال کیا ہے بالخصوص عوام تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں فلاں شخص اولیاء ہے۔

میں جس کسی بھی وکیل، بیرسٹر، مجسٹریٹ یا جج سے ملا اسے قوت ایمانیہ سے محروم پایا یعنی یہ لوگ کسی شخصیت پر شاذونادر ہی ایمان لاتے ہیں کیونکہ ان کا واسطہ حاجیوں۔ نمازیوں۔ پیروں۔ فقیروں اور سجادہ نشینوں سے پڑتا ہے اور اکثر خوب جھوٹ بولتے ہیں۔ تو جس شخص کو لاہور کی پوری ضلع کچہری ولی مانتی ہو اس کی ولایت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ وہ اچھے خاصے وکیل تھے چار پانچ سو

روپے کی آمدنی کو تو کوئی ولی اللہ ہی ٹھکرا سکتا ہے۔ کسی نے علامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ ولی کی کیا پہچان ہے؟ فرمایا جو پیسے کو ٹھکرا دے وہ ولی ہے۔ وکیل صاحب کی تو "تکبیر اولیٰ" بھی کبھی فوت نہیں ہوتی تو ہم انہیں ولی کیسے نہ مانیں؟ ہم تو جماعت تک سے محروم ہیں ہمیں تو یہ بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ولی کی یہ پہچان ہے کہ اسے دیکھ کر خدا یاد آئے۔ ہم جیسے بے خدا لوگ جب انہیں دیکھتے ہیں تو خدا یاد آتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت تلاش کیا کہیں بھی ولی اللہ نہیں ملتا۔ ایسے لوگوں سے میں کہا کرتا ہوں کہ خدا کی زمین خالی نہیں ہر ملک اور ہر شہر میں اولیاء اللہ ہیں۔ مگر ہر شخص نے اپنا ایک معیار بنا رکھا ہے اور اپنے اس غلط معیار پر جانچ کر برگشتہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے کرامات کو سب سے بڑا معیار بنا رکھا ہے۔ حالانکہ کرامات معیار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک فضیلت ہے جسے اللہ دے دے۔

ایک شخص بڑا کبیدہ خاطر ہو کر مایوسانہ صورت بنا کر کہنے لگا۔ ہم نے بہت تلاش کیا کہیں بھی کوئی ولی اللہ نہیں ملا۔ میں نے کہا نا امید کیوں ہوتے ہو۔ مجھے دیکھ لو میں ولی اللہ ہوں! کہنے لگا تو کوئی کرامت دکھاؤ! میں نے کہا میں کوئی بازی گر ہوں کہ تجھے کوئی شعبدہ دکھاؤں؟ یا کوئی پیغمبر ہوں کہ لوگوں کو معجزے دکھاتا پھروں اور ان سے مطالبہ کروں کہ میری پیغمبری پر ایمان لاؤ۔ ہم ولی اللہ ہیں کوئی مانے یا نہ مانے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں کیا ضرورت لوگوں سے اپنی ولایت کو تسلیم کراتے پھریں بھائی یہ ولایت ہے۔ رسالت نہیں۔ رسالت کو ضرورت پڑتی ہے کہ معجزات دکھا کر انہیں مومن بنائے۔ سنو کچھ منطق پڑھی ہے؟ انسان یا عدو اللہ ہو گا یا ولی اللہ۔ ظاہر ہے کہ میں عدواللہ نہیں تو لازماً" ولی اللہ ہوا۔ کیونکہ **اِرْتِفَاعِ نَقِیْضَیْن** محال ہے۔ ہر مومن متقی ولی اللہ ہے اور اللہ اس کا ولی ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ایک سے نہیں۔ جس کا دوست اللہ ہو گا وہ اللہ کا دوست یعنی ولی اللہ ضرور ہو گا کیونکہ عدو اللہ کا اللہ دوست نہیں ہو سکتا۔

سنا ہے کہ شیخ چلیؒ نے دعوی کیا کہ میں اور میری بیوی دونوں ولی اللہ

ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کیسے؟ فرمایا میں کہتا ہوں آج بارش ہو گی اور میری بیوی کہتی ہے آج بارش نہیں ہو گی تو کبھی اس کی بات سچی نکلتی ہے کبھی میری لہٰذا ہم دونوں ولی اللہ ٹھہرے۔

اولیاءؒ، علماءؒ، صلحاءؒ بھی آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہیں مگر ان کی ہنسی مذاق کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے وکیل صاحب جب بھی میرے مطلب میں تشریف لاتے ہیں میں ان سے اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں لاہور کا ابدال ہوں وہ ہمیشہ اس فقرے کے جواب میں اپنا ایک پیٹنٹ فقرہ کہا کرتے ہیں۔ میں نہ مانوں میں نہ مانوں۔

ایک دفعہ میں نے وکیل صاحب سے کہا بھائی کچھ تو منہ ملاحظہ کر لیا کرو۔ ہم تو سارے جہان میں آپ کی ولایت کاڈنکا بجاتے پھرتے ہیں اور آپ ہیں کہ بالکل صاف اڑا دیتے ہیں۔ ذرا کچھ تو دیدوادید چاہیئے فرمانے لگے میں نہ مانوں میں نہ مانوں میں نے کہا آپ اس روز مانیں گے جب میں لاہور سے آپ کا تبادلہ کر دوں گا۔

؎ تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

وکیل صاحب آپ کا ہمارا معاملہ اس فلسفی کا سا ہے کہ حاضرین جلسہ نے ایک فلسفی کی بڑی تعریف کی۔ تو وہ بڑی بے پروائی سے ان کی تعریف سنتا رہا۔ کسی نے حاضرین میں سے اس سے پوچھا۔ جناب آپ اپنی تعریف سن کر کچھ خوش نہیں ہوئے کہنے لگا کیا خوش ہوتا۔ یہ سب بے وقوف ہیں۔

سارے مداح اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ یہ فلسفی بھی بڑے ہی خشک مزاج ہوتے ہیں۔ ظالم نے کچھ بھی رکھ رکھاؤ سے کام نہ لیا۔ یہی حال وکیل صاحب کا ہے۔ کہ ہم تو ساری دنیا میں ان کی تعریف کرتے پھرتے ہیں اور وہ ہماری بات فوراً ہمارے منہ پر مار دیتے ہیں۔

وکیل صاحب نے عرصہ دراز ہوا ایک کتاب "رویائے صالحہ" لکھی تھی۔ تب سے ان سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔

پھر انہوں نے "سیرت النبی بعد از وصال النبی" (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھی تو لوگوں

کی آنکھیں کھل گئیں اور لوگ ان کے پاس زیارت و دعاء کے لئے آنے لگے۔ پھرانھوں نے "زیارت نبی بحالت بیداری" لکھی تو سب حیران رہ گئے۔ وکیل صاحب تو چھپے ہوئے رستم نکلے۔ آج کل وہ کوئی اور دھماکہ خیز کتاب لکھ رہے ہیں۔ کئی بار پوچھا۔ کیا عنوان ہے مگر بتاتے ہی نہیں۔ ان کی کتابوں کو پڑھ کر بریلوی علماء حیران ہیں کہ ہم دیو بندیوں کو کیا سمجھتے تھے۔ ان کے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مضبوط روابط نکلے اور دیوبندی حیران ہیں کہ ہم بریلویوں کو کیا کچھ کہتے تھے یہ تو مقربین بارگاہ رسالت سے ہیں۔

بڑی مشکل ہے کہ وکیل صاحب کسی کو لفٹ ہی نہیں دیتے۔ بس چھپے چھپے پھرتے ہیں۔

؎ کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

وکیل صاحب بڑے صحیح العقیدہ غیر متعصب' اچھے مقرر ذہین اور مصنف ہیں اس کے علاوہ ماہر علوم و فنون اور وسیع العلم ہیں۔ میں ان سے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ میں لاہور کا "ابدال" ہوں۔ آپ کو لاہور کا "صاحب خدمت" بنانا چاہتا ہوں آپ مسجد شہداء میں درس قرآن دیا کریں کیونکہ یہ جتنے بھی لوگ مختلف مساجد و مراکز اور ریڈیو پر بول رہے ہیں ان سب سے آپ بہتر ہیں تو وہ مانتے ہی نہیں۔ ہمیشہ یہی کہتے ہیں مولانا مجھے گوشۂ گمنامی ہی میں پڑا رہنے دیجئے۔

آج کل تو پانچ چھ ہزار کی کوئی وقعت ہی نہیں تقسیم ملک سے پہلے وہ مشہور عالم سمپسن دواساز کمپنی کے مینجر تھے اور پانچ چھ ہزار تنخواہ پاتے تھے۔ پھر وہاں سے استعفیٰ دے کر وکالت شروع کر دی۔ پھر اس پر بھی لات ماردی۔ وہ سائنس کے طالب علم بھی رہے اور طبابت سے بھی خوب واقف ہیں۔ مسائل حاضرہ پر ان کی بڑی نظر ہے۔ میں کہتا ہوں آپ بھی ریڈیو پر بولا کریں تو سنی ان سنی برابر کر دیتے ہیں۔

وہ کبھی کبھار ہمیں اپنے مضامین بغرض افادہ سنایا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ تشریف لائے کہ مجھے آپ کے بیٹے سلیم کو ایک مضمون سنانا ہے۔ میں نے کہا اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے سنائیں فرمانے لگے وہ سائنس سے متعلق ہے۔ آپ

کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں نے کہا یہ تو آپ میری توہین کر رہے ہیں مجھ جیسا عالم تو نہ کوئی ہے نہ ہوا نہ ہو گا۔ فرمانے لگے میں نہ مانوں میں نہ مانوں۔ (یہ گفتگو دوستانہ مزاح اور دل لگی کی ہے)

ایک یہودی کسی جاہل مسلمان سے کسی مسئلہ پر بحث کر رہا تھا اللہ کی شان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ فرمایا۔ اس سے نہیں مجھ سے پوچھ وہ کہنے لگا۔ آپؓ تو علامہ ہیں فرمایا **ان تسئل عالما اجدی لک** "عالم سے دریافت کرنا تیرے لئے زیادہ فائدہ مند ہے"۔

تو میں نے وکیل صاحب سے عرض کیا وہ مضمون مجھے سنایئے۔ آپ کو فائدہ ہو گا۔ فرمانے لگے نہیں۔ عجیب بات ہے وکیل صاحب مجھے تو ولی اللہ تسلیم نہیں کرتے مگر میرے بیٹے کو ولی اللہ مانتے ہیں شاید انہوں نے کہیں پڑھ لیا ہو گا۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است

اولیاء اللہ (اللہ کے دوستوں) کو محشر کے ہولناک مناظر کا کوئی خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر وہ غمگین ہونگے۔ (القرآن) ان کی پہچان اگلی آیت میں یہ بیان کی ہے کہ مومن متقی اللہ کا ولی ہوتا ہے۔ ایمان و تقویٰ کے درجات ہیں چنانچہ جس درجہ کا ایمان و تقویٰ کسی میں ہو گا اس درجہ کی ولایت اس کو حاصل ہوگی۔ اولیاء مانگتے نہیں ہیں۔

***

الوہاب جل جلالہ

اس "الوہاب" کی سب سے بڑی مَوْہَبَتِ عظمیٰ اور نعمتِ کبریٰ یہ زندگی ہے جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، چلتی پھرتی، سمجھدار زندگی۔ اگر یہ زندگی پتھروں جیسی زندگی ہوتی تو ہم ایک جگہ پڑے رہتے ہمیں دنیا اور دنیا کی باتوں کا کچھ علم نہ ہوتا ہم دنیا کی رعنائیوں سے لطف اندوز نہ ہو سکتے نہ نسیم سحری کو جانتے نہ باد و باراں کو اور اگر نباتات جیسی زندگی ہوتی تو کہیں بھی آ جا نہ سکتے اور دنیا بھر کی سیر نہ کر سکتے۔

یہ زندگی جو اس نے ہمیں بخشی ہے کتنی بڑی نعمت ہے پھر یہ نعمت بخش کر ہمیں ساری زمین، دریاؤں اور پہاڑوں کا مالک بنا دیا ہے ہم جہاں چاہیں رہیں، سیر کریں، فضاؤں اور ماحول سے لطف اندوز ہوں، پہاڑوں پر چڑھیں، دریاؤں اور سمندروں میں تیرتے پھریں اور ملکوں ملکوں کی سیر کریں پھر ساری دنیا کو ہماری خدمت پر لگا دیا جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہوں یا کائنات، سب کو ہمارے لئے مسخر کر دیا۔ ہم جس پر چاہیں حکومت کریں اور جس سے چاہیں کام لیں۔ کوئی ہمارے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ حیوانات ہماری خدمت پر مامور ہیں۔ نباتات ہمیں سایہ، ہوا اور خوراک وغیرہ مہیا کرنے پر مامور ہیں اور جمادات کو ہم جیسے چاہیں کام میں لائیں۔

اس بھری پری کائنات سے ہٹ کر ہم خود اپنے اندر جھانکتے ہیں تو بے شمار نعمتیں اس "الوہاب" کی اپنے اندر پاتے ہیں کوئی ہمارے لئے دیکھتا ہے، کوئی بولتا ہے، کوئی سونگھتا ہے، کوئی چکھتا ہے، کوئی گرفت کرتا ہے، کوئی ہمیں لے کر چلتا ہے، کوئی سنتا ہے، کوئی سوچتا اور سمجھتا ہے کوئی غذا ہضم کرتا ہے، کوئی خون بناتا ہے، تو کوئی جسم سے غلاظتوں کو دفع کرتا رہتا ہے۔

اس کی بخشی ہوئی بیشتر نعمتیں ایسی ہیں جو مادی ہیں اور حواس خمسہ سے محسوس کی جا سکتی ہیں مگر بہت سی نعمتیں ایسی بھی ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں جیسے عقل، ذہانت اور روح وغیرہ۔

ہمیں اس نے اخلاق حسنہ سے بہرہ ور کیا جیسے شجاعت، سخاوت اور صداقت وغیرہ کہ اس کے یہ عطیے دکھائی تو نہیں دیتے مگر ہمارے اندر ہیں اسی طرح کائنات میں بھی اس نے ایسی بہت سی نعمتیں پیدا کی ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں یا جن کا ہمیں بالکل کوئی احساس نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ اس کے محافظ فرشتے ہیں جو ہماری خدمت کرتے ہیں ہم سے بلاؤں کو دفع کرتے ہیں اور کچھ ارواح و معانی و الفاظ ایسے ہیں جو ہمیں غلط راہ پر چلنے سے روکتے ہیں ہمیں سیدھی راہ دکھاتے ہیں اور خطا سے بچاتے ہیں۔

اس دور کے انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے ایسی نعمتیں عطا کی ہیں جو پرانے زمانوں کے بلکہ ایک صدی پہلے کے بھی بڑے سے بڑے بادشاہ کو میسر نہ تھیں اگلے وقتوں کے لوگوں کو یہ سہولت کہاں میسر تھی کہ ذرا بٹن دبایا اور گھر بقعۂ نور بن گیا نہ دھواں نہ بدبو نہ دھیمی روشنی ذرا بٹن دبایا اور جنت کی ہواؤں کا دروازہ کھل گیا جب چاہو کمرہ گرم کر لو جب چاہو سرد کر لو، دنیا بھر کے مناظر اور اشیاء کو پل بھر میں دیکھ لو دنیا بھر کی آوازیں سن لو دور بیٹھے دوستوں سے باتیں کر لو ذرا تکلیف ہو دوا کھا لو اور درد دور۔ چوڑھے چماروں تک کو یہ آسانی حاصل ہے کہ دنیا بھر کے بہتر سے بہتر پروگرام اور مناظر دیکھ سکیں۔ اور گھر بیٹھے دنیا کی سیر کر سکیں۔ امراض سے بچنے کے لئے طرح طرح کی مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں پہلے زمانے کے بادشاہ اندھے ہو گئے تو بس ہو ہی گئے۔ معذور ہو گئے تو مجبور ہو کر بیٹھ رہے مگر اب تو دانت آنکھ اور پاؤں وغیرہ بازار سے خرید کر فٹ کرالو۔ نگاہ خراب ہو جائے تو چشمہ لگا لو دل بہلانے کے بیشمار سامان ہیں اور آنے جانے کی بڑی سہولتیں ہیں زمین کی طنابیں اس قدر سکڑ گئی ہیں کہ جن ممالک کا سفر مہینوں میں طے ہوتا تھا اب منٹوں میں طے ہوتا ہے قسم قسم کے پھل، مٹھائیاں اور کھانے افراط کے ساتھ میسر ہیں۔

دور دراز کے ملکوں کے پھل اور کھانے باسانی میسر آ سکتے ہیں کسی بادشاہ کو اگر انگور کھانے کی خواہش ہوتی تھی تو دوسرے ملک سے منگانے میں پندرہ بیس دن لگ جاتے تھے۔

انسان جس قدر ترقی کرتا جائے گا نئی نئی نعمتوں سے سرفراز ہوتا جائے گا۔ سیر افلاک و قمر کے بعد ایسی بہت سی نعمتوں کا انسان کو علم ہوا ہے جن کا اسے پہلے علم نہ تھا اور آئندہ دوسرے ستاروں کے مسخر کرنے پر اسے نہ معلوم کس قدر اور نعمتیں ملیں گی۔ اسی طرح اس کی بے شمار نعمتیں اس سرزمین پر بھی ایسی ہیں جن کا انسان کو علم نہیں لہٰذا وہ اس "الوہاب" کی بہت سی عظیم موہبت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا یا اسے وہ پہنچتی تو ہیں اور وہ ان سے متاثر بھی ہوتا ہے مگر اسے ان کا علم نہیں ہے فضاؤں میں اس کے سینکڑوں خادم ہیں جو خدمت انجام دیتے ہیں مگر ظلوم و جہول انسان ان سے ناآشنا ہے یا ان کا منکر ہے مگر وہ ہیں اور اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔

موہبت الٰہی بے شمار ہیں اور بعض کا ظہور بصورت مصائب و امراض ہوتا ہے اور انجام کار ہمیں یا ہمارے معاشرے کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے مگر انسان گھبرا جاتا ہے۔ ہماری نظر اس کی حکمتوں پر نہیں ہوتی اور ہر معاملے کو آنی اور وقتی طور پر جانچتے ہیں۔ مستقبل سے بے خبر ہوتے ہیں اور وقت و زمان و مکان کے پابند ہوتے ہیں تو رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

جہاں اس نے جسمانی و مادی لذتیں پیدا کی ہیں روحانی لذتیں بھی بے شمار ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی لذت علم ہے جس کے لئے اہل علم جان تک کی پروا نہیں کرتے جب کوئی گتھی سلجھاتے ہیں تو روح تر و تازہ اور ہشاش بشاش ہو جاتی ہے کیونکہ علم غذائے روح ہے اسی لئے بہت سے اہل علم نے نان جویں پر گزارہ کیا اور دربار شاہی کے حلووں کو ٹھکرا دیا۔ جو لوگ اپنی روح کو بیدار کرنے پر لگ جاتے ہیں۔ گو ان کے اجسام سوکھ جاتے ہیں مگر انہیں ایسی روحانی لذتیں حاصل ہو جاتی ہیں کہ وہ دنیا کی کسی بھی نعمت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں ایک ایسا دائمی سرور رہتا ہے جس کے سامنے سرور شراب کوئی بھی وقعت نہیں رکھتا اور

ایسا سکون قلبی حاصل رہتا ہے کہ کسی بھی بادشاہ کو ایسا سکون ساری زندگی کبھی بھی میسر نہیں آتا۔ شراب کا سرور گھنٹے دو گھنٹے کے بعد ختم ہو جاتا ہے مگر روحانی شراب کا سرور کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کے چہروں پر ایسا سکون ہوتا ہے جو بادشاہوں کے چہروں پر نہیں ہوتا۔ ان باتوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے روح کے بیدار کرنے کے لئے قدم اٹھایا انکے لئے ہر آن اور ہر گھڑی نیا سرور اور نئی راحتیں ہیں۔

ایک دنیا دار انسان ایک سچے پیر صاحب کا مرید ہوا تو ان کے مریدوں سے کہنے لگا

"ارے مجھے معلوم نہ تھا کہ تم لوگ تو حلوے کھا رہے ہو"۔۔ روحانی لذتوں سے آشنا ہوا تو دیکھو کن الفاظ میں اپنی پچھلی محرومیوں اور موجودہ حالت کا اظہار کیا۔

دوا تلخ ہوتی ہے اور آپریشن بے چینی و کرب لاتا ہے مگر انجام سلامتی و صحت ہوتی ہے۔ زندگی اس کی موہبت عظمیٰ ہے مگر موت بھی موہبت کبریٰ ہے اگر موت نہ ہوتی تو ہمارے مصائب و آلام و امراض کسی طرح ختم نہ ہوتے۔ لوگ پتھروں سے سر ٹکراتے پھرا کرتے موت ہماری نجات دہندہ ہے کہ سب تفکرات و آلام سے چھڑا دیتی ہے۔

ارباب دنیا کی نظر ظاہر تک ہوتی ہے جسے لوگ موت کہتے ہیں دراصل حیات ہے اور جسے حیات کہتے ہیں وہ حیات نہیں اک خواب ہے موت ہمیں اس خواب سے بیدار کر دیتی ہے جو کبھی خوش کن ہوتا ہے اور کبھی غم آلود۔ واللہ باللہ موت نہیں یہ تو صرف انتقال ہے ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف انتقال بخدا کوئی بھی انسان کبھی نہیں مرتا۔ ایک ایسا عالم جو زمان و مکان وغیرہ کی قیود سے آزاد ہے اور اس گندی دنیا سے بہتر ہے مل جاتا ہے۔

؎ مرنے والے تجھے مرنے کا بھی کچھ ہوش نہیں
ماں کا آغوش ہے یہ موت کا آغوش نہیں

مصر کے مشہور رسالے "الہلال" نے مشاہیر سے یہ درخواست کی تھی کہ

وہ اس بارے میں مقالات تحریر کریں کہ جن جانوروں کو ہم ذبح کرتے ہیں آیا یہ ظلم ہے؟ تو اکثریت نے یہ جواب دیا کہ ہم انہیں ذبح کرتے ہیں تو ہم انہیں دنیوی تکالیف سے نجات دلا دیتے ہیں یعنی ہم ان کے نجات دہندہ ہیں۔ یہی حال موت کا ہے کہ یہ ہماری نجات دہندہ ہے۔ میرے وہ عزیز و اقارب جو کب کے مر چکے میری ان سے ملاقات ہوتی ہے اگر واقعتاً وہ فنا ہو چکے تھے تو ملاقات کیسی؟ ملاقات تو اس ذات سے ہو سکتی ہے جو وجود رکھتی ہو' معدوم سے تو ملاقات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا' ملاقات کے لئے ایک نہیں دو شخصیتوں کا وجود ضروری ہے' اگر ہمارا اپنا وجود مسلم ہے تو بلاشبہ ان کا وجود بھی مسلم و موجود ہے۔

جب رات گئے ہمارا جسم مرجاتا ہے تو ہماری روح زندہ ہو جاتی ہے اور جب صبح دم جسم زندہ ہو جاتا ہے تو روح مردہ ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح جب حقیقی موت طاری ہو جائے گی تو روح اپنی پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہو جائے گی اسے ہم جسم کی موت کہہ سکتے ہیں روح کی موت نہیں کہہ سکتے موت ہماری روح کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتی جسم کے مرنے پر ہماری روح کو پر پرواز مل جاتے ہیں اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جسے لوگ موت کہتے ہیں وہ دراصل انتقال ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

کسی زمانے میں عام لوگوں کی طرح میں موت سے بہت زیادہ ڈرا کرتا تھا مگر جب سے موت کے بارے میں میری غلط فہمی کا ازالہ ہوا میں ہر وقت بخوشی موت کو گلے لگانے کے لئے تیار رہتا ہوں کہ اس گندگی بھری دنیا سے نجات حاصل ہو اس عالم میں بھی ہمارے عزیز و اقارب اور دوست احباب بکثرت ہیں اور یہاں سے زیادہ ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ اچھے ہیں وہاں بھی ہمارا ایک کنبہ آباد ہے۔

؎ خرم آں روز کزیں محفل ویراں بروم

وہ میری سب سے بڑی خوشی کا دن ہو گا جو لوگوں کے لئے سب سے بڑے غم کا دن ہوتا ہے جس سے لوگ بھاگتے ہیں۔ نفرت کرتے ہیں اور کتراتے ہیں۔ کسی نے اسی جیسی ذہنیت رکھنے والوں کے لئے کہا ہے

ے نشان مرد مومن باتوگویم

کہ چون مرگ آید تبسم برلب اوست

میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے اکثر لوگوں کو میں نے جانچا اور اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا کہ مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا عوام و خواص سب خدا کی محبت کا دم بھرتے ہیں مگر اس سے ملنا کوئی بھی نہیں چاہتا ایک دو صاحبوں سے میں نے پوچھا بھی کہنے لگے اپنے اعمال سے ڈر لگتا ہے۔

اعمال کا بہانا کرتے ہیں وہاں تو کوئی بھی جانا نہیں چاہتا گو کا کیڑا گو ہی میں خوش رہتا ہے۔ خاکی خاک میں رہنا چاہتا ہے اس سے ملنے کی تڑپ جیسی صحابہؓ و تابعینؒ میں دیکھی کسی میں نہ دیکھی کہ شادی کی پہلی ہی صبح میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ خدا سے جا ملے اور خوشی خوشی جان دی۔

"فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ"

***

الھادی جل جلالہ

"ھاد" اور "ھادی" قرآن شریف میں آٹھ جگہ آیا ہے اور "ھادیا" ایک جگہ پارہ انیسواں رکوع نمبرا میں ہے۔ **وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا**" تمہارا پروردگار ہدایت دینے والا اور مدد گار کافی ہے۔

یھدی تھدی۔ نھدی۔ ھدوا۔ ھادوا۔ ھدیا۔ ھدا۔ وغیرہ بکثرت آتے ہیں۔ وہ فرماتا ہے۔ **یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا** وہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے۔

معلوم ہوا ہدایت و ضلالت اسی سے ہے جیسے خیرو شر بھی اسی سے ہے مگر ہم ادب کی بنا پر اس فعل کی نسبت اس کی طرف نہیں کرتے جیسے خیر کی نسبت تو کرتے ہیں مگر شر کی نسبت نہیں کرتے۔

قرآن شریف میں بہت سی جگہ آیا ہے۔ **وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ**۔ "ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے" ولا یظلم ربک احدا "تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا" **ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ** تم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا تو معلوم ہوا وہ خواہ مخواہ کسی کو گم راہ نہیں کرتا۔ یہی حال **خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** کا ہے کہ خدا نے خواہ مخواہ ان کے دلوں پر مہر نہیں لگا دی یہی حال **وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا**۔ کا ہے۔ جب بارش برستی ہے تو کہیں لالہ و گل اگتے ہیں اور کہیں خس و خاشاک بارش کا پانی ایک ہی ہے فرق صرف زمین کا ہے۔ اگر کہیں خس و خاشاک اگے تو اس میں بارش کی کوئی خطا نہیں۔ پہلی آیت میں جو یہ فرمایا کہ ہم اس قرآن کے ذریعے کسی کو گم راہ کر دیتے ہیں اور کسی کو ہدایت یافتہ تو وہ خواہ مخواہ گم راہ نہیں کرتے ان کی طبائع ہی میں فساد ہوتا ہے۔

"باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس"

اللہ تعالیٰ کسی کو گم راہ نہیں کرتے نہ کسی کے دل پر خواہ مخواہ مہر لگاتے ہیں نہ کسی کے آگے پیچھے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں نہ کسی کی آنکھوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ان تمام باتوں کی جو نسبت اپنی طرف کی ہے یہ ایک طرز کلام تو کلام ہے اور بظاہر یا بباطن ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ پھر جبکہ ہر کام کا مرجع چونکہ ان کی ذات ہے لہٰذا اپنی طرف نسبت کر دی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم گمراہ کرتے ہیں۔ ہم مہر لگاتے ہیں ہم اندھا کر دیتے ہیں وہ خود بخود ایسا نہیں کرتے ہم خود گم راہ ہوتے ہیں۔ ہم خود مہر لگواتے ہیں۔ ہم خود اندھے بنتے ہیں۔ کیونکہ وہ بار بار فرماتا ہے کہ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے۔

آریوں نے اس قسم کی آیات کو لے کر قرآن شریف پر بڑے سخت اعتراضات کئے ہیں وہ سمجھے نہیں یہ تو محض ایک طرز کلام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو ہم نے بیان کی۔ کَلَّا رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اللہ نے ان کے دلوں پر زنگ لگا دیئے ہیں۔ اس نے نہیں لگائے دراصل ان کے دل ہی زنگ آلود ہیں۔ اسے کیا ضرورت کہ وہ کسی کے دل کو زنگ آلود کرے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ میں ظلمت سے نور کی طرف لاتا ہوں اور طاغوت نور سے ظلمت کی طرف لاتے ہیں۔ تو جو ذات اس امر کی دعویدار ہو کہ میں منور کرتا ہوں وہ کیسے کسی کے دل پر زنگ چڑھائے گا وہ کیوں کسی کو گمراہ کرے گی وہ کیسے کسی کے دل پر مہر لگائے گی۔ وہ کیوں کسی کی آنکھوں پر پردہ ڈالے گی وہ کیسے کسی کو آگے پیچھے رکاوٹیں کھڑی کرے گی۔

مخالف کی نظر ہمیشہ عیوب پر جاتی ہے وہ محاسن سے اندھا ہوتا ہے۔ آریوں کو قرآن شریف میں ایسی واضح آیتیں نہ ملیں جن میں لکھا ہے کہ ہم تاریکی سے نور کی طرف لاتے ہیں۔ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے اور دوسری قسم کی آیتیں خوب نظر آئیں۔ حد ہے دیانند سرموتی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جیسی

بے غبار آیت پر چودہ اعتراضات ٹھونک دیئے۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے بڑی کاوش سے عربی کی تحصیل صرف اس لئے کی تھی کہ قرآن پر اعتراضات کریں۔ جب شروع ہی سے نیت خراب ہو گی تو نتیجہ بھی ویسا ہی ہو گا۔

خشت اول چون نہد معمار کج ؎ تا ثریا می رود دیوار کج

"اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو آسمان تک عمارت ٹیڑھی ہی جائے گی"۔

ہمارے ایک دوست جو دہریہ تھے کہنے لگے میں نے تو قرآن کی پہلی سطر ہی پڑھ کر اسے لپیٹ کر رکھ دیا کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا یہ تو کسی اور کا ہے۔ ہم نے دریافت کیا وہ پہلی سطر کونسی ہے۔ کہنے لگے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ شروع کرتا ہوں اللہ رحمان و رحیم کے نام سے یہ ترجمہ دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ تو کوئی اور بول رہا ہے۔ خدا کا کلام ہوتا تو خدا یہ کیوں کہتا کہ میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اس دنیا میں بھانت بھانت کا پنچھی ہے ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنھیں بسم اللہ جیسے جملوں پر شدید اعتراض ہے۔ اگر کوئی خدا کو نہ مانے تب بھی اس جملے کی پاکیزگی میں کیا کلام ہو سکتا ہے اور اگر کوئی شخص خدا کو مانتا ہو۔ جیسے کہ دیانند سرسوتی خدا کے قائل تھے تو اگر کوئی یہ کہے کہ میں اللہ رحمان ورحیم کے نام سے شروع کرتا ہوں تو ایک موحد کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ اسے رحمان و رحیم بھگوان بھی مانتا ہو۔

اسی طرح میرے ایک ذی علم دوست میرے ایک جملے پر بڑے چراغ پا ہوئے میں نے کہا ہم جو کچھ لکھتے ہیں تو اسے گھر گھر پڑھانے نہیں جاتے اس کا یہ مطلب ہے آپ غلط سمجھے تو میں کیا کروں۔ اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاردی وہ گھر گھر تو ہر ایک کو جا کر پڑھانے سے رہا۔

ہدایت کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ہادی درہبر منزل مقصود تک پہنچا دے دوسری صورت یہ ہے کہ سیدھی راہ دکھا دے۔ جیسے کوئی شخص آپ سے پوچھے راہ کی نشاندہی کر دیں۔ پہلی صورت ہدایت کاملہ کی ہے اور دوسری بھی ہدایت کاملہ ہے مگر اس میں بھٹک جانے کا احتمال ہے۔

اس "الھادی" نے دونوں طرح جن و انس کی ہدایت کی ہے کسی کو منزل مقصود تک پہنچا دیا اور کسی کو سیدھی راہ دکھا دی۔ پہلی صورت انبیاءؑ اولیاءؒ اور بعض خاص بندوں کے لئے ہے اور دوسری عام ہے۔ اسی لئے ہر نماز میں اھدنا الصراط المستقیم ہمیں سیدھی راہ دکھا دے تو پڑھتے ہیں۔ اگر کوئی منزل مقصود تک کسی کو سیدھی راہ دکھا دے ایسی صورت میں بھی بھٹکنے کا کوئی احتمال نہیں۔

؎ راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں کوئی راہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

اس "الھادی" کی ہدایت کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ کسی پیر و مرشد سے ملاقات کرا دیتے ہیں۔ کبھی کوئی کتاب یا مضمون ہاتھ میں دے دیتے ہیں کبھی کسی مجلس وعظ میں پہنچا دیتے ہیں کبھی کوئی ناگہانی آفت ڈال دیتے ہیں جس سے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔

ان دنوں کی بات ہے جب شروع شروع پاکستان بنا تھا ایک دفعہ لاہور میں بڑا ہی شدید زلزلہ آیا تھا جس سے میرا ایک پڑوسی بڑا پکا نمازی بن گیا کہنے لگا میں نے کبھی مسجد کا دروازہ نہیں دیکھا تھا زلزلہ آیا تو میں نے سوچا اگر آج مر گیا تو کیا ہو گا میں نے اسی دم توبہ کی۔ اپنی کوتاہی پر اللہ سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ اگر زندہ رہا تو کبھی نماز نہیں چھوڑوں گا۔

بعض لوگوں کے جان و مال اولاد پر تباہی آجاتی ہے تو وہ ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں اور غم کی بھٹی ان کے دل کے زنگ کو دور کر دیتی ہے بعض پر نعمتوں کی بارش ہوتی ہے تو ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں اس قابل تو نہ تھے لہٰذا دینے والے کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

بعض کو خواب میں ہدایت نصیب ہو جاتی ہے ایسے بھی بہت سے واقعات ہوئے کہ انہیں کوئی ایسا خواب نظر آیا جس سے وہ مہر ٹوٹ گئی جو ان کے دل پر لگی ہوئی تھی میری یہ عادت تھی کہ میں عصر و مغرب کے درمیان سیر کرنے کے لئے جایا کرتا تھا اور کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا کہ میں اس دوران میں خدا کے وجود پر دلائل سوچا کرتا تھا تو کبھی مجھے ایسی کوئی دلیل نہ ملی جس سے خدا کا وجود

ثابت ہو سکتا ایک شب میں سویا تو خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تو ہمارا ہے اور ہم تیرے ہیں۔ میں نے سوچا یونہی خیال ہے حسب معمول سیر کے وقت غور کرتا رہا تو روز روشن کی طرح دلائل سامنے آتے چلے گئے۔

سلاسل اولیاءؒ میں ایک سلسلہ عیاضیہ کہلاتا تھا یہ سلسلہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کی طرف منسوب ہے۔ فضیل ڈاکو تھے۔ ایک قافلہ کو لوٹا۔ وہ لوگ نماز پڑھنے لگے جہری نماز تھی امام نے جو سورت پڑھی اس میں ایک آیت یہ بھی تھی **اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَانَزَلَ مِنَ الْحَقِّ۔** "کیا ابھی ایمان والوں کے لئے وہ گھڑی نہیں آئی کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے پسیج جائیں"۔ فضیل نے یہ آیت سنی تو فوراً کہا **بلی قدآن یا ربی۔** پروردگار کیوں نہیں۔ وہ گھڑی آن پہنچی۔ قافلے والوں کا مال واپس کیا توبہ کی اور حضرت جنیدؒ بغدادی سے بیعت کرلی۔ حتیٰ کہ سالار صوفیہؒ بن گئے۔

کبھی کسی شعر غزل یا نظم نے کسی کو راہ ہدایت پر ڈال دیا معلوم نہیں دیوان حافظؒ میں کیا جادو بھرا ہے سیکڑوں اسے پڑھ کر عاشق صادق بن گئے۔ مثنوی مولانا رومؒ نے بھی ہزاروں کی کایا پلٹ دی جیسے کلام قبالؒ نے ان گنت دہریوں کو مسلمان بنایا۔ علی گڑھ جو کفر گڑھ تھا۔ کلام اقبال کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ کوئی مولوی ملا پیر فقیر انگریزی دان بے دینوں کو مسلمان نہ بنا سکا۔ اقبال نے بے شمار کافروں کو حلقہ بگوش اسلام کردیا۔ ایسی ہی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے

شاعری جزویست از پیغمبری الشعراء تلامیذالرحمان۔ شاعری پیغمبری کا جزو ہے اور شعرا تلامذۃ رحمان ہیں۔ مولانا مودودی اور مولانا الیاسؒ کی جماعت کے فیوض سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی موذن کی اذان سن کر داخل اسلام ہو گیا تو کوئی کباب و پلاؤ کھا کر ایمان لے آیا کہ جس مذہب کا کھانا اتنا پاکیزہ ہے وہ مذہب یقیناً ان مذاہب سے بہتر ہے جہاں گائے کا گوبر اور موت کو پاک و صاف سمجھا جاتا ہے۔ کسی کے لئے ایک جملہ کافی ہوتا ہے اور کسی کے لئے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا ذکر ہے کہ محلے کے کچھ اوباش شطرنج کھیلنے میں

مصروف تھے۔ ایک بزرگ نے ان سے کہا ارے تم شطرنج کھیل رہے ہو اور مسلمانوں پر تباہی آرہی ہے۔ ہٹے کٹے جوان ہو تلواریں لو اور مرہٹہ گردی کا مقابلہ کرو۔ یہ ذراسی بات ان کے دل کو کھا گئی اور ان جوانوں نے مرہٹوں کے ساتھ جہاد کیا اور ہزاروں مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔

کہتے ہیں شمس تبریزؒ کی ایک نگاہ نے مولانا رومؒ کو کچھ سے کچھ کر دیا اور امام غزالیؒ کو ان کے بھائی کی نصیحت نے کتابوں سے ہٹا کر حقیقت پر گامزن کر دیا۔

اس ''الھادی'' نے نہ صرف جن وانس کو ہدایت پر لگایا بلکہ آسمان و زمین کی ہر شے کو ہدایت دی۔ اس نے کواکب کو ان کی راہ دکھائی کہ تمہیں اس طرف اور اس طرح چلنا ہے ''وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ'' ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ سورج اپنے مقرر کردہ راستے پر چلتا ہے۔ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ یہ عزیز و حکیم کی تقدیر ہے۔ وَکُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے پر پیدا کیا ہے لَا الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَهَا اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ۔ سورج کی کیا مجال کہ چاند کو پا سکے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ افلاک کو بتا دیا ہے کہ تمہیں کس طرح رہنا ہے۔

اس نے ہمیں شکم مادر سے نکلنے کے لئے راہ سجھائی ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ''پھر اس کے لئے راہ آسان کر دی۔'' اور ہمیں دو پستانوں کی طرف ہدایت کر دی وَهَدَیْنَاهُ النَّجْدَیْنِ ''ہم نے اسے دو پستانوں کی طرف ہدایت کی۔'' ہم نے ان سے رزق حاصل کیا اور پھر وہ رزق اس کی ہدایت کے مطابق ہمارے پیٹ میں کیمیاوی تحلیلات سے گزرا۔ سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ''پچنے والا دودھ پینے والوں کے لئے'' اس کی ہدایت کے مطابق ہمیں شہد پلایا گیا۔ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ان کے شکموں سے نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہیں اور اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے

میں کہا کرتا ہوں یہ انسان عورت کے معاملے میں حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔ بیل بکرے بھینسے حتیٰ کہ کتے تک اس کی ہدایت کے مطابق چلتے ہیں۔ نہیں

چلتا تو یہ انسان نہیں چلتا۔ اسی لئے اس دور میں جنسی و اعصابی امراض عام ہیں اور یہ بے قاعدگی سیکڑوں امراض کا سرچشمہ ہے جو پشت در پشت چلتے ہیں۔ انہیں حرکتوں کی وجہ سے نئی نسل بے حد کمزور ہے۔

اگلے وقتوں میں بوڑھیاں بچوں کو بڑی اچھی لوری سنایا کرتی تھیں۔

"انت "الھادی" انت الحق لیس "الھادی" الاھو الاھو الاھو" اس نے مچھلیوں کو ہدایت کی ہے کہ اپنی نسل کی بقا کے لئے دریاؤں کے کنارے انڈے دو تاکہ تمہارے بچے نکل کر دریا میں آجائیں اس طرح تمہارے انڈے دوسری مچھلیوں کی یلغار سے محفوظ رہیں اور پانی کی موجوں سے انہیں نقصان نہ پہنچے۔ اس طرح بطخیں مرغابیاں اور آبی جانور خشکی میں اپنے انڈے محفوظ کر دیتے ہیں۔

جو بچے انڈے سے نکلتے ہیں انہیں ہدایت کر دی جاتی ہے کہ جب تم کسی قابل ہو جاؤ تو چونچ مار مار کر اس قید خانے سے باہر نکل آؤ کیونکہ اب یہاں تمہارا رزق نہیں رہا۔ جو حشرات الارض اپنے سیل سے نکلتے ہیں۔ انہیں بتا دیا ہے کہ اسے چاٹ چاٹ کر کے باہر نکلو۔ مکڑی کو ہدایت کر دی ہے کہ اپنے انڈوں کے اوپر مضبوط جالا تن دے اور ایک رخ ایسا نازک رکھ دے کہ بچے اسے چاٹ کر باہر نکل سکیں۔ بچوں کو بتا دیا ہے کہ کس طرح تم اپنے دشمنوں سے بچ سکتے ہو اس طرح ہر مخلوق کو گزند سے بچنے کے لئے ہدایت کر دی ہے کسی کو سینگ عطا کئے کسی کو ڈنک کسی کو دانت کسی کو زور دست دیا اور کسی کو ناخن وغیرہ۔

اس "الھادی" نے ہماری ہدایت کے لئے مختلف کتابیں نازل فرمائیں یہ کتابیں زمانے کے مطابق راہیں دکھاتی تھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اس نے ہمارے دماغ میں اپنا ایک رسول مرتکز کر دیا ہے۔ جسے عقل کہتے ہیں۔ عقل کے علاوہ قلب و ضمیر ہے جو ہمیں برائی پر فوراً متنبہ کر دیتا ہے جب ہم اس کی آواز کی پرواہ نہیں کرتے تو وہ مرجاتا ہے۔ عقل تاریک ہو جاتی ہے۔ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ مقدس کتابیں بے معنی رہ جاتی ہیں اور نصائح ضائع ہو جاتی ہیں۔

اس نے ہماری ہر وقت کی مادی ہدایت کے لئے دو آنکھیں عنایت کیں

کہ ایک بیکار ہو جائے تو دوسری کام دے سکے دو کان دیئے کہ ہدایت کی باتیں سنیں اور ہادی کی آواز پر لبیک کہیں سنیں اور اطاعت کی طرف بڑھیں دو پاؤں دیئے کہ اگر ایک بیکار ہو جائے تو دوسرے سے کام لے سکے زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی چل سکے۔

اس ''الھادی'' نے انبیاءؑ و رسلؑ کے بعد بہت سے ہادی بھیجے جو انبیاء کے نائب بنکر تبلیغ و دعوت اور اصلاح کا کام کرتے۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ان میں کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا۔ یہ لوگ اپنی قوم کی اصلاح کے لئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

قرآن نے رسول اللہ کو بھی ہادی کہا ہے آپ کا نام ''الھادی'' بھی ہے معلوم ہوا عبد''الھادی'' بھی ''الھادی'' ہو سکتا ہے۔

***

ضمیمہ

حجاب اندر حجاب

لوگ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات حجاب اندر حجاب ہے۔ حالانکہ انسان خود حجابات میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کی نظروں پر طرح طرح کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور قسم قسم کی شہوتیں اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں جو اس کی بصیرت کو مکدر کرتی رہتی ہیں۔ وہ خود اندھا ہے لہٰذا اسے ذات باری تعالیٰ کے ورے پردے ہی پردے نظر آتے ہیں مگر آنکھوں والے اسے ہر جگہ جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

آنکھوں والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے   دیدۂ کور مگر کیا دل بینا دیکھے

انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ خود وہ اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتا جیساکہ اسے اس کے دوست احباب اور دشمن جانتے ہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہمارے دوست بھی ہمیں اتنا نہیں جانتے جتنا کہ دشمن جانتے ہیں کیونکہ محبت دوستوں کو ہمارے عیوب سے اندھا کئے رکھتی ہے۔ محبت اندھی پیدا ہوئی ہے اور انسان کو اندھا ہی کر دیتی ہے۔ ہمارے بارے میں دشمن کی جو رائے ہوتی ہے وہ قریب قریب صحیح ہوتی ہے۔ ماں باپ اور دوست احباب کی رائے اکثر غلط ہوتی ہے اس نے جگہ جگہ اپنے جلوے بکھیر دیئے ہیں کون کہتا ہے کہ وہ حجابوں میں ہے چاند سورج ستارے چاندنی دھوپ چھاؤں دریا پہاڑ سمندر شجرو حجر جمادات و حیوانات سب میں اس کا جمال چمکتا ہے مگر ضعیف البصر کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکتا۔

انسان اپنے پردوں کو چاک کر کے خود اپنے اندر دیکھے تو اسے اسکا نور چمکتا نظر آئے گا۔ ان گنت رگوں سیکڑوں ہڈیوں اور سیروں گوشت پوست میں لپٹا ہوا انسان آخر رہتا کس جگہ ہے؟ کتنی گندگیوں میں لپٹا ہوا ہے کہ خود اپنی گندگی

سے اس کا دماغ پھٹ جاتا ہے اور طبیعت نفرت کرتی ہے۔ بلغم خون سودا صفراء گندے پانی اور گندے جراثیم کا یہ پوٹلا آخر کس جگہ رہتا ہے؟ اس پر کتنے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اپنے آپ کو دیکھ ہی نہیں سکتا تو خدا کو کیسے دیکھے؟ لہٰذا کہہ دیتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ حجاب اندر حجاب ہے۔ اس پر گندی رطوبتوں کے لیپ چڑھے ہوئے ہیں۔ اگر آنکھوں میں ذرا سا نور نہ ہوتا تو یہ اپنے ڈھانچے کو بھی نہ دیکھ پاتا اور ساری عمر اپنے مادی جسم کو بھی حجابوں میں پاتا حالانکہ اس کا یہ مادی جسم حجابوں میں نہ ہوتا یہی حال ذات باری تعالیٰ کا ہے کہ چونکہ ہمیں وہ نور عطا نہیں کیا گیا جس سے ہم اسے دیکھ پاتے لہٰذا اسے حجابوں میں سمجھتے ہیں اور جن لوگوں کو یہ نور عطا کیا گیا ہے وہ اسے بے حجابانہ ہر جگہ جلوہ گر دیکھتے ہیں اور انہیں بھی جو حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی انہی کے حجابات ہیں۔

اے درد ڈھونڈ آپ ہی میں مثل آئینہ

بیرون در تو اپنی کوئی راہ ہی نہیں

ہمارے نور بصیرت کو کہیں حقہ سگریٹ کا دھواں کالا کر رہا ہے کہیں پان کی پیک داغ دار کر رہی ہے۔ کہیں تمباکو کی بدبو برباد کر رہی ہے۔ کہیں چائے وغیرہ کی لت اسے لت پت کر رہی ہے۔ کبھی شہوتِ طعام کبھی اور دوسری شہوتیں کبھی خواہش نام و نمود کبھی جذبۂ شہرت کبھی غرورِ ریاست کبھی حرص مال و اولاد کبھی ہماری بداخلاقیاں اور کبھی بے جا مصروفیتیں الغرض اس آئینے پر مختلف خرابیوں کا ہر وقت دھاوا رہتا ہے اور ہمارا نور بے نور ہو کر رہ جاتا ہے تو خدا کیسے دکھائی دے آئینہ دل کو جلا دو تو وہ اسمیں صاف جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

چشم بندو گوش بندو لب بہ بند

گر نہ بینی نور حق بر ما بہ خند

آنکھ، کان، موکھ، موند کر نام نرجن کا لے

اندر کے پٹ جب کھلیں جب باہر کے پٹ دے

قلب انسانی اللہ کا گھر ہے۔ وہ زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا مگر ہمارے دل میں سما سکتا ہے یہ کعبہ و قبلہ بیت اللہ ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ

دل بدست آور کہ حج اکبر است
وزہزاراں کعبہ یک دل خوش تر است

خانہ خدا کو صاف شفاف رکھو تو وہ اس میں متمکن رہیں گے ورنہ شیطان گھر بنائے گا اور طرح طرح کے بت آباد ہو جائیں گے کوئی سگریٹ کی صورت میں ہو گا کوئی پان کی تو کوئی زر زمین زن کی شکل میں ہو گا اور سب سے بڑا بت ہماری انا ہے اسی لئے شاعر نے کہا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

سب سے بڑے حجاب ہم خود ہیں اور ہمارے اندر طرح طرح کے حجاب ہیں۔ اندھے آدمی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا حالانکہ ساری اشیاء بے حجاب اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ پردے تو اس کی بصارت پر پڑے ہوئے ہیں یا اس کی آنکھیں بے نور ہوتی ہیں۔ اشیاء سارے کی ساری منور ہوتی ہیں۔ یہی حال ان دھریہ اور بے دینوں کا ہے کہ ان کی بصیرت اندھی ہوتی ہے لہٰذا وہ خدا کو نہیں دیکھ سکتے حالانکہ وہ تو ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود ہے۔ چونکہ انہیں خدا دکھائی نہیں دیتا لہٰذا وہ اس کی ہستی سے انکار کر دیتے ہیں مگر کیا کوئی نابینا وجود اشیاء کے انکار کرنے میں حق بجانب ہو سکتا ہے اگر وہ انکار بھی کرے تو اشیاء کے وجود پر اس کے انکار کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو بہر حال موجود ہیں۔ اس نے نہیں دیکھا لہٰذا وہ انکار کرتا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص' خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو اس کا انکار بیکار ہے۔ ہم رات دن بہت سے حقائق کا انکار کرتے رہتے ہیں مگر وہ تو ہوتی ہیں معدوم نہیں ہو جاتیں اور جن لوگوں نے ان حقائق کو پالیا ہے وہ انہیں دیکھتے ہیں۔ نہ دیکھ سکنے والوں کے لئے حقائق حجاب میں ہیں اور دیکھنے والوں کے لئے بے حجاب ہیں۔ اسی طرح مولیٰ تعالیٰ بے حجاب ہیں۔ فَفِرُّوْا اِلَی اللہِ۔

"آؤ اللہ کو دیکھیں"

ہم رات دن کہتے ہیں اس چیز کی یہ تاثیر ہے اس کا یہ اثر ہے۔ فلاں غذا کی یہ تاثیر ہے فلاں دوا یہ اثر دکھاتی ہے اس کام کا یہ اثر ہے تمہاری بات نے دل پر یہ اثر کیا میری تعریف سے فلاں پر اچھا اثر پڑا۔ فلاں شخص کا فلاں پر اثر ہے مگر کوئی مجھے بتائے کیا کسی نے کبھی اثر و تاثیر کو دیکھا ہے؟ ظاہر ہے نہیں دیکھا کیونکہ وہ آنکھوں سے دکھائی دینے والی چیز نہیں ہے چونکہ ہم نے اثر و تاثیر کا نتیجہ دیکھا ہے لہٰذا ہم نے کہہ دیا کہ اس کا یہ تاثر یا تاثیر ہے۔

دنیا کی ہر بری بھلی چیز کوئی نہ کوئی اثر یا تاثیر رکھتی ہے اس سے کوئی بھی چیز خالی نہیں یہ ہر جگہ موجود ہے اسے ہر ایک محسوس کر سکتا ہے۔ آگ کی تاثیر گرم ہے جلا دیتی ہے۔ ہم نے اس کے اثر کا یہ نتیجہ دیکھا تو کہہ دیا آگ گرم ہے اور پانی اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے لہٰذا جان لیا کہ پانی کی تاثیر سرد ہے اس طرح کے اثرات ہوتے دیکھے تو اشیاء کے اثرات کے قائل ہو گئے گو آج تک ہم نے اثر کو کبھی دیکھا نہیں ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کہیں کسی قسم کا اثر ہو گا وہاں موثر پہلے سے موجود ہو گا آگ پہلے سے موجود ہو گی تب ہی اس سے اثر پیدا ہو گا۔ پانی پہلے سے موجود ہو گا تب ہی اس کا اثر ظاہر ہو گا۔ الغرض کوئی اثر بغیر کسی مؤثر کے نہیں

پایا جاتا اور اس مؤثر کا پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے مؤثر واثر کا سلسلہ غیر متناہی ہے۔ اس سارے عالم کا کارخانہ موثر واثر پر قائم ہے اور انہیں سے سارے عالم میں چہل پہل، رونق، راحت و آرام، فتنہ وفساد اور رنج و تکلیف کا وجود ہے۔ تاثیر واثر کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا یہ چکی ہر آن اور ہر لمحہ چلتی رہتی ہے کہیں آبادی کردیتی ہے اور پھول بکھیر دیتی ہے اور کہیں بربادی مچادیتی ہے اور بازار ہلاکت وتباہ حالی گرم کردیتی ہے۔اس تمہید سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اثر و تاثیر کا وجود تو ہے مگر آج تک کسی نے اسے دیکھا نہیں اور کوئی اثر و تاثیر بغیر موثر کے نہیں ہوتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اثر و تاثیر کا چکر جو زمین سے لے کر آسمانوں تک پھیلا ہوا ہے آخر اس چکر کو چلانے والا اور اشیاء میں اثر پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ کوئی اثر بغیر موثر کے نہیں ہوسکتا لہٰذا اثر پیدا کرنے والا کوئی ہے اور جس طرح ہم رات دن یہ کہتے ہیں کہ میں نے فلاں چیز کا یہ اثر دیکھا تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ہر اثر میں موثر دیکھا یعنی خدا کو دیکھا۔

ہم ایک کرسی دیکھتے ہیں تو اس کرسی کے بنانے والے کو بھی دیکھتے ہیں مگر یہ دیکھنا ظاہری آنکھوں سے نہیں ہوتا جس طرح ہم کرسی کو دیکھتے ہیں۔ بڑھئی کو نہیں دیکھ پاتے مگر پھر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اسے کسی نے بنایا ضرور ہے خود نہیں بنی پھر ہم کہتے ہیں بنانے والے نے بڑی اچھی بنائی ہے یا یہ کہتے ہیں بڑھئی نے فلاں خامی چھوڑدی اور پھر بعض اوقات یہ بھی کہہ اٹھتے ہیں واہ رہے بڑھئی خوب بنائی ہے حالانکہ بڑھئی ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتا مگر ہم اسے مخاطب کرکے اس کی تعریف یا برائی کرتے ہیں اسی طرح ہم کائنات کو دیکھتے ہیں تو خدا کو بھی دیکھتے ہیں جیسے کرسی کو دیکھتے ہیں تو بڑھئی کو بھی دیکھتے ہیں۔

ہم اور آپ ہر وقت خدا کو دیکھتے ہیں گو ہم میں بہت سے افراد ایسے ہیں جو اسے ہر وقت ہماری ہی طرح تو دیکھتے ہیں مگر پہچانتے نہیں۔ رات دن ایسا ہوتا

ہے کہ ہم بعض اشیاء کو دیکھتے تو ہیں مگر پہنچانتے نہیں ہم میں سے بعض افراد ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ پہنچانتے نہیں بلکہ انکار بھی کرتے ہیں جیسے رات دن ایسا ہوتا ہے کہ ہم بعض چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر پہنچانتے نہیں تو انکار کر بیٹھتے ہیں مگر ہمارے نہ پہنچاننے یا انکار سے کیا ہوتا ہے ہمارے اقرار یا انکار سے چیز کے وجود میں کوئی فرق نہیں پڑتا بہت سے ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا مگر پہچانا نہیں اور قتل کردیا اور بہت سوں نے اپنے باپ کو دیکھا مگر پہچانا نہیں بلکہ انکار کردیا گو اسنے انکار کردیا مگر وہ باپ اس کا خالق تو بہر صورت ہے اس کے انکار سے اس کے ”خالق مجازی“ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

کائنات کے ہر ذرے میں خدا دکھائی دیتا ہے آپ اپنے دل کی آنکھیں کھولیں تو ضرور دکھائی دے گا آنکھیں موند لوگے تو کیسے دکھائی دے گا کیا بغیر آنکھیں کھولے آپ کچھ دیکھ سکتے ہیں؟ دیکھنے کے لئے آنکھ کھولنا شرط ہے آنکھیں بند کرلو گے تو کچھ نہیں دیکھ سکو گے۔

یہ ایک پھول ہے کتنا خوشنما کتنا خوش رنگ کیسا خوش وضع کیسا نازک کیسا تروتازہ بھینی بھینی خوشبو والا کس طرح اپنی آغوش میں زر گل لئے ہوئے ہے شہد وشکر سے لبریز اس پھول میں ہمیں ایک صاحب جمال وکمال ولطافت ونزاکت نظر آرہاہے آپ بھی اپنے دل کی آنکھ کھولیں تو آپ بھی اسے جلوہ گر پائیں گے بالکل آنکھوں کے سامنے۔

یہ شیر جس کی آواز سے سارا جنگل دہل رہا ہے اور آپ کا دل دھک دھک کررہا ہے یہ مجسمئہ قوت و شجاعت وجلالت وہیبت بتارہا ہے کہ میرے اندر کوئی صاحب جلال جبار وقوی اثر انداز ہے جو بڑے سے بڑے طاقتور جبار کو توڑ مروڑ سکتا ہے یہ ذرہ یہ شیشہ جو چمک رہا ہے اپنے اندر خود تو یہ نور پیدا نہیں کرسکتا کسی نے اس کے اندر نور بھرا ہے تب ہی تو یہ روشن ہوا یہ چاند سورج اور ستارے نور کہاں سے لائے؟ یہ بے پایاں نور کے کیسے مالک ہوگئے؟

ظاہر ہے یہ ان کا ذاتی نور نہیں ہے کسی اور ہی کے نور سے یہ چمک رہے ہیں! یہ مخلوقات جو دوڑی بھاگی پھرتی ہے از خود تو نہیں دوڑتی کیونکہ پیدائش کے وقت تو اسے حرکت کرنے میں بھی دشواری ہوتی تھی پھر اس میں دوڑنے کی قوت کس نے پیدا کی؟ اور کچھ مخلوق ایسی ہے جو نہ تو چل پھر سکتی ہے البتہ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے حرکت کر سکتی ہے تو اس میں حرکت کی طاقت کسی نے پیدا کی او رکچھ مخلوق ایسی ہے جو نہ تو چل پھر سکتی ہے نہ حرکت کر سکتی ہے بس اپنی جگہ پڑی رہتی ہے تو یہ کس کے حکم کی پابند ہے؟ کیوں حرکت نہیں کرتی؟ اگر باقی مخلوق اپنے اختیار سے چلتی پھرتی اور حرکت کرتی ہے تو یہ مخلوق کیوں ایک جگہ پڑے رہنے پر قانع ہوگئی اپنے آپ کو کون بے جان دیکھنا پسند کرتا ہے؟

دور کیوں جایئے آپ خود اپنے آپ کو دیکھیں اگر ہمارا نظام پیدائش اس طرح کا نہ ہوتا تو کون یقین کر لیتا کہ شکم مادر میں پانی کا ایک قطرہ چلا جاتا ہے تو اس سے ایک دوسرا انسان پیدا ہوجاتا ہے اور شکم مادر میں ایک ایسا عضو ہے جو اس قطرے کی حفاظت کرتا ہے اسے خون پلاتا رہتا ہے اور ایک خاص مدت تک اپنے اندر محفوظ رکھتا اور پھر تکمیل کے بعد اسے باہر پھینک دیتا ہے اور وہ عضو نہ تو خودمختار ہے نہ خود تخلیق کا کام انجام دے سکتا ہے اور نہ مادر وپدر کو یہ پتا چلتا ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہے نہ انہیں اس کے اندرونی انقلاب کا حال معلوم ہوتا ہے نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ بچہ کب اور کس وقت پیدا ہوگا اور جب پیدا ہوجاتا ہے تو اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے جس میں مناسب شکر ونمک وذائقہ اور قوت شامل ہوتی ہے اور ماں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ دودھ جو وہ پلا رہی ہے کب اور کیسے بنا؟ اور کتنی مقدار میں بنا؟ اس کے خون نے دودھ کی شکل کیسے اختیار کی اس میں مٹھاس کیسے پیدا ہوئی اور سرخ خون سپید کیسے ہوگیا؟ پھر بغیر علم وکوشش وسعی کے، اس کے سینے سے دو چشمے کیسے جاری ہوگئے پھر اس بچے کے اعضاء بغیر اس کی اور اس کے ماں باپ کی کوشش واختیار کے رات دن کیسے تناسب کے ساتھ

بڑھتے رہے کہ ہر عضو کو اس کی مناسب غذا پہنچتی رہی۔ کسی کو خون، کسی کو پانی، کسی کو بلغم، کسی کو سوداء، کسی کو صفراء ہر غدود کو اسی کی مناسب غذا پہنچی اور رہر رگ وریشہ کو مناسب رزق ملا۔ بچے کو پلایا گیا صرف دودھ اور پیٹ میں جاکر اس نے کتنی مختلف ومتضاد شکلیں پیدا کرلیں اور جب وہ اپنا کام پورا کرچکا اور بچے کے کسی کام کا نہ رہا تو دونوں راہوں سے آسانی کے ساتھ خارج ہوگیا اس دودھ سے بیٹری بنی جس نے اس کی آنکھوں کو روشن کر دیا اور قوت سماعت وغیرہ پیدا کر دیں۔

اگر کہتے ہو یہ کام اس کے دل جگر وغیرہ نے انجام دیئے تو بتائیے جگر نے یہ کام کہاں سے سیکھا؟ وہ کوئی اور کام کیوں نہیں انجام دیتا؟ اس نے دودھ کو سرخ رنگ کیسے دیا؟ کیوں دیا؟ کس کی طاقت سے دیا؟ سپید دودھ میں سرخی کہاں سے آئی سوکھی روٹی میں خون کہاں؟ ہرے ہرے پتوں میں سرخی کیسے پیدا ہوئی؟

اگر کہتے ہو ان میں پہلے سے سرخ ذرات موجود تھے تو ہم آپ سے دریافت کریں گے کہ وہ سرخ ذرات ازخود پیدا ہوئے یا کسی نے پیدا کیے؟ اگر اسباب کا سہارا لیتے چلے جاؤ گے تو تھک کر خود ہی لاجواب ہو جاؤ گے اور ایک مسبب الاسباب کو مان کر ہی گلوخلاصی ہوگی۔

یہ اتنی بڑ وسیع وعریض دنیا عالم کبیر ہے اور انسان عالم صغیر۔ اس کے اندر دریا، سمندر، پہاڑ، راہیں، پگڈنڈیاں، آبشاریں، لاسلکی، تار، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، راڈار، کمپیوٹر، پرنٹنگ پریس، بجلی، کیمرہ، انجن، مشین غرض سب کچھ ہے دیکھ سکتے ہو تو دیکھ لو اور کاری گر کو بھی دیکھ لو۔

ے گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ ودشت ودریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیاکیا دیکھوں؟

تجلیاتِ الٰہیّہ

جس طرح کیمیا کے طالب کبھی کیمیا نہ بنا سکے البتہ کشتے پھونکنا خوب جانتے ہیں اور کیمیا کی طلب میں چند ایک بوٹیوں سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح خدا کے طالب تمام عمر صرف کر دیتے ہیں اور خدا کو نہیں پاتے ہاں چند ایک تجلیات سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ ان میں بھی بہت کچھ حصہ خیالات کا ہوتا ہے مگر یہ تجلیات محض خیالی بھی نہیں ہوتیں جیسا کہ آجکل کے فلسفی کہتے ہیں۔ انہیں کچھ پتہ نہیں ان کا یہ خیال بھی تو ایک خیال ہے تجربہ کچھ اور ہی کہتا ہے یہاں نہ پا سکنا ہی پالینا ہے۔ جس نے اس کی جستجو کی اور جدوجہد کے بعد بھی اسے نہ پا سکا اور عاجز رہا تو اس نے بقدر اپنی کوشش و عجز کے اسے پالیا۔ یہ عالم ہی نرالا ہے یہاں نہ پاسکنا ہی پالینا ہے۔

اس کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی البتہ صفات و تجلیات کا دروازہ کھلا ہے بقدر مجاہدہ ہر شخص اس کی صفات سے بہرہ ور ہوتا ہے مگر ان تجلیات میں خود صاحب مجاہدہ کے خیالات کا بڑا حصہ ہوتا ہے پھر بھی تجلیات خداوندی کو محض خیالی چیز نہیں کہا جا سکتا فلاسفہ جن کی ساری بنیاد خیال پر ہوتی ہے ان تجلیات کو بھی خیالی کہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے گو ان کی یہ بات بالکل غلط بھی نہیں ہے جن اہل دل کو تجلیات ربانی ہوتی ہیں انہیں قدرتی طور پر کچھ ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ تجلیات رحمانی و خیالی میں فرق کر لیتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس تجلی میں کس حد تک ان کے اپنے خیال کا دخل ہے۔ مخلوط تجلیات میں بھی انہیں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کس تجلی میں کس حد تک ان کے اپنے خیال کا دخل ہے۔ مخلوط تجلیات میں بھی انہیں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کتنا حصہ حقیقت کا ہے اور کتنا خیال کا۔ گو ان لوگوں کو شعور و

لاشعور جیسی اصطلاحات کا علم تک نہیں ہوتا مگر یہ شعور ولاشعور سے واقف ہوتے ہیں اور فلاسفہ کی کم عقلی پر ہنستے ہیں کہ یہ ہر چیز کو خواب و خیال کے دائرے میں لاتے ہیں کیونکہ ان کی تگ و دو یہیں تک ہے ایک عالم شعور ولا شعور وغیرہ سے بھی بالا ہے جہاں ان کی پہنچ نہیں ہو سکتی اور فکر و نظر اور علم و عقل سے وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ مجاہدات و مراقبات کی گھاٹیوں سے نہ گزریں انسان پر مجاہدات سے کچھ ایسی نئی راہیں کھلتی ہیں جہاں علم و فلسفہ اور فکر و نظر بہت سطحی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

فلاسفہ نے اللہ تعالیٰ' روح و روحانیات اور الٰہیات کے بارے میں علم و عقل کی روشنی میں فکر و نظر کی رہبری سے بہت باتیں کہی ہیں مگر اصحاب باطن کی نظر میں وہ باتیں نہایت سطحی ہیں۔ ان لوگوں نے علم و فکر کے گھوڑے دوڑائے تو کسی حد تک سرحد تک پہنچ سکے آگے جانے کے لئے جس سواری کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہ تھی تو یہ لوگ اسی کو منزل سمجھ بیٹھے اور لگے دون کی ہانکنے۔

انسان کے لئے علم حاصل کرنے کی دو راہیں ہیں ایک کتابی اور دوسری غیر کتابی۔ کتابی علم والے دنیا میں ایسے انقلابات نہیں لا سکے جیسے غیر کتابی والے اور کتابی علم والوں نے مادیات و محسوسات میں ترقی کی روحانیات میں نہ کر سکے بلکہ اکثر تو انکار ہی کر بیٹھے اس دور کے فلسفی ہر غیر محسوس وغیر معقول کا انکار کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ انہوں نے ان باتوں کے بارے میں ریسرچ کی اور پھر انکار کیا بلکہ صرف اس لئے کہ ارباب سائنس نے ایک بین الاقوامی اصول بنا لیا ہے کہ جو چیز حس و عقل سے باہر ہو اس کا انکار کر دیا جائے جب تک کہ کھلا ثبوت مہیا نہ ہو اور اسے سائنٹیفک معیار پر نہ جانچ لیا جائے دنیا کا نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ یہ سمجھ بیٹھا کہ واقعی خدا نہیں ہے کیونکہ سائنس دانوں نے اسے ڈھونڈا تو نہ پایا انہیں یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے بغیر کدو کاوش کے انکار کیا ہے

اور اپنے ایک مسلمہ اصول کے تحت انکار کیا ہے اگر روس یہ کہتا ہے کہ ہم نے خدا کو اپنے حدود سے باہر نکال پھینکا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا ہے ہی نہیں۔ اول تو یہ بات غور طلب ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے فلاں چیز کو اپنے دروازے سے باہر نکال پھینکا ہے یا اسے اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیا تو اس نے اس کے وجود کا اقرار کر لیا ہے کیونکہ جو چیز ہے ہی نہیں اسے کیسے پھینکا جا سکتا ہے؟ دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ اگر کوئی ملک یہ کہتا ہے کہ ہم نے خدا کو اپنی سرحدوں سے نکال دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقعی ایسا کر بھی چکا ہے یا کر سکتا ہے روس ہزار کہے کہ ہم نے خدا کو نکال دیا ہے۔ مگر پھر بھی وہ نہیں نکلا وہ وہیں موجود ہے جیسے پہلے تھا ویسے ہی اب بھی ہے۔ وہ روس وغیرہ کی دسترس سے باہر ہے۔ پکڑا نہیں جا سکتا کہ نکالا جائے۔ اگر کوئی فلسفی کسی چیز سے انکار کرتا ہے تو اس سے اس چیز کے ہونے یا نہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ **فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔**

عالمِ حقیقت

کوتاہ بیں، خام دماغ، اور نو تعلیم یافتہ، بعض خواص اور عوام الناس عالم حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ اور جب ان سے حقائق کے بارے میں کوئی بات کی جاتی ہے تو وہ مذاق اڑاتے ہیں یا یقین نہیں کرتے کیونکہ وہ جس عالم میں رستے بستے ہیں اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جو کچھ دیکھ سکتے ہیں اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جو کچھ دیکھتے سنتے چھوتے اور چکھتے ہیں اسی کو سب کچھ جانتے ہیں۔ اس سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں نہ مانتے ہیں حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ جس عالم میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ تو اس سے بھی واقف نہیں ہیں۔ بس اپنی ضروریات کے بقدر علم رکھتے ہیں۔ دیکھو انسانوں کی بیشتر تعداد جڑی بوٹیوں کے خواص سے ناواقف ہے۔ ناواقف ہی نہیں بلکہ ان کے ناموں سے بھی نا آشنا ہے بلکہ سارے انسان بیشتر جڑی بوٹیوں کے خواص تو کیا ناموں سے بھی آشنا نہیں ہیں بلکہ ابتدائے کائنات سے آج تک انسان اللہ کی پیدا کردہ مخلوق کے نام بھی نہیں رکھ سکا بس جن سے وہ کام لیتا ہے یا جن کے خواص سے آشنا ہو گیا ہے ان کے نام تو دھر دیئے ہیں باقی کے نام بھی نہیں رکھ سکا۔ بہت سے درخت ایسے ہیں جن کے نام بھی انسان نہین رکھ سکا۔ اہل ہند ہر اس جھاڑ جھنکاڑ کو "بن" کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں جس کے نام سے وہ آشنا نہیں ہیں اور جس کا نام آج تک انسان نہیں رکھ سکا۔ پنجاب کے لوگ ایسی جھاڑیوں اور درختوں کو

"جھنڈ" کہہ دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ بیشتر مخلوق کا احاطہ ہی نہیں کر سکا۔ کتنے ہی سمندری جانور ایسے ہیں جنکے نام انسان نہیں رکھ سکا اور کتنے ہی کیڑے مکوڑے ایسے ہیں جن کے نام رکھنے کی اسے قدرت ہی نہ ہو سکی۔

خیر یہ بات تو بطور تمہید تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس عالم کے سوا اور بہت سے عالم ہیں جن سے ہم واقف نہیں ہیں کیونکہ وہ ہماری سمع و بصرو لمس و شامہ کی گرفت میں نہیں آتے اور ہماری سمجھ سے بالا تر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عالم حقیقت بھی ہے جسے ہم نہ دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں نہ چکھ سکتے ہیں مگر اس کے بارے میں سنتے ضرور ہیں اور اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ موٹی سی مثال لے لیجئے۔ رات دن ہم سچائی سچ اور جھوٹ وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں مگر کسی نے آج تک سچائی یا جھوٹ کو دیکھا چھوا یا سونگھا؟ معلوم ہوا بعض حقائق ایسے ہیں جنہیں کسی بھی سائنسی آلے سے دیکھا چھوا یا چکھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ سیال نہیں ہیں۔ وہ رنگ دار نہیں ہیں۔ وہ بو اور مزے والے نہیں ہیں۔ وہ سائنس کی گرفت سے بالاتر ہیں۔ سارے اخلاق حسنہ ورذیلہ کو اسی پر قیاس کر لیجئے۔ رات دن ہم شجاعت جرات اور بہادری کا ذکر کرتے ہیں اور اس پر انعامات بھی دیتے ہیں مگر ہم نے شجاعت کو دیکھا نہیں سخاوت نظر نہیں آتی بزدلی دکھائی نہیں دیتی۔ بخیل کو تو ہم نے دیکھا ہے مگر بخالت کو کسی نے نہیں دیکھا۔

اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ کبھی ہم نوجوانوں کے سامنے عالم حقیقت کی بات کرتے ہیں تو وہ ان باتوں پر ہنستے ہیں کیونکہ ان کی ناقص عقل اور کچی تعلیم کے احاطہ سے یہ باتیں باہر ہوتی ہیں مگر کیا انسان کو ایسی باتوں کا مذاق اڑانا روا ہے جو اس کی سمجھ میں نہ آئے اور اس سے بہتر انسانوں کی عقلوں نے انہیں تسلیم کیا ہو۔

فرشتوں اور جنات کا وجود ہے یہ محض مذہبی اور خیالی باتیں نہیں ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر مخلوق کا وجود ہمارا ہی جیسا وجود ہو۔ دیکھو وجود کی کئی

قسمیں ہیں۔ وجود کی ایک قسم وجود خارجی ہے یعنی وہ ہر چیز جس کا خارج میں کوئی وجود ہو جسے دیکھا چھوا سنا یا چکھا جا سکے۔ اس میں سارے عالم ظاہری کی چیزیں داخل ہیں۔ وجود کی ایک قسم اور بھی ہے جسے وجود نفس الامری کہتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو خارجی وجود والی تو نہیں ہیں مگر نفس الامر اور حقیقت میں موجود ہیں جیسے سچائی' شجاعت' شرافت اور نجابت وغیرہ۔ وجود کی ایک قسم اور بھی ہے جسے وجود ذہنی سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی نہ وہ خارجی وجود والی کوئی شے ہوتی ہے نہ وجود نفس الامری والی چیز بلکہ وہ صرف ذہن میں موجود ہوتی ہے جیسے شاعرانہ خیالات کہ ان کا وجود صرف شاعر کے ذہن میں ہوتا ہے حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کی کمر بال سے باریک اور اس کے بال کالی رات سے زیادہ تاریک اور چہرہ چاند سے زیادہ روشن ہے تو محبوب کا یہ وجود صرف وجود ذہنی رکھتا ہے۔ خارجی یا نفس الامر میں ایسا کوئی محبوب نہیں دیکھا گیا جو اس صفت کا ہو۔

جس عالم میں ہم رہتے ہیں یہ عجیب و غریب ہے بظاہر ایک ہے مگر اس میں ان گنت عالم ہیں جن میں سے ایک عالم حقیقت بھی ہے جو ہمارے اس مضمون کا عنوان ہے اور جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔ اب آپ میرا مذاق نہ اڑائیں اگر میں یہ کہدوں کہ امراض و آلام بھی وجود رکھتے ہیں۔ بخار کا ایک وجود ہے۔ طاعون کا ایک وجود ہے صحت کا ایک وجود ہے زندگی کا ایک وجود ہے۔ موت کا ایک وجود ہے۔ اور مابعد الموت زندگی کا ایک وجود ہے۔

میرے خیال میں اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بعض سچے عاملوں کے عملیات سے لوگوں کے امراض دور ہوئے ہیں جبکہ دنیا بھر کی دوائیں اور اطباء انہیں دور نہ کر سکے تو ایسا کیوں ہوا اس مرض کا ایک وجود تھا۔ اس پر روحانی طاقت کی کاری ضرب پڑی تو وہ ختم ہو گیا۔ بلاؤں کا وجود ہے۔ یہ شخص جس کا بخار بغیر کسی دوا کے ہمارے تعویذ سے دور ہو گیا کیوں دور ہوا۔ وہ بخار یا تو اس شخص سے زائل ہو گیا یا فنا ہو گیا۔ بخار کا ایک بڑا اچھا تعویذ ہے۔ بخار

والے کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ برو برو ورنہ در گور قاضی مرتشی قید خواہی شد۔ چلا جا ورنہ رشوت خور قاضی کی قبر میں دفن کر دیا جائے گا۔ اس قسم کے تعویذ ہیں جن میں امراض کو ڈرایا جاتا ہے اور وہ بھاگ جاتے ہیں۔ ہم بچھو وغیرہ کے کاٹے پر دم کرتے ہیں۔ بغیر دوا کے کیسے اچھا ہو جاتا ہے۔ مار گزیدہ کی خبر لانے والے کو ہم پانی پلاتے ہیں۔ وہ میلوں دور ہو تو کیسے اچھا ہو جاتا ہے۔ پانی ایک غیر شخص کو پلایا جاتا ہے اور وہ سانپ اسی وقت مرجاتا ہے۔ دیکھئیے روحانی اثرات کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں۔ یہ فاصلوں کے پابند نہیں۔

میرا ایک دہریہ دوست کہنے لگا صارم صاحب یہ تعویذ گنڈے کیا فضولیات ہیں۔ میں نے کہا اگر حق کی تلاش ہے تو "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا" آپ کسی بھڑ یا بچھو سے کٹوائیے اور ہم پانی پیئیں گے اور آپ کا زہر اتار دیں گے۔ یعنی پانی ہم پیئیں گے اور زہر آپ کا اترے گا۔

میں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا تھا کہ میں نے دن کی روشنی میں اپنی ان مادی آنکھوں سے فرشتوں کو دیکھا ہے۔ میرا ایک دوست یہ پڑھ کر چراغ پا ہو گیا۔ کہنے لگا صارم صاحب آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا آپ کو اس بات پر کیوں غصہ آیا جبکہ آپ مسلمان ہیں۔ نماز روزہ کرتے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں جس کے ہر تیسرے چوتھے صفحے پر فرشتوں کا ذکر ہے۔ میں نے انکار تو نہیں کیا۔ اثبات کیا ہے۔ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے اس کی تصدیق کی ہے تکذیب تو نہیں کی کہ آپ کو غصہ آئے۔ کہنے لگے مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ فرشتے دکھائی دیں؟ میں نے کہا ہو کیسے نہیں سکتا۔ اگر کوئی چیز وجود رکھتی ہے تو کوئی نہ کوئی اسے دیکھ بھی سکتا ہے۔ اور ہزاروں آدمیوں نے انہیں دیکھا ہے صرف میں نے ہی نہیں دیکھا تو آپ کس کس کی تکذیب کریں گے۔

بہر حال فرشتوں کا وجود ہے جنات کا وجود ہے۔ بلاؤں کا وجود ہے اور اسی کی طرف ہماری کتاب کی پہلی سطر میں اشارہ ہے۔ رب العالمین یعنی بہت سے عالموں کا پروردگار الحمداللہ رب العالمین۔ مالک یوم الدین روز جزا ہے اور حساب

کتاب کا دن مقرر اور ہر شخص کا نامہ اعمال اس کی گردن میں ہر وقت لٹکا رہتا ہے اور مرنے کے بعد اس کے سامنے پیش کیا جائے گا بلکہ مرتے دم اکثر اشخاص کو بصورت فلم ساری زندگی دکھائی جاتی ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر لوگ مرتے دم اپنے گناہوں پر بہت پچھتاتے ہیں اور بہت توبہ تلا کرتے ہیں اور لوگوں سے معافی مانگتے ہیں کہ ہم یہ کیا کر چلے۔ مگر پچھتانے کا وقت گزر جاتا ہے اور توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کو مرتے دم یہ معلوم ہوتا ہے کہ صبح آیا تھا اور شام ہوتے چلا تو میں نے اس ایک دن کی زندگی کے لئے کیوں لوگوں کو ستایا۔ کیوں حقوق مارے کیوں چھپ چھپ کر گناہ کئے جبکہ یہ سارے پوشیدہ گناہ اب مجھے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ انہیں بھلانا چاہتا ہے۔ ان سے آنکھیں چراتا ہے مگر وہ اس کے سامنے مجسم کھڑے ہوتے ہیں۔ منہ پھیرتا ہے تو کام نہیں بنتا۔ جدھر دیکھتا ہے انہیں پاتا ہے۔

یہی حال عالم قبر کا ہے کہ ایک ایک قبر میں ستر ستر مردے دفن ہیں اور اسی عالم برزخ میں اسی ایک قبر میں کسی کے لئے جنت کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور کسی کے لئے دوزخ کی۔ بات سمجھ میں نہیں آتی نہ آسکتی ہے خدا معلوم وہ عالم کیسا ہے اور کیسے ایک ہی گڑھے میں جنت بھی ہے اور دوزخ بھی۔ الغرض مذہب کی اکثر باتیں عقل میں نہیں آتیں نہ آسکتی ہیں لہٰذا بغیر دلیل کے ایمان لاؤ۔

***

عجزِ زبان و قلم

روحانی لوگوں کو بعض اوقات ایسی باتوں کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اگر بیان کرنا چاہیں تو زبان و قلم ساتھ نہیں دیتے۔ بعض اوقات ان پر ایسے حقائق منکشف ہوتے ہیں کہ انہیں دنیا کی کسی لغت میں مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے الفاظ نہیں ملتے روحانی تو بجائے خود رہے شعراء پر بعض دفعہ ایسے جذبات طاری ہو جاتے ہیں جنکی ترجمانی وہ نہیں کر پاتے۔ شعر بعض اوقات ایک عام انسان پر ایسے جذبات طاری کر دیتا ہے کہ وہ ان کی صحیح تصویر پیش نہیں کر سکتا۔

یہ حال عام لوگوں کا ہے جو رات دن صرف عادیات میں محصور رہتے ہیں تو جو لوگ اس عالم سے بالا تر ہیں ان کا کیا حال ہوتا ہو گا؟ اس دور کے فلسفی بہت سے روحانی حقائق کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کی دسترس سے باہر ہیں مگر حقیقت تو بہر صورت اپنی جگہ پر ثابت رہتی ہے خواہ اسے کوئی مانے یا نہ مانے۔

ابھی قریبی دور میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ ہر شخص اس بات کا انکار کرتا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک اقلیم میں بات کریں تو دوسری اقلیم میں اسی وقت سنائی دے۔ پھر یہ حقیقت جو پہلے ہم سے پوشیدہ تھی سامنے آگئی تو سب مان گئے کہ ایسا ممکن ہے مگر یہ حقیقت ہمارے اقرار سے پیدا نہیں ہوئی وہ تو پہلے سے موجود تھی پھر معلوم ہوا کہ جیسے آواز منتقل ہو سکتی ہے تصویر بھی منتقل ہو سکتی ہے تو لوگ کہنے لگے آواز کی تو اور بات ہے تصویر کیسے منتقل ہو سکتی ہے۔ مگر ٹیلی ویژن کی ایجاد نے ثابت کر دیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے تو سب نے اس حقیقت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا مگر یہ حقیقت بھی پہلے سے موجود تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کسی انسان نے اسے ایجاد نہیں کیا بلکہ انکشاف کیا ہے جنہیں ہم لوگ موجد کہتے ہیں یہ دراصل موجد نہیں ہوتے انکشاف و دریافت کرنے

والے ہوتے ہیں۔ حقیقت تو پہلے سے موجود ہوتی ہے مگر ہم اس سے ناواقف ہوتے ہیں سائنس دان اسے آشکارا کر دیتے ہیں۔

اس تھوڑی سی تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں اور جیسے سائنس دانوں پر جدوجہد سے حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے اسی طرح روحانی ترقی کرنے والوں پر بہت سے اسرارِ قدرت منکشف ہوتے ہیں پھر ان میں سے بعض لوگ گونگے بن جاتے ہیں کہ حقائق کا اظہار نہیں کرتے اور بعض کرنا چاہتے ہیں تو الفاظ نہیں پاتے اور بعض ان کے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں لیکن کسی مصلحت یا خوف کی وجہ سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور بعض اشارات و کنایات کو ترجیح دیتے ہیں کہ جو سمجھنے والے ہیں سمجھ جائیں اور جو ناسمجھ ہیں انہیں پتہ نہ چلے۔

بعض اہلِ باطن نے قصے اور کہانیوں کی صورت میں حقائق کو بیان کیا ہے اور بعض نے ان اسرار کو شعر کا جامہ پہنا دیا ہے کہ عام آدمی اپنی سمجھ کے مطابق کچھ سمجھ لیتا ہے اور خواص ظاہری معنیٰ سے باطنی معنیٰ کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

آسمانی کتابوں کا کچھ اس قسم کا انداز ہے کہ ظاہری معنی بالکل واضح اور عام فہم ہوتے ہیں مگر اہل علم و اصحاب باطن ان ظاہری معانی سے اور معانی پیدا کرتے ہیں اور پھر معانی کا سلسلہ چل نکلتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی کتابوں کی ہزاروں شرحیں اور تفسیریں ہیں اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

صوفیہؒ مفسرینؒ اور علماءؒ نے جو کچھ فرمایا گو اس دور کا روشن خیال طبقہ انہیں نہ مانے لیکن وہ حقائق ثابتہ ہیں جو اپنی جگہ پر قائم ہیں جہاں کسی کے انکار و اقرار کا کوئی اثر نہیں پہنچتا۔

افسوس بھی ہوتا ہے اور تعجب بھی کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ کیوں ان باتوں کا انکار کرتا ہے جن کے لئے انہوں نے یا ان کے استادوں نے جدوجہد ہی نہیں کی۔ بات ان لوگوں کی مستند ہو گی۔ جنہوں نے اس سلسلہ میں عمریں کھپا دی ہیں۔

نہ کہ ان لوگوں کی جو انکار کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

ہم امراض کے بارے میں ڈاکٹر یا حکیم کی بات مانتے ہیں کسی لوہار یا بڑھئی کی نہیں کیونکہ یہ اس کا میدان ہی نہیں ہے لہٰذا روح و روحانیت وغیرہ کے بارے میں ان لوگوں کی بات مانی جائے گی جو اس فن سے تعلق رکھتے ہیں مادی لوگوں کی نہیں کیونکہ مادی لوگ مادہ پرست ہوتے ہیں انہیں روح و روحانیت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا وہ اپنی ساری زندگی مادیات کے پیچھے گنوا دیتے ہیں اور روحانیات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتے مادہ پرستوں کو چاہیئے کہ جس طرح ہم مادیات کے بارے میں ان کی بات مانتے ہیں روحانیت کے بارے میں وہ ہماری بات مانیں "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔"

***

”سیرِ کائنات“

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے عادات و اطوار اس قدر مختلف طریقے کے بنائے ہیں کہ حد شمار سے خارج ہیں۔ مثال کے طور پر کتے کو دیکھیے کہ وہ جب بھی پیشاب کرتا ہے ٹانگ اٹھا کر کسی چیز پر دھار مارتا ہے۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ بغیر ایسا کئے اس کا پیشاب ہی نہیں اترتا۔ یہ اس کے بالغ ہو جانے کی علامت ہے۔ مرغ کے بالغ ہونے کی علامت اس کا اذان دینا ہے۔ یہ جانور اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے دونوں بازو ہلائے اور اذان دے اور راتوں کو بھی اذان دے اور مستی کے وقت اپنا ایک بازو پاؤں پر لٹکا کر ذرا سا چکر کھائے بلی اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے پاخانے کو ڈھانپ دے۔ معلوم نہیں قدرت کی اس میں کیا مصلحت ہے شاید بدبو کو بند کرنے اور جراثیم کے پھیلنے یا پیدا ہونے کو روکنا مقصود ہو۔ کبوتر اپنی گردن کو کس طرح پھلا سکتا ہے کہ دوسرے جانور ایسا نہیں کر سکتے۔

الغرض کائنات پر غور کیجئے تو عجیب عجیب کیریکٹر نظر آئیں گے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ خلاق کیریکٹرز ہیں اور انہیں اس بات کا بڑا ہی شوق ہے کسی کو ناچنے پر مجبور کر دیا جیسے مور کبوتر اور مرغ وغیرہ۔ کسی کو گانے پر مجبور کر دیا۔ جیسے بلبل کوئل اور فاختہ وغیرہ کسی کو بھاگنے دوڑنے پر مجبور کر دیا ہے تو کوئی

کچھوے کی طرح ایک ہی جگہ پڑا ہے۔ کوئی ہنہناتا ہے تو کوئی رینگتا ہے۔ گدھے اور مرغ کے پھیپھڑے انہیں آواز کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مور کبوتر اور مرغ کے دماغ میں ایک ایسا پٹھا رکھ دیا ہے کہ بغیر گھومے اور چکر کھائے انہیں زندگی میں مزا ہی نہیں آتا۔

کوئی گوشت کھانے کا عادی ہے کوئی سبزی کا اور کوئی دونوں چیزیں کھاتا ہے۔ کسی کی ایسی عادت بنا دی ہے کہ وہ جب تک کھاتا رہتا ہے۔ اپنے کھانے کو کاٹ کاٹ کر پھینکتا بھی جاتا ہے۔ اس کے بغیر اسے کھانے میں مزا ہی نہیں آتا۔ کوئی طوطا چشم ہے تو کوئی وفائے مجسم کہ کتنا ہی مارو پیٹو مگر گھر نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ بلی کتے کو کتنا ہی ماریں پیٹیں وہ گھر نہیں چھوڑ سکتے مگر برسوں کے پلے ہوئے طوطے کو ذرا آزاد کر دیجئے کبھی بھی گھر کا رخ نہیں کرے گا۔ کبوتر کو اپنے گھر سے اس قدر عشق ہوتا ہے کہ گھر کی خاطر اپنے بچوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔

بندر اور لنگور کو دیکھو کہ انھیں بغیر اچھلے کودے اور چڑچڑ کئے مزاہی نہیں آتا۔ یہ ایک دوسرے کی جوئیں پاتے ہیں اور بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ ایک ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ کتے بلی کی طرح نہیں کہ اپنے ہم جنس کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ یہ کتے بلی کی طرح اپنی دم سے سلام خوشامد یا مرعوب ہو جانے کے اظہار کا کام نہیں لیتے بندر کو دیکھو یہ اپنے غصہ کا اظہار اور ہی طرح کرتا ہے اور کتا بلی اپنے غم و غصہ کا اظہار اور طرح کرتے ہیں۔ بلی کتے غم و تکلیف کے وقت انسان کی طرح آنسوؤں سے تو نہیں رو سکتے آواز کے ساتھ رو سکتے ہیں۔ مگر بعض حیوانات کسی طرح بھی اپنے غم کے اظہار پر قادر نہیں ہیں۔ اونٹنیاں اپنے بچھڑے ہوئے بچوں کو یاد کر کے اسی طرح روتی ہیں جیسے عورتیں اپنے اپنے بچوں کو یاد کر کے روتی ہیں۔ اونٹ کا کیریکٹر دیکھو سب سے جداگانہ ہے۔ بڑا صابر ہے۔ مگر سخت منتقم۔ بڑا ہی جفاکش فرمانبردار اور حوصلہ مند ہے۔

سارس کو دیکھ عشق مجسم ہے۔ اپنے جوڑے کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے اور اگر ساتھی مرجائے تو مرجانا پسند کرتا ہے۔ کسی دوسرے کے ساتھ زندگی

گزارنا گوارا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو نذر آتش بھی کر دیتا ہے۔ اور اپنے بچوں کے لئے جان تک کی پروا نہیں کرتا۔ مگر چڑے میاں کی بیوی مرجاتی ہے تو صبح اٹھتے ہی انہیں دوسری چڑیا کی تلاش پڑ جاتی ہے۔ رہے مرغ سو ان کا عمل اس مصرعے پر ہے۔

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔

یہی چال بعض انسانوں کا ہے۔ کچھ سارس جیسا کیریکٹر رکھتے ہیں۔ کوئی چڑے جیسا اور کوئی مرغ جیسا۔ کسی کا کیریکٹر کبوتر جیسا ہے۔ مجال ہے جو کوئی ان کے گھر میں قدم تو رکھ لے یا ان کی اہلیہ کو آنکھ بھر کر تو دیکھ لے۔ اور کوئی ہے کہ ہما شما سب کا زیادہ سے زیادہ آنا پسند کرتے ہیں۔ وہ دولت آشنا ہے۔ عصمت آشنا نہیں۔

سارے جاندار رات میں سونا پسند کرتے ہیں مگر اس نے کچھ کیریکٹر ایسے پیدا کر دیئے ہیں۔ جو رات کو جاگنا پسند کرتے ہیں ان میں بعض انسان حیوان پرند اور حشرات الارض شامل ہیں۔ انہیں رات کی خنکی و تاریکی پسند ہے۔ دن کی روشنی انہیں نہیں بھاتی۔ عموماً ظالم، بُری، شرانگیز اور خون ریز مخلوق اس طبقہ میں شامل ہے۔

سارے جاندار جب سوتے ہیں لیٹ کر یا بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔ مگر اس نے بعض کیریکٹر ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ کھڑے کھڑے سونا پسند کرتے ہیں۔ ابھی ایک کریکٹر کی کمی رہ گئی تھی لہٰذا اس نے چمگادڑ کو پیدا کر دیا ہے کہ وہ الٹی لٹک کر سوتی ہے۔

ہر جاندار اپنے خون، پیپ، ڈھیٹ، پیشاب، قے اور پاخانے سے نفرت کرتا ہے۔ مگر بعض جاندار اس نے ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ اپنا خون، پیپ اور بیٹ وغیرہ مزے سے کھا جاتے ہیں۔ بلی جب اپنا اور اپنے بچوں کا منہ دھوتی ہے تو آنکھوں کے ڈھیٹ وغیرہ سب کچھ بڑے شوق سے چاٹ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے بچوں کی طہارت بھی اپنی زبان سے کرتی ہے۔ کتا اپنی قے بڑے لطف سے

کھا جاتا ہے۔ بیل گائے کا پیشاب اور بھینسا بھینس کا پیشاب پی لیتا ہے۔ آدمیوں کے بعض چھوٹے چھوٹے ننھے منے بچے بھی اپنا پیشاب پاخانہ بڑے مزے سے کھا پی جاتے ہیں۔ جب بلی بچے دیتی ہے تو اپنی ساری جیل کھا جاتی ہے اس طرح قدرت نے زچگی کے بعد اس کے لئے بہترین غذا اس کے جسم سے پیدا کر دی ہے تاکہ اطمینان سے بچوں کی حفاظت کرتی رہے۔

کوئی اپنے چاروں ہاتھوں پاؤں سے تیز تیز چلنا پسند کرتا ہے کوئی آہستہ آہستہ کوئی پیٹ کے ذریعے بھاگا جاتا ہے تو کوئی گھسٹتا جاتا ہے۔ کوئی کودتا ہوا چلتا ہے تو کئی اچھلتا ہوا۔ کوئی پسو کی طرح چٹکتا ہے اور کوئی پیروں کے ذریعہ ہوا سے باتیں کرتا ہے کوئی کچھوے کی طرح ایک ہی جگہ پڑا رہنا پسند کرتا ہے تو کوئی رات دن تیرتا پھرتا ہے ابھی ایک کیریکٹر کی کمی رہ گئی تھی لہٰذا اس نے ایک ایسی مخلوق پیدا کر دی جو ایک ہی جگہ قائم رہ کر ہلتی جلتی رہتی ہے۔ پھر مزید ایک مخلوق ایسی پیدا کر دی جو اپنی جگہ پڑی رہتی ہے نہ ہل سکتی ہے نہ چل سکتی ہے۔

بعض جانور بلکہ انسان بھی اس نے ایسے پیدا کر دیئے ہیں جو پانی سے نہانا گوارا نہیں کرتے۔ انہیں پانی سے ڈر لگتا ہے۔ بعض جانور ایسے ہیں کہ وہ مٹی میں لوٹنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں مٹی میں لوٹنے سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو ہمیں پانی کے ساتھ نہانے سے بعض غسل شمسی کے دل دادہ ہیں۔ پھر اس غسل شمسی و آبی و خاکی کے بارے میں ہر ایک کا کیریکٹر جداگانہ ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے میں نے بعض انسان ایسے دیکھے ہیں جو نہانے پر آتے ہیں تو شدید جاڑوں میں بھی صبح سے شام تک نہاتے ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی انہیں تسلی نہیں ہوتی اور بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ کبھی بھی دن میں نہانا پسند نہیں کرتے ہمیشہ رات میں نہاتے ہیں اور صبح تک نہاتے ہی رہتے ہیں۔ خواہ موسم سرما ہی کیوں نہ ہو۔

بعض جانور اپنی دم سے بعض منہ سے اور بعض پنکھ وغیرہ سے ستار بجاتے ہیں اور گانے والے تو بے شمار ہیں۔ ایک جھینگر کو ہی دیکھ لو گانے کا اس قدر رسیا ہے کہ کھانے کی بھی پروا نہیں کرتا مگر ایک چیونٹی کا کردار کہ وہ رات

دن کھانے کے لئے ذخیرہ کرتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے مردہ ہم جنس کو بھی رسد خانے کی زینت بنا دیتی ہے۔ کسی میں خواہش اکل اس قدر تیز ہے کہ اسے کھانے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا وہ رات دن اسی فکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہی حال بعض انسانوں کا بھی ہے کہ وہ پیٹ کی خاطر ہر ذلت و رسوائی کو بخوشی گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر بعض بھوکوں مرنا گوارا کرتے ہیں۔ پر عزت پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ دیکھا جائے تو دنیا میں ساری رونق پیٹ سے ہے اور یہ پیٹو انسان ہی رونق عالم ہیں۔ یہی ہر طرح کے جرائم اور دھوکا بازیاں کرتے ہیں۔ ورنہ دنیا میں بڑا ہی سکون ہوتا۔

خانہ سازی کے بارے میں بھی اس نے طرح طرح کے کیریکٹر پیدا کر دیئے ہیں۔ کوئی اچھا عمدہ صاف ستھرا گھر چاہتا ہے کوئی بس رات کا ٹھکانا مانگتا ہے اور کوئی گھر بار سے بالکل بے نیاز ہے وہ ساری عمر کوئی گھر نہیں بناتا۔ دوسرے کا گھر بھی نہیں بننے دیتا۔ بندر کو دیکھو بیئے کا گھر نوچ کر پھینک دیتا ہے جس نے بڑی محنت و جانفشانی اور سلیقے کے ساتھ تنکے تنکے جمع کر کے اسے آراستہ کیا تھا۔ یہ بندر بھی عجیب جانور ہے اس میں ریس اور نقالی بہت زیادہ ہے جیسا کہ بعض انسانوں میں ہوتا ہے۔

انسان کے اخلاق و عادات تمام جانوروں سے نرالے ہیں۔ اس کے کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، پیشاب کرنے اور پاخانہ پھرنے کے اطوار سب سے جداگانہ ہیں۔ عموماً تمام جاندار جب پیشاب کرتے ہیں تو اسے روکنا نہیں چاہتے کہ آدھا کریں اور آدھا نہ کریں کیونکہ انہیں اس سے تکلیف پیدا ہو جاتی ہے مگر کتا جب بھی پیشاب کرتا ہے پورا نہیں کرتا بچا لیتا ہے تاکہ کسی اور جگہ پر بھی چھڑکاؤ کر سکے۔ کتا اور بلی پیشاب کرنے یا پاخانہ کرنے سے پہلے سونگھ کر جگہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں۔ مرغیاں اور چڑیاں ہر وقت کھاتی ہیں اور ہر وقت بیٹ کرتی ہیں۔

گو نوع انسانی ایک ممتاز کیریکٹر کی حامل ہے مگر انسان کے ان گنت افراد ہیں۔ ان گنت کیریکٹر ہیں کہ ایک کے خصائل و شمائل دوسرے سے نہیں ملتے۔

جس طرح ان کی شکلیں مختلف ہیں۔ عادات و اطوار بھی مختلف ہیں حتیٰ کہ باپ اور بیٹے ماں اور بیٹی کے اخلاق میں باوجود یگانگت کے بھی کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہوتا ہے کسی کو کوئی خبط ہے کسی کو کوئی بعض کیریکٹر نہایت متین اور سنجیدہ ہیں مگر یہ بہت ہی کم ہیں۔ بعض درمیانی درجے کے ہیں اور بعض نہایت ہی مضحکہ خیز ہیں اور یہ بہت ہیں۔

قدرت جس سے جیسا کام لینا چاہتی ہے۔ اس کا کیریکٹر اسی طرح کا بنا دیتی ہے کہ وہ اس کام کے کرنے پر مجبور رہے اور ویسا کئے بغیر اسے زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے۔ کسی کو چوری کی لت ہے۔ وہ بغیر چوری کئے زندگی میں کوئی لطف محسوس نہیں کرتا۔ کسی کا بغیر جھوٹ بولے کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا اور کسی کو بغیر غیبت و تہمت تراشی کے کھانا پینا حرام ہے۔ وہ بغیر زبان چلائے نہیں رہ سکتا۔ کوئی گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا ہے کہ ضرورت کے مطابق بھی نہیں بولتا۔ کسی کو بغیر لڑے جھگڑے مزا ہی نہیں آتا تو کوئی پٹتا ہی رہتا ہے اور اف تک نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے کسی کو طاؤس کا کیریکٹر عطا کر دیا ہے کہ وہ رات دن رقص کے بارے ہی میں سوچتا رہتا ہے اور جان و دل سے اس فن کی خدمت میں لگا رہتا ہے کیونکہ وہ اسی میں انسانیت کی فلاح سمجھتا ہے۔ کسی کو مصوری کا گرویدہ بنا دیا ہے وہ تصویر کشی کرتے کرتے مرجاتا ہے۔ تو کوئی شاعری کے مرض میں مبتلا ہے وہ اس کے لئے سب کچھ قربان کر دیتا ہے کسی کو ہوس دنیوی میں مبتلا کر دیا ہے تو کسی کو خوف عقبیٰ نے مار ڈالا ہے۔ کوئی شہرت کا بھوکا ہے اور اس کے لئے سب کچھ تج دیتا ہے تو کوئی مال کا لہٰذا اس کے لئے ہر قسم کی ذلت گوارا کر لیتا کسی کو لوہار بننا پسند ہے، کسی کو بڑھئی، کسی کو افسر، کسی کو ڈاکٹر، کسی کو ٹیچر، غور سے دیکھا جائے تو یہ دنیا اچھا خاصا پاگل خانہ ہے رنگ رنگ کا باؤلا اور طرح طرح کا خبطی اس میں آباد ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ ہر خبطی اور ہر پاگل اپنے آپ کو دانا سمجھتا ہے اور اپنے خبط میں ساری دنیا کو مبتلا دیکھنا چاہتا ہے۔ سچ ہے "**للجنون**

فنون" چور اپنے دوست کو چور بنانا چاہتا ہے۔ شرابی لیڈر ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے اور صوفی ساری دنیا کو صوفی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح ہر سمت رسا کشی رہتی ہے۔

میرا ایک صوفی دوست گنہگاروں کو دیکھ کر بڑا ہی کبیدہ خاطر تھا میں نے اس سے کہا مولیٰ نے یہ نظام اسی طرح بنایا ہے بس یہی ٹھیک ہے۔ اسے نہ آپ بدل سکتے ہیں نہ کوئی اور اس نے تو ایسے کیریکٹر پیدا کئے ہیں جو آپ کے کیریکٹر سے بالکل متضاد ہیں اور آپ کی باتیں ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ یہ مختلف کیریکٹر اللہ تعالیٰ نے اسی لئے بنائے ہیں۔ تاکہ اعتدال قائم رہے نہ زہد خشک کا غلبہ ہو سکے نہ محض عیاشی کا سکہ چل سکے۔ نہ مخلوق ہاتھ میں تسبیح لے کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے نہ یہ کہ مسجدیں مندر اور گرجے شوالے ویران ہو جائیں اور صرف سینما گھر اور ناچ گھر ہی آباد رہیں۔

میرے بعض دوست احباب رات میں جاگنا اور دن میں سونا پسند کرتے ہیں بعض سرشام ہی سونے کے عادی ہیں اور چڑیوں سے بھی پہلے اٹھ بیٹھنا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کو صبح کی آمد کا پیغام سنائیں مگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ جب تک آفتاب سرپر نہ چڑھ جائے بستر سے اٹھنے کا نام تک نہ لے۔ کوئی اپنی رات "اللہ ھو اللہ ھو" کرتے گزارنا چاہتا ہے تو کوئی تاش اور شطرنج سے رات کو بیدار رکھنا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کے دم سے رات بالکل سونی ہونے نہیں پاتی ورنہ ہر طرف موت کا سناٹا چھا جایا کرتا۔

کچھ لوگ میلا کچیلا رہنا پسند کرتے ہیں تاکہ دنیا کے اس گلزار میں کہیں سنڈاس بھی تو نظر پڑے اور کوئی صفائی ستھرائی کے اس قدر دل دادہ ہیں کہ آدھی زندگی اسی کی نذر کر دیتے ہیں۔

کوئی اس قدر سختی پسند ہے کہ اس نے اپنی جان کو ضیق میں ڈال رکھا ہے اور کوئی اس قدر عیش پرست کہ دوسروں کے لئے وبال بن گیا ہے۔ کوئی پیسے پیسے پر جان دے رہا ہے تو کوئی بے پروائی سے گل، چھرّے اڑا رہا ہے اور "بابر بہ

عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر عامل ہے۔
کھانے، پینے، پہننے، بیٹھنے، سونے، جاگنے، غرض ہر چیز کے بارے میں اس نے مختلف کیریکٹر پیدا کر دیئے ہیں تاکہ رونق عالم قائم رہے کوئی گوشت کا دلدادہ ہے کوئی سبزی کا کوئی چائے پر جان دیتا ہے۔ کوئی لسی پر کسی کو زیادہ نمک مرچ پسند ہے کسی کو کم۔ کوئی زیادہ سے زیادہ میٹھا کھانا پسند کرتا ہے کوئی کم سے کم۔ کوئی تیز خوشبوئیں پسند کرتا ہے کوئی ہلکی کوئی شوخ رنگ پر فریفتہ ہے تو کئی صوفیانہ رنگ پسند کرتا ہے کسی کو اپنے گھر میں پھلواری لگانا پسند ہے۔ تو کوئی اسے بیکار محض سمجھتا ہے کوئی گھر کے در و دیوار کو منقش دیکھنا چاہتا ہے تو کوئی ایک سادہ رنگ پسند کرتا ہے کسی کو اونچے اونچے مکان پسند ہیں کسی کو ایک منزل کوئی شور و غل کا دلدادہ ہے بات بھی کرتا ہے تو بڑی بلند آواز سے۔ مگر کوئی اس کے برخلاف اتنا آہستہ بولتا ہے کہ بس ان کا نیفا ہی سنتا ہے۔ کسی کو ہر بات میں قدیم طرز زندگی پسند ہے تو کوئی قدیم کا دشمن جانی کوئی کیسے بال بناتا ہے کوئی کیسے کوئی داڑھی رکھتا۔ کوئی مونچھیں۔ تو کوئی صفا چٹ میدان چاہتا ہے۔ کسی کی ہر بات میں تکلف، تصنع، اور ناز و ادا ہے تو کوئی بالکل سادہ لوح ہے۔ بعض لوگ کھیل کود، تاش اور شطرنج، کرکٹ وغیرہ کے ایسے رسیا ہیں کہ بس رات دن اسی میں لگے رہتے ہیں۔ نہ انہیں بیوی بچوں کی پرواہ نہ گھر بار کی نہ عزت و دولت کی نہ کاروبار کی۔ میرے دو عزیز وکیل ایسے ہیں کہ اگر ان کے پاس بھولا بھٹکا کوئی موکل آ بھی جاتا ہے تو وہ شطرنج میں ایسے غرق رہتے ہیں کہ اس کی بات ہی نہیں سنتے اور اگر اتفاقاً کوئی عورت اپنا مقدمہ لے کر آجاتی ہے تو وہ سب سے پہلے اس سے اپنی شادی کی فکر کرنے لگتے ہیں گو وہ شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو اور گو وہ خود بیوی بچوں والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی حال ہم نے بعض حکیموں کا دیکھا۔ بعض احباب اپنے پیشے کی عزت کو ہر بات پر فوقیت دیتے ہیں تو بعض پیسے کو اور ایسے زیادہ ہیں کسی کو کبوتر پالنے کا شوق ہے۔ کسی کو مرغی خانے کا کوئی تیتر بٹیر میں خوش ہے تو کوئی مینا بکری گائے بھینس وغیرہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

آپ کے دوست احباب میں بہت سے ایسے ہوں گے جو اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا ذرا سی بات سے ان کی بے عزتی ہو جاتی ہے مگر بعض ایسے بھی ہوں گے جو بری طرح احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں لہٰذا وہ بات بات پر برا مانتے ہیں کہ ہمیں ذلیل سمجھا حالانکہ نہ انہیں کسی نے عزیز سمجھا نہ انہیں کسی نے ذلیل۔ کوئی ذرا ذرا سی باتوں کو بہت بڑا سمجھتا ہے کوئی بڑے بڑے جھگڑوں کو بھی کچھ نہیں سمجھتا اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

اپنے جوڑے کے انتخاب اور اس کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں آپ کے دوستوں کے مختلف کیریکٹر ہیں۔ کوئی موٹا تازہ ساتھی پسند کرتا ہے۔ تو کوئی دبلا پتلا۔ کوئی لمبا تڑنگا تو کوئی متوسط القامت یا چھوٹا قد۔ کوئی گورے رنگ کو پسند کرتا ہے تو کوئی گندمی کو کوئی تعلیم یافتہ کو تو کوئی غیر تعلیم یافتہ کو۔ کوئی صرف ذات پات دیکھتا ہے اور کچھ نہیں تو کوئی چٹی چمڑی کے سوا کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ بعض لوگ اپنوں میں شادی کرنا پسند کرتے ہیں۔ بعض غیروں میں اور بعض غیر ملکی دوست کو پسند کرتے ہیں الغرض "اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے" والا معاملہ ہے۔

پھر ہر دوست کا معاملہ جداگانہ ہے کوئی اپنے جوڑے کے نجی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی کرنا نہیں چاہتا۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ ایک قدم بھی بغیر اس کی اجازت کے نہ اٹھنے پائے کوئی غلام بن کر رہنا پسند کرتا ہے تو کوئی آقائے مطلق بننا چاہتا ہے تو کوئی نرم ہے۔ کوئی سخت تو کوئی درمیانی چال چلتا ہے۔ کسی کے یہاں معافی کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو کوئی خوردہ گیر ہے سخت نکتہ چینی اور تنقید باز۔ کوئی اپنے لباس پر زور دیتا ہے۔ جوڑے کے لباس کی پروا نہیں کرتا کوئی اپنے بدن پر تو مٹی تھوپے پھرتا ہے مگر جوڑے کو بیش قیمت لباس پہناتا ہے کسی کا طرز عمل ان دونوں کے درمیان ہے۔

بچوں کے بارے میں بھی ہر ایک کا مزاج جداگانہ ہے کسی کو کثرت اولاد

کی ہوس ہے تو کوئی اس سے بے نیاز ہے۔ اولاد ہوئی ہوئی نہ ہوئی تو پروا نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ بچے ہیں انہیں میلا کچیلا ننگا دھڑنگا پھرنے دو کیا ہے بچے ہی تو ہیں۔ مگر بعض اپنے سے زیادہ اپنے بچوں کی صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔ کچھ ماں باپ ایسے ہیں کہ بچوں سے چھپا کر کچھ بھی کھا پی نہیں سکتے خواہ کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہو بعض لوگ اپنے سے زیادہ اپنے بچوں کی صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔

بعض لوگ لڑکی کی صورت دیکھنا

نہیں چاہتے بعض لڑکیوں کو بھی لڑکوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ لڑکے یا لڑکی میں کوئی فرق نہیں کرتے ساری اولاد کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں ہر شخص کا ایک جداگانہ کیریکٹر ہے کیریکٹر ایک دوسرے سے قریب قریب تو ضرور ہوتے ہیں۔ مگر بالکل ایک جیسے ہر گز نہیں ہوتے کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ جو ہم لوگ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں کے اخلاق و عادات بالکل ایک جیسے ہیں۔ دراصل مبالغہ پر مبنی ہوتا ہے۔ایک جیسے تو کہیں بھی نہیں ہوتے قریب قریب یا مشابہ ضرور ہوتے ہیں۔

اور انہیں کی بنا پر دوستی یا اتحاد قائم ہوتا ہے۔ انجمنیں بنتی ہیں اور پارٹیاں تشکیل پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انجمن اور ایک پارٹی کے افراد ایک دوسرے کے مخالف یا دشمن ہوتے ہیں۔

اس نے بعض جانور ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ ساری عمر زمین میں بل بناتے رہتے ہیں۔ یہی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ پھر ہر جانور اپنی ضروریات اور اپنی افتاد طبع کیمطابق بل بناتا ہے۔ بعض جانور لکڑی میں سوراخ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور بعض دیمک کی طرح دیواروں وغیرہ میں سوراخ کر کے اس پر مٹی کی ایک تہہ جما دیتے ہیں۔ مکڑی جالا بنتے بنتے تھکی جاتی ہے اور بعض مکڑیاں اور ہی طرح کا گھر بناتی ہیں۔ بیئے کو دیکھو کتنا بڑا انجینئیر ہے کہتے ہیں انسان نے گھر بنانا اسی سے سیکھا ہے۔

الغرض مولیٰ نے بھانت بھانت کے کیریکٹر پیدا کر دیئے ہیں۔ اور بھی بہت سے کیریکٹر ہیں جن سے ہمیں سابقہ ہی نہیں پڑا کیونکہ ہم انہیں جانتے ہی نہیں نہ ہم نے انہیں کبھی دیکھا ہے۔

******

ہماری چند مطبوعات

شرح اسماء الحسنیٰ اُردو (علامہ عبدالصمد صارم الازہری)

بذل المجہود فی حل ابی داؤد (مکمل مجلد سیٹ)

معدن الحقائق " " "

تاریخ علم نحو مجلد (علامہ عبداللہ

تاریخ فقہا " "

تاریخ قدیم مدارس عربیہ "

کوثر النبی صلی اللہ علیہ وسلم

صرف گھوٹوی سو سالہ تصنیف

نقش حیاتِ امام اعظمؒ

تحصیلِ علم

حقیقتِ فقہ

گناہوں کا کفارہ اور مغفرت کے اسباب (مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی)

حقیقت اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (زیر طبع)

تفسیر رُوح اللہ "

کمالاتِ اعزازیہ شرح اردو مقامات حریریہ "

فضائل اذان و اقامت (احادیث کی روشنی میں)

تعلیم الاسلام (مکمل چار حصے)

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے: **مکتبہ قاسمیہ مُلتان** نزد چوک گھنٹہ گھر کچہری روڈ، ملتان۔

تاریخ فقہاء

◎ حقیقتِ فقہ

◎ علم فقہ کی تاریخی، اِبتدائی حیثیت

◎ پاک وہند میں فقہاء کی آمد

◎ برّصغیر میں صحابہ کرامؓ کی تشریف آوری

◎ امامِ اعظمؒ کے خاص حالات

◎ نو سو تیس فقہاءِ احناف کے حالات

مؤلفہ

علامہ عبدالبر محمد قاسم

مہتمم جامعہ قاسم العلوم گلگشت، ملتان۔

مکتبہ قاسمیہ ملتان پاکستان

نزد چوک گھنٹہ گھر، کچہری روڈ۔ فون : ۴۴۵۸۵

یہ جو کتاب "شرح اسماء الحسنٰی" کے نام سے مولانا عبد الصمد صارم نے لکھی ہے، اس میں معارف اور معانی کا اک جہان آباد ہے۔ میں نے یہ جہانِ معنی خود دیکھا ہے اور وہ لمحے جن میں روحِ انسانی آگہی سے سیر اب، علم سے شاداب اور عرفان سے سرشار ہوتی ہے، میں نے وہ کم یاب اور قیمتی لمحے طویل ہوتے ہوئے اسی جہان معنی میں گزارے ہیں۔ صارم صاحب خطیب نہیں، ادیب ہیں، لیکن ان کی تحریریں تقریر کی لذت موجود ہے۔ حکایتوں، تمثیلوں، اشعار اور اقوال سے ایک سماں بندھتا ہے، ایک رنگ جمتا ہے۔ پھر اس رنگ میں سے تفکر، تفلسف، تذکیر اور تزکیہ کے کئی رنگ پیدا اور ہویدا ہونے لگتے ہیں۔ منطق کی گتھیوں اور لغت کے بکھیڑوں پر لذتِ شوق غالب آجاتی ہے۔

ذوالکفل بخاری / ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان۔

ملتان سے شائع ہونے والی انتہائی خوبصورت کتابوں میں تازہ اضافہ "شرح اسماء الحسنٰی" ہے۔ غیر معمولی دیدہ زیب ٹائٹل اور معیاری طباعت پہلی نظر میں متاثر کرتی ہے اور موضوع بھی ایسا کہ جس کے ہر عنوان کو ہر مسلمان اپنے نام کا جزو بنا کر اظہار بندگی کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کم و بیش ہر نام کے ساتھ عبد کا سابقہ لگا کر نام مکمل کرنے کی روایت تمام مسلمان معاشروں میں موجود ہے اور ایسا حصول فضل و برکت کے لئے کیا جاتا ہے۔ "شرح اسماء الحسنٰی" علامہ عبد الصمد صارم کی تحقیق و تدقیق کا شاہکار ہے۔ انہوں نے نہ صرف ہر نام کی مفصل تشریح اور اسکے فضائل و مناقب کھول کر بیان کر دئے ہیں بلکہ وظائف کے ذریعے کامیابیوں کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مختلف لوگوں کو پیش آنے والے واقعات بھی درج کئے ہیں۔ جس سے کتاب میں تاریخی چاشنی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اسکے حبیب ﷺ سے محبت رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بلاشبہ انمول تحفہ ہے۔

روزنامہ نوائے وقت ۔ ملتان

Scientific Research on

FAIREST NAMES OF ALLAH

شرح اسماء الحسنیٰ

عارف کمپنی

ملتان - پاکستان

ARIF COMPANY, MAKTABA QASMIA

MULTAN - PAKISTAN.

Processed by: ALI PROCESS MULTAN